

چونکا دیئے والی خوفناک کہانیوں کا انتخاب
ماہنامہ

ڈائجسٹ
کراچی

جنوری 2015

قیمت: 70 روپے

خاص نمبر

WWW.PAKSOCIETY.COM

چونکا دینے والی خوفناک کہانیوں کا انتخاب

ماہنامہ
ڈائجسٹ
کراچی

جلد نمبر 16 شمارہ نمبر 4 جنوری 2015ء

ای میل ایڈریس: Dardigest01@gmail.com

نیجنگ ایڈیٹر خالد علی

چیف ایڈیٹر آصف حسن

ایڈیٹر شاہد علی

سب ایڈیٹر محمد ذیشان

قیمت 70/- روپے

سالانہ قیمت 1000/- روپے



ادارہ کا کسی بھی رائٹر کے خیالات سے متعلق ہونا ضروری نہیں۔ ڈائجسٹ میں چھپنے والی تمام کہانیاں فرضی ہوتی ہیں کسی کی ذات یا شخصیت سے مماثلت اتفاقاً ہو سکتی ہے

<p>45 طاہرہ آصف</p> <p>نادیدہ مخلوق</p> <p>کوئی مانے یا نہ مانے لیکن یہ حقیقت ہے کہ نادیدہ مخلوق کا وجود واقعی دنیا تک رہے گا</p>	<p>16 عبدالحمد ساگر</p> <p>موت کے گھاٹ</p> <p>ہل ہی حیران کرئی جتنی وادیوں میں سرگرداں تیرے شرکی ناقابل فرسوش سنسنی خیز کہانی</p>	<p>06 ادارہ</p> <p>قرآن کی باتیں</p> <p>دین و دنیا میں علاج پانے کیلئے قرآن کی باتوں پر عمل کرنا انسانی زندگی کیلئے اہم ہے</p>
<p>66 اے وحید</p> <p>رولو کا</p> <p>وہ واقعی پراسرار توں کا مالک تھا اس کی نیرت انگیز اور جادوی کرشمہ ساز ہیں آپ کو تنگ کر دیں گی</p>	<p>59 محمد خالد شاہان</p> <p>خونی انتقام</p> <p>حقیقی خواہشات کا پروردہ نفس جب اس کی خواہش کی تکمیل نہ ہوتی تو اپنے ہوش کو جینا</p>	<p>51 شگفتہ ارم درانی</p> <p>بیٹی</p> <p>حقیقت میں اور واقعی بیٹیاں والدین کے لئے دل کا سرور اور آنکھوں کی ٹھنڈک ہوتی ہیں</p>
<p>109 سیدہ عطیہ زاہرہ</p> <p>خونی چکر</p> <p>یہ حقیقت ہے کہ مہیب و خطرناک جادو سر چڑھ کر بولتا ہے۔ ثبوت کہانی میں موجود ہے</p>	<p>97 رضوان علی سومرو</p> <p>موت کا سودا</p> <p>چہرے و غلوں کی نیک امنست کہانی جو پڑھنے والوں کو سوچ کے سمندر میں غوطہ زن کر دے گی</p>	<p>89 عاصمہ احمد</p> <p>پراسرار مندر</p> <p>رات کے گھناؤپ اندھیرے میں جنم والینے والی پرہول، پرہیت اور ڈراؤنی کہانی</p>
<p>143 مریم قیصر</p> <p>آہنی گرفت</p> <p>ایک ظالم چڑیل کی کہانی جو کہ اپنے پڑھنے والوں کو حیرت کے سمندر میں ڈال دے گی</p>	<p>139 عامر ملک</p> <p>فطرت</p> <p>عادت تو آسان سے بدل جاتی ہے مگر فطرت کا بدلنا ناممکن ہوتا ہے کہانی پڑھ کر غور کریں</p>	<p>114 ایم اے راحت</p> <p>زندہ صدیاں</p> <p>سوچ کے نئے در سے کھلتی اپنی نوعیت کی سبے مثال، لا جواب اور دلچسپ کہانی</p>

ایڈیٹر و پبلشر آصف علی نے نئی بریل ہالبرو، ڈکراچ، سرحد کا شمار کرتے ہیں

copied F

170

ایم الیاس

عشق ناگن

یہ دنیا ہے نہ رہے لیکن کہانی محبت کی زندہ رہے گی۔ انہی الفاظ کو احاطہ کرتی دگدگاز کہانی

160

فکیل نیازی

مجازی محبت

انسانی زندگی پر سب سے زیادہ محبت کا اثر ہوتا ہے۔ اس کے مصداق یہ حقیقی رواداد ہے

146

ایس امتیاز احمد

روح کی بے چینی

دل و دماغ اور ذہن پر اپنا نکتہ پھیلانی اور دھنسنے کھڑے کرتی عجیب و غریب پرچہ خوفناک کہانی

211

ساجدہ راجا

حد بندی

انہونی اور حقیقت کو بھٹلاتا اکثر زندگی کو عذاب سے دو چار کر دیتی ہے۔ اس کا ثبوت کہانی میں ہے

201

عثمان غنی

مسکراہٹ

کبھی کبھی انسان مطلب پرستی میں تمام حدیں بھٹاٹ کر جاتا ہے۔ کہانی پڑھ کر دیکھیں

191

پیاسر

درد دل

یہ حقیقت ہے کہ انسان ہی نہیں بلکہ تادیدہ مخلوق بھی دل کے ہاتھوں مجبور ہوتی ہیں

237

ضرغام محمود

موت کا سامنا

جب حقیقت میں موت سامنے کھڑی ہو تو کیسا غسوسی ہوگا۔ لہذا یہ حقیقی کہانی پر مصائب بھرنے کا

231

مدثر بخاری

آسیب زدہ

طویل عرصہ سے خالی مکان اور غیر آباد علاقہ آسپ زدہ ہو جاتا ہے۔ حقیقت کہانی میں ہے

216

ملک این اے کاوش

قلبی اذیت

عقل و شعور کو حیرت میں ڈالتی اور حقیقت سے روشناس کراتی دل کو چھوٹی رواداد

262

شہزادہ حاند زیب

پراسرار سایہ

دل و دماغ سے محو نہ ہونے والی ہیر تاک، ہیر تاک، خوفناک اور دل گرفتہ کہانی

257

صابحہ اسلم

ذہنی اذیت

نئی، بدی پر مبنی خوف کے سمندر میں غوطہ زن دل گرفتہ دل نگار اور دل غریب کہانی

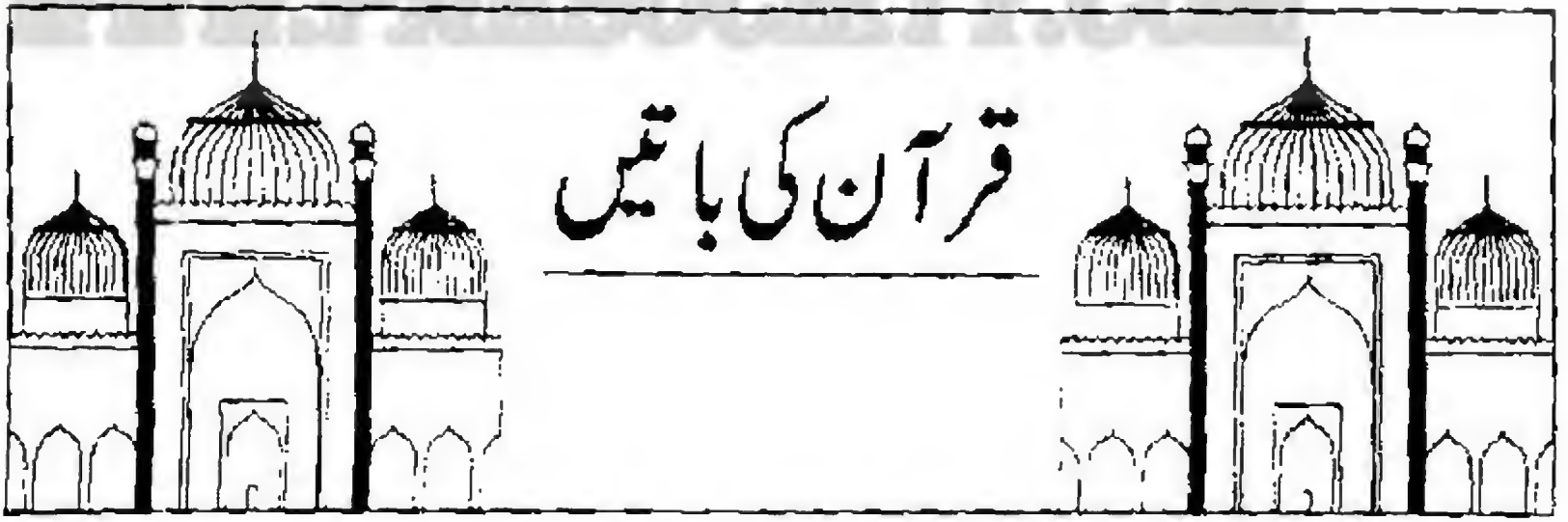
250

ادارہ

قوس قزح

قارئین کے جیسے کئے اشعار نہیں قارئین بڑے ذوق و شوق سے پڑھتے ہیں

خط و کتابت گاہ: ماہنامہ ڈرڈا جسٹ لورانی آرکیڈ نیو رو بازار کراچی: 32744391



☆ اور کسی شخص میں طاقت نہیں کہ اللہ کے حکم کے بغیر مر جائے۔ اس نے موت کا وقت مقرر کر کے لکھ رکھا ہے۔
(سورۃ آل عمران 3 آیت 145)

☆ اے جہاد سے ڈرنے والو تم کہیں رہو موت تو تمہیں آ کر رہے گی خواہ بڑے بڑے مخلوق میں رہو۔
(سورۃ نساء 4 آیت 78)

☆ اور وہ اپنے بندوں پر غالب ہے اور تم پر نگران مقرر کئے رکھتا ہے یہاں تک کہ جب تم میں سے کسی کی موت آتی ہے تو ہمارے فرشتے اس کی روح قبض کر لیتے ہیں اور کسی طرح کی کوتاہی نہیں کرتے۔ (سورۃ انعام 6 آیت 61)

☆ بھلا تمہارے پاس ابراہیم کے معزز مہمانوں کی خبر پہنچی ہے جب وہ ان کے پاس آئے تو سلام کہا انہوں نے بھی جواب میں سلام کہا۔ دیکھا تو ایسے لوگ کہ نہ جان نہ پہچان تو اپنی گھر جا کر ایک بھنا ہوا سونا پتھر الٹائے اور کھانے کے لئے ان کے آگے رکھ دیا کہنے لگے کہ آپ تناول کیوں نہیں کرتے؟ اور دل میں ان سے خوف معلوم ہوا۔ انہوں نے کہا کہ خوف نہ کیجیے اور ان کو ایک دانش مند اسحاق لڑکے کی بشارت بھی سنائی۔

(سورۃ ذاریات 51 آیت 24 سے 28)

☆ تو ان لوگوں کے عہد توڑ دینے کے سبب ہم نے ان پر لعنت کی اور ان کے دلوں کو سخت کر دیا یہ لوگ کلمات کتاب کو اپنے مقامات سے بدل دیتے ہیں، اور ان جن باتوں کی ان کو نصیحت کی گئی تھی ان کا بھی ایک حصہ فراموش کر بیٹھے اور تھوڑے آدمیوں کے سوا ہمیشہ تم ان کی خطائیں معاف کر دو اور ان سے درگزر کرو کہ اللہ احسان کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے اور جو لوگ اپنے بارے میں کہتے ہیں کہ ہم نھاری ہیں، ہم نے ان سے بھی عہد لیا تھا مگر انہوں نے بھی اس نصیحت کا جو ان کو کی گئی تھی، ایک حصہ فراموش کر دیا، تو ہم نے ان کے باہم قیامت تک کے لئے دشمنی اور کینہ ڈال دیا اور جو کچھ وہ کرتے رہے، اللہ عنقریب ان کو اس سے آگاہ کرے گا۔ (سورۃ مائدہ 5 آیت 13 سے 14)

☆ اور قسم نفس انسانی کی اور اس ذات کی جس نے اس کے اعضا کو برابر کیا پھر اس کو بدکاری سے بچنے اور پرہیزگاری کرنے کی سمجھ دی کہ جس نے اپنے نفس کا ترکیہ کیا، وہ مراد کو پہنچا اور جس نے اسے خاک میں ملایا، وہ خسارے میں رہا۔ (سورۃ شمس 91 آیت 7 سے 10)

☆ ہم کو روز قیامت کی قسم اور نفس لواسکی کہ سب لوگ اٹھا کر کھڑے کئے جائیں گے۔ (سورۃ قیامہ 75 آیت 1 سے 2)
(کتاب کا نام ”قرآن مجید کے روشن موتی“ بشکر یہ شمع بک ایجنسی کراچی)

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✧ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریچ
- ✧ ایڈ فری لنکس، لنکس کو پیسے کمانے کے لئے شریک نہیں کیا جاتا
- ✧ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو مائیل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پریویو
- ✧ ہر پوسٹ کے ساتھ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریچ
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

درد کا احساس کرنے لگیں تو ہماری ساری پریشانیاں دور ہو جائیں، دونوں کہانیاں مل گئی ہیں کہانیاں سیٹ موصول ہوئیں ورنہ اس شمارے میں ضرور شامل اشاعت ہوتی، اگلے شمارے میں کہانی ضرور شامل اشاعت ہوگی۔ آپ کے انکل کے لئے ہم اور کارمین دعا گو ہیں۔

سحرش حنیف لڑا پکی سے، السلام علیکم اب میر کا ڈائجسٹ پانچ سو بہت خوشی ہوئی۔ بہت بہت شکر یہ میر اور میری والدہ کا خط شائع کرنے کا۔ امید ہے میرا یہ خط جلد آپ کے ہاتھوں میں ہوگا اور ”خمس نمبر“ کی زینت بنے گا۔ تمام کہانیاں عمدہ ہیں، خاص کہانیاں واقعی بہت خاص تھیں، ”خمس نمبر“ سب پر سہقت لے گئی۔ ”ہلا ہلا“ اور ”زندہ صفت“ سے مجھے یہ ڈائجسٹ ”خونی نمبر“ لگا، لیکن ”مجبوری“ کے اختتام نے میرے اس خیال کو پاش پاش کر دیا۔ درت بالا کہانوں کے علاوہ ”محروست“، ”شیر فوٹاں“، ”نقیی موت“ اور ”عقرب بھی بہت عمدہ تھیں۔“ ”الگ قلوب“ معصومیت سے بھر چڑھی۔ ”خونی سینا“ نہ بہت اچھی تھی نہ بہت بُری تھی۔ تمام کہانیاں بہت عمدہ تھیں۔ خاص نمبر کا بہت شدت سے انتظار ہے۔ امتحانات کی مصروفیات زیادہ ہیں۔ امتحانات میں اتنی نمبروں سے کامیابی کے لئے محنت شرط ہے لیکن آپ تمام کارمین سے اتماس ہے کہ مجھے میری بہن اور میری تمام کلاس کے لئے اچھے نمبروں سے کامیابی کے لئے دعا کیجئے گا۔ امتحانات سے فراغت کے بعد ایک کہانی تحریر کرنے کا ارادہ ہے، امید ہے کہ اپنے اس ارادے کو پایہ تکمیل تک پہنچا سکوں۔ میرانی لڑا، کراس سوال کا جواب دیتے گا کہ یہ کہانیاں صرف کہانیاں ہی ہوتی ہیں۔ یا ان میں کچھ حقیقت پنہاں ہوتی ہے؟ اس امید کے ساتھ کہ میرا یہ خط بھی شائع ہوگا۔ خدا حافظ!

ہلا ہلا سحرش صاحبہ: دیری دیری تھکنکس کا امتحان کی مصروفیت کے باوجود آپ نے خط لکھا۔ ہماری اور کارمین کی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ، آپ کی بہن اور تمام کلاس فیلوز کو اچھے نمبروں سے کامیاب کرے، لیکن محنت شرط ہے، آپ کی کہانی کا شدت سے انتظار رہے گا، کہانی میں کہانی کے علاوہ حقیقت بھی پنہاں ہوتی ہے۔ اکثر لوگوں کے ساتھ ایسے واقعات پیش آتے ہیں۔

سیدہ عطیہ زاہرہ لاہور سے، السلام علیکم اب میر کا ڈائجسٹ کا اضافہ شہرت ہوگا۔ اس کے علاوہ میں ڈائجسٹ کے تمام سے اور پڑھنے والے کارمین کے لئے دعا گو ہوں کہ اللہ تعالیٰ ان سب کو بھی خوش و خرم رکھے۔ اس کے ساتھ ساتھ میں آپ سب کو نئے سال کی مبارکباد بھی دیتی ہوں۔ اور دعا کرتی ہوں کہ اگلے سال ہم سب کے لئے خوشیوں سے بھرا ہو۔ پرانا سال جو کہ اب اپنے اختتام کی طرف بڑھ رہا ہے۔ مجھے ڈر ڈائجسٹ کا ایک حصہ بٹالیا۔ اس سال شاید دو یا تین ماہ ایسے گزرے۔ جس میں میری کہانی شامل نہ تھی۔ باقی پورا سال میری تحریریں کو جھنڈی لگی۔ میں اس کے لئے اوارے کی شکر گزار ہوں۔ میں ان تمام دوستوں کا بھی شکر گزار ہوں جنہوں نے میری تحریریں کو پڑھ لیا۔ اب میں دھمپنے پرست ہوں کہ سب تحریریں شامل ہوگی تھیں بہترین تھیں۔ میری کہانی کو سرورق پر جگہ دینے کے لئے دوبارہ شکر یہ اب میں ایک اور کہانی ارسال کر رہی ہوں۔ امید کرتی ہوں پسند آئے گی۔ ڈر ڈائجسٹ کے لئے شب و روز دعا گو ہوں۔

ہلا ہلا عطیہ صاحبہ: اعلیٰ کہانی میں سال بعد اس کے جذباتی کہانی بھی موصول ہوئی۔ اس کے لئے دیری دیری تھکنکس اور آپ نے چاہت دیکھیں اور نگاہ سے پورے سال کہانی ارسال کی۔ امید ہے کہ آپ یہ غلام باری رکھیں گی۔ اس کے لئے ایک مرتبہ بھر شکر یہ کہانی شامل اشاعت ہے۔

فلک زاہد لاہور سے، السلام علیکم اب میر کا ڈائجسٹ میں شامل ہو رہی ہوں، امید ہے جو صلہ افزائی فرمائیں گے۔ ڈر سے میرا لگاؤ زیادہ پرانا نہیں ہے۔ پہلی بار ڈر اگست 2014ء کا شمار پڑھا جس میں میرے فیورٹ رائٹر عثمان غنی بھیا کی کہانی ”پس منظر“ شائع ہوئی تھی جو کہ دلچسپ کہانی تھی۔ نام پڑھ کر ہی رسالہ خرید لیا اور پورے ڈر کو اچھا اور مایوسی رسالہ پایا۔ اے راحت اور ایم ایس صاحب کو ڈر میں دیکھ کر خوشی ہوئی۔ ڈر میں جن رائٹرز حضرات کی کہانیاں نے مجھے متاثر کیا ان میں ایس حبیب خان قابل ذکر ہیں۔ ان کی کہانیاں ”روح کی تلاش“ اور آخری اچھا لا جواب تحریریں تھیں۔ ایس امتیاز احمد آپ کی کہانیاں ”نئی قبر، سرد جنم اور مجبوری“ قابل تعریف کہانیاں تھیں۔ عطیہ زاہرہ خوب تو نہیں۔ پھر بھی ڈر میں پھانسی ہوئی ہیں۔ ”نقاب اور لغت“ ساحل دعا بخاری کی زیر دست کہانیاں تھیں۔ عمران قریشی آپ کی کہانیاں ”ڈمی اور مادیدہ مجرم“ پڑھ کر دل بے اختیار عیش عشق کر اٹھا۔ کالی چڑیل شہزادہ چاند زیب، دلہن شگفتہ ارم دورانی، نبی آواز ملک نسیم ارشاد، جناتی کہانیاں فرحان، محمد نصیب اور خونی دنیا نور محمد اسلم کی یہ سب خوب صورت کہانیاں تھیں، باقی دبیر کا شمار ابھی زیر مطالعہ ہے اس لئے تھوڑا محفوظ۔ جبکہ ”قبر کی چوری“، ”عمر محمود فرہاد آپ نے تو میرا دل ہی جیت لیا وہ میرے فیورٹ، انگلش کرداروں پر اتنی خوب صورتی سے جو کبھی گئی تھی۔ اپنی پہلی کہانی ”شراب“ بھیج رہی ہوں۔ امید ہے مایوس نہیں

کرے گی۔ پلیز! حوصلہ افزائی ضرور کیجئے گا۔ اس کے علاوہ اپنی انہی کہانی بھی جلد بھیج دوں گی جو کہ مکمل ہونے کو ہے۔
 اللہ بڑا نیک صاحب: ڈر ڈائجسٹ میں موسم و نیم آگاہی کے لئے کچھ ہونا ہے پڑھ کر خوش ہوئی، اہانیوں کی تعریف اور نئی کہانی بھیجئے کے لئے ڈیڑھ روٹ شکر یہ۔ خط بہت ہی نیک موصول ہوا، لہذا کہانی شامل دشانت نہ ہوگی۔ اس کے لئے معذرت۔

پیاسو مدینہ سیدال گجرات سے، السلام علیکم! امید ہے کہ ادارے کے سارے لوگ خیریت سے ہوں گے۔ اب آنے ہیں دسمبر کے شمارے کی طرف قرآن کی باتیں۔ کے بعد سب سے پہلے اپنا خط پڑھا، کبھی کبھی کانٹ چھانت بہت اچھی چیز ثابت ہوتی ہے۔ اس کے بعد ساجدہ راجہ کا خط پڑھا، ساجدہ بہن آپ کے بچاؤں کا پڑھ کر دل دیکھ دیا، آپ کا اللہ نے یہ رشتہ دے کر دیا جس کے لئے، مجھے اللہ نے ان تمام رشتوں کی مناسبت سے محروم رکھا ہوا ہے۔ اللہ آپ کے بچوں کو جو رحمت میں لگا دے اور آپ کے والد صاحب کو صحت کاملہ عطا فرمائے آمین۔ غنیمت کاوش بھائی ویل ڈن مجموعی طور پر کہانی کا اثر بہت اچھا تھا۔ دختر آتش واقعی کچھ لوگ اس طرح موت کی انت منت مثال چھوڑ جاتے ہیں جو رہتی دنیا تک قائم رہتی ہے۔ ساجدہ راجہ صاحب کی محنت بھی اپنے آپ میں ایک اچھوتی اور سنسنی خیز کہانی تھی۔ مدثر بھائی کی قیمتی موت اچھی تھی مگر سنسنی کب لیا! مجبوری بھی بلاشبہ بہترین تحریر تھی۔ باقی کہانیاں بھی ایک سے بڑھ کر ایک تھیں، اشعار بھی اچھے تھے۔ مرنے والوں کی غزل میں ختم ختم غزلوں کی تیرائیوں میں اتنی انہی غزلوں میں فریدہ خانم کی غزل کمال کی تھی۔ پیاسو کی نظم میرے خیال میں اچھی تھی۔ اب تو صرف "بی" کا انتظار ہے۔ اس کے ساتھ کچھ تحریریں اور حاضر خدمت ہیں۔ ہم تو ادارے کے سحر میں جکڑے ہوئے ہیں۔ اللہ سے دعا ہے کہ ڈرائنگ ترقی کرے کہ ہر دل پر دیکھا جاوے چھوٹے ہر دل پر ڈر کی حکمرانی ہو۔ آمین۔ اس کے ساتھ ہی اگلے ماہ نمبر کے لئے اجازت، اللہ تعالیٰ۔

اللہ بڑا نیک صاحب: قلبی نوازش ہے۔ پڑھ کر خوش ہوئی۔ ہر ماہ آگاہی کے لئے اس میں کیا کریں تو اپنی رائے ضرور مال کر دیا کریں۔ چلے گا "ماہی کی جگہ درویش" حاضر ہے۔ آپ کی رائے کا شدت سے انتظار ہے گا۔ Thanks۔

بلقیس خان پشاور سے، السلام علیکم! امید تھا کہ ہے کہ پورا اسٹاف خیر و عافیت سے ہوگا۔ درمیان کی رگوں میں اپنے اپنے جیسے کارنگ، ڈالنے کا بھرپور اہم کردار ادا کر رہا ہوں گا۔ نومبر کا ڈر ڈائجسٹ کا بہترین نام تھا۔ مری، مدینہ بہت معمول نگ رہی تھی، سب دوستوں کے تبصرے پرند آئے، آپ سب کا بہت بہت شکریہ ادا کیا کہ آپ کو میری کہانیاں پسند آ رہی ہیں۔ تمام کہانیاں بہترین اور مدہور ہیں۔ نئی کہانی زندہ صدیاں بھی زبردست ہے۔ ہر رات کا اپنا ایک مقام ہے۔ سب لوگ محنت سے آگے بڑھ رہے ہیں۔ میری کہانی شہر شکار اور شکاری، بھی تو سا لگرو نمبر کے لئے تھی، ابھی تک نگ نہیں سکی۔ پھر بھی میں ناراض نہیں ہوں۔ کوشش تو بہت کرتی ہوں، کہ رنگ بولر ہو جاؤں، مگر مصروفیات آڑے آ جاتی ہیں، باقی شگفتہ ارم درنی، اس حبیب، عطیہ زاہرہ، ساحل دہا، صاحبہ، طلحہ اور شائستہ سحر، ساجدہ راجہ اچھا لکھ رہی ہیں۔ اور بیسٹ بارہی ہیں۔ آپ سب مجھے بھول نہ جائیں کیونکہ میں اپنی دعاؤں میں ہمیشہ آپ سب کو یاد رکھتی ہوں۔ رولو کا، انہی بارہی ہے۔ عشق ناکن کبھی کبھی بالی ووڈ اولڈ فلموں، فلمیں، ٹکینہ، نگاہیں، کا سا اسٹائل اپنا لیتی ہے۔ میرا بی ایم ایس صاحب کا سرف نام ہی کافی ہے۔ پلیز، نئے راسخوں کو بھی موقع دیجئے کہ وہ بھی اپنی صلاحیتیں نکھار کر سامنے رکھیں، ادارے سے ہمیں کوئی شکوہ شکایت نہیں ہے، ہم نے راسخ ہیں۔

ہماری کہانیاں لگد ہی ہیں۔ خوشی کی بات ہے ہمارا شمارہ سلسلے دار تحریروں کی جانب سے۔ یقیناً آپ غور کریں گے۔ والسلام۔
 اللہ بڑا نیک صاحب: قلبی نوازش ہے۔ تحریروں کی تعریف کے لئے شکریہ۔ آپ اور راسخ راسخوں سے کہا جاتا ہے کہ زیادہ تر چھوٹی کہانیاں لکھیں کیونکہ چھوٹی کہانیاں زیادہ شامل اشاعت ہوتی ہیں۔ بڑی کہانیاں نمبر میں لگ جاتی ہیں۔ آپ کی امتحانی مصروفیات زیادہ ہیں، خیر ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو کامیاب و کامران کرے۔

ایس حبیب خان کراچی سے، السلام علیکم! سب سے پہلے ڈر کی ٹیم، تمام راسخوں اور اس کے پڑھنے والوں کو میری طرف سے نیا سال مبارک! دعا ہے کہ نیا سال ہم سب کے لئے امن و سلامتی کا پیغام لے کر آئے۔ (آمین) ڈر دسمبر 2014ء کا شمارہ ملا، سال کا آخری رسالہ ہونے کی وجہ سے دلچسپی خاص تھی، نئے سال کے "خاص نمبر" کا شدت سے انتظار ہے۔ سب سے پہلے خط لکھنے کی کفیل میں پہنچے، جہاں پر ساجدہ راجہ کے بیچا کی وفات کا پڑھ کر بہت افسوس ہوا، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور ان کے والد کو صحت و تندرستی اور عمر و روز عطا کرے۔ (آمین) باقی کافی لوگ غیر حاضر تھے، کہانیاں میں اجتلاہ، درندہ صفت، الگ جھوک، محنت اور مجبوری پسند آئیں۔

شائستہ سحر اور بلقیس خان کی کئی مجبوری ہوئی۔ دونوں صاحبزادی ہیں اور آپ کو کل خاص طور سے مدد و ہمدردی کا تحریروں اور دوستی جاری

ہیں۔ خاص نمبر کے لئے تحریر ارسال کر رہی ہوں۔ آپ اسے خاص نمبر میں جگہ دے کر شکریہ کا موقع دیں گے۔ آخر میں اڈکے لئے دعا ہے کہ آئے دنوں میں ڈرامہ کا میاں پاں حاصل کرے۔ (آمین)

☆ ایس جلیب صاحبہ: نئی تحریر کے لئے شکریہ۔ جس طرح آپ کسی نئی شہرہ سے غیر حاضری کو تہ دل سے محسوس کرتی ہیں تو اسی طرح اور بھی آپ کی غیر حاضری کو محسوس کرتے ہیں، امید ہے غور فرمائیں گی۔ نئی تحریر دیر سے موصول ہوئی، اس لئے اس شمارے میں نہ شائع ہو سکی، اس کے لئے بہت بہت معذرت، آپ تو کراچی کی ہیں یعنی گھر کے افراد ہی غیر حاضر رہیں تو... پلیز!

راجل بخاری محبوب شہادت، اسلام ٹیکم: امید ہے سب بخیریت ہونگے۔ قرآن کی باتیں ایمان کی تازگی کا سبب بنیں۔ کہانیوں میں قیمتی حوت مدثر بخاری، تھپتھپانے والا نور بخاری، اچھی نکلیں۔ ایس اقبال احمد بچائی لیتے ہیں۔ ساجدہ سسر! آپ کے بچے کا سن کر بہت دکھ ہوا۔ اللہ پاک ان کو جوار رحمت میں جگہ دے۔ آپ لوگوں کو صبر دے اور آپ کے ابو کو حوت کاملہ عطا فرمائے۔ آمین... ویسے میرا بہت دل کرتا ہے کہ جب ڈرامہ انجسٹ شائع ہوتا ہے، تیار ہو کر باہر نکلتے ہیں تو انہیں... کیا منظر ہوتا ہوگا۔ کاش! میں دیکھ سکتی۔ شگفتہ ارم آپ کو شادی کی مبارکباد، پلیز نکلتی رہیے گا۔ اس بار سارے ملک کی تحریر کو سناؤ۔ شہر احمد بھٹی! ڈرامہ انجسٹ تو سب کا دیبا توں میں جا نکلا ہے۔ ہم لوگ بھی گاؤں میں رہتے ہیں۔ محروم رہتے نہیں ہیں۔ دارانہ روایت ہے۔ شبانہ آئی اور سسر! سسر! بکراں ڈر۔ ڈر کسی کی حوصلہ شکنی نہیں کرتا... تمام لوگوں کو نیا نیسوی سال مبارک ہو۔ آخر میں سب کو سلام اور ڈر کی ترقی کے لئے دعا کریں۔ آئندہ ماہ تک کے لئے خدا حافظ۔

☆ ایس جلیب صاحبہ: خط لکھنے کے لئے شکریہ قبول کریں، کیا یہ اچھا نہیں کہ آپ ہر ماہ قیمتی غزل ارسال کیا کریں، آپ کی پسندیدہ کہانی "نقاب" زبردست تھی۔ اب نئی آئی ہے "سایہ" دیکھتے ہیں کیا رٹم دکھائی ہے۔ جب آپ کو پتہ تھا کہ یہ جیل سنس ہو جائیں گے تو پھر... خیر امید ہے شکریہ کا موقع ہر ماہ دیں گی۔

پری لاہور سے، اسلام ٹیکم: کسی بھی ڈرامہ انجسٹ میں میرا یہ پہلا خط ہے۔ امید ہے حوصلہ افزائی ہوگی۔ دمیر کا ڈرامہ انجسٹ پڑھ کر دلی خوشی ہوئی۔ اب اپنے خط کو ڈرامہ انجسٹ کی تعریف سے سجانا پسند کروں گی۔ جی تو جیسا کہ یہ میرا پہلا خط ہے۔ تو آپ کو یہ بتا دوں کہ دمیر کا شمار مجھے بہت اچھا لگا۔ اس کا ناکل بہت ہی اچھا ہے۔ اس میں مجھے جو کہانی حقیقت سے بالکل قریب لگی۔ وہ کہانی "ڈنٹر آؤٹس" ہے۔ اس کے علاوہ "مقرب" بھی بہت اچھی ہے۔ اس کے علاوہ باقی تمام کہانیاں بہت اچھی نکلیں۔ لیکن ڈنٹر آؤٹس کا جواب نہیں۔ تو اس طرح بھی بہت ہی اچھا ہے۔ ڈرامہ انجسٹ کی ترقی کے لئے دعا گو ہوں کہ یہ دان دینی رات چوتھی ترقی کرے۔ بھائی جی، آپ سے پورے تمام قارئین سے درخواست ہے کہ میرے لئے خصوصی دعا کیجئے گا تاکہ میں اپنے ہر کام اور ہر مقصد میں کامیابی حاصل کروں اور اپنی پڑھائی میں بھی زبردست کامیابی حاصل کروں۔ انشاء اللہ جیسے ہی فرصت ملے گی دوبارہ خط ضرور لکھوں گی۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنے ایمان میں رکھے۔ آمین!

☆ ایس جلیب صاحبہ: ڈرامہ انجسٹ میں موسم ویکم، چنے آپ کی حوصلہ افزائی ہوگئی۔ اب امید ہے کہ برہان آپ خط لکھ کر شکریہ کا موقع ضرور دیں گی۔ اس بات کو ذہن میں بیٹھالیں کہ مسلسل منت ہی آؤں گا کیا بکرتی ہے۔ اگر آپ بھی متواتر منت سے کہانی نکلیں تو ایک اچھی رائٹر بن سکتی ہیں۔ ہوری اور قارئین کی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو جو بڑا مقصد میں کامیاب و کامران کرے۔

آویٹہ نیازی بڑے موڑی ٹیکم سے، اسلام ٹیکم: امید کرتی ہوں کہ ڈرامہ انجسٹ کا اسٹاف اور قارئین کرام بخیریت ہوں گے، کچھ مصروفیات کی وجہ سے کافی عرصہ غیر حاضر رہی، اس لئے سوری... 2014 کا شمارہ گزرنے سے لے کر پڑھا۔ ڈرامہ انجسٹ کا جواب نہیں۔ مجموعی طور پر تمام کہانیاں اپنی مثال آپ تھیں اور قوس قزح کے رنگ بھی کچھ کم نہیں۔ دل تو چاہتا ہے کہ ہر ماہ کچھ نہ کچھ اس میں نکلیں، مگر وقت نہیں ملتا، خیر اب کوشش کروں گی کہ ریکور ہو جاؤں۔ سلسلے دار کہانیاں بہت اچھی ہیں، رولو کا بھی اچھی جارہی ہے۔ سوچ رہی ہوں کہ اپنی کہانی بھجوں، مگر ڈرامہ بھی لگ رہا ہے کہ حوصلہ افزائی ہوگی بھی کہ نہیں، جنوری کے خاص نمبر میں میرا خط ضرور شامل اشاعت کیجئے گا تاکہ میرا حوصلہ بڑھے۔ ڈرامہ انجسٹ کی ترقی کے لئے شب و روز دعا گو ہوں۔

☆ آویٹہ صاحبہ: ایک مرتبہ پھر ڈرامہ انجسٹ میں خوش آمدید، اس دور میں کسی کے پاس فالو کا نام نہیں۔ مگر نام نکالنا پڑتا ہے۔ لکھتے لکھتے آدمی لکھاری بن جاتا ہے۔ آپ کہانی بعد شوق لکھیں، لکھتے لکھتے آپ کو بھی لکھنا آ جائے گا، کہانی لکھ کر اسے دوبارہ پڑھئے گا، اس میں غلطیاں ہوں گی تو اسے اصلاح کر کے دوبارہ فیکر کرنے کے بعد ارسال کیجئے گا، لیکن ایک لائن چھوڑ کر کہانی لکھئے گا تاکہ اصلاح کے لئے جگہ کھل سکے۔

قاضی حماد سرور اوکاڑہ سے، سلام محبت! آج کل کے دور میں جہاں موبائل، انٹرنیٹ اور کیبل وغیرہ نے نہ صرف خلوص و محبت

اور سچے جذباتوں کو فروغ دیا بلکہ رشتوں کے تقدس کو بھی بری طرح پامال کیا ہے۔ ان حالت کے باوجود ڈارڈا انجسٹ" سٹ پڑھتے وقت یہ ضرور محسوس ہوتا ہے کہ اس نفسا نفسی کے عالم میں بھی "دور" نے بے لوث جذباتوں اور رشتوں کی سچائیوں کو قائم رکھا ہوا ہے۔ اور یہی بات ڈرنیم کی محنت، خلوص نیت اور کامیابی کا منہ ہوتا ثبوت ہے۔ وگرنہ تو..... یہ محبت ان باتوں کی بات ہے قرآن..... جب لوگ سچے اور مکان کچے ہوا کرتے تھے! ایک بات میں تمام راسخ حضرات سے جنگی معذرت کے ساتھ گوش گزار ضرور کرنا چاہوں گا کہ یہ "ڈارڈا انجسٹ" والوں کا اعلیٰ ظرف ہے کہ وہ ہر لکھنے والے کی بہت حوصلہ افزائی کرتے ہیں اور موقع بھی دیتے ہیں جبکہ میں نے وہ کہانیاں بھی پڑھی ہیں جو "دور" کے معیار کے مطابق نہ تھیں۔ مگر یہ ڈرنیم کا ہوا پن ہے کہ وہ بھی صفحات کی زینت بنیں۔ میرا مقصد کسی بھی راسخ کہانی کی دل شکنی کرنا نہیں مگر میری تمام راسخ حضرات سے یہ التماس ہے کہ کوئی بھی کہانی لکھنے اور بھیجنے سے پہلے صرف ایک دفعہ دل سے ڈارڈا انجسٹ کی مقبولیت اور معیار کو مد نظر رکھنے کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی ضرور سوچے گا کہ ہمارے لئے پوری ڈرنیم کی نیک نیتی اور خلوص میں کوئی شک نہیں۔ ماہ دسمبر 2014ء کے ڈارڈا انجسٹ میں "شیبا، ہتھیار اور مقرب بہترین اور انہی کہانیاں تھیں مگر جس کہانی نے دل و دماغ پر اپنا نقش ثبت کیا وہ "دور آتش" رہی۔ آخری بات یہ کہ اللہ غفور الرحیم نے ہم کو ہر چیز میں مانگے عطا کرنے کا وعدہ کیا ہے مگر وہ چیزیں ایسی ہیں جو صرف اس ذات اقدس سے مانگنے پر ہی انسان کو ملتی ہیں۔ اللہ کی محبت، اللہ کی ہدایت اور میرا ایمان ہے کہ یہ دونوں چیزیں اللہ کے فضل سے ہی حاصل ہو سکتی ہیں اور وہ ہے "عاجزی، ادکام خداوندی پر عمل۔" اللہ پاک ڈرنیم اور آپ سب کو خوش رکھے۔ دعاؤں میں یہ بھی اس ڈیجیٹل بھی۔ والسلام۔

نہلا نہلا صا دسب: نوب جگ۔ بہت خوب لکھا، تلیسی لکھا، دگا سے لکھا، ہوا خلوص نام۔ پڑھ کر کی خوش ہوئی، آپ نے تہہ دل سے محسوس کرتے ہوئے بالکل سچ لکھا کہ واقعی ڈارڈا انجسٹ اپنے چاہنے والوں کی عزت کرتا ہے اور بعض اوقات ایسی کہانیاں بھی راسخ حضرات کی شائع کرتا ہے جو کہ دور کے موضوع سے ہٹ کر ہوتی ہیں۔ اس لئے کہ کسی کا دل نہ کوئے، اور اسے قلبی خوش و سکون ملے، آپ کے خلوص نام۔ کا ہر ماہ شدت سے انتظار رہے گا۔ امید ہے شکر یہ کاموقع دینا بھولیں گے نہیں۔ Thanks۔

عثمان غنی پشاور سے، السلام علیکم! کم دسمبر کا شمار 21 کو، بلدی مل جانے پر دل خوشی سے بھر گیا، اندرونی صفحات، قرآن کی پاک باتوں سے دل کو نور کی روشنی سے منور کیا، پھر کہانیوں پر سرسبز نظر و زرائی، اپنی کہانی ڈھونڈی انیس ملی، خیر اگلے ماہ تھی۔ سارے خطوط زبردست پسند آئے، خطوط سے ہمیں تقویت ملتی ہے کہ اچھا اور نیا نہیں لکھ سکتیں۔ نئی کہانی مسکراہٹ خاص شمارہ جنوری کے لئے لکھی ہے۔ کیونکہ جنوری میرے لئے بہت زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ جن جناب! جنوری میں میری سالگرہ ہے۔ سالگرہ کے دن، دوست دشمن کر دیتے ہیں۔ دوست، کزن، تحفے بھی دے دیتے ہیں۔ اب آپ کی باری ہے۔ کہانی شائع کر دیں تو یہی میرا تحفہ ہوگا! میں ان سمجھوں گی۔ میں اپنی برتھ ڈے، سادگی سے منانا پسند کرتا ہوں، جن دوستوں کی جنوری میں برتھ ڈے آ رہی ہے، میں انہیں جتنی مبارک دیتا ہوں۔

☆ عثمان صاحب: خوش ہو جائیں آپ کی مسکراہٹ بطور تحفہ منظر عام پر آگئی۔ ہماری اور قارئین کی طرف سے سالگرہ بہت بہت مبارک ہو۔ اللہ تعالیٰ ڈھیروں خوشیوں سے نوازے۔

محمد اسلم جاوید فیصل آباد سے، السلام علیکم! ایک دعاؤں اور خیر و خافیت کے ساتھ حاضر ہوں۔ موسم بدل گیا ہے اور سردی کا آواز ہو چکا ہے، ماحول خوشگوار تھا کسی کام کے سلسلے میں شہر جانا پڑا، وہاں ایک اسٹال پر ماہ دسمبر 2014ء کے تازہ پرچے سے ملاقات ہوگئی، سردرق پہلے سے زیادہ دید و زیب تھا ایسا سردرق میں نے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا، اس سال کا یہ سردرق اپنی مثال آپ تھا، پرچہ پہلے سے زیادہ دلکش اور کامیابی سے ہمکنار ہے، پرچہ دیکھ کے میرا دل خوشی سے باغ باغ ہو گیا۔ خط اور غزل شائع کرنے کا بہت بہت شکریہ۔ ہر کہانی اپنی اپنی جگہ پر کامیاب تھی، کسی ایک کی تعریف کرنا مناسب نہیں ہے تو اس قریح کے تمام اشعار اچھے، غزلیں سبھی کی لا جواب تھیں، آپ کا خلوص ہمارے لئے بہت اہم ہے، اگر دیکھا جائے سال 2014ء میں بے شمار خم لگے، افزائقری، دہشت گردی، بے قصور لوگوں کا خون زیادہ بہا، شہید ہونے والوں میں ہمارے فوجی جوان بھی شامل ہیں۔ آئندہ اللہ تعالیٰ ہم پر رحم و کرم کر کے ہمیں تمام پریشانیوں سے دور رکھے۔ ہم پر اپنا فضل و کرم رکھے، آسنے والا نیا سال ہمارے لئے خوشیاں ہی خوشیاں لے کر آئے۔ نیا سال تو آتا ہے اور پرانا ہو کر چلا جاتا ہے۔ مگر اصل میں عمل ہمارا نیک ہو رہا ہے اور یہی ہم لوگوں کو سوچنا چاہئے۔ جب تک ہم خود کو نہیں سدھاریں گے

اگر وقت تک ہم خوشحال زندگی نہیں گزار سکتے۔ میں تمام دوستوں کو کہتا ہوں کہ اللہ سے دعا کریں کہ ہمارا سال 2015ء (م)

بہارِ امتیاز صاحب: لکھا اور خوب لکھا دل خوش کر دیا، امید ہے اس طرح برآمد کا تجزیہ ارسال کرتے رہیں گے۔ Thanks۔

بشیر احمد بھٹی فوتی ہستی بہارِ امتیاز سے، السلام علیکم، کم دسمبر 2014ء کا آخری شمارہ سامنے ہے۔ یہ سال بھی رخصت ہونے کو ہے۔ نیا سال 2015ء کی آمد آمد ہے۔ اب آتے ہیں کہانیوں کی طرف۔ پہلی کہانی اہلِ لبو، دوسری درندہ صفت انجی رہیں۔ ترقی روح بھی لا جواب ہے۔ مجبوری، الگ حقوق، ہتھیار، نجومست، اخونی مسیحا، نئی موت کے بعد آخری طویل کہانی 'تقریب' بھی قابلِ تحریف ہے۔ 'تقریب' زیرِ مطالعہ ہے۔ طویل کہانی کو ذرا ٹھہر ٹھہر کے پڑھنا پڑتا ہے تاکہ تصوراتی منظر کا تسلسل نہ ٹوٹے۔ دسمبر کے شمارے میں آپ نے مجھے یہ اشارہ دے کر یہ بیان کر دیا ہے کہ بس ایک ہی کہانی میں نے، اقیانی تک دور میں ایک ہی کہانی شائع کرائی ہے۔ اس قدر زیادہ کہانیوں کے درمیان الگ رہنے کے باوجود آپ کو یہ یاد رہتا ہے کہ کس نے کتنی کہانیاں بھیجی ہیں۔ آپ کی یادداشت کو داد دیتا ہوں، خدا آپ کے ذہن کو اور طاقت بخشے۔ عنقریب ایک ذرا فنی کہانی ارسال کروں گا۔ شکریہ۔

بہارِ امتیاز صاحب: بخیر لکھنے اور کہانیوں کی تحریف کے لئے شکر ہے، پرانا رخصت ہوا اور نئے سال کی آمد ہے۔ ہم تمام لوگوں کو سوچنا چاہئے کہ ہم نے گزشتہ سال میں کیا لکھا، کیا پایا، کیا احساسات، کتنے فیصد رہا۔ نئی کہانی کا شدت سے انتظار ہے۔

محمد اسحاق انجم سنگت پور سے، السلام علیکم، امید ہے ادارے کے سارے اہلِ خیریت سے ہوں گے! خطوط کی محفل میں شامل ہونا بھی ایک مشغلہ ہے۔ دوستوں کے شکوے شکایت اپنی جگہ اور ذاتی مصروفیات الگ، اسی ڈائجسٹ کے لئے یہ بات خوشی کی ہوتی ہے کہ لوگ اس ڈائجسٹ کا انتظار کرتے ہیں اور وہ سب 'ڈرڈائجسٹ' جس کا ہم بھی نہیں کرتے ہیں۔ اور آنے والے شمارے کا بے یقینی سے انتظار رہتا ہے، میری طرف سے تمام دوستوں کو نیا سال مبارک، یکم ایڈیٹس مبارک، یہ سال ہمیں اور آپ سب کو خوشیاں دے اور ہمارے پاکستان کے لئے ترقی و خوشحالی کا سال ثابت ہو، سب کے لئے دعا گو!

بہارِ امتیاز صاحب: نوازش نامہ ارسال کرنے اور کہانیوں کی تحریف کے لئے شکر ہے، آپ تمام دوستوں کی چاہت کا ثبوت ہے کہ آپ سب ڈرڈائجسٹ سے البتہ لگاؤ رکھتے ہیں۔ اس کے لئے بہت بہت شکریہ۔

طارق محمود کامرہ وکالا سے، السلام علیکم، امید ہے نوازش اور امتیاز سے دعا ہے کہ ادارے سے تعلق رکھنے والے حضرات، لکھاری، حضرات اور ڈرڈائجسٹ سے محبت کرنے والے قاری سب خیریت سے ہوں گے، تمین ماہ بعدہ کی بزم میں حاضر رہا ہوں، کچھ ذاتی پروگرام کی وجہ سے کوئی خط لکھ نہ سکا اور نہ ہی اپنی کہانی و غزل وغیرہ ارسال کر سکے گا۔ نکلن برآمد کا رسالہ باقاعدگی کے ساتھ پڑھتا رہا۔ نومبر میں 'محبت کی بازی، حسد، پرانا قبرستان، سرد چائے، جادوئی بس، بہت اچھی کہانیاں تھیں، باقی کہانیاں بھی اچھی تھیں اور اس ماہ دسمبر کا رسالہ 'اہلِ لبو' بہت خوب، عطیہ زاہرہ صاحبہ 'تقریب' نور محمد کاوش 'مجبوری' ایس، امتیاز احمد، 'ختر آتش' ظاہرہ آصف باقی کہانیاں ابھی پڑھی تھیں، یقیناً وہ بھی بہت اچھی ہوگی۔ چھپنے تمین ماہ میں اپنی کہانی اور غزل اور میں دیکھنے کی حسرت سی رہی۔ چلیں خیر ہو سکتا ہے اگلے ماہ کوئی آجائے، رسالہ کی قیمت بن کر۔ ایک غزل ارسال ہے، برائے مہربانی ضرور شائع کیجئے گا اور انشاء اللہ کہانی اگلے ماہ بھیجوں گا، میری دعائیں رسالہ کی ترقی کے لئے۔

بہارِ امتیاز صاحب: نوازش نامہ اور کہانیوں کی تحریف کے لئے دلی شکر ہے، آپ کی دو کہانیاں موجود ہیں۔ مگر چھوٹی بلکہ بہت چھوٹی کہانیاں کے دو صفحات بھی نہیں ہیں، امید ہے فوراً کریں گے، کہانی کے صفحات مزید بڑھائیں، نئی کہانی کا انتظار ہے گا۔ شکریہ۔

سید عبادت کاظمی ڈیرہ اسماعیل خان سے، السلام علیکم، کم دسمبر کا ڈرپڑھ کر دلی خوشی ہوئی، تمام کہانیاں بہت اچھی اور زبردست ہیں۔ ویسے ڈرڈائجسٹ سے میرا رشتہ کافی پرانا ہے، دسمبر کے شمارے میں آپ نے میری غزل شائع کر کے کرم کیا، اس امید پر کچھ اور بھیج رہا ہوں اور میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ڈرڈائجسٹ کو مزید عروج بخشے۔

بہارِ امتیاز صاحب: نوازش نامہ ارسال کرنے کے لئے شکر ہے، ہر ماہ ایک سٹیک کرنے سے قلمی رشتہ زیادہ مضبوط ہوتا ہے، پلیز! ہر ماہ ڈرڈائجسٹ کے لئے بھی ایک جھنڈ نکال لیا کریں۔ امید ہے فوراً کر کے شکریہ کا موقع دیں گے۔

نعیم بخاری آکاش دکاڑہ سے، السلام علیکم، میں خیریت سے ہوں اور امید ہے ادارے کے سارے لوگ بخیر ہوں گے۔ ماہ دسمبر کا شمارہ خریدنا تو اپنی کہانی دیکھ کر بہت خوش ہوئی، آپ کی نظر کرم کا بہت شکر ہے، آپ کی نظر کرم کی بدولت میرے دل کے آنگن میں نئے پھول کھل گئے اور ان کی خوشبو سے میں بارش مان بولگنا، اس خوشی کے ساتھ تھوڑا سا شکوہ بھی ہے کہ سال 2011ء میں تمہیں کہانیاں

میں نے ارسال کی تھیں۔ جن میں سے تڑپتی روح شائع جبکہ ”اُغوا“ اور ”ذیہ مین“ شائع نہیں ہوئی ہیں۔ اگر ہو چکی ہیں تو مجھے اس ماہ کے ڈائجسٹ بھجوا دیں میں آپ کو ان کی قیمت اور کردوں گا۔ میں اچھے دورے نئے موضوع کی تلاش میں گا مزن رہتا ہوں تاکہ ذکر کے لئے اچھا اور نیا لکھ سکوں۔ اب آتے ہیں ڈر و سبر کی طرف سب سے پہلے ”ابتدا“ پر جمی، سیدہ عطیہ زاہرہ نے ایک قصائی پر بہت اچھی کہانی لکھی ہے۔ مجبوری، رولو کا، الگ مخلوق بھی اچھی کہانیاں تھیں۔ اور ”نیچنی موت“ بھی مدثر بخاری نے اچھا لکھا ہے۔ اب اجازت اس دعا کے ساتھ کہ اللہ تعالیٰ ہمارے ڈر و ڈائجسٹ کو دن دگنی اور رات چو گنی ترقی دے۔

نعم صاحب: بہت بہت شکریہ کہ آپ نے نئی کہانی بھیجی، اسٹر آپ کی کہانی ہمارے موضوع سے بہت گہری ہے۔ جو کہانی آپ کی شائع ہوئی ہے یقیناً پڑھیں گے، اینڈ میں کہانی کو بڑھاتا ہمارے موضوع نیا کیا ہے امید ہے آپ غور فرما کر آئندہ ہمارے موضوع کو زیر قلم لائیں گے۔ thanks۔

دلکش امیر پوری کہہ رہی ہے، السلام علیکم! کے بعد غرض ہے کہ بندہ بڑے عرصے بعد خط لکھ رہا ہے۔ امید ہے وہی کی نوکری کی نذر نہ ہوگا۔ خداوند کریم سے امید کرتے ہیں کہ ذکر کا اسٹاف، پڑھنے والے اور لکھنے والے خیر و عافیت سے ہوں گے۔ جناب کہانیاں ابھی پڑھی نہیں چونکہ رسالہ ابھی خریدتا ہے، امید ہے پہلے کی طرح تمام کی تمام کہانیاں بہترین ہوں گی۔ چونکہ یہی ذکر کا خاصہ ہے۔

نعم صاحب: بڑے عرصے کو قبول کرنا جلد۔ جاری خط رسالہ کو دیکھ کر یہ مہربانی ہوگی، کیوں ٹھیک ہے ناں اور ہاں کہانیاں پڑھنے کے بعد اپنی رات ارسال کرنا بھولے گا نہیں۔

محسن عزیز حلیم کوٹھاکھان سے، السلام علیکم! امید ہے سب خیریت سے ہوں گے۔ خدا کرے سب خوش رہیں، Soo Said ساجدہ آہلی کے بچاؤں کا سن کر بہت افسوس ہوا اور آپ کے ابو کے لئے ہم دعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ صحت کاملہ عطا فرمائیں اور ان کا سایہ ہمیشہ آپ کے سر پر رکھے۔ ذہن کے شمارے میں ساجدہ، نجمہ، عطیہ زاہرہ، طاہرہ آصف، مبائیمہ انظم، فرمان احمد، صفہ سراج، نور محمد کاوش، نعیم بخاری آکا ش، ان سب راکٹر حضرات نے بہت اچھا لکھا۔ اچھی کہانیاں خود ہی اپنا لو با منوالتی ہیں۔ ہاں یا، آیا۔ میری دونوں کہانیاں مظلوم روحیں اینڈ دیرانے کا جن۔ ویسے جلد از جلد ان میں سے ایک کو تو اگر ایسا نہ ہوا تو ہم روٹھ جائیں گے۔ اور ہاں سب کو Happy New Year مبارک ہو، ذہیر ساری دعاؤں کے ساتھ۔

نعم صاحب: وقت آنے پر آپ کی کہانی بھی ضرور چپ گی، فکر نہ کریں، خط لکھتے اور کہانیوں کی تعریف کے لئے ویری ویری ٹھیکس، روٹھنا اچھا نہیں اور ویسے بھی ہمیں روٹھے ہوؤں کو مٹانا آتا ہے۔

محمد نوید قمر کرچی سے، السلام علیکم! امید ہے آپ اور ”ڈر“ ڈائجسٹ کی پوری ٹیم خیر و عافیت سے ہوں گے۔ ہمیشہ کی طرح اپنی ایک الگ پہچان کے ساتھ ڈر و ڈائجسٹ ہر عمر کے لوگوں کی توجہ کا مرکز ہے اور اس کی یہی انفرادیت اسے ہر خاص و عام میں مقبول کئے ہوئے ہے، چاہے وہ سنسنی خیز کہانیاں ہوں، یا قوس قزح کے رنگ ہوں یا خطوط کی مجھل، آپ لوگ جس محنت اور لگن سے اس کی تیاری کرتے ہیں وہ قابل ستائش ہے اور خاص کر سنے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی بہت ہی لائق تعظیم جذبہ ہے، میں بھی کئی بار آپ کی بزم میں بازیابی کا شرف حاصل کر چکا ہوں اور اب کافی ٹائم بعد اپنی کچھ شاعری آپ کو ارسال کر رہا ہوں، اگر آپ کے معیار کے مطابق ہو تو شکریہ کا موقع عنایت فرمائیں، انشا اللہ آئندہ بھی قلمی ملاقات کا سلسلہ جاری رہے گا۔ شکریہ۔

نعم صاحب: ایک مرتبہ پھر ڈر و ڈائجسٹ میں موسٹ و سٹم، یہ حقیقت ہے کہ ڈر و ڈائجسٹ اپنے پڑھنے والوں کا خیال رکھتا ہے، چلے شکریہ کا موقع فراہم ہو گیا اور اب امید ہے کہ آپ حسب وعدہ قلمی ملاقات کا سلسلہ جاری رکھیں گے۔ Thanks۔

قاسم رحمان ہری پور سے، السلام علیکم! سال کا آخری مہینہ آئی گیا۔ 2014ء اختتام پذیر ہونے کو ہے۔ جانے والا سال کچھ لوگوں کے دامن میں خوشیاں اور کچھ کے دامن میں غموں کی برسات چھوڑ کر جا رہا ہے۔ رب العزت سے دعا ہے کہ آنے والا نیا سال امت مسلمہ کے لئے بہترین سال ثابت ہو۔ اور وطن عزیز کے حالات بہترین ہو جائیں۔ ذہیر کا ذکر اب تک نہیں ملا۔ امید ہے کہ ”شمہ نموشاں“ کو شمارہ میں جگہ ضرور مل جائے گی۔ عطیہ زاہرہ کی نو سبر میں شائع ہونے والی کہانی پہلے بھی شائع ہو چکی ہے۔ عطیہ صاحبہ خوب بلکہ بہت خوب لکھتی ہیں، مگر یہ تحریر... آج کل شمارے کی تمام کہانیاں بہت اچھی ہو رہی ہیں۔ راکٹر حضرات کی سوچ اور محنت خوب سے خوب تر نظر آ رہی ہے۔ ڈر و ڈائجسٹ کی ترقی کے لئے شب و روز دعا گو ہوں۔

مذکورہ قاسم صاحب: اللہ تعالیٰ آپ اور ہم سب کی دعا قبول کرے کہ آنے والے سال میں ہمارے ملک میں خوشحالی کا دور دورہ شروع ہو جائے۔ آپ نے جس کہانی کی نشاندہی کی، بالکل صحیح ہے، کئی سال پہلے یہ کہانی دُور میں شائع ہو چکی ہے، دراصل ایسی کہانیاں ترجمہ ہوتی ہیں، اب ہر راسخ ہر سالہ تو پڑھتا نہیں، اکثر اہل رے ذہن سے بھی کہانی نکل جاتی ہے، دیے آپ کی کہانی شہرِ خوشحالی و کبر کے شمارے میں شائع ہو چکی ہے۔

محمد ابو ہریرہ بلوچ بہاننگر سے، اسلام علیکم! امید کرتا ہوں کہ سب خیریت سے ہوں گے، میں ایک گزارش کرنا چاہتا ہوں، گزارش سے پہلے ایک چھوٹا سا واقعہ سناتا ہوں، پچھلے دنوں میں رسالہ خریدنے مارکیٹ گیا، وہاں ایک لڑکی سے میری بحث ہو گئی، بحث اس بات پر تھی کہ لڑکیاں بہتر ہیں یا لڑکے، میں کہتا کہ لڑکے بہتر ہیں اور وہ کہتی کہ لڑکیاں، پھر اس نے دخل دینے کے لئے مجھ سے پوچھا کہ آپ کون کون سے رسالے پڑھتے ہیں۔ میں نے اسے چار پانچ رسالوں کے نام گنوانے تو وہ بولی کہ ان سب رسالوں میں لڑکیاں لڑکوں سے زیادہ شمولیت کرتی ہیں۔ آپ پاکستان کا کوئی بھی مشہور رسالہ اٹھا لو اس میں لڑکیوں کی شمولیت ضرور ہوگی اس کے برعکس آپ صرف ایک ایسا رسالہ بتاؤ جس میں صرف لڑکے ہوں، میں نے کہا کہ ان کے لئے لڑکے تو کسی بھی ذرا بحث میں نہیں ہیں، تو پھر لڑکیاں لڑکوں سے بہتر ہوں میں ہاں اس نے اپنے دعوے پر دلیل دی، جس پر بحث خاموش ہو کر رہا۔ ستمبر 2014ء کے رسالے میں شامل کہانیوں میں مجھے ابھی لگیں وہ سب سے بیسٹ ہیں زندہ صدیاں، دختر آتش، شغریہ، باقی کہانیاں مجبوری، تڑپتی روح، نحوست اور امگ مخلوق بھی عمدہ تھیں۔ اشعار اور نثریں بھی عمدہ تھیں۔ کہانی مکمل ہو گئی ہے۔ انشا اللہ اگلے خط کے ساتھ روانہ کر دوں گا۔ میرے دوستوں عمر فاروق، پروفسر محمد اختر اور ابو ذر غفاری کوذخیرہ سارا اس۔

اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے ”مرز“ کو تفتیش کیا۔ امید ہے آپ آئندہ بحث میں کریں گے۔ شکریہ۔

کاشف عبید کاوش بڑے سوڑی بٹ گرام سے، السلام علیکم اور میر کا جینی سال کا آخری شمارہ اے بسے آباد سے بنائی نے بھیجا تھا۔ بہت خوب صورت تھا۔ قرآن کی باتیں پڑھ کر ایمان تازہ ہوا۔ تمام کہانیوں پر سرسری نظر ڈالی تو سب ہی اچھی لگیں۔ دوستوں کی محفل بھی زبردست رہی اور پھر قوس قزح کے صفحات نے تو دل مو لایا۔ میری فزائلیں گونجنے لگیں تھیں۔ اپنی کہانی بہت تھکادار سال لکھ دوں گا۔ میری کوشش تو تھی کہ میری کہانی جنوری کے خاص نمبر میں شائع ہو مگر کبھی بھی سوچا ہوا پورا نہیں ہوا، خیر دیر آئے دوست آئے گو ہر دفعہ کر دل کو سمجھایا۔ کارٹون کو نیا سال مبارک ہو اور خدا کرے یہ سال ہم پاکستانیوں کے لئے خوش حالی کا سال ثابت ہو۔

بلاشبہ کاشف صاحب: خط لکھنے اور مہنگوں کی تعریف کے لئے شکر۔ کوشش، کوشش اور پھر کوشش سے آدمی اپنے کام میں ماہر اور کامیاب ہو جاتا ہے۔ کہانی لکھ کر اسے پڑھیں اور پھر اصلاح کر کے دوبارہ لکھ کر اس سال کریں لیکن ایک ایسے چھوڑ کر لکھئے گا۔ امید ہے خود فرمائیں گے اور اگلا قدم اٹھائیں گے۔ یقیناً کامیابی آپ کے قدم پہنچے گی۔ خط ایف موصول ہوا۔ آئندہ ذرا جلدی کا خیال رکھئے گا۔ Thanks۔

مدثر بخاری شہر سلطان سے، سب کو دل سے سلام اور آداب..... مردیاں عروج کے لئے کوشاں ہیں، جب یہ تبصرہ چھپے گا، حکم جنوری میری پیدائش کا دن... اور 2015ء کا آغاز... سوچنا صرف اتنا ہے کہ ہم نے اس سال کیا کھویا کیا پایا..... کتنے لوگوں کی مدد کی اور کتنوں کا دل توڑا... کچھ غلط ہو گیا تو اس سال نہ ہو۔ ایک مثبت سوچ، ایک اعلیٰ تربیت کے ساتھ سچائی اور اخلاقی مروت کے ساتھ معاشرے کو گوارہ امن بنانا ہے، انشاء اللہ... کچھ باتیں دبیر کے جریدہ کی... اس دفعہ ٹائٹل زبردست تھا... جو ہر دفعہ ہی کنال کا ہوتا ہے۔ ویلڈن۔ اگر تبصرہ کیا جائے تو میری ناقص عقل کہتی ہے کہ سید عطیہ زاہرہ کا مور سے اہل لبو لے کر جلوہ گر ہوئیں، ظاہرہ آصف سہیواں سے تشریف لائیں اور دختر آتش بھی تحفہ میں لائیں۔ دوسرے نمبر پر رہی۔ امید ہے ظاہرہ آصف اس طرح تعلیمی سفر کو جاری رکھیں گی..... سر کو دھاسے نور محمد کاوش، مقرب لے کر آئے، مقرب بھی کنال کی کہانی رہی۔ خیر، میری تحریر جاوٹی پنکھ کو تارکین نے پسند کیا۔ بہت شکریہ تمام دوستوں کا.....

☆ مؤثر صاحب: قلبی نوازش نامہ کے لئے Thanks۔ آپ کی سوچ مثبت ہے، کاش کہ ہم سب کوشش کریں تو ہمارا ملک خوشیوں کا گہوارہ بن جائے، خود غرض، مطلب پرست اور دبشت گرد راہ راست پر آجائیں تاکہ ان کی بھی آخرت -خوب- جائے۔ نئی کہانی کے لئے شکریہ، کہانی شامل اشاعت ہے۔

موت کے گھاٹ

عبدالحمید ساگر - کنڈیاں

اچانک ایک دھماکہ ہوا، دھماکہ اتنا شدید تھا کہ کان بند ہو گئے اور پھر ایک دیوہیکل مہیب شکل شخصی نمودار ہوا جس کے منہ سے آگ کے شعلے نکل رہے تھے اور پھر جو منظر نظر آیا۔

بل بل جیران کرتی جناتی وادیوں میں سرسرواں خیر و شر کی ناقابل فراموش سنسنی خیز کہانی

ایسا تھا جیسے دو گھر مجھے آپس میں مل کر بیٹھ جائیں۔ اس کے بال کاٹواں کی طرح سیدھے لیکن چھوٹے تھے اور اس کے سر سے ایک لمبی سانپ جیسی چوٹی نکل کر اس کی کمر پر لٹک رہی تھی۔ البتہ اس میں کوئی بال نظر نہیں آ رہے تھے بلکہ وہ ایک سانپ کی سخت کھال جیسی سخت اور لمبی تھی۔ اس کی دو آنکھوں کے بجائے تین آنکھیں تھیں۔ تیسری آنکھ اس کے اوپر ماتھے پر تھی۔

اس جن کے میدان میں آتے ہی مسلمان جنوں کی کماریاں گرنے لگیں اور بے دین جن تیزی سے مسلمان جنوں پر نوٹ پڑے۔ اس جن کے منہ سے نکلنے والی آگ نے بھی بڑی تعداد میں مسلمان جنوں کا خاتمہ شروع کر دیا۔

”چنڈاں۔۔۔“

”کیا یہ چنڈاں ہے؟ لیکن اس نے تو وعدہ کیا تھا کہ وہ آئندہ شیخانی چیلوں اور مسلمان جنوں کی جنگ کے درمیان نہیں آئے گا۔“ دونوں جن نے آپس میں گفتگو کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ بڑا دھوکے باز ہے۔ لیکن تم اب جاؤ سردار جن کو بلا لاؤ جلدی کرو۔۔۔“ ایک نے دوسرے سے کہا۔

چنڈاں بڑی تیزی سے مسلمان جنوں کو قتل کر رہا

”آج ہمیں فتح ضرور نصیب ہوگی۔“ سردار خیام جن نے اپنے ساتھ بیٹھے ہوئے دونوں سے کہا۔

”ہاں سردار آج ہم ضرور جیت جائیں گے۔ آپ دیکھ تو رہے ہیں کس طرح ہمارے ساتھی جن ان بے دین اور شیطانی مذہب رکھنے والے جنوں پر نوٹ پڑے ہیں۔“ ایک جن نے سردار جن خیام کو جواب دیا۔

”ہاں۔۔۔۔۔ ہاں بالکل شیطان مننے والا ہے اور انشاء اللہ مٹ کر ہی رہے گا۔“ سردار جن خیام نے کہا۔

”اچھا اب میں چلتا ہوں۔ اگر ضرورت ہو تو مجھے بلا لیتا۔“ سردار نے کہا۔ اور پھر وہ ایک طرف چلنے لگے۔

سردار جن کے جانے کے بعد دونوں جن بے دین مخالف جنوں اور اپنے مسلمان جنوں کے درمیان ہونے والی لڑائی کو دیکھنے لگے۔ یہ دونوں جن میدان جنگ سے دور

ایک اونچے ٹیلے پر بیٹھے تھے۔ مسلمان جن بڑی تیزی سے ساتھ شیطان کے پیادوں کا خاتمہ کر رہے تھے کہ اچانک ایک دھماکہ ہوا اور مسلمان جنوں کی کماریاں گرنے لگیں۔

دھماکہ اتنا شدید تھا کہ دونوں جن جو کہ ریت کے ٹیلے پر بیٹھے تھے ان کے کان بھی بند ہو گئے۔ دھماکے کے فوراً بعد

ایک دیوہیکل نما جن میدان میں نمودار ہوا۔ اس کے منہ سے آگ نکل کر چاروں طرف پھیل رہی تھی۔ اس کا منہ



copied from

دستک دی۔ اس کے ساتھ ایک نوجوان لڑکی بھی تھی۔
دوسری دستک پر ایک بوڑھے آدمی نے دروازہ کھولا۔ ”جی
کس سے ملنا ہے آپ کو؟“ بوڑھے نے پوچھا۔

”کیا دانشاؤ کا گھر یہی ہے؟“

”جی ہاں بالکل۔“ بوڑھے نے جواب دیا۔

”ہمیں انہی سے ملنا ہے۔“ بوڑھی عورت نے کہا۔

”آپ اندر تشریف لائیں۔“ بوڑھے شخص

نے دروازہ مزید کھولتے ہوئے کہا۔

بوڑھا انہیں ایک صاف ستھرے کمرے میں بیٹھا

کر اندر چلا گیا۔ چند منٹ بعد دروازہ کھلا اور ایک جوان

آدی جس کی عمر تقریباً تیس برس تھی اور اس کے چہرے پر

بلکی بلکی دائرہ بھی تھی اندر داخل ہوا۔ جوان کے چہرے پر

کافی رونق تھی۔ اور اس کے چہرے سے سفیدی بھٹک

رہی تھی۔ ”السلام علیکم“ جوان آدمی نے کمرے میں

داخل ہوتے ہوئے کہا۔

”علیکم السلام“ بوڑھی عورت نے جواب دیا۔

”جی میرا نام دانشاؤ عمر ہے۔ کہیے کیا کام ہے آپ

کو سمجھتے ہیں؟“

”وہ جی دراصل میں اپنی بیٹی کی شادی کرنا چاہتی

ہوں، لیکن.....“

”لیکن کیا؟“ دانشاؤ نے کہا۔

”لیکن میری بیٹی دونوں آنکھوں سے نابینا ہے۔

جس کی وجہ سے جو بھی رشتہ آتا ہے میری بیٹی کو دیکھتے ہی

ٹھکرا دیتے ہیں اور اب تو رشتے بھی آنا بند ہو گئے ہیں۔

میں نے اپنی بیٹی کا بہت علاج کروایا لیکن کوئی فائدہ نہ

ہوا۔“

”کیا آپ کی بیٹی پیدا انٹی نابینا ہے؟“ دانشاؤ

نے پوچھا۔

”جی نہیں میری بیٹی پیدائش کے وقت ایسی نہیں

تھی بلکہ اس کی آنکھیں اتنی خوب صورت تھیں کہ سب

لوگ ہر وقت دیکھنے کو کہتے تھے۔ لیکن بعد میں جب یہ

پندرہ سال کی ہوئی تو ہم اپنے گاؤں کے قریب ہی ایک

اور گاؤں سے واپس آ رہے تھے کہ راست کے وقت سڑک

تھا۔ اس کے منہ سے نکلی ہوئی آگ بے دین جنوں پر کوئی
اثر نہیں کر رہی تھی۔ بہت سے مسلمان جنوں نے چنڈال کو
دیکھ کر میدان ہی چھوڑ دیا تھا جبکہ کچھ بڑے تھے۔

سردار جن کے آتے ہی دوسرا جن مستعدی سے

کھڑا ہو گیا اور کہنے لگا۔ ”سردار ہماری فتح شکست میں بدل

گئی۔ چنڈال نے ہمیں دھوکہ دیا ہے۔“

”مجھے اس کے بارے میں شک تھا۔ اس لئے تو

تم سے کہا تھا کہ مجھے بلا لینا۔ خیر فی الحال تم جا کر اپنی فوج

کے ہر جن سے بات کرنے کی کوشش کرو کہ وہ میدان

جنگ سے باہر نکل آئیں اور ایک سائیڈ پر جمع ہو جائیں۔“

سردار نے کہا۔

وہ دونوں جن تقریباً بھاگتے ہوئے میدان تک

پہنچے۔ تقریباً آدھے گھنٹے تک تمام مسلمان جن میدان

سے باہر نکل آئے اس دوران بہت سے جن زخمی حالت

میں بھی میدان میں پڑے ہوئے تھے۔

چنڈال نے سردار جن خیاں کو بھی دیکھ لیا تھا۔ وہ

سردار جن کی طرف دیکھ کر بہت زہریلی مسکراہٹ کے

ساتھ مسکرا رہا تھا۔

سردار نے اپنے تمام جنوں کو ایک سائیڈ پر کر کے

اپنے ہاتھ فضا میں بلند کر لئے اور منہ کے اندر آہستہ آہستہ

کچھ پڑھنے لگا۔ تقریباً پانچ منٹ بعد جب سردار نے

چنڈال اور مخالف جنوں کی طرف ہاتھ کیا تو ان کے اور

مسلمان جنوں کے درمیان ایک دیوار نکل آئی دیوار بہت

اوپنی اور تانبے کی تھی۔ تب سردار جن خیاں کے کہنے پر تمام

مسلمان جن واپس چلنے لگے۔

☆.....☆.....☆

شہر کی بکی آبادی میں بڑی بڑی عمارتوں کے

درمیان ایک درمیانے درجے کا ٹھیس اور صاف ستھرا مکان

واضح دکھائی دے رہا تھا۔ مکان کے دروازے پر ”دانشاؤ عمر“

کی موٹے حروف میں واضح تختی لگی ہوئی تھی۔ اس محلے میں

ہندو بھی تھے اور مسلمان بھی۔ لیکن زیادہ تعداد ہندوؤں کی

تھی۔ چند لمبے گزرے تھے کہ اس مکان کے دروازے پر

ایک بوڑھی عورت جس کی عمر تقریباً ستر سال تھی اس نے

دعاؤں کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔ آپ کی بڑی مہربانی ہوگی میں۔ میں زندگی بھر آپ کی احسان مند رہوں گی، آپ کی غلام رہوں گی۔“ بوڑھی عورت نے کہا۔ اس دوران اس کی بیٹی خاموش بیٹھی تھی۔

دشاد عمر بہت گہری سوچ میں پڑ گیا۔ پھر اچانک بولا۔ ”آپ کیا سمجھتی ہیں کہ اس کام میں میرا کوئی فائدہ نہیں ہے تو میں اسے کروں گا۔۔۔۔۔؟ اور کیا کر بھی پاؤں گا۔۔۔۔۔؟“ افریقہ جانے کے لئے بہت سے روپوں کی ضرورت ہوتی ہے۔۔۔۔۔؟“

دشاد بیٹا ہم نے آپ کے بارے میں بہت زیادہ سنا ہے کہ آپ بہت نیک آدمی ہیں۔ آپ نے ہمیشہ غریبوں، مسکینوں کی مدد کی اور کسی کو اپنے در سے خالی نہیں لوثایا۔ ہم آپ کے پاس بڑی امیدیں لے کر آئے ہیں۔ اس دنیا میں ہمارا اک دو بچے کے سوا کوئی نہیں ہے۔“ بوڑھی عورت نے نرودا آواز میں کہا۔

”اگر آپ کے کہنے کے مطابق میں نے اپنے در سے کسی کو خالی نہیں لوثایا تو آپ کو خالی کیسے لوثا سکتا ہوں۔ جائے اور ایک مہینے کے بعد آ کر اپنی بڑی بولی ہسپتال لے جائے گا۔“ یہ لہر دشاد اندر دوسرے کمرے میں جانے لگا تو بوڑھی نے ہاتھ زور دیتے ہوئے کہا۔ ”بیٹا اگر یہ میری طرف سے تمہارے سے زور ہیں یہ میں نے کوئل کی شادی کے لئے رکھے تھے تمہیں اس کی ضرورت پڑے گی۔“

”ارے ماں بیٹی آپ یہ زور کوئل کی شادی کے لئے رکھیں اور بے فکر ہو جائیں، خدا انہیں اتنے بڑے نیک کام کے لئے روانہ کرتا ہے ان کا خرچ اور رزق بھی بھیج دیتا ہے۔ اور ہاں میری باتوں کا برا نہ مانیے گا میں ویسے آپ کو چیک کر رہا تھا۔“ دشاد نے کہا اور اس کے ساتھ ہی دشاد واپس چلا گیا۔ تو بوڑھی اور اس کی بیٹی بھی وہاں سے اپنے گھر کے لئے روانہ ہو گئیں۔

.....

ایک بڑے اور خوب صورت کمرے میں رنگین قالین پر ایک بوڑھا جن بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ میں تسبیح تھی۔ اس کے تقریباً تمام بال سفید ہو چکے تھے۔ چند

پراچانک ایک بڑے ٹرک کی ہیڈ لائٹس روشن ہوئیں اور میری بیٹی کوئل کی آنکھوں پر پڑیں۔ اس وقت تو کوئل کی آنکھیں معمولی چندھیائی گئیں لیکن بعد میں آہستہ آہستہ کامل کو دکھائی دینا بند ہو گیا اور وہ مکمل طور پر مایوس ہو گئی۔“ بوڑھی عورت نے تسبیح بتاتے ہوئے کہا۔ اس کے ساتھ ہی بوڑھی عورت رونے لگی۔

”آپ رو نہیں مت آپ مجھے بتائیں کہ آپ مجھ سے کیا چاہتی ہیں۔ نہ ہی میں کوئل ڈاکٹر ہوں اور نہ ہی حکیم تو میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟“ دشاد نے کہا۔ بوڑھی عورت آنسو صاف کرتے ہوئے بولی۔ ”علاج کراتے کراتے جب ہم مختلف حکموں، ڈاکٹروں کے پاس گئے تو ایک ہفتہ پہلے ہماری ملاقات ایک بہت بڑے حکیم سے ہوئی جو کہ تقریباً نوے سال کی عمر کا تھا۔ اس نے کوئل کی آنکھیں دیکھتے ہوئے ہم سے کچھ پوچھے بغیر ہی بتا دیا۔“ کوئل کی آنکھیں ٹرک کی ہیڈ لائٹس کے اچانک آنکھوں پر پڑنے سے خراب ہوئی ہیں اور ٹرک کی ہیڈ لائٹس کی روشنی میں لیزر شعاع ہوتی ہے اور لیزر شعاع کا ایک ہی ٹوڑ ہے اور وہ ہے چوڑے چوڑے چوڑے بولی ہسپتال، جو کہ افریقہ کے گتے جنگلات کے علاوہ نہیں نہیں مل سکتی اور افریقہ کے بھیا نک اور خونخوار جنگلات میں جانا بہت جان جوہوں کا کام ہے لیکن پھر بھی کسی طرح اگر ان جنگلات سے ہسپتال سے بولی حاصل ہو جائے اور اس کا رس نکال کر اسے گلاب کے عرق کے ساتھ ملا کر آنکھوں میں ڈالا جائے تو خدا کے تکر سے پیدا انٹی ٹامینا بھی ٹھیک ہو جاتا ہے۔“

”تو آپ چاہتی ہیں کہ میں افریقہ کے گتے اور بھیا نک جنگلات میں جا کر آپ کی بیٹی کے لئے وہ جڑی بولی ہسپتال لے آؤں۔۔۔۔۔؟“ دشاد نے بوڑھی عورت کی بات سمجھتے ہوئے کہا۔

”جی ہاں۔“ بوڑھی عورت نے ہنسنے لگا۔

”اس کے بدلے آپ مجھے کیا دیں گی؟“ دشاد

نے پوچھا۔

”جی۔۔۔۔۔ میرے پاس تو آپ کو دینے کے لئے

فاسلے پر قبیلے کا سردار جن خیام بھی دس بوڑھے جن کے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔ وہ بوڑھے جن کو مسلسل دیکھ رہا تھا جبکہ بوڑھا جن شاید کسی عمل میں مصروف تھا۔ کچھ دیر بعد بوڑھا جن بولا۔ ”خیام جیسا کہ تم جانتے ہو کہ میں ایک نجومی جن ہوں اور نجومی کا کام ہے مستقبل کے لئے پیشین گوئی کرنا، ایک اندازہ لگانا اور میں نے جو اندازہ لگایا ہے وہ یہی ہے کہ تم چندال کو ایک مہینے کے اندر اندر ختم کر دو ورنہ اس کا وجود تمہارے حق میں بہتر نہ ہوگا۔“

”لیکن بیکال جی، آپ تو جانتے ہیں کہ چندال شیطان کا پیجاری ہے اور ہم مسلمان جن ہیں ہم اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ ہم جانتے ہیں کہ ہمارے پاس روشنی کی کئی طاقتیں ہیں۔ لیکن چندال شیطان کا پیجاری ہے۔ اور اس نے شیطان کی ہزاروں سال پرورش کی ہے۔ جس کی وجہ سے وہ ایسی شیطانی طاقتوں کا مالک ہو گیا ہے کہ ہم اس پر ہاتھ نہیں ڈال سکتے اور ویسے بھی ہماری اس سے کوئی دشمنی نہیں ہے۔ لیکن جب ہم اپنے مخالف قبیلے رینخان کے ساتھ مذہب کی بنا پر جنگ کرتے ہیں تو یہ حرام زادہ چندال بیچ میں آ جاتا ہے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ رینخان بھی ہندو اور شیطانی قبیلہ ہے اور چندال بھی شیطان کا پیجاری ہے۔ اس لئے چندال آ جاتا ہے۔“ سردار خیام نے تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔

”وہ سب ٹھیک ہے۔ خیام لیکن جب تک اس چندال کی موت نہیں واقع ہو جاتی تم لوگوں کو دائمی سکون نہیں ملے گا اور اگر تم نے قبیلہ رینخان کے ساتھ مزید جنگ کی تو چندال ہمارے مسلمان قبیلے کو مکمل طور پر نیست و نابود بھی کر سکتا ہے۔ اور ہاں تم سمجھ رہے ہو کہ محض شیطان کا پیجاری ہونے کی وجہ سے چندال قبیلہ رینخان کی مدد کر رہا ہے۔ ایسا نہیں ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ رینخان قبیلے کے جن چندال کو ہر ماہ کئی جوان خوب صورت لڑکیاں دیتے ہیں۔ اور چندال ان میں سے کچھ کے ساتھ جھسی ملاپ کرتا ہے۔ اور کچھ کو شیطان کی بیمنٹ چڑھا دیتا ہے جس کی وجہ سے شیطان چندال کو خاص شکلیاں عطا کرتا ہے اور اس طرح روز بروز چندال کی خصلتوں میں اضافہ

ہو رہا ہے اور میں جانتا ہوں کہ تم اور تمہارے قبیلے کے جنات چندال کو ختم نہیں کر سکتے۔ لیکن اس کا حل بھی میرے پاس ہے۔“ بیکال جن جو کہ نجومی تھا۔ اس نے خیام جن سے کہا۔

”وہ کیا حل ہے بیکال جی.....؟“ خیام جن نے پوچھا۔

نجومی بیکال بولا۔ ”اس کا واحد اور ممکن حل یہی ہے کہ تم کسی انسان کے ذریعے چندال کا خاتمہ کروادو۔“ ”جی۔“ خیام۔

”یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ ایک انسان ایک شیطان جن کا کیسے خاتمہ کر سکتا ہے۔“ خیام حیران ہوتے ہوئے بولا۔

”کر سکتا ہے.....“

بالکل کر سکتا ہے ایک انسان، جن سے بہت زیادہ طاقتور ہوتا ہے کیونکہ وہ اشرف المخلوقات ہے۔ اس کے پاس دماغ ہے، عقل ہے، شعور ہے، وہ سوچنے سمجھنے اور اپنا دفاع کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اس لئے وہ مناسب کوشش کر کے کسی بھی مشکل کو نہ صرف حل کر سکتا ہے بلکہ ناممکن و ممکن بنا دیتا ہے۔“ نجومی جن نے کہا۔

”وہ سب تو ٹھیک ہے بیکال جی لیکن جو طاقتیں ایک جن کے پاس ہوتی ہیں وہ ایک انسان کے پاس تو نہیں ہوتیں تو پھر کیسے ایک انسان ایک جن کا مقابلہ کر سکتا ہے۔“ خیام نے نہ سمجھنے والے انداز میں کہا۔

”تمہیں یہ سب سمجھ نہیں آئے گا تم یوں کہو کہ تم سیدنا حمیر شریف بیچ کر مزار پر حاضری دو اور سلام کرو، پھر وہاں موجود بابا کمال الدین شاہ کے پاس پہنچو، میں بھی تمہیں اسی جگہ ملوں گا۔ مزید بات ادھر ہی ہوگی۔“ نجومی بیکال نے کہا اور اس کے ساتھ ہی وہ اٹھ کر ایک پردے کی دھڑ میں غائب ہو گیا، جبکہ خیام جن بھی کچھ سوچتے ہوئے اٹھ کر وہاں سے ایک طرف کوچل دیا۔

ہٹا..... ہٹا..... ہٹا.....

ایک بہت بڑا غار تھا۔ جس کے اندر اندھیرا ہونے کی وجہ سے چھوٹے چھوٹے دیئے جل رہے تھے۔

نے جیسے ہی ہاتھ اٹھائے دوبارہ کسی نے اس کے پیٹ میں گدگدی کی ”ارے کون۔۔۔ کیا ہے بھئی۔۔۔ اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ ساتھ میں بیٹھے ہوئے دوسرے مسافر نے کہا۔ ”کیوں بھئی کیا ہوا؟“

”بھائی جان کوئی میرے پیٹ میں گدگدی کر رہا ہے۔ اور مجھے نظر نہیں آ رہا۔“

”یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔“ دلشاد کی بات سن کر دوسرا مسافر بولا۔ ”آپ کا مطلب ہے کہ کوئی بھوت یا جن آپ کے پیٹ میں گدگدی کر رہا ہے اور آپ کو نظر نہیں آ رہا۔۔۔ ناممکن یہ تو ہو ہی نہیں سکتا۔“

”بھائی صاحب آپ میرا یقین کیجئے۔۔۔ اوئے ایسا نہ کر“ دلشاد نے اپنے پیٹ پر ہاتھ رکھ کر مختلف آدڑیں نکالیں۔ دوسرا مسافر اسے حیرانی سے دیکھ رہا تھا کہ اچانک دلشاد اپنی جگہ سے یوں غائب ہو گیا جیسے گدے کے سر سے سینک۔ ”ارے۔۔۔ یہ آدمی کہاں غائب ہو گیا۔ ارے بھائیو، سنو۔۔۔ پلیز سنئے مس۔۔۔“ اس نے ایک ایئر ہوسٹس سے کہا۔

”جی۔“ خوب صورت ایئر ہوسٹس نے جواب دیا۔ ”ابھی میرے ساتھ اس سیٹ نمبر، نمبر سے ایک آدمی غائب ہو گیا۔ وہ بڑی دیر سے مجھ سے کہہ رہا تھا کہ اسے کوئی بھوت تنگ کر رہا ہے اور پھر اچانک وہ غائب ہو گیا۔“

”کیا آدمی غائب ہو گیا۔“ ایئر ہوسٹس چلائی۔ پورے جہاز کے مسافروں نے یہ بات سنی تو ان میں طبلبل مچ گئی۔ مسافر شور مچا رہے تھے کہ اچانک ایک حسینہ کی آواز ابھری۔ ”تمام مسافروں سے التماس ہے کہ وہ اپنی سیٹ بیلٹ باندھ لیں ہم اپنا ایک آدمی کے غائب ہونے کی وجہ سے جہاز کو قریبی ہوائی اڈے بائیں آباد پر اتار رہے ہیں۔ دھو اد۔“ تمام مسافروں نے سیٹ بیلٹ باندھ لیں اور جہاز آہستہ آہستہ لینڈ کرنے کے لئے نیچے جانے لگا۔

☆.....☆.....☆

ایک درمیانے درجے کا خوب صورت کمرہ تھا۔ کمرے کے درمیان میں سنگ مرمر کی بنی ہوئی ایک خوب صورت میز رکھی ہوئی تھی۔ میز کے ارد گرد خوب صورت

لکڑی کے تراشے ہوئے صوفے رکھے ہوئے تھے۔ ان صوفوں میں سے ایک صوفے پر دلشاد بے ہوش پڑا ہوا تھا۔ اس کے اوپر دو خوب صورت پرزیاں پٹکھا جھل رہی تھیں کہ اچانک دلشاد کو ہوش آ گیا۔ ”اوہہ۔۔۔ او۔۔۔ میں کہاں ہوں؟“ ہوش میں آتے ہی دلشاد نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔ ”پرزیاں میں سے ایک پر پی بھاگی اور کمرے کے دروازے سے باہر نکلتے ہوئے بولی۔

”شہون۔۔۔ شہون۔۔۔ اس کو ہوش آ گیا ہے۔۔۔ آقا۔“

”اچھا چلو چلتے ہیں۔ لیکن تم جاؤ۔۔۔ میں سردار کو خبر کر رہوں۔“ شہون جن نے کہا۔

پری کے کمرے میں آتے ہی چند لمحوں بعد سردار خیام اور شہون کمرے میں داخل ہوئے۔

”السلام تمہم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ“ سردار خیام اور شہون جن نے بیف وقت کہا۔ یہ دونوں اس وقت انسانی شکل میں تھے، اس لئے دلشاد کو ذرا خبر بھی کچھ محسوس نہ ہوا۔ ”وہیکم السلام۔۔۔ لیکن بھئی صاحب آپ کون لوگ ہیں اور میں کہاں ہوں۔۔۔؟“ دلشاد نے کہا۔ ”بتاتے ہیں دلشاد صاحب، آپ ذرا صبر تو کریں۔“ شہون نے جلدی سے کہا۔ اس نے سردار جن خیام اور شہون جن دلشاد کے قریب ایک صوفے پر بیٹھ گئے۔ ”کا جل تم دلشاد کی خاطر مزارت کا بندوبست کرو جاؤ۔“ سردار خیام نے کا جل پر پی تے کہا۔ جو کہ دلشاد پر پٹکھا جھل رہی تھی۔

”اچھا بھئی دلشاد اب میں آپ کو سب کچھ تفصیل سے بتاتا ہوں۔“ سردار خیام نے کہا۔ دلشاد ان دونوں کی طرف غور سے دیکھ رہا تھا۔ ”بات دراصل یہ ہے کہ ہم لوگ انسان نہیں ہیں بلکہ جن ہیں۔“

”کیا آپ لوگ جن ہیں لیکن۔۔۔“ دلشاد نے سردار خیام کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

”ہاں ہم جن ہیں تمہیں ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہم اس وقت انسانی شکل میں ہیں اور ہم ایک مسلمان قبیلے کے جن ہیں۔ ہم تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچانے والے، بلکہ تمہیں خود ہماری مدد کی ضرورت

اپنے ملازم جن بطش کو افریقہ کے جنگلات سے وہ جڑی بوٹی لانے کے لئے بھیج دیا تھا۔ سردار خیام نے کہا۔
”اوغدا کا شکر ہے کہ آپ نے ایسا کیا ورنہ شاید میں آپ کی کوئی بات نہ مانتا۔“

”تو کیا آپ ہمارا کام کرنے کے لئے تیار ہیں۔“ سردار نے دانش کی بات سن کر جلدی سے کہا۔ ”جی ہاں میں بالکل تیار ہوں کیونکہ یہ کام نیکی کا ہے اور دوسرا میرے مرشد نے مجھے اس کام کے لئے چنا ہے۔ لیکن میں یہ کام شروع کرنے سے پہلے کچھ معلومات حاصل کرنا چاہوں گا۔۔۔۔۔“

”کیسی معلومات؟“ خیام نے حیران ہو کر کہا۔
”اس وقت تو نہیں کیونکہ اب میں پہلے امیر شریف میں حاضری دوں گا اور اپنے مرشد کمال الدین شاہ سے بھی ملوں گا وہاں سے واپسی کے بعد آپ سے بات چیت ہوگی۔“ دانش نے کہا۔

”ٹھیک ہے جس طرح آپ کی مرضی۔ اگر آپ نے ہمیں اس مشکل سے نکال دیا تو ہم زندگی بھر آپ کے احسان مند رہیں گے۔“ خیام نے کہا۔ اتنے میں کا جل پری آگئی اور بولی۔ ”شہون آقا کھانا دسٹر خوان پر لگ چکا ہے۔“

”ٹھیک ہے ہم آرہے ہیں۔“ شہون نے جواب دیا۔ اور وہ دانش کو لے کر دوسرے کمرے میں جانے لگے۔

.....

آگرہ شہر میں ایک تاریخی محلے میں ایک لال رنگ کی کوٹھی کے من گیسٹ پر راجیش نام کی تختی لگی ہوئی تھی۔ کوٹھی کے اندر کے ایریا میں بہت زیادہ رستے پر مشتمل زمین ویران پڑی ہوئی تھی۔ جس میں خشک گھاس کے سوا کچھ نہ تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے یہ کوٹھی صدیوں سے ویران پڑی ہو۔ لیکن حقیقت میں ایسا نہ تھا۔ کوٹھی میں ایک شخص رہتا تھا جس کا اصل نام راجون تھا لیکن لوگ اسے راجیش کے نام سے جانتے تھے۔ راجون کے پاس ایک پرانے ماڈل کی لمبی کار تھی جو کہ کوٹھی کے اگلوتے گیراج میں کھڑی تھی۔ راجون اس وقت کوٹھی کے سب سے

چھوٹے کمرے میں بیٹھا ہوا تھا کہ ایک نگرانی کے میز پر پڑے ہوئے ایک پرانے طرز کے ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ ”نیو راجیش بول رہا ہوں۔“ راجون نے فون اٹھاتے ہوئے کہا۔ ”ہاں ہیلو میں سونیا بول رہی ہوں۔ ہیلو راجیش کیا تم آج گھر پر رہو گے؟“ دوسری طرف سے سونیا نے تیزی سے کہا۔

”ہاں۔۔۔ لیکن کیوں تم کیوں پوچھ رہی ہو۔۔۔“ راجون نے کہا۔

”وہ میں تمہیں وہیں آ کر بتاؤں گی بس تم رکو میں آرہی ہوں۔“ سونیا نے کہا۔ ”لیکن“ راجون نے کچھ کہنا چاہا لیکن سونیا نے فون بند کر دیا۔

راجون اس وقت مین گیٹ کے سامنے ایک کمرے کے اندر بیٹھا ہوا کھڑکی سے گیٹ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ایسے لگ رہا تھا جیسے وہ منہ ہی منہ میں پتھر بڑا رہا ہو۔ اپنی ملک اس نے مین گیٹ کی طرف پھونک ماری تو گیٹ چہ چہ بٹ کی آواز سے ساتھ کھل گیا۔ تھوڑی دیر بعد ایک کار گیٹ سے اندر آتی ہوئی دکھائی دی۔ کار میں ایک خوب صورت لڑکی بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے نیلے رنگ کا نیم مریاں لباس پہنا ہوا تھا۔ جو کہ نہ ہونے کے برابر تھا۔ کار سے اترتے ہی وہ لڑکی راجون کے کمرے میں داخل ہوئی۔ اس کے ہاتھوں میں ایک درمیانے درجے کا ٹشو پیپر جتناڑ بہ تھا۔

”پتی برتھ ڈے نو یو راجیش۔“ وہ اونچی آواز میں بولی اور راجون کے سگ سے لگ گئی۔ بوسہ دینے کے بعد وہ بولی۔ ”کیسا لگا میرا سر پر انزرا جیش۔“

”واقعی تمہارا حافظہ بہت تیز ہے مجھے تو یاد ہی نہیں تھا کہ آج میرا جنم دن ہے۔“ راجون نے اس کی کمرے کے گرد ہاتھ جھانک کرتے ہوئے کہا۔

”تمہیں یاد نہیں ہے ناں، مجھے تو یاد ہے۔۔۔۔۔ اور بھول بھی کیسے سکتی ہوں تم سے پیار جو کرتی ہوں۔“ اس لڑکی نے کہا۔

”ہاں سونیا تم مجھ سے واقعی بہت پیار کرتی ہو اور میری یہ خواہش ہے کہ تم مجھ سے ہمیشہ اسی طرح پیار کرتی

دانت لمبے ہو گئے پھر وہ ہلکی ہلکی آوازوں کے ساتھ سونیا کی طرف بڑھنے لگا۔ کمرہ سونیا کی بھیا تک چیموں سے کونچا اٹھا۔ اس نے دونوں دانت سونیا کی شرنگ میں گاڑ دیئے تھے۔ جیسے ہی سونیا کا جسم ساکت ہوا۔ راخون نے اسے جھوڑ دیا اور اپنا منہ صاف کر کے باہر صحن میں نکل آیا۔ اب اس کے دانت اپنی اصلی حالت میں آچکے تھے۔

پچھویر بعد وہ اپنی پرانی ماذل کی کار میں بیٹھا اور دوسرے ہی لمحے اس کی کار ایک ویران سڑک پر دوڑ رہی تھی۔ تقریباً ایک گھنٹے کے سفر کے بعد کار ایک پہاڑی علاقے میں داخل ہوئی جہاں چاروں طرف خشک پہاڑ تھے۔ پھر آہستہ آہستہ کار نے ایک موزموزا پھر کار ایک ویران کالے رنگ کے پہاڑ کے ساتھ رک گئی۔ راخون کار سے باہر نکلا اور آہستہ آہستہ ایک سمت چلنے لگا۔ چند لمحوں بعد اسے ایک غار نظر آئی اور وہ اس میں داخل ہو گیا۔ اس کے اندر داخل ہوتے ہی غار کا منہ ایک بھاری پتھر سے بند ہو گیا۔

راخون نے پیچھے مڑ کر دیکھا ہی تھا کہ اچانک غار کی چھت سے ایک بھیا تک آواز آئی۔ ”بس راخون آج سے اپنی موت تک تم اس غار میں بند رہو گے اور جب تم مر جاؤ گے تو پھر تمہارا نیا جہنم ہوگا، تمہاری آتما کو ایک نیا شریعہ ملے گا۔ اور اس جہنم میں تمہارا نام بلجان ہوگا اور لوگ تمہیں لیثونیت کے نام سے پکاریں گے، یہی تمہارے پاپ کی سزا ہے۔ میں آج ہی کالے شیطان آقا کے سامنے منکا دیوی کو یہ وجہ دوں گا کہ ناری کو چھو لینے کے بعد اب تمہارا جسم منکا دیوی کے قابل نہیں ہے۔ اس لئے منکا دیوی آزاد ہے اور تمہیں تمہارے پاپوں کی سزا ضرور ملے گی۔“ اور اس کے ساتھ ہی آواز آنا بند ہو گئی۔

”نہیں چنڈال آقا مجھ پر دیا کیجئے، مجھے شام کر دیجئے میں بہک گیا تھا۔ اس لئے آپ کے ساتھ کئے ہوئے وجہ کو نبھانہ سکا۔ لیکن آپ تو مہا پرش ہیں دیالو ہیں۔ مجھے شام کر دیجئے منکا دیوی کو وجہ مت دیجئے۔“ چنڈال آقا مجھے بس آپ کا سہارا ہے۔“ راخون نے گڑ گڑا کر چھت کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ لیکن بدلے میں کوئی رد عمل نہ ہوا۔ ”چنڈال آقا میں نے آپ پر وشوا کیا ہے

رہو۔“ راخون نے اسے اپنے بازوؤں میں بٹھتے ہوئے کہا۔ ”او کے مائی ڈارلنگ۔“ سونیا نے کہا۔ اور پھر وہ دونوں وہیں پر ایک دوسرے میں کھو گئے۔ راخون اس وقت اس کے سرخ اور نرم و نازک ہونٹوں کا رُس پی رہا تھا کہ اچانک ایک دھماکہ ہوا اور کمرے کا فرش پھٹ گیا۔ دھماکہ اتنا شدید تھا کہ راخون کے کان بند ہو گئے اور سونیا بے ہوش ہو گئی۔ فرش کے پھٹنے ہی نیچے سے کانے رنگ کا دھواں نکلنے لگا۔ دھواں اتنا زیادہ پھیل گیا کہ کمرے میں کوئی چیز دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ پھر آہستہ آہستہ دھواں ختم ہوا اور پھر ایک سیاہ رنگ کا کتا فرش میں موجود گڑبڑ سے باہر نکلا اس کے بال بال کتل کا ٹٹوں کی طرح کھڑے تھے اور شکل بالکل ایک شکاری کتے جیسی تھی۔

”نارنگ تم..... تم اور اچانک اس طرح..... خیریت۔“ راخون نے گھبراتے ہوئے کہا۔ اور پھر کتے کے منہ سے انہی زبان میں آواز نکلی۔

”مجھے چنڈال آقا نے بھیجا ہے اور کہا ہے کہ آپ کو کالی شکتیاں دیتے وقت چنڈال آقا نے عہد لیا تھا کہ آپ تین مہینے تک کسی ناری کو ہاتھ نہیں لگائیں گے بلکہ اس کی شکل بھی نہیں دیکھیں گے لیکن آپ نے دوسرے مہینے کے اندر ہی یہ عہد توڑ ڈالا اور ناری کے بدن کو چھو لیا۔ اب مجھے چنڈال آقا نے بھیجا ہے کہ میں آپ کو خیر کر دوں کہ آپ کو اس کی کڑی سزا ملے گی۔ اور اس کے لئے چنڈال آقا نے آپ کو شانان کی کالی پہاڑیوں پر بلایا ہے۔ بس اب میرا کام ختم۔ اس لئے مجھے اجازت۔“ نارنگ نے کہا اور اس کے ساتھ ہی ایک دفعہ پھر دھماکے کی آواز آئی اور فرش کے اندر نارنگ غائب ہو گیا اور فرش کی سطح برابر ہو گئی۔

راخون کو پسینے جھوٹ رہے تھے۔ نارنگ کی بات سن کر وہ کانپنے لگ گیا تھا کہ پتہ نہیں چنڈال اس کے ساتھ کیا سلوک کرے گا۔ کچھ سوچتے ہوئے اس نے ایک نظر بستر پر ڈالی جہاں ابھی تک سونیا بے ہوش پڑی ہوئی تھی۔ پھر وہ مسلسل بستر کو گھورنے لگ گیا۔ اسی لمحے اس کے حلق سے عجیب سی آواز نکلی اور اس کے آگے کے دو

آپ میرے ساتھ اس طرح نہ کریں آپ کو شیطان آقا کا واسطہ.....“ راخون نے چیخے ہوئے کہا۔

”ٹھیک ہے راخون میں تجھے قید نہیں کروں گا اور تجھ سے تیری ہتکدیاں بھی نہیں چھینوں گا لیکن منکا ویوی اب تیری نہیں ہو سکتی۔ اس لئے تو اسے بھول جا اور وہاں تجھے اپنے پاپ کا ازالہ بھگتنا پڑے گا۔“

”آپ دیالو ہیں آقا..... آپ شکتی مان ہیں۔ آپ نے مجھے شاکر دیا، مجھے آپ کی ہر شرط منظور ہے۔“ راخون نے گھٹنے نیچے ہوئے کہا۔

”وہ سب ٹھیک ہے۔ لیکن تو اب میری بات غور سے سن۔“ چندال کی بھاری آواز غار میں گونجی۔ ”ایک شخص دلشاد ہے جس کا تعلق دہلی سے ہے۔ اسے آج کل مجھ سے ٹکر لینے کے لئے تیار کیا جا رہا ہے۔ اور یہ کام روشنا قبیلے کا سردار جن خیام کر رہا ہے کیونکہ اسے مجھ سے خطرہ ہے کہ میں اس کے قبیلے کو ختم کر دوں گا۔ وہ براہ راست مجھ پر ہاتھ نہیں ڈال سکتا اس لئے حرام خور اب معصوم انسانوں کا سہارا لے رہا ہے۔ لیکن یہ دلشاد بہت نیک انسان ہے اس کے پاس روشنی کی بے شمار طاقتیں ہیں اور اس کے سر پر بزرگوں کی دعائیں ہیں اس نے آج تک کوئی کام اپنے مفاد کے لئے نہیں کیا اس لئے مجھے اس شخص سے خطرہ ہے۔ تو یوں کر کہ اسے مجھ تک پہنچنے سے پہلے ہی ختم کر دے۔ تاکہ بعد میں پریشانی نہ اٹھانی پڑے۔“

”لیکن آقا کیا وہ اتنا طاقتور ہے کہ آپ کو اس سے خطرہ ہے.....“ راخون نے معصومیت سے کہا۔

”مجھ سے جو کہا ہے اس پر عمل کر۔ یہی تیرے پاپ کا ازالہ ہے اور ہاں اگر تو اسے ختم کرنے میں ناکام رہا تو تیری سزا صرف موت ہے۔“ اور اس کے ساتھ ہی چندال کی آواز آنا بند ہو گئی اور غار کا منہ اب کھل گیا تھا۔ اسے دیکھتے ہی راخون باہر نکل آیا اور اپنی کار کی طرف چلنے لگا۔

☆.....☆.....☆

”بولے دلشاد آپ مجھ سے کسی معلومات چاہتے ہیں۔“ سردار خیام نے دلشاد سے کہا۔ وہ دونوں اس وقت سردار خیام کی ذاتی بیٹھک میں بیٹھے تھے۔ اجیر شریف

میں حاضری دینے اور اپنے مرشد سے ملنے کے بعد دلشاد واپس آ گیا تھا اور اس وقت وہ سردار جن خیام سے کچھ ضروری معلومات حاصل کرنا چاہتا تھا۔

”خیام تم سے میرے تین اہم سوال ہیں: جبکہ باقی یونہی چھوٹی موٹی غیر ضروری باتیں ہیں۔ پہلا سوال یہ ہے کہ ”تم جانتے ہو کہ ایک جن کے پاس ماورائی طاقتیں ہوتی ہیں۔ وہ پل میں غائب ہو سکتا ہے اور پل میں حاضر ہو سکتا ہے، اس کے علاوہ وہ اڑ سکتا ہے۔ غرضیکہ اس کے لئے وہ تمام کام جو انسان کے لئے ناممکن ہوتے ہیں، ممکن ہوتے ہیں۔ اس لئے ایک انسان ایک جن کو کیسے ہلاک کر سکتا ہے۔“

دوسرا سوال یہ ہے کہ ”میں نے سنا ہے کہ ایک جن پر پستول، مندرق وغیرہ کی گولیاں اثر نہیں کرتیں لیکن اگر ایک جن کو آگ یعنی روشنی دھانی جائے تو وہ بھاگ جاتا ہے۔ اس بات میں کہاں تک چٹائی ہے۔“

اور تیسرا اہم سوال یہ ہے کہ ”اگر لڑائی کے دوران جن نظروں کے سامنے سے غائب ہو کر واپس کرے تو اسے کیسے دیکھا جاسکتا ہے۔“ دلشاد نے تفصیل سے کہا۔

”دلشاد میں سب باتیں بتا دیتا ہوں۔ جو مجھے ابھی تک معلوم ہوا ہے۔“ سردار خیام نے کہنا شروع کیا۔

”ایک انسان کسی جن کو واقعی اس طرح ختم نہیں کر سکتا جس طرح ایک ہتھیار سے آسانی کے ساتھ دوسرے انسان کو ختم کر دیتا ہے لیکن انسان چونکہ اشرف المخلوقات ہے۔ وہ اپنے دماغ سے ایسی ترکیب آخر نکال ہی لیتا ہے کہ وہ جن پر بھاری پڑتا ہے اور چونکہ تمہیں چندال کو ختم کرنے کے لئے ہم بھیج رہے ہیں۔ اس لئے ہم تمہیں کچھ ایسی طاقتیں بخشیں گے جس سے تم دوسرے انسان اور جن دونوں کا ذہن پڑھ سکو گے اور صدیوں کا فاصلہ چند گھنٹوں میں طے کر دو گے اور اس کے علاوہ چھوٹے موٹے کام جو ایک انسان نہیں کر سکتا تم کر سکو گے اور اس کے علاوہ تمہارے اپنے پاس بھی تو بے شمار روحانی علم ہے تم اسے بھی استعمال کرو گے۔“

”اور میرا دوسرا سوال۔“ دلشاد نے سوالیہ نگاہوں

اور ہاں جب جن کو انسانی شکل میں باندھ دیا جائے تو وہ اپنی شکل بھی تبدیل نہیں کر سکتا۔“ سردار خیام نے کہا۔
 ”خیام صاحب، بہت بہت شکریہ آپ نے میری ایک مشکل تو آسان کر دی۔“ دلشاد نے کہا۔
 ”دلشاد صاحب جانے سے پہلے آپ میرے ساتھ آئیں تاکہ میں آپ کو کچھ اور ضروری اشیاء دوں جو کہ آپ کے بہت کام آئیں گی۔“ سردار خیام نے کہا تو دلشاد اور خیام دروازے سے نکل کر ایک طرف چل پڑے۔

☆.....☆.....☆

راخون اپنی کوٹھی کے ایک تہہ خانے میں فرش پر آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا۔ اس کے پاس فرش پر ایک ڈبہ بڑا ہوا تھا۔ جس میں سیندور تھا۔ سامنے آتش دان میں آگ جل رہی تھی۔ اس نے ایک کالا غافہ کھول جس میں بوسیدہ ہڈیاں تھیں۔ پھر ایک موٹی ہڈی پر کچھ پھونک کر اسے سیندور کے ڈبے میں ڈالا۔ جب ہڈی سیندور کی تہہ سے اٹھی طرح بھرنی تو اس نے اسے سامنے جلتی ہوئی آگ میں پھینک دیا۔ پھر غافہ بند کر کے آگ کی طرف دیکھنے لگا اور منہ میں کچھ بڑبڑانے لگا۔

اچانک ایسی آواز آئی جیسے کسی نے آگ پر پانی پھینک دیا، اور پھر واقعی آگ بجھ گئی اور کالے رنگ کے دھوئیں نے آتش دان کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ دھواں ختم ہوتے ہی ایک ہمایک آواز آئی۔ ”ابلاشا حاضر ہے آقا راخون۔“ اور پھر سامنے آتش دان میں ایک لمبے منہ والی بہت چھوٹی سی لومڑی بیٹھی دکھائی دی جس کا کالا رنگ تھا۔ ”حکم دیجئے آقا۔“ لومڑی کے منہ سے دوبارہ آواز آئی۔ ”ابلاشا دہلی شہر میں ایک بہت نیک شخص دلشاد رہتا ہے جانتی ہوں۔“ راخون نے کہا۔

”دلشاد، دو منٹ معلوم کرنا پڑے گا آقا۔“ ابلاشا نے کہا۔ اور پھر وہ غائب ہو گئی۔ واقعی دو منٹ بعد لومڑی ایک دفعہ پھر حاضر ہو گئی۔ ”راخون آقا میں نے سب کچھ معلوم کر لیا ہے۔“ ابلاشا نے کہا۔

”بتاؤ کیا جانکاری ملی۔“ راخون نے کہا۔ ”دلشاد واقعی ایک نیک شخص ہے۔ اس نے آج تک کوئی

سے خیام کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”تمہارے دوسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ واقعی ایک جن کسی گولی سے نہیں مر سکتا۔ اور نہ ہی اس کا کوئی اثر جن پر ہوتا ہے۔ البتہ اگر کوئی لوہے کی چیز ہاتھ میں ہو تو جن بھاگ جاتا ہے اور انسان کو کوئی نقصان نہیں پہنچاتا اور ہاں لوہے کے علاوہ روشنی کو بھی دیکھ کر جن انسان کے نزدیک نہیں آتا۔ اور تمہارے تیسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ اگر لڑائی کے دوران جن چھپ کر وار کرے تو اسے میرے علم کے مطابق نہیں دیکھا جاسکتا۔ ہاں شاید کسی رانا کو یہ بات معلوم ہو۔ لیکن یہ بات میرے علم میں نہیں ہے۔“ خیام جن نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

”ٹھیک ہے خیام تمہاری بہت مہربانی اب میں چلا ہوں تم میرے لئے دعا کرنا کہ میں کامیاب لوں۔“ دلشاد نے اٹھتے ہوئے کہا۔

”مہربانی تو آپ کی ہے۔ دلشاد جی آپ ہماری خاطر اتنی مشکل میں پڑ رہے ہیں۔“ خیام جن نے بھی اٹھتے ہوئے کہا۔ وہ دونوں اٹھے ہی تھے کہ اچانک خیام نے سر پر ہاتھ لگاتے ہوئے کہا۔ ”دو منٹ دلشاد جی آپ بیٹھ جائیں۔“

”کیوں کیا ہوا؟“ دلشاد نے جیتے ہوئے کہا۔ ”مجھے یاد آ گیا ہے کہ ایک جن کو کیسے ختم کیا جاسکتا ہے۔“ ”کیسے بتائیں؟“ دلشاد نے جلدی سے پرجوش لہجے میں پوچھا۔

”یہ تجربہ مجھے مصر کے ایک جادوگر پر نام نے کر لیا تھا۔ اس کے مطابق اگر جن کو کالی ڈوری یا بونوں کے تسمے سے کسی دیوار یا کرسی یا کسی بھی چیز کے ساتھ باندھ دیا جائے تو اس کی تمام طاقتیں ختم ہو جاتی ہیں اور جب تک وہ بندھا رہتا ہے ایسا ہوتا ہے لیکن جو بھی وہ آزاد ہوتا ہے اس کی طاقتیں پھر لوٹ آتی ہیں۔۔۔۔۔ لیکن۔۔۔۔۔“ ”لیکن کیا۔۔۔۔۔“ دلشاد نے کہا۔

”لیکن اس کی ایک شرط ہے اور وہ یہ کہ اس وقت جب جن کو باندھا جائے، جن انسانی شکل میں ہوتا چاہئے، ورنہ دوسری صورت میں وہ باندھا ہی نہیں جاسکتا

ہے۔ دفعہ ہو جایاں سے ورنہ۔ دوسرے لمحے دلشاد کی آنکھوں سے ایک شعاع نکلی اور اس آدمی پر پڑی۔ وہ ہوا میں اڑنے لگا۔ اس کی کھوار گریچی تھی۔ آ۔ آ۔ آ۔ مجھے معاف کر دو۔ میں پھر ایسا نہیں کروں گا۔ اس نے ہوا میں قلابازیاں کھاتے ہوئے کہا۔ ”وعدہ کرتے ہو۔“ دلشاد نے کہا۔ ”ہاں۔ ہاں میں وجہ دیتا ہوں میں پھر کسی لڑکی پر ہاتھ نہیں اٹھاؤں گا۔“ اس آدمی نے ہانپتے ہوئے کہا۔ پھر دلشاد کی آنکھوں سے ایک اور شعاع نکلی اور اس پر پڑی وہ آدمی سیدھا ہوا اور کھڑے ہوتے ہی ایسے بھاگا جیسے اس کے پیچھے جنگلی کتے لگے ہوئے ہوں۔ دلشاد وہاں سے واپس جانے کے لئے مڑا ہی تھا کہ لڑکی نے کہا۔ ”آپ کا بہت بہت شکریہ آپ نے میری جان بچائی۔“ ”ارے جان لینا دینا تو خدا کے ہاتھ میں ہے۔ بس اس نے آپ کی مدد کے لئے مجھے بھیج دیا۔“ دلشاد نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”لیکن آپ نے تو جادو کر دیا کیا آپ کوئی جادوگر ہیں؟“

”جی نہیں میں کوئی جادوگر نہیں بلکہ ایک عام سا انسان ہوں۔“ دلشاد نے دھیرے سے جواب دیا۔ ”میرا نام پلوشا ہے اور میں یہیں ایک جنات کے قبیلے میں رہتی ہوں۔ آپ کا کیا نام ہے۔“ ”کیا کہا تم نے تم جنات کے قبیلے میں رہتی ہو کون سا قبیلہ ہے تمہارا؟“

دلشاد نے حیران ہوتے ہوئے پوچھا۔ ”ہمارے قبیلے کا نام چنڈال قبیلہ ہے۔“ ”کیا؟۔۔۔۔۔ چنڈال۔“ دلشاد حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔

”ہاں بابو جی چنڈال ہی ہمارے قبیلے کا نام ہے۔ لیکن آپ اتنا حیران کیوں ہو رہے ہیں۔“ پلوشا نے پوچھا۔

”پلوشا کیا تمہارے سردار کا نام چنڈال ہے؟“ دلشاد نے کہا۔

”ہاں بابو جی چنڈال ہمارے قبیلے کے سردار کا نام

کام اپنے فائدے کے لئے نہیں کیا۔ وہ صرف دوسروں کے لئے سوچتا ہے۔ دوسروں کے مساکین حل کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے پیچھے لاکھوں لوگ دعائیں کرتے ہیں اور وہ کامیاب رہتا ہے۔ اور آج کل وہ مسلمان جنات کے قبیلے روشنا کو چنڈال آقا سے نجات دلانے کے لئے چنڈال کو مارنے کے مشن پر روانہ ہو چکا ہے اور اس کام کے لئے ات بابا کمال الدین شاہ نے چنا ہے۔“ ابلاشا نے تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔

”بس ابلاشا تمہیں اور کچھ بتانے کی مجھے کوئی ضرورت نہیں تم سب کچھ جان گئی ہو اور اب تمہارا کام یہ ہے کہ تم دلشاد کو چنڈال آقا تک تو کیا وہاں کی سرحد تک پہنچنے سے بھی پہلے ختم کر دو۔ یہ میرا حکم ہے اور اگر اس میں تم ناکام ہو گئیں تو میری موت ہے اور اگر میں مر جاؤں تو تمہارا کیا حال ہو گا تم اچھی طرح جانتی ہو۔ اب جاؤ تمہارے پاس وقت بہت کم ہے۔“ راخون نے کہا۔ اور اوڑنی منایا ہوئی جبکہ آتش دان میں دوبارہ آگ جلنے لگی۔

☆.....☆.....☆

چاروں طرف پہاڑ تھے۔ جن کے اوپر کالے رنگ کے چھوٹے قد والے بے شمار درخت اگے ہوئے تھے۔ پہاڑوں کے درمیان ایک چشمہ بہہ رہا تھا۔ یہاں ایک بڑا پتھر تھا جس کے ساتھ دلشاد ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ اچانک ایک آواز سنائی دی۔ ”بچاؤ۔۔۔۔۔ بچاؤ۔۔۔۔۔ بھگوان کے لئے مجھے بچاؤ۔“ یہ آواز کسی لڑکی کی تھی جو کہ مدد کے لئے پکار رہی تھی۔ دلشاد اٹھا اور آواز کی سمت چل پڑا۔ کچھ دور چلتے کے بعد اسے درختوں کے جھنڈ میں ایک مرد اور ایک سفید رنگ کے کپڑے پہنے لمبے بالوں والی حسین لڑکی دکھائی دی۔ مرد نے لڑکی کو ایک ہاتھ سے پکڑا ہوا تھا اور دوسرے ہاتھ میں کھوار اٹھا رکھی تھی۔ دوسرے لمحے دلشاد ان کے پاس موجود تھا۔ ”بھائی صاحب آپ لڑکی کو کیوں قتل کر رہے ہیں، چھوڑ دیں اسے۔“ دلشاد نے کہا۔ ”بھگوان کے لئے مجھے بچالیں۔“ لڑکی نے دلشاد کی طرف امید بھری آنکھوں سے دیکھا۔

”تو کون ہے منحوس اور اس سے یہاں کیوں آیا

کے مولے تھے کے ساتھ ایک لمبی سیٹ نما پتھر بڑا ہوا تھا۔ وہاں پہنچتے ہی پلو شا پتھر پر بیٹھ گئی اور دلشاد سے بھی بیٹھنے کو کہا۔ لیکن دلشاد نے کہا کہ وہ کھڑا ہی نہیں ہے۔ اس دوران دلشاد منہ میں کچھ چبا رہا تھا۔ اسے لگ رہا تھا جیسے وہ پان کھا رہا ہو اور واقعی وہ پان تھا۔ ”یہ تم کیا کھا رہے ہو؟“ پلو شا نے سوال کیا۔

”یہ... یہ مدراس کا پان ہے۔ اسے بڑی پان بھی کہتے ہیں۔ اس کی خوبی یہ ہے کہ جب لمبی گفتگو کرنی ہو تو اس کے کھانے سے فینڈ نہیں آتی اور باتوں کا مزہ آتا ہے۔ اس لئے میں اسے کھا رہا ہوں۔ اوتھم بھی کھاؤ۔“ دلشاد نے حیب سے ایک سیر پتے میں لپٹا ہوا پان نکالا۔ ”نہیں... میں نے بھی پان نہیں کھایا رہے دو۔“ ”اگرے کیسے رہنے دوں نہیں کھایا تو آج کھا لو۔“ یقین کرنا بڑا مزہ دے گا اور گھبراؤ نہیں پکرو گرنہیں آئیں گے۔“ دلشاد نے زور دیتے ہوئے کہا۔ اور مجبوراً پلو شا کو پان لینا پڑا۔ ”ہاں اب بتاؤ چندال کن شکتیوں کا مالک ہے؟“ دلشاد نے پلو شا کے ساتھ بیٹھتے ہوئے کہا۔

”چندال... چند... ال... ہاں... اوتھم... اور اس کے ساتھ ہی پلو شا برگد کے درخت کے ساتھ لڑھک پڑی۔ پان اپنا اثر دکھا چکا تھا۔ دلشاد نے جلدی سے اپنی سائڈ والی حیب سے ایک کالی لمبی ڈوری نکالی اور اس کے ساتھ پلو شا کو برگد کے تنے کے ساتھ باندھنے لگا۔ پلو شا کو باندھتے ہی پلو شا کی گردن سے ایک کانے رنگ کی ڈوری میں موجود مالا دلشاد نے نکال لی۔ اب وہ پلو شا کے چہرے پر لگا تار پتھروں کی برسات کر رہا تھا۔ تھوڑی دیر میں ہی پلو شا ہوش میں آ گئی۔ ”آ نکھیں کھولتے ہی وہ کراہ اٹھی... تم نے مجھے... اس طرح باندھ کیوں رکھا ہے؟“

”خاموش ہو جا خبیث چڑیل تو مجھے مارنا چاہتی تھی ناں... اب دیکھ میں تیرے ساتھ کیا کرتا ہوں۔“ دلشاد نے کہا۔

”یہ تم کیا کہہ رہے ہو، میں تمہیں کیسے مار سکتی ہوں... مجھے تو خود تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔“ پلو شا

ہے اور اسی کے نام پر قبیلے کا نام چندال رکھا گیا ہے۔“ پلو شا نے جواب دیا۔

”اس کا مطلب ہے کہ میں ٹھیک جگہ پر پہنچا ہوں۔“ دلشاد نے خود سے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔ ”پلو شا تم تو انسان ہو، پھر تم اس جنات کی وادی میں کیوں رہتی ہو؟“ دلشاد نے اچانک سوال کیا۔

”کیا بتاؤں بابو جی... کیا آپ میرا یقین کریں گے...“ دلشاد سے پلو شا نے کہا۔

”ہاں پلو شا بولو۔“ دلشاد نے ایک گہری نگاہ پلو شا پر ڈالتے ہوئے کہا۔ ”میں بھی آپ کی طرح انسانوں کی دنیا میں رہتی تھی۔ لیکن کب اس چندال کی نظر مجھ پر پڑی اور یہ مجھے اٹھا کر یہاں لے آیا اور مجھے ہمیشہ کے لئے قید کر دیا۔ آج بھی میں بڑی مشکل سے یہاں سے بھائی تھی کہ پتہ نہیں کیسے اس جن کو خیر ہو گئی اور وہ مجھے مارنے لگ گیا اگر آپ نے میری جان نہ بچائی ہوتی تو...“ اور پھر پلو شا رونے لگی۔

”لیکن پلو شا وہ جو تمہیں مار رہا تھا وہ تو انسان تھا۔“ دلشاد نے کہا۔

”نہیں بابو جی وہ مجھے دھوکہ دینے کے لئے انسانی شکل میں آیا تھا وہ اصل میں جن تھا۔“ پلو شا نے جواب دیا۔ ”پلو شا کیا تم مجھے اس چندال کی شکتیوں کے بارے میں کچھ بتا سکتی ہو۔ مجھے اسے ستم کرنا ہے اس طرح تم بھی آزاد ہو جاؤ گی بولو کیا کہتی ہو۔“

”بالکل بابو جی ضرور بتاؤں گی قبیلے میں رہ کر مجھے اس کی کالی شکتیوں کا علم ہو گیا ہے۔ لیکن بابو جی یہاں نہیں وہاں سامنے برگد کا جو درخت دکھائی دے رہا ہے ناں، وہاں چلتے ہیں، یہاں ہمیں کوئی دیکھ لے گا۔“ پلو شا نے کہا۔

”چلو ٹھیک ہے جیسے تمہاری مرضی۔“ دلشاد نے آہستہ سے کہا اور پھر وہ دونوں برگد کے درخت کی طرف چلے گئے۔ پلو شا آگے چل رہی تھی جبکہ دلشاد پیچھے پیچھے تھا کہ اچانک دلشاد نے پلو شا کی گردن میں کوئی سیاہ رنگ کی ڈوری دیکھ لی۔ اور پھر دلشاد دھیرے سے مسکرا دیا۔ ایسے لگتا تھا جیسے اسے کسی بات کا یقین آ گیا ہو۔ برگد کے درخت

ستار بجار ہاتھ تھا کہ اچانک کمرے میں بے شمار دھواں نکلنے لگا۔ پھر اچانک ایک پتھر کی بنی ہوئی سرخ گری کمرے میں ظاہر ہوئی اور پھر چند لمحوں بعد جب دھواں ختم ہوا تو اس گری پر چنڈال بیٹھا ہوا دکھائی دیا۔ چنڈال کی آنکھیں غصے سے سرخ تھیں اور پھر وہ چنگھاڑ کر بولا۔ ”راخون میں نے تجھ سے کہا تھا ماں۔ اگر تو دلشاد کو مارنے میں ناکام ہو گیا تو میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ بس آج وہ دن آ گیا ہے۔ آج تجھے اپنے باپ کی سزا ضرور ملے گی۔“

”آقا۔۔۔ چنڈال آقا۔“ راخون نے چنڈال کے پاؤں پڑتے ہوئے کہا۔

”میں نے دلشاد کو مارنے کے لئے ابلا شاکو بھیجا ہے آقا۔۔۔“

”خاموش نمک حرام تیری اس ابلا شاکو دلشاد نے ختم کر دیا ہے۔ اور اب تجھے میں ماروں گا۔“

کیا۔۔۔ ابلا شاکو ختم ہو گئی ہے۔۔۔ تو پھر آقا مجھے ایک موقع اور دو میں خود دلشاد کو مارنے چاہوں گا۔ میں دیکھتا ہوں کہ یہ چیز کیا ہے۔ آقا مجھے ایک موقع اور دو۔۔۔ تمہیں تمہارے شیطان آقا کا واسطہ۔۔۔ ”راخون بدستور چنڈال کے قدموں میں پڑا رہا۔“ راخون میں تجھے ہرگز منافق نہ کرتا لیکن چونکہ دلشاد خود میرے لئے راستے کا پتھر بنا ہوا ہے۔ اور وہ میری جان لینا چاہتا ہے اس لئے اس کا ختم ہونا بہت ضروری ہے اور اسی کام کے لئے میں تجھے آخری موقع دیتا ہوں۔ لیکن اب یہ کام تو میرے پان کے مطابق کرے گا۔“ چنڈال نے قدرے نرم لہجے میں کہا۔

”چنڈال آقا میں آپ کا غلام ہوں۔۔۔ آپ جیسے کہیں گے، میں ویسے کروں گا۔ لیکن دلشاد کو میں موت کے گھاٹ ضرور اتاروں گا۔“ راخون نے کہا۔

”نمک خاموش ہو جا، نمک حرام اور میری بات غور سے سن۔“ چنڈال نے گرجدار آواز میں کہا۔

”تو ایسے دلشاد کو نہیں مار سکتا اس کے پاس نیکی کی بے شمار طاقتیں ہیں اور دوسرا اسے اس کام کے لئے بابا کمال الدین شاہ نے بھیجا ہے ہم اسے آسانی سے ختم نہیں کر سکتے۔ تو یوں کر کر اسے کسی طرح معبد کے کالے عار

نے ہلکی آواز سے کہا۔

”اب مزید نمک مت کر۔ میں نے تیرا ذہن پڑھ لیا تھا تو مجھے ختم کرنا چاہتی تھی۔ تیرا پلان تھا کہ جب تو مجھے اس پتھر پر بیٹھائے گی تو اوپر درخت میں بندھا ہوا پتھر جو کہ کئی ٹن وزنی ہے مجھ پر گرا دے گی اور مجھے مار دے گی اور مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ تو ایک انسان نہیں بنے ہوئے ہے۔۔۔ شیطان بنے ہوئے ابلا شاکو۔ بول کس کے کہنے پر تو مجھے مارنے آئی تھی ورنہ۔۔۔“

”جب تجھے سب پتہ چل چکا ہے تو تجھے میری طاقت کا اندازہ بھی ہو گا۔ میں تجھے جلا کر بھسم کر دوں گی۔“

پلو شاکو نے غصیلے لہجے میں کہا۔

”تجھے معلوم نہیں چل میں بتا دیتا ہوں۔ اس وقت تیری کوئی شیطانی طاقت تیرے ساتھ نہیں ہے۔ میں تجھے اس درخت کے ساتھ باندھ چکا ہوں اور میں نے تیری ماں ابھی اتار لی ہے۔ اب تو بالکل ایک معمولی انسان کی طرح ہے۔ چل اب جلدی سے بتا دے تو کس کے کہنے پر مجھے مارنے آئی تھی۔ ورنہ تجھے آج کوئی نہیں بچا سکتا۔“

”میں۔۔۔ میں بتاتی ہوں۔ تمہیں مارنے کے لئے مجھے راخون نے بھیجا تھا۔“ پلو شاکو نے بکلاتے ہوئے کہا۔

”کیوں۔۔۔؟“ دلشاد نے پوچھا۔

اور پھر پلو شاکو نے چنڈال اور راخون کے بارے میں تمام تفصیل بتا دی۔ ”منو میں نے تمہیں تمام سچ بتا دیا ہے۔ اب تم مجھے چھوڑ دو۔“ پلو شاکو نے گڑگڑاتے ہوئے کہا۔

”نہیں تم جیسی طاقتوں کو چھوڑ دینا بہت بڑی بے وقوفی ہے۔ میں تمہیں نہیں چھوڑ سکتا۔“ دلشاد نے کہا۔ اور پھر ایک زوردار اور بھیاں تک چیخ سنائی دی۔ دلشاد نے پلو شاکو کا سر اس کے دھڑ سے ٹکوار کے ذریعے جدا کر دیا تھا۔ اور پھر دلشاد ایک طرف چلنے لگا وہ کچھ سوچ رہا تھا۔

☆.....☆.....☆

راخون اپنے کمرے میں بیٹھا ایک پرانے طرز کا

میں لے جا اور وہاں اس سے مقابلہ کر، تو ضرور اسے ختم کر دے گا۔ کیونکہ وہاں شیطانی معبد کا سایہ ہے اس لئے وہاں نیکی کی طاقتیں کام نہیں کرتیں اور جب اس کی نیکی طاقتیں اس کا ساتھ چھوڑ دیں گی تو وہ ایک حقیر انسان ہوگا۔ جسے تو جس طرح چاہے گا مار دے گا۔“

”ٹھیک ہے آقا، جس طرح آپ کا حکم۔۔۔“

راخون نے کہا۔

”راخون یہ تیرے لئے آخری موقع ہے۔ اگر تو دانشاد کو مارنے میں ناکام ہوا تو میں تجھے زندہ کالے پہاڑوں کی کالی دلدل میں پھینک دوں گا۔ جہاں سے تیری آتما بھی واپس نہیں آسکے گی۔“ چنڈال نے دھمکی دیتے ہوئے کہا۔

”جی آقا۔۔۔“ راخون نے کانپتے ہوئے کہا۔ اور اس کے ساتھ ہی چنڈال کرسی سمیت چند لمحوں بعد غائب ہو گیا اور فرش کی سطح برابر ہو گئی۔

.....

دانشاد لمبی گھاس کے اوپر بیٹھا گہری سوچ میں غرق تھا۔ وہ مسلسل جدوجہد کے بعد چنڈال قبیلے کی سرحد کے قریب تھا۔ لیکن وہ یہ سوچ رہا تھا کہ چنڈال کو کس طرح ختم کرے۔ چنڈال ایک بہت بڑی شیطانی قوت تھی۔ اس کے پاس ہزاروں ایسی شکستیاں تھیں۔ جن سے وہ ایک مل میں دانشاد کو ختم کر سکتا تھا۔ دانشاد کو اس بات کی بھی بڑی فکر کھائے جا رہی تھی کہ ”اسے اس کام کے لئے بابا کمال الدین شاہ نے بھیجا ہے اور وہ اپنے مرشد کے سامنے شرمندہ اور شکست خوردہ ہو کر واپس نہیں جاسکتا۔“ دانشاد انہی سوچوں میں گم تھا کہ اچانک جیسے وہ اچھل پڑا۔ اس نے فوراً اپنے دائیں ہاتھ کی شہادت کی والی انگلی میں موجود ایک پتیل کی چمکتی ہوئی انگلی کو دیکھا۔ اور پھر دھیرے سے مسکرایا۔ دوسرے لمحے دو لمبی لمبی گھاس پر آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا۔ اس نے منہ میں دھیرے دھیرے کچھ پڑھا اور پھر زور سے کہنے لگا۔ ”میرے پاس آؤ میرے بلیک پال دوست۔۔۔۔۔ ہاں میں۔۔۔۔۔ میں دانشاد کہیں پکار رہا ہوں۔۔۔۔۔ دانشاد جسے تیرا سے راگونا کہتے تھے۔ آج مجھے

تمہاری ضرورت ہے۔ تمہیں یاد ہوگا جب افریقہ کے گھنے جنگلات میں، میں نے ماسٹر انگو سے تمہاری جان بچائی تھی۔ تب تم نے کہا تھا کہ مجھے جب تمہاری ضرورت ہوگی اس انگوٹھی کو چومنے سے تم میرے پاس دوڑے چلے آؤ گے۔“ یہ کہہ کر دانشاد نے ایک بار آنکھیں بند کر کے انگوٹھی کو چوم لیا۔ انگوٹھی کو چومنا تھا کہ اچانک ایک ہماری رعب دار آواز آئی۔ ”میرے دوست راگونا تمہارے بلانے پر افریقہ کے کالے جنگل کا وچ ڈاکٹر ڈاکٹر بلیک پال تمہارے سامنے حاضر ہے۔“

”لیکن تم مجھے نظر کیوں نہیں آ رہے۔ تم کہاں ہو؟“ دانشاد نے پر جوش لہجے میں کہا۔

”میرے پیارے دوست راگونا، ابھی تمہارے سامنے آ جاتا ہوں۔“ وچ ڈاکٹر پال کی آواز آئی۔ اور اس کے ساتھ ہی دانشاد کے سامنے بے شمار دھویں کے ساتھ اس میں سے ایک کالے رنگ کا آدمی نکلا۔ اس کا تمام رنگ بالکل افریقہ کے حبشیوں کی طرح سیاہ تھا۔ وہ گول گول گھومتا ہوا دانشاد کے قریب پہنچ گیا۔ ”تم کو سلام ہو میرے مسلمان دوست۔“ وچ ڈاکٹر بلیک پال نے دانشاد سے کہا۔ ”وہیکم السلام۔۔۔۔۔ عظیم وچ ڈاکٹر کہو کیسے ہو۔۔۔۔۔“

”میں بالکل ٹھیک ہوں پیارے راگونا۔۔۔۔۔ لیکن تم بتاؤ تم کو میری کسی ضرورت پڑ گئی کیا ہوا ہے تمہارے ساتھ۔۔۔۔۔“ وچ ڈاکٹر نے کہا۔

”عظیم وچ ڈاکٹر مجھے ایک بہت بڑی شیطانی طاقت چنڈال کو ختم کرنا ہے اور اس کا طریقہ تم سے پوچھنا ہے کہ چنڈال کو کیسے ختم کیا جائے، وہ بہت بڑی شیطانی قوت ہے اور مجھے اچھی طرح اس کی شکلیوں کا بھی علم نہیں ہے اس لئے میں آسانی سے اس کے قریب بھی نہیں جاسکتا۔۔۔۔۔“ دانشاد نے کہا۔

”کیا۔۔۔۔۔ چنڈال کو۔۔۔۔۔ تم چنڈال کو مارو گے۔۔۔۔۔ ارے وہ تو شیطانی دنیا۔۔۔۔۔ کا سب سے بڑا بے تاج بادشاہ مانا جاتا ہے۔۔۔۔۔ اس کی اتنی شکلیاں ہیں کہ ان کی کوئی حد نہیں۔۔۔۔۔ تم اسے نہیں مار سکتے۔۔۔۔۔ تم جانتے

ہو مجھ سے پہلے کے عظیم وچ ڈاکٹر گر مال کو بھی اسی چنڈال
نے مار دیا تھا۔ جس کے بعد میں وچ ڈاکٹر بن گیا۔
اس کے پاس بے حساب کالی ٹمکتیاں ہیں۔ وہ اتنا طاقتور
شیطان جن سے کہ افریقہ کے سیاہ فام جھنشی قبیلے کے سردار
دیوانکا جو کہ بہت سی کالی شمتیوں کا مالک ہے۔ جس سے
کالے سمندر کا راجہ گوپال بھی پناہ مانگتا ہے۔ وہ بھی
چنڈال کی غلامی کرتا ہے۔ اور اسی کے بتائے ہوئے
اصولوں پر عمل کرتا ہے۔ اب بھلا تم چنڈال کو کیسے مار سکتے
ہو۔“ وچ ڈاکٹر پال نے کہا۔

”مجھے اپنے خدا پر یقین ہے عظیم و جواکثر۔ تم مجھے صرف اسے مارنے کا طریقہ بتاؤ۔ میرا مقصد نیک ہے اور انشاء اللہ مجھے کامیابی حاصل ہوگی۔“ دلشاد نے کہا۔

”لیکن تم اسے مارنا کیوں چاہتے ہو؟“ وچ واکٹر پال نے دلشاد کی بات کا جواب دینے بغیر کہا۔ اور پھر دلشاد نے اسے سردار جن نیا مہاپتہ مرشد اور ابلا شاکے مارنے تک کی تمام تفصیل بتادی۔

”سنو پیارے دوست راگونا..... جہاں تک
چنڈال کو ختم کرنے کا سوال ہے تو وہ مجھے نہیں معلوم۔ لیکن
مجھے اس کی شکلیوں کا علم ہے۔ جن میں سے تمہیں ایک
واقعے کے بارے میں بتا دوں تو تم باقی اندازہ خود لگا لو گے۔
تم نے جارج نیلسن اور کلاڈیا کے نام تو سنے ہوں گے۔“

”ہاں..... یہ وہی ہیں ناں جو پوری دنیا میں کولی
دنیا کے سب سے طاقتور انسان جانے گئے تھے۔“

ہاں یہ وہی ہیں اور انہوں نے ہی جادوگر ہری ناتھ کو انڈیا میں شکست دی تھی۔ چارج اور کلاؤیا مغربی دنیا کے دو انسان تھے۔ انہوں نے روس کے سفید برفیلے پہاڑوں میں جادوگری اور دیوی ویتاؤں کے مامول میں ہی اپنی زندگی گزاری تھی اور پھر وہ شادی کر کے دوسری بڑی طاقتوں کا مقابلہ کرنے روس سے نکل آئے تھے۔ انہوں نے کئی علاقوں کا دورہ کیا اور بہت سے علاقوں کو اپنے جادو اور کالی شکلیوں سے فتح کر لیا۔ مصر کے پہاڑوں میں فرعون کی بے قرار روح کو بھی انہوں نے اپنے قبضے میں کر لیا۔ وہ پوری دنیا میں مشہور ہو گئے تھے۔ دنیا

کے عام لوگ تو ان کے نام سے بھی تھر تھر کانپتے تھے۔ وہ ان دنوں انڈیا کے ایک گاؤں ناگ پور میں تھے کہ اچانک غائب ہو گئے۔ تمہیں پتہ ہے ان دنوں کو کس نے غائب کیا تھا۔۔۔۔۔ اس چنڈاں نے۔۔۔۔۔ اور وہ آج تک چنڈاں کی قید میں ہیں۔ اتنی زیادہ ہلکتیاں رکھنے والے اور کالی دنیا کے عظیم جادوگر جارج ٹیلسن اور جادوگر ٹی کلاڈیا کو چنڈاں نے آسانی کے ساتھ غائب کر دیا اور اپنی آگ کی بنی ہوئی سرخ کوٹھی میں ہمیشہ کے لئے قید کر دیا۔ اب تم خود اندازہ لگا سکتے ہو کہ چنڈاں کتنا طاقتور ہے اور کتنی شہتیوں کا مالک ہے۔ میری مائیں تو اسے ختم کرنے کا خیال دیاں سے نکال دوں۔‘‘ وہی ڈاکٹر پاں نے تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔

”فقیر بیچ ڈاکٹر میں چند ادا کی شیطانی حکمتوں سے آگاہ ہو گیا ہوں۔ لیکن تم نے مجھے اسے مارنے کے طریقے کے بارے میں نہیں بتایا۔ بقول تمہارے کہ تم کچھ نہیں جانتے۔ لیکن تم مجھے اسے مارنے کا کلیو تو بتا سکتے ہو۔۔۔۔۔ میں کوئی ایسا راستہ تو ہوگا جس سے مجھے اپنی منزل مل سکے۔۔۔۔۔ کوئی اندازہ۔۔۔۔۔ کوئی ایسی ترکیب۔۔۔۔۔ کہیں کوئی اور بڑی طاقت جو چند ادا کی موت کا طریقہ جانتی ہو۔۔۔۔۔“ دانشا نے کہا۔

”ہاں..... پیارے دوست۔ راگونا..... مجھے واقعی ایک بڑی طاقت یاد آگئی ہے۔ وہ بہت بڑی طاقت ہے۔ وہ چند اہل کو ختم نہیں کر سکتی۔ لیکن اس کی موت کا طریقہ ضرور جانتی ہے۔“

”نک..... کون ہے وہ؟“ ویشاد نے خوش سے اٹھتے ہوئے کہا۔

”سردار بالکے کی آتما..... ہاں سردار بالکے کی آتما..... صدیوں سے افریقہ کے کالے جنگلوں میں سردار بالکے کی روح بے چین سے پھر رہی ہے..... چنڈال نے اسے اپنے قبضے میں کرنے کی کوشش کی تھی لیکن سردار بالکے کی آتما نے چنڈال کو زخمی کر دیا تھا۔ پھر چنڈال نے ہمیشہ کے لئے سردار بالکے کی روح کا پیچھا چھوڑ دیا۔ کالے شیطان نے بھی اسے منع کر دیا تھا۔ میں ابھی سردار

”واو بھئی کمال ہے پھیل کے درخت کا اتنا بڑا کرشمہ ہے اور ہمیں معلوم نہیں۔“ دلشاد نے کہا۔
”ہاں بعض اوقات کچھ چیزوں کا بہت زیادہ فائدہ ہوتا ہے لیکن ہم اسے نہیں جانتے۔۔۔۔۔“ وچ ڈاکٹر نے مسکرا کر کہا۔

”اچھا یہ بتاؤ ڈاکٹر تم نے اتنی جلدی سردار بالکے کی آتما سے رابطہ کیسے کر لیا۔۔۔۔۔“ دلشاد نے پوچھا۔
”تم نہیں سمجھو گے، آتماؤں کے لئے ناسلہ طے کرنا کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔۔۔۔۔ اس لئے میرے بلائے پر سردار بالکے کی آتما وڑی چلی آئی۔۔۔۔۔“ ڈاکٹر نے کہا۔
”ٹھیک ہے۔“ عظیم وچ ڈاکٹر۔ تمہارا بہت شکریہ۔۔۔۔۔ اگر تم نہ ہوتے تو میں بڑی مشکل میں ہوتا۔ تم نے میری مشکل آسان کر دی۔ میں تمہیں اپنی زندگی میں فراموش نہیں کروں گا۔“ دلشاد نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”تم میرے دوست ہو۔۔۔۔۔ راگونا۔ اور دوست کے لئے وچ ڈاکٹر جان بھی دے سکتا ہے۔۔۔۔۔ لیکن چندال کو دھیان سے ختم کرنا وہ بہت مکار جن ہے۔ اچھا اب میں چتا ہوں۔ تمہارا خدا حافظ۔۔۔۔۔ اور میرا گاؤ۔۔۔۔۔“ وچ ڈاکٹر نے کہا اور اس کے ساتھ ہی وچ ڈاکٹر ہوا میں تحلیل ہو گیا۔ دلشاد اسے تسین آ میر نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

☆.....☆.....☆

راخون کی کار ایک ویران سڑک پر خراٹے بھرتی ہوئی جا رہی تھی۔ ڈرائیونگ سیٹ پر راخون جبکہ ساتھ والی سیٹ پر ایک دوسرا آدمی بیٹھا ہوا تھا۔ جب کار جنگل کے بیچ ایک ویران جگہ پر آئی تو رک گئی۔ راخون گاڑی سے اتر اور اس نے اشارے سے دوسرے آدمی کو کہا۔ ”تم گاڑی لے کر اب واپس جاؤ۔“

دوسرے آدمی کے واپس جاتے ہی راخون جنگل میں ایک طرف جانے لگا۔ وہ مسلسل گھنے جنگل کی طرف بڑھ رہا تھا۔ آخر کار وہ ایک جگہ رک گیا اور گھور گھور کر چاروں طرف دیکھنے لگا۔ یہاں چاروں طرف ساہو دار گھنے درخت تھے۔ اور درمیان میں جنگلی گھاس تھی۔ دوسرے لمحے وہ زمین پر بیٹھ گیا۔ اس نے آنکھیں بند

بالکے کی آتما کو بلاتا ہوں۔۔۔۔۔ تم۔۔۔۔۔ تم یوں کر دو کہ اپنی آنکھیں اور کان کسی کپڑے سے بند کر لو۔۔۔۔۔ سردار بالکے کی آتما کی بہت بھیا تک آواز ہے اور اس کی شکل اس کی آواز سے بھی زیادہ بھیا تک ہے۔“ وچ ڈاکٹر نے کہا۔ پھر دلشاد نے اپنے موٹے رومال کے ذریعے اپنے کان بند کر لئے اور آنکھیں بھی بند کر لیں۔ کچھ لمحے خاموش رہی۔ پھر تقریباً بیس منٹ تک وچ ڈاکٹر اور کسی دوسری ناویدہ سستی کی گھس پھس کی آوازیں سنائی دیں۔ ”کھول دو کان اور آنکھیں۔“ وچ ڈاکٹر پال نے کہا۔

”میں نے سردار بالکے کی بے چین آتما سے چندال کو مارنے کا طریقہ پوچھ لیا ہے۔“ وچ ڈاکٹر نے کہا۔
”کیا طریقہ ہے مجھے جلدی بتاؤ۔۔۔۔۔“

دلشاد نے بے چینی سے کہا۔

”یہ طریقہ بہت مشکل ہے۔ پیارے دوست راگونا۔ اس میں جان بھی جاسکتی ہے۔ لیکن میں پھر بھی تمہیں بتا دیتا ہوں۔۔۔۔۔ تم۔۔۔۔۔ اگر چندال کے بالوں کی لمبی چوٹی سے تین بال جو کے لمبائی میں برابر ہوں کاٹے میں کامیاب ہو گئے تو تم چندال کو آسانی کے ساتھ ختم کر سکتے ہو۔۔۔۔۔“

”لیکن کیسے۔۔۔۔۔؟“ دلشاد نے پوچھا۔

”کسی بھی طرح اگر تم نے چندال کی چوٹی کے تین بال حاصل کر لئے تو پھر ان کو خورس کے پتوں میں لپیٹ کر آگ لگا دو گے تو چندال اپنی کالی زنا سمیت جل کر راکھ ہو جائے گا۔ اس کا کالا شیطان بھی اسے نہ بچا پائے گا۔“ وچ ڈاکٹر نے جواب دیا۔

”لیکن یہ خورس کا درخت کون سا ہے۔ اس کے پتے کہاں ملیں گے۔۔۔۔۔؟“ دلشاد نے کہا۔

”کمال ہے تم کو خورس کے درخت کا نہیں پتہ۔۔۔۔۔ اوہو۔۔۔۔۔ مجھے معلوم نہیں تھا۔۔۔۔۔ مجھے معاف کر دینا دوست۔۔۔۔۔ دراصل ہم جسے خورس کا درخت کہتے ہیں تم لوگ اسے اپنی زبان میں پھیل کا درخت کہتے ہو اس لئے میرے خورس کہنے پر تم حیران ہو گئے تھے۔“ وچ ڈاکٹر نے معذرت کرتے ہوئے کہا۔

گرد ایک پھونک ماری۔ پھونک مارنے سے ارد گرد کی آگ ختم ہوگئی اور راخون نے اپنے ہاتھ تیزی سے آسمان کی طرف بلند کر لئے اور کچھ بڑبڑانے لگا۔ دوسرے ہی لمحے وہ غائب تھا۔

☆.....☆.....☆

دلشاد جیسے ہی چنڈال قبیلے کی سرحد میں داخل ہوا۔ اپنا کھدو پہرے دار جن کواریں لے کر سامنے آئے اور انہوں نے دلشاد کو ایک طرف پھرنے کا اشارہ کیا وہ دلشاد کو لے کر ایک ہال نما بڑے کمرے میں آئے۔ کمرے میں ہر طرف اندھیرا تھا۔ استنہ میں ایک جن آگے بڑھا اور اس نے لوہے کی بھاری زنجیر سے دلشاد کے ہاتھ باندھ کر اسے ایک موٹے ستون کے ساتھ باندھ دیا۔ ”ہا ہا۔۔۔ ہا ہا۔۔۔ ہمارے آقا چنڈال کو مارنے آیا تھا۔۔۔ خود ہی شکار ہو گیا۔۔۔ اب بتا کیسے مارے گا چنڈال آقا کو۔۔۔“ ایک جن نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

”چنڈال تو تو میں ماروں گا۔ مگر یہ سوچو اس وقت تمہارا کیا ہوگا۔ تم میری فٹیں کرو گے کہ مجھے چھوڑ دو۔ اس لئے میری بات مانو مجھے کھول دو اور چنڈال کا ٹھکانہ بھی بتاؤ۔“

”ہا۔۔۔ ہا ہا، یہ تو بڑا بہادر ہے بھئی۔۔۔ ہماری قید میں ہو کر بھی چنڈال آقا کی موت کی بات کرتا ہے۔ واہ بھئی واہ۔ کیا بات ہے۔“ پہرے دار جن نے دوبارہ قہقہہ لگایا۔ ”ارے دیکھتے دواست خواب، لیکن اس کا یہ خواب، خواب ہی رہے گا، کبھی پورا نہیں ہوگا، میں چنڈال آقا کو خیر کرنے جا رہا ہوں وہ اسے موت کے گھاٹ اتار دے گا۔“ دوسرے جن نے ہنسنے لگا۔

لیکن تھوڑی دیر میں ہی وہ واپس آ گیا۔ اور دوسرے جن سے بولا۔ ”میں تو اس کی موت کا انتظام کرنے جا رہا تھا۔ لیکن چنڈال آقا کو شاید خبر ہوگئی ہے اس لئے انہوں نے اس کے لئے راخون کو بھیج دیا ہے وہ ہی اس کا کام تمام کریں گے۔“ دلشاد خاموشی سے سب کچھ سن رہا تھا۔

استنہ میں راخون اندر داخل ہوا۔ ”کھول دواست

کر لیں اور منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑانے لگا۔ پھر اس نے آنکھیں کھولیں اور اپنے ارد گرد ایک پھونک ماری۔ پھونک کا مارنا تھا کہ راخون کے ارد گرد انڑے کی شکل میں آگ لگ گئی۔ راخون آگ کے دائرے میں بیٹھا مزید کچھ پڑھ رہا تھا کہ اچانک ایک گرجتی ہوئی آواز آئی۔ ”کیوں بلایا مجھے راخون۔۔۔ کیوں بلایا۔۔۔ میں نے تجھے منع کیا تھا کہ مجھے دوبارہ مت بلانا۔۔۔ روجن کو دوبارہ مت بلانا۔“ پھر تو نے اپنا وچن کیوں توڑا۔ کیوں بلایا مجھے۔“ روجن نے کہا۔

”مجھے تمہاری بہت اشد ضرورت ہے روجن۔ اس لئے میں نے اپنا وچن توڑا۔ چنڈال آقا کی زندگی کو خطرہ ہے۔ ہماری دنیا کا ایک انسان اس کے پیچھے پڑا ہے۔ چنڈال آقا نے مجھے اس کو مارنے کو کہا ہے۔ اگر میں اسے نہ مار سکا تو میری موت چنڈال آقا کے ہاتھوں لازم ہے۔“ راخون نے روجن جن کی نظر نہ آنے والی صورت سے کہا۔ ”کیا۔۔۔ چنڈال کی زندگی کو خطرہ ہے؟ یقیناً نہیں آقا کہ ایک معمولی انسان سے چنڈال کو کیا خطرہ ہو سکتا ہے۔“ روجن کی آواز آئی۔

”تم یہ بات نہیں سمجھو گے۔ تم آگ کی پرستش میں مصروف ہوتا۔ تم بس مجھے یہ بتاؤ کہ دلشاد جو کہ چنڈال کی تلاش میں نکلا ہے، کہاں ہے تاکہ میں وہاں پہنچ کر اسے ختم کر سکوں۔ اسی کام کے لئے میں نے تجھے یہاں بلایا ہے۔“ راخون نے کہا۔

”فہمیدو مجھے معلوم کرنا ہوگا۔۔۔“ روجن کی آواز آئی۔ ”وہ چنڈال قبیلے کی سرحد کے قریب پہنچ گیا ہے۔ تمہاری بھیجی ہوئی طاقت ابلاشا کو ختم کرنے کے بعد اس نے افریقہ کے شکتی مان اور نامور وچ ڈاکٹر ہلیک پال کو بلا کر اس نے چنڈال کو مارنے کا طریقہ بتا دیا ہے۔“ سردار ہالکے کی آتما نے اسے سب کچھ بتا دیا ہے۔“

”اوہ۔۔۔ یہ کیا ہو گیا۔۔۔ یہ تو اترتھ ہو گیا۔ اگر میں بروقت وہاں نہیں پہنچا تو وہ چنڈال کو ختم نہ کر دے۔۔۔ مجھے جانا ہوگا۔ تمہارا بہت شکریہ روجن، تم اب جاؤ۔“ راخون نے کہا۔ اور اس کے ساتھ ہی راخون نے اپنے ارد

اور تم سب جاؤ یہاں سے۔۔۔۔۔“ راخون نے کہا۔ انہوں نے دلشاد کو کھول دیا اور باہر چلے گئے۔ ”آؤ دوست آؤ میرے ساتھ، میں تمہارا دوست ہوں اور تمہیں یہاں سے بچانے آیا ہوں۔“ راخون نے کہا۔

”لیکن ابھی تو میں نے سنا ہے کہ تم چنڈال کے آدمی ہو اور مجھے مارنے آئے ہو۔“ دلشاد نے کہا۔ ”نہیں دوست۔ وہ میں نے جھوٹ بولا تھا تمہیں بچانے کے لئے تاکہ یہ جن تمہیں کھول کر میرے حوالے کر دیں۔ میں واقعی تمہیں بچانا چاہتا ہوں۔ مجھے سردار جن خیام نے بھیجا ہے تاکہ جہاں بھی تم مشکل میں پھنسو تو میں تمہاری مدد کروں۔“ راخون نے اپنی صفائی بیان کی اور دلشاد خاموش ہو گیا۔

اس کے ساتھ ہی وہ دونوں واپسی کے راستے پر چلے گئے۔ جلد ہی وہ چنڈال قبیلے کے باہر تھے۔ ”دلشاد بابو چنڈال کو تمہارے بارے میں سب کچھ معلوم ہو گیا ہے۔ اس لئے اب وہ تمہاری تلاش میں ضرور اپنے چیلوں کو روانہ کرے گا۔ اور تمہیں مارنے کی کوشش کرے گا۔ لیکن اگر ہم کالے معبد کے غار میں چھپ جائیں تو چنڈال تو کیا اس کا باپ بھی نہیں ڈھونڈ سکے گا اور بعد میں موقع آنے پر تم چنڈال کے قبیلے میں پھر گھس جاؤ گے۔“ راخون نے تفصیل بیان کرتے ہوئے کہا۔

”ٹھیک ہے جیسا آپ کہیں گے ویسا ہی ہوگا۔ آخر آپ کو ہماری حفاظت کے لئے سردار خیام نے بھیجا ہے۔“ دلشاد نے مسکراتے ہوئے کہا۔ لیکن دلشاد کی مسکراہٹ عجیب تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے اس نے راخون کو پہچان لیا ہو۔ اور پھر واقعی جب وہ دونوں کالے معبد کے غار کی طرف جانے لگے۔ راخون آگے چل رہا تھا جبکہ دلشاد پیچھے چل رہا تھا کہ اچانک دلشاد نے زوردار آواز میں کہا۔

”رک جاؤ راخون عرف یثونت۔۔۔۔۔“ ”کیا۔۔۔۔۔ تم میرا یہ نام کیسے جانتے ہو۔“ راخون نے گھبرا کر کہا۔

”ہرے بھی تم بھی کمال کرتے ہو۔ اٹھ یا میں تم اسی نام سے مشہور ہو۔ اور اب پوچھتے ہو کہ میں یہ نام کیسے

جانتا ہوں۔“ دلشاد نے کہا۔ ”اچھا۔۔۔۔۔ اچھا میں سمجھا کہ۔۔۔۔۔ چلو چھوڑو جلدی کرو چلتے ہیں۔“ راخون نے سنبھلتے ہوئے کہا۔

”لیکن جانے سے پہلے تم مجھے یہ بتاؤ کہ تمہارے دو نام کیوں۔۔۔۔۔ یہ کیوں؟“ دلشاد نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ”بھئی ایک آدمی کے دو نام نہیں ہو سکتے کیا۔۔۔۔۔؟ دنیا میں کتنے آدمی ہیں جن کے چار، چار نام ہوتے ہیں اور میرے دو ہیں تو کیا ہوا۔“ راخون نے جلدی سے کہا۔ ”لیکن کتنے عجیب نام ہیں ناں۔۔۔۔۔“ دلشاد نے معصومیت سے کہا۔

”لگتا ہے تمہیں حقیقت بتانی ہی پڑے گی۔

دراصل چنڈال کا ایک آدمی ہے۔ راخون وہ ہندوستان میں یثونت کے نام سے مشہور ہے اور چنڈال نے اپنی جاتی دنیا میں اسے راخون کا نام دیا ہے۔ میں نے اسی راخون کا بھیس بدلا ہوا ہے۔ اور شکل و صورت بھی ویسی ہی بنائی ہے۔ اس لئے تم مجھے پہچان نہیں رہے اور مجھے راخون سمجھ رہے ہو۔ حالانکہ میں سردار خیام کا آدمی ہوں اور میرا نام سامون جن ہے۔“ راخون نے تیزی سے کہا۔

”جھوٹ بولتے ہو تم۔۔۔۔۔ تمہارا نام سامون نہیں راخون ہے۔ ہندوستان میں تم یثونت کے نام سے مشہور ہو۔ اور چنڈال کے پاس راخون کے نام سے، حقیقت یہ ہے کہ تم ہی چنڈال کے خاص آدمی ہو۔ چنڈال نے تمہیں کالی شکتیاں عطا کر رکھی ہیں۔ تم نے کئی سال چنڈال کی پوجا پاٹ میں گزارے ہیں۔ ہندوستان میں تمہاری ایک لال رنگ کی کوٹھی ہے۔ جہاں تم دنیا کی نظروں سے محفوظ اور کالے دھندوں میں مصروف ہو۔ مجھے مارنے کا حکم بھی تمہیں چنڈال نے دیا ہے۔ کیونکہ تم نے چنڈال کے حکم کے خلاف ایک کنیا کو ہاتھ لگا دیا تھا اور چنڈال نے سزا کے طور پر تمہیں مجھے ختم کرنے کا حکم دے دیا۔ بعد میں تم نے اس کنیا کو بھی موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اور خود میرے پیچھے اپنی ماورائی طاقت ابلاشا کو لگا دیا لیکن جب میں نے ابلاشا کو موت کے گھاٹ اتار دیا تو چنڈال تمہارے پاس

”دلشاد میں کمزور ہوں۔ لیکن اتنا بھی نہیں کہ تم میری جان کی حفاظت کرو اور تم جو چنڈال کو مارنے کا خواب دیکھ رہے ہو اسے دیکھنا چھوڑ دو۔ چنڈال واقعی تمہیں مار دے گا وہ چنڈال ہے، کوئی راخون نہیں جو تم اس کے منتر بے اثر کر دے۔“ راخون نے کہا۔

”تم چنڈال کی بات چھوڑو راخون تم اپنی بات کرو۔ میں جانتا ہوں کہ تم خود بھی چنڈال کے تم سے تنگ ہو۔ لیکن کچھ نہیں سکتے۔ چنڈال ہی وہ بھیا نک شیطان جن سے جس نے مصر کے پہاڑوں میں تم سے مقابلہ کر کے تمہیں مار دیا تھا۔ پھر اس نے تمہاری روح کو ایک نیا جسم اور دو نئے نام دیئے یعنی راخون اور یثوت۔“

”ت..... تو..... تم یہ سب کچھ آخر کیسے جانتے ہو؟“ راخون نے بے چین ہوتے ہوئے کہا۔

”تم یہ سب چھوڑو اور آگے سنو۔ اس وقت تمہارا نام قیسر تھا۔ تم نے مصر کے عجائب گھر میں رہ کر سونالی جو کہ ایک جادوگرنی تھی اس سے روحانی ظلم سیکھا تھا۔ تمہارے پاس اتنی طاقتیں تھیں کہ تم ایک جادوگر کہلا سکتے تھے۔ پھر چنڈال کا فکر او تم سے ہوا۔ اور اس نے تمہیں دو نئے نام دیئے کے ساتھ ساتھ کالی ماں کی طاقتیں دیں اور تمہیں ہمیشہ کے لئے اپنا غلام بنالیا، اس نے تم سے ہندوستان کی سرزمین پر کئی ناجائز کام کروائے۔ اس نے تمہیں صرف ایک ہی بات سے منع کیا تھا کہ تم کبھی کسی کنیا کو ہاتھ نہیں لگاؤ گے۔ کیونکہ اس کے بعد وہ تمہیں ایک خاص مدت پوری ہونے پر منکا دیوی جیسی خوب صورت عورت کو انعام میں عطا کر دیتا۔ لیکن جب تم نے اس کے ساتھ کیا ہوا وعدہ توڑا تو اس نے سزا کے طور پر تمہیں میرے پیچھے لگا دیا۔ کیونکہ اسے مجھ سے خطرہ تھا۔“ دلشاد نے تمام تفصیل بتائی۔

”دلشاد..... مجھے یقین ہے تم واقعی چنڈال کو ختم کر لو گے۔ لیکن تم بتاؤ میں تمہاری کیا مدد کر سکتا ہوں؟“ راخون نے تنہا تنہا سے انداز میں کہا۔

”راخون جیسا کہ تم جانتے ہو کہ میں نے دج ڈاکٹر بلیک پال سے چنڈال کو مارنے کا طریقہ پوچھ لیا ہے۔ لیکن

آیا اور اس نے تمہیں ایک پلان بتایا۔ اس نے تمہیں بتایا کہ تم مجھے کسی طرح معبد کے کالے غار میں لے جاؤ اور وہاں مجھ سے مقابلہ کرو۔ کیونکہ میرے پاس نیکی کی طاقتیں ہیں اور نیکی کی طاقتیں معبد والے کالے غار میں نہیں آتیں۔ کیونکہ وہاں شیطانی طاقتوں کا اثر ہے اور نیکی ہمیشہ شیطانی پلید جگہ سے دور رہتی ہے۔ ہاں کبھی ایک مقصد سامنے ہو تو مقابلہ ضرور کرتی ہے۔“ دلشاد نے تفصیل بیان کرتے ہوئے کہا۔

”یہ..... یہ..... سب تمہیں کیسے پتہ چلا..... تم تو مجھے کوئی نبوی لگتے ہو..... لیکن میں پھر بھی تمہیں ضرور ماروں گا کیونکہ تمہاری موت ہی میری زندگی ہے۔“ راخون نے کہا۔ اور اس کے ساتھ ہی راخون کوئی منتر پڑھنے لگا۔ اس نے جیسے ہی دلشاد کی طرف پھونک ماری تو حیران ہوئے بغیر بندہ سا۔ منتر کا دلشاد پر کوئی اثر نہ ہوا۔ وہ اپنی جگہ پر کھڑا مسکرا رہا تھا۔ ”یہ..... یہ کیا! تم پر میرے منتر کا اثر کیوں نہیں ہو رہا۔ حالانکہ یہ کالی ماں کا منتر تھا۔ اس کے مطابق تمہیں جل کر راکھ ہو جانا چاہئے تھا۔“ راخون نے گھبرا کر کہا۔

”راخون تمہارے کسی منتر کا مجھ پر کوئی اثر نہیں ہوگا۔ کیونکہ میں دیکھ رہا ہوں کہ اس وقت میرے مرشد بابا کمال الدین شاہ اور امیر شریف کے دو کپوتر میرے اوپر فضاؤں میں گھوم رہے ہیں اور تمہارے منٹروں کی طاقت کو بے اثر کر رہے ہیں۔ تم چاہے دنیا کے کوئی بھی کالے منتر پڑھ لو۔ تم میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔“ دلشاد نے کہا۔

”لیکن..... مجھے تمہیں مارنا ہے، میں تمہیں مار کر رہوں گا۔“ راخون نے کہا۔ اور اس کے ساتھ ہی راخون ایک طرف بھاگنے لگا۔

”رک جاؤ راخون مجھے معلوم ہے کہ تمہاری جان خطرے میں ہے۔ کیونکہ اگر تم نے میری جان نہ لی تو چنڈال تمہاری جان لے لے گا اور تمہیں ہمیشہ کے لئے کالی دلدل میں گاڑ دے گا۔ جہاں سے تمہارا زندہ لوٹنا ناممکن ہے۔ اس لئے اگر تم میری مدد کرنے کا وعدہ کرتے ہو تو میں تمہاری جان کی حفاظت کا ذمہ لیتا ہوں۔“ دلشاد نے کہا۔

ڈاکٹر کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق اسے موت کے گھاٹ اتار سکتے ہیں۔“
 ”واقعی... یہ عمل تو درست رہے گا۔ اس طرح تو مجھے بڑی آسانی ہوگی۔ چنڈال کو مارنے میں۔ لیکن تم اس کی مزید شیطانی طاقتوں کے بارے میں تو کچھ بتاؤ۔“
 دانشاد نے پرجوش لہجے میں کہا۔

”دانشاد بابو، چنڈال ایک بہت بڑی شیطانی قوت ہے۔ اس نے پیدا ہونے کے بعد ایک تنکے کے برابر بھی نیکی کا کام نہیں کیا۔ اس لئے اس کی تمام محافظ طاقتیں شیطانی ہیں۔ اگر دیکھا جائے تو اس کے پاس اتنی زیادہ شکتیاں ہیں کہ جیسے صحرا میں ریت۔ لیکن اس کی سب سے بڑی شکتی جو کہ چنڈال کی محافظ ہے۔ شولما چرن ہے۔ شولما چرن چنڈال کا دایاں بازو ہے۔ شولما کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ کارستان کے بڑے شیشان گھاٹ کی بے چین آتما ہے۔ جس نے کبھی بھی کارستان کے باشندوں کو بین سے نہیں رہنے دیا۔ پھر چنڈال نے اسے قایم کر کے اپنا غلام بنالیا۔ پھر چنڈال نے شولما کو اتنی شکتیاں بخشیں کہ وہ چنڈال کا دایاں بازو بن گئی۔ اس کے علاوہ چنڈال کی قید میں لاکھوں کروڑوں ایسی آتماں موجود ہیں جن سے چنڈال اپنی مرضی کے کام لیتا ہے۔ اگرچہ چنڈال خود ایک ہندو جن ہے وہ یہ سب کام خود کر سکتا ہے۔ لیکن اسے حکومت کرنے کا شوق ہے۔ اس لئے وہ ہر کسی کو اپنا غلام بنانے کا خواب دیکھتا رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے اپنی ایک لٹکا بنا رکھی ہے۔“ راخون نے بتایا۔

”تم فکر مت کرو، راخون میں چنڈال کی لٹکا میں آگ لگا دوں گا۔“ دانشاد نے کہا۔

”مگر وہ شولما...“ راخون نے فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔
 ”ارے اس سے میرا کراؤ ہو چکا ہے۔ ایک دفعہ اگر سمجھدار روح ہوگی تو مجھے دیکھتے ہی میرے راتے سے ہٹ جائے گی۔“ دانشاد نے کہا۔

”کیا... آپ شولما سے پہلے ایک دفعہ مقابلہ کر چکے ہیں۔ مجھے تو یقین...“
 ”نہیں آ رہا ناں یقین... آ جائے گا ایک دفعہ

چونکہ تم اتنے عرصہ سے چنڈال کے ساتھ رہ رہے ہو۔ اس لئے تم اس کی موت کا سامان اچھی طرح جانتے ہو گے۔ مجھے معلوم ہے کہ چنڈال جیسی شیطانی طاقتوں کی جان ایک جگہ نہیں ہوتی اس لئے تم مجھے مزید کچھ بتاؤ چنڈال کے بارے میں اس کی شکتیوں کے بارے میں اور اس کے علاوہ اس کے محافظ جن بھی تو ہونگے۔ ان کے بارے میں بھی تفصیل بتاؤ۔“ دانشاد نے کہا۔

”دانشاد میں واقعی چنڈال کی موت کے بارے میں جانتا ہوں۔ کیونکہ میں نے اس کے ساتھ پورے پندرہ سال گزارے ہیں۔ لیکن میرے بتانے کے بعد تم اسے مار ضرور دینا۔ کیونکہ اگر تم نے کسی وجہ سے اسے چھوڑ دیا تو وہ مجھے ہر حال میں کالی دلدل میں پھینک دے گا۔“
 راخون نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

”تم اس بات کی بالکل فکر مت کرو، میں اسے مار کر ہی دم لوں گا۔“ دانشاد نے جواب دیا۔

”دانشاد بابو۔“ راخون نے کہا۔ ”وچ ڈاکٹر نے آپ کو چنڈال کی موت کا جو طریقہ بتایا ہے وہ ضرور پھیل کے پتے میں چنڈال کے تین بال کاٹ کر لمبنے کا ہوگا۔ یہ طریقہ ہر طرح سے چنڈال کی موت کے لئے موزوں ہے۔ لیکن چنڈال کی موت کا ایک اور طریقہ بھی میرے علم میں ہے۔ اس طریقے کے مطابق اگر کالے رنگ کی بلی کو مار کر اس کی کھال میں سو سال کے مگرچھ کے ایک دانت کو لپیٹ کر تعویذ بنالیا جائے۔ اور اسے کسی طرح دھامکے کے اندر ڈال کر چنڈال کی گردن میں ڈال دیا جائے تو چنڈال اتنی تیزی سے ہلاک ہو جائے گا کہ جتنی تیزی کے ساتھ انسان تھوک منہ سے باہر نکالتا ہے۔ لیکن اس طریقے میں ایک ہی مشکل ہے کہ مگرچھ کا یہاں ملنا ناممکن ہے۔ اور وہ بھی سو سالہ مگرچھ۔ البتہ اس طریقے کا ایک فائدہ اور یہ ہے کہ اگر مگرچھ کے دانت کے بجائے زرکون کا ایک پتھر بلی کی کھال میں لپیٹ دیا جائے اور تعویذ بنا کر چنڈال کے گلے میں ڈال دیا جائے تو چنڈال تقریباً دو گھنٹوں کے لئے بے ہوش ہو جائے گا۔ اور اسے بے ہوش کرنے کے بعد آپ آسانی سے اس کے بال کاٹ سکتے ہیں اور پھر وچ

شولما کو میرے سامنے تو آنے دو۔“ دلشاد نے راخون کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

”اگر شولما تمہارے راستے میں نہیں آئی تو تم ضرور چنڈال کو مار دو گے۔ کیونکہ آج کل اس نے اپنی حفاظت کے لئے شولما کو ہی مقرر کر رکھا ہے۔ باقی عام طاقت والے جن ہوں گے جو کہ فی الحال چنڈال کی حفاظت پر مقرر نہیں ہوں گے۔ لیکن تمہیں ادھر ادھر نظر آئیں گے۔“ راخون نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”ٹھیک ہے، راخون تم اب جاؤ اور امیر شریف جا کر بابا کمال الدین شاہ کے ہاتھوں کلمہ پڑھ لیتا۔ اس کے بعد تم وہیں رہنا دہاں تمہیں چنڈال کا باپ بھی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔“ دلشاد نے کہا۔

”بہت، بہت شکریہ دلشاد بابو لیکن میں آپ کو چنڈال کی رہائش گاہ کے بارے میں بتا دوں۔ یوں تو وہ ایک جگہ نہیں نکلا۔ لیکن جہاں کہیں بھی اس کے ٹھکانے ہیں۔ وہاں بہت پرانا اور بہت بڑا برگد کا درخت ہوگا اور اس کے تنے پر ایک کے کالے ناگ کی تصویر بنی ہوئی ہوگی۔“ راخون نے کہا۔

”تمہارا بہت بہت شکریہ۔ میرے دوست۔ بس تم جاؤ تاکہ میں اگلا قدم اٹھا سکوں۔“ دلشاد نے راخون سے کہا۔ اور اس کے ساتھ ہی راخون سلام کر کے جانے لگا۔ جبکہ دلشاد اسے دور تک جاتے دیکھتا رہا۔

☆.....☆.....☆

ایک بہت بڑا غار تھا۔ غار کے اوپر برگد کا ایک درخت تھا جس کے تنے کے اوپر ایک کالے ناگ کی تصویر بنی ہوئی تھی۔ غار کے اندر پتھر کی کرسی پر چنڈال بیٹھا ہوا تھا۔ سامنے ایک تیس برس کی خوب صورت عورت ڈھیلے کپڑے پہنے ادب سے کھڑی تھی۔ اچانک چنڈال رعب دار آواز میں بولا۔ ”شولما میں نے کہا تھا ناں کہ یہ بازی میں جیت ہی جاؤں گا۔ تم نے دیکھا ناں کہ کل میرے قبیلے کے جنوں نے کس طرح سردار خیام اور اس کے ساتھیوں کے چھکے چھڑا دیئے۔ اور اس بار سردار خیام نے بھی ڈر کے مارے کوئی مزاحمت نہیں کی۔“

”وہ تو ٹھیک ہے آقا۔۔۔۔۔ لیکن وہ آدمی جسے سردار خیام نے آپ کو مارنے کے لئے روانہ کیا ہے۔ وہ اگر آپ تک پہنچ گیا تو۔۔۔۔۔“ شولما نے پیشین گوئی ظاہر کی۔ ”سنو شولما۔۔۔۔۔ تمہیں تو میری شکلیوں کا اندازہ ہے پھر تم میری توہین کیوں کر رہی ہو۔ میرا نام چنڈال ہے۔۔۔۔۔ اول تو وہ آدمی مجھ تک پہنچ ہی نہیں پائے گا کیونکہ راخون اسے کالے معبد کے غار میں لے جا کر مار دے گا اور اگر وہ کسی طرح راخون کے ہاتھوں بچ گیا تو میں راخون کے ساتھ ساتھ اسے بھی کالی دلدل میں زندہ گاڑ دوں گا۔“ چنڈال نے غصے میں کہا۔

”مجھے شاکر دو آقا۔۔۔۔۔ میرا مطلب آپ کی توہین کرنا نہیں تھا۔“ شولما نے کہا۔

”ٹھیک ہے لیکن آئندہ احتیاط کرنا، اور ہاں اب تم جاؤ اور سردار شلخ کو میرے پاس بلا کر لاؤ۔ مجھے اسے کچھ ہدایات دینی ہیں۔“ چنڈال نے کہا۔

”جو حکم میرے آقا۔“ شولما نے اونچی آواز میں کہا اور اس کے ساتھ ہی وہ باہر جانے لگی۔ اور چنڈال نے اپنی آنکھیں سکون لینے کے لئے بند کر لیں۔

☆.....☆.....☆

چاروں طرف لمبی لمبی کانٹے دار جھاڑیاں تھیں اور دلشاد ان جھاڑیوں کے درمیان سے نکلتا ہوا جا رہا تھا۔ اس نے اب چنڈال قبیلے میں داخل ہونے کے لئے دوسرا راستہ چنا تھا۔ دنیا کی نظروں میں یہاں جنگل تھا۔ کانٹے دار جھاڑیوں اور ایک گندے پانی کا جو ہڑ تھا۔ لیکن حقیقت یہ تھی کہ یہاں جنوں کا چنڈال قبیلہ آباد تھا۔ اور یہ سائیڈ قبیلے کی پچھلی سائیڈ تھی۔ دلشاد جو نئی کانٹے دار جھاڑیوں سے نکلا اسے گندے جو ہڑ کے ساتھ ایک بڑا سوراخ نظر آیا جو کہ نیچے کی طرف جا رہا تھا۔ سوراخ اتنا بڑا تھا کہ اس میں سے بیک وقت دو آدمی اندر جاسکتے تھے۔ دلشاد دھیرے دھیرے سوراخ میں داخل ہو گیا۔ دوسرے لمحے اسے ایسا لگا جیسے وہ کسی بادشاہ کے محل میں آ گیا ہو۔ باہر سے سوراخ نظر آنے والی یہ تنگ جگہ اندر سے بہت کھلی صاف اور کشادہ تھی۔ سوراخ کے اندر زمین

پھر تم سے اپنے قبیلے کے کام کروانے لگا۔ آج بھی تم یہاں صفائی کر رہے تھے کہ میں ادھر آ نکلا اور ہاں یہ تمہارے ساتھی ہیں۔ یہ تمہارے ساتھ پالم پور سے یہاں آئے ہیں۔ ان کا نام.....“

”بس کرو بابو جی۔ بس ہمیں یقین آ گیا ہے۔ آپ واقعی جادوگر ہیں، جادوگر۔“ خیردین نے دلشاد کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

”میں کوئی جادوگر نہیں ہوں۔ بس عام سا انسان ہوں۔ لیکن مجھے تم لوگوں کی مدد کی ضرورت ہے۔“ دلشاد نے کہا۔

”کیسی مدد.....؟“ خیردین نے کہا۔ پھر دلشاد نے کچھ دیر انہیں کچھ سمجھایا۔ تھوڑی دیر بعد دلشاد بولا۔ ”تم چندال کی رہائش گاہ تو جانتے ہو ناں۔“

”جی بابو جی چندال آج کالی ماں کے مجھے کے سامنے والے غار میں موجود ہوگا۔ اس کے ساتھ محافظ جادوگر کی شول بھی وہیں موجود ہوگی۔“ خیردین نے کہا۔ ابھی وہ یہی باتیں کر رہے تھے کہ اچانک انہیں دور سے بہت سے آدمی آتے ہوئے دکھائی دیئے وہ ان کی طرف تیزی سے آرہے تھے۔ ”دلشاد بابو یہ انسان نہیں جن ہیں۔ آج منگل وار ہے اور ہفتے کے ہر منگل کے دن چندال قبیلے کے جن اپنی طاقت بڑھانے کے لئے انسانی شکل میں آتے ہیں۔“ خیردین نے کہا۔

”تو پھر دیکھتے کیا ہو۔ اپنے ان صفائی والے اوزاروں سے ٹوٹ پڑوان پر، انسانی شکل میں ان کی طاقتیں بھی عام انسانوں کی طرح ہوتی ہیں۔“ دلشاد نے کہا۔

دوسرے لمحے دلشاد سمیت وہ تمام اپنے بیلچوں، کلبازیوں کے ساتھ تمام جنوں پر ٹوٹ پڑے۔ وہ انہیں بیلچوں اور کلبازیوں سے ایسی ضربیں لگا رہے تھے کہ وہ دوبارہ اٹھنے کے قابل نہ رہتے۔ دلشاد نے ایک بڑے آدمی جو کہ ضرور ان جنوں کا سردار تھا اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا۔ ”سردار جن تم ستاروں میں گردش کر رہے ہو۔ تم ہواؤں میں تیر رہے ہو۔ تم..... بولو..... تم ستاروں میں ہو ناں۔“

کیاتہ میں سنگ مرمر لگا ہوا تھا۔ دلشاد دھیرے دھیرے آگے بڑھ رہا تھا کہ اچانک اس نے دیکھا آگے صاف میدان تھا۔ جس سے آگے بہت سے درخت نظر آرہے تھے۔ دلشاد چند لمحے وہاں دیکھتا رہا پھر اس نے کچھ سوچتے ہوئے اپنی جیب سے ایک خنجر نکالا اور پھر اس پر کچھ پڑھنے لگا۔ اب دلشاد نے خنجر ہاتھ میں ایسے پکڑا جیسے کسی کو مارنے جا رہا ہو۔

”دوسرے ہی لمحے دلشاد اپنی جگہ سے اٹھا اور اڑنے لگ گیا۔ وہ بہت تیزی سے کسی عقاب کی طرح اڑ رہا تھا۔ پلک جھپکتے میں وہ میدان کو کراس کرتا ہوا درختوں تک پہنچ گیا۔ اب اس نے خنجر کو پکڑنے کا انداز بدلا۔ دوسرے لمحے وہ زمین کی طرف آنے لگا اور آخر کار زمین پر اتر گیا۔ زمین پر اترتے ہی وہ گھٹنے درختوں میں ایک طرف چلنے لگا۔

اچانک اس نے دیکھا تھوڑے سے فاصلے پر چار آدمی کھڑے تھے۔ دلشاد نے ان کا ذہن پڑھ لیا اور پھر ان کی طرف بڑھ گیا۔ ”اے کون ہو تم؟“ ان میں سے ایک آدمی نے دلشاد کو اپنی طرف آتا دیکھ کر کہا۔

”میں کون ہوں یہ چھوڑو۔ تم لوگ اپنی فکر کرو۔“ دلشاد نے کہا۔

”کیا مطلب.....؟“

”مطلب یہ کہ تم مجھ سے پوچھ رہے ہو کہ میں کون ہوں۔ لیکن میں تم سے پوچھ رہا ہوں کہ تم کون ہو اور کہاں سے آئے ہو۔“ دلشاد نے کہا۔

”اچھا بتاؤ ذرا ہم بھی تو سنیں کہ ہم کون ہیں؟“ آدمی نے ہنستے ہوئے کہا۔

”تم میں سے ایک آدمی پالم پور کا غریب کسان جو کہ تم ہو۔“ دلشاد نے ایک آدمی کی طرف اشارہ

تے ہوئے کہا۔ ”تمہارا نام خیردین ہے تمہاری ایک خوب صورت بیٹی کلثوم ہے جسے چندال اٹھا کر

لے آیا ہے تم اس کی تلاش میں یہاں آئے ہو اور

بامداد ایک نیک بخت پنڈت نارائن نے کی ہے۔

تمہیں یہاں پہنچانے کا انتظام کیا ہے۔ لیکن

تمہیں نے چندال نے تمہیں چھ مہینے تک قید کر لیا اور

”ہاں میں ستاروں میں گھوم رہا ہوں۔“ اس آدمی نے جواب دیا۔ ”اچھا اب میں جو کہوں گا تم وہ کرو گے۔ ٹھیک ہے۔“

”ہاں بالکل ٹھیک ہے۔“ اس نے دلشاد کی بات سن کر کہا۔ ”تم چندال کو جانتے ہو۔۔۔ کون ہے، چندال۔“ دلشاد نے پوچھا۔

”چندال میرا آقا ہے۔ جتنی دنیا کا بے تاج بادشاہ۔“

”اب میرا حکم سنو۔۔۔ تم چندال کے پاس جا کر کہو گے کہ اس سے ملنے مصر سے جادوگر برٹن راج آیا ہے اور اس کے پاس دریائے نیل کا وہ سانپ ہے جسے آپ نے برسوں پہلے منگوایا تھا چونکہ یہ سانپ چندال کی رہائش گاہ کے قریب یا نزدیک لے جانے سے مر جائے گا۔ اس لئے چندال کو مجھ سے ملنے یہاں بلاؤ۔“ دلشاد نے اس سردار جن پر اپنا ناز کا علم کیا تھا۔ اور اس طرح چندال کو بلایا تھا۔

”ٹھیک ہے۔“ اس آدمی نے کہا۔ اور تیزی سے چندال کی رہائش گاہ کی جانب جانے لگا۔ جبکہ دلشاد ایک کلہاڑی سے چندال کے مختلف جنوں سے لڑنے لگا۔ شور کی آواز سن کر قبیلے کے دوسرے جن بھی ادھر آ نکلے تھے۔ وہ تمام انسانی شکل میں تھے۔ وہ بھی مختلف ہتھیاروں سے دلشاد، خیر دین اور اس کے ساتھیوں سے لڑنے لگے۔ لڑائی بہت زور و شور سے جاری تھی۔ لڑائی میں خیر دین کے آئے ہوئے ساتھی بھی مارے گئے۔ پورے قبیلے میں ہنگامہ مچ گئی تھی۔ ہر طرف شور شرابہ تھا۔ دلشاد کے پاس چونکہ روحانی طاقتیں تھیں اس لئے اس پر چندال قبیلے کے جنوں کی کمزوریوں کا کچھ اثر نہیں ہوا تھا۔ دلشاد نے دیکھتے ہی دیکھتے بہت سے جنوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ ”خیر دین تمہیں تمہاری بیٹی کا پتہ ہوگا کہ وہ کہاں قید ہے۔ تم جاؤ اسے چھڑاؤ میں انہیں دیکھتا ہوں اور ویسے بھی قبیلے کے تمام جن ادھر آ نکلے ہیں۔“ دلشاد نے خیر دین سے کہا۔ دلشاد کی بات سن کر خیر دین اپنا منہ چھپا کر ایک طرف بھاگنے لگا۔

جبکہ دلشاد ایک کمزور اٹھائے مختلف جنوں کے سر قلم کرتا جا رہا تھا۔ دلشاد کو اپنے اوپر بھاری دیکھ کر بہت سے جن واپس بھاگ گئے۔ دلشاد بھی ان کے پیچھے بھاگتا گیا اور ایک ایک کو کمزور سے مارتا گیا۔ جنوں کو مارتے مارتے آخر کار وہ درختوں کی ٹوٹ میں ایک طرف جھکتے ہوئے بھاگنے لگا۔ راستے میں اسے دو آدمی ملے جو کہ دلشاد سے ڈر کے مارے پیچھے ہوئے تھے۔ دلشاد نے ایک کا سر کمزور سے قلم کر دیا اور دوسرے سے کہا۔ ”بتاؤ کہ چندال نے کلثوم کو کہاں قید کر رکھا ہے۔ بتاؤ ورنہ تیرا حشر بھی تیرے ساتھی جیسا ہوگا۔“

”بتاتا ہوں۔۔۔ چندال آقا نے کلثوم کو یہاں سے تھوڑی دور ہی ایک غار میں اپنی بیگم سے قید کیا ہوا ہے۔ پہلے وہ کسی اور جگہ پر تھی۔ لیکن اب چندال آقا سے یہاں لے آیا ہے۔“ اس نے دلشاد سے کہا۔ دوسرے لمحے دلشاد نے اسے ایک زوردار دھکا دیا اور خود اس طرف بھاگنے لگا جہاں غار میں کلثوم قید تھی۔

تھوڑی دیر میں دلشاد وہاں پہنچ گیا۔ اس نے دیکھا وہاں خیر دین بہت سے جنوں سے لڑ رہا تھا۔ اس کی کمزور لڑتے لڑتے ٹوٹ چکی تھی۔ دلشاد نے زمین سے منہ بھر مٹی اٹھائی اور اس پر کچھ پڑھ کر پھونکا۔ اور وہ مٹی ان جنوں کی طرف اچھال دی۔ وہ اندھے ہو گئے اور آپس میں ٹکرائیں مارتے لگے۔

دوسرے لمحے دلشاد غار کے اندر رکھے ہوئے بیگم سے کی طرف بڑھ گیا۔ بیگم سے کا کوئی تالا یا دروازہ نہ تھا۔ بیگم ہر طرف سے بند تھا۔ دلشاد نے اپنے دونوں ہاتھ بیگم سے داخل کر کے سلاخوں کو پکڑا اور انہیں ایک دوسرے سے دور کھینچتے ہوئے دور کرنے کی کوشش کی، دوسرے لمحے بیگم سے کی سلاخیں خود بخود کھلتی گئیں اور ان میں اتنا خلا پیدا ہو گیا کہ دو آدمی آسانی سے داخل ہو سکتے تھے۔ دلشاد اندر داخل ہوا۔ بیگم سے کے ایک کونے میں کلثوم بنو کہ واقعی بہت خوب صورت تھی۔ بے ہوش پڑی ہوئی تھی۔ دلشاد نے اسے اٹھایا اور خیر دین کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔

”خیر دین تم کلثوم کو لے کر یہاں سے نکل جاؤ تمہیں نکلے ہوئے کوئی خطرہ نہیں ہوگا۔ کیونکہ تمام جن اب کھلے میدان کی طرف جائیں گے۔ تم یہیں سے کسی راستے سے نکل جاؤ۔“

دلشاد بابو تمہارا بہت شکریہ۔“ شکریہ کی بات نہیں۔ تم جادو میرے پاس وقت کم ہے۔“ اور دلشاد یہ کہہ کر واپس کھلے میدان کی طرف بھاگنے لگا۔ بھاگتے ہوئے جب وہ درختوں کے قریب آیا تو اس نے جیب سے ایک لمبی ڈوری نکالی۔ جس میں ایک بلی کے چمڑے سے بنا ہوا کالے رنگ کا تعویذ لٹک رہا تھا یہ وہی تعویذ تھا جس کے بارے میں رانخون نے اسے بتایا تھا۔ دلشاد زور زور سے عربی زبان میں کچھ پڑھنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد جب اس نے اپنے سینے پر پھونک ماری تو اس کی شکل تبدیل ہونے لگی۔ آخر کار اس کی شکل بالکل جادوگر کرشن کی طرح ہو گئی۔ اس کا لباس بھی مصری بن گیا۔ تب اچانک وہ اپنی جگہ سے اڑا اور ہوا میں معلق ہو گیا۔ اڑتے اڑتے وہ وہاں پہنچا۔ جہاں بہت سے جن انسانی شکل میں جمع تھے۔ ان کے درمیان میں وہ اوپر سے ایسے اتر اچیسے فوجی بیرو اشوت لے کر زمین پر اترتے ہیں۔ نیچے اترتے ہی اس نے دیکھا۔ سرخ رنگ کی پتھر کی بڑی کرسی تھی۔ جس کے اوپر ایک سوئے جسامت کا آدمی بیٹھا ہوا تھا اس کی لمبی چوٹی پیچھے لٹک رہی تھی۔ جو کہ کسی سانپ کی طرح لگ رہی تھی۔

”آؤ..... آؤ..... جادوگر راج کرشن تمہیں مبارک ہو کہ تم نے میرا مطلوبہ سانپ پکڑ لیا۔“

”ہاں چنڈال آقا میں اس کو برا سانپ کو پکڑنے میں کامیاب ہو گیا ہوں۔ اب آپ آسانی سے اپنا عمل مکمل کر سکیں گے۔“ دلشاد نے اونچی آواز میں کہا۔ تمام جن دلشاد کو حیران نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔

”راج کرشن تم جلدی سے یہ سانپ مجھے دے دو لیکن تمہارا انعام میں تمہیں بعد میں دوں گا کیونکہ اس وقت میرا ایک انسان دشمن میرے قبیلے میں کھس آیا ہے۔ مجھے اسے ختم کرنا ہے۔ اس نے میرے قبیلے میں بھگدڑ

مچادی ہے۔“ چنڈال بولا۔

”ٹھیک ہے آقا۔“ دلشاد نے کہا۔ اور جیب سے کچھ نکالنے لگا تھا کہ اچانک ایک آواز آئی۔ ”دلشاد..... دلشاد..... تم۔“ یہ آواز شولما کی تھی جو کہ چنڈال کے پیچھے کھڑی مسکرا رہی تھی۔

”کیا دلشاد.....“ چنڈال نے گرجدار لہجے میں کہا۔ ”تو..... تو نے یہاں آنے کی جرأت کیسے کی حرام خور..... لیکن اچھا ہوا جو تو یہاں آ گیا۔ آج میں تجھے یہاں زندہ جلا دوں گا۔“

تمام قبیلے میں بھگدڑ مچ گئی۔ کچھ جن تو یہ نام سن کر بھاگنے لگے۔ چنڈال نامعلوم زبان میں کچھ پڑھ رہا تھا۔ اچانک دلشاد نے اپنی جیب سے ایک چھوٹا سا کانڈ نکالی کر چنڈال کی طرف پھینک دیا۔ کانڈ کے چنڈال کے پاس سے گرتے ہی کانڈ کو آگ لگ گئی اور دیکھتے ہی دیکھتے آگ چنڈال کے ارد گرد پھیل گئی۔ آگ کو دیکھ کر چنڈال گھبرا گیا۔ لیکن دوسرے ہی لمحے چنڈال نے ایک زبردست پھونک آگ کی طرف ماری۔ وہی آگ ہوا میں اڑتی ہوئی دلشاد کے ارد گرد بھڑکنے لگی۔ دلشاد آگ کے گولی دائرے میں پریشان کھڑا تھا کہ اچانک چنڈال بولا۔ ”حقیر انسان دلشاد میں نے تجھے تیری ہی لگائی ہوئی آگ میں پھنسا دیا ہے۔ اب تو چند لمحوں میں جل کر راکھ ہو جائے گا۔ حرام خور مجھے مارنے آیا تھا۔“

دلشاد یونہی پریشان تھا کہ اچانک اوپر آسمان سے آگ کے اوپر بارش کی طرح پانی گرنے لگا اور دیکھتے ہی دیکھتے آگ بجھ گئی۔ دلشاد نے جیسے ہی اوپر دیکھا وہ سفید کبوتر کافی اونچائی پر اڑ رہے تھے۔ انہیں دیکھ کر دلشاد مسکراتے لگا۔ دوسرے لمحے ایک دھماکے کی آواز آئی اور زمین پھٹ گئی۔ دلشاد کی آنکھوں کے سامنے چنڈال زمین میں اتر گیا اور پھر زمین برابر ہو گئی۔ تمام قبیلے کے جن بھی بھاگنے لگے کہ اچانک دلشاد کی نظر شولما پر پڑی۔ ”رک جاؤ شولما..... تم نہیں بھاگ سکتیں۔ آج تمہاری وجہ سے چنڈال میرے ہاتھوں سے نکل گیا۔ آج میرے

خبر دینے آیا ہوں۔ خبر یہ ہے کہ آپ کے ساتھ بڑا دھوکا ہونے والا ہے۔“ سردار جن خیام نے کہا۔
 ”دھوکہ کیسا دھولہ تفصیل سے بتائیں خیام۔“
 دلشاد نے کہا۔

”دلشاد بات یہ ہے کہ شولما نے آپ کے ساتھ تعاون کا وعدہ کیا ہے۔ لیکن حقیقت میں وہ آپ کو دھوکے سے مروانا چاہتی ہے۔ اس نے آپ کو یہی کہا ہے ناں کہ چنڈال ملک شام کے پہاڑی علاقوں میں موجود لال غار میں ہے اور شولما آپ کی بتائی ہوئی جگہ یعنی بابا خیر دین کے گھر چلی جائے اور ان کی مدد بھی کرے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ شولما پہلے آپ کے بتائے ہوئے گھر یعنی خیر دین کے گھر جائے گی اور ان کی مدد کرنے کے بجائے لال غار خیر دین کی بیٹی کاٹوم کو اٹھالے گی اور اس کے بعد شولما ٹاگ پور میں موجود پنڈت کرشن لال پونا والے کے پاس جائے گی اور اسے دوسو سو نوادے کروہ والا خریدے گی جس پر کوئی بھی مسٹر یا جادو اثر نہیں کرتا۔ اور جس کو پہننے کے بعد چنڈال پر کوئی بھی نیکی کی طاقت اثر نہیں کرے گی۔ اور پھر شولما جب چنڈال کے پاس ہوگی تو تم وہاں پہنچو گے اور پھر تمہاری کوئی طاقت چنڈال پر اثر نہ کرے گی اور چنڈال تمہیں شیطان کے کالے پنجرے میں قید کر دے گا اور تم بھوکے پیاسے مر جاؤ گے۔“ سردار جن خیام نے کہا۔

”اتنا بڑا دھوکہ لیکن خیام یہ سب کچھ تمہیں کس نے بتایا۔“ دلشاد نے پوچھا۔

”دلشاد جی۔“ خیام نے کہنا شروع کیا۔ ”مجھے یہ سب کچھ بابا کمال الدین شاہ نے بتایا ہے۔ اور انہوں نے یہ بھی کہا ہے کہ میں آپ کو خبر کرنے کے ساتھ ساتھ یہ بھی کہوں کہ آپ نے چنڈال اور شولما کو اسی لال غار کے اندر مارنا ہے۔ اگر چنڈال اپنے قبیلے میں مرے گا تو تمام بے قصور جانیں بھی ضائع ہو جائیں گی۔ دلشاد جی آپ نے اتنی محنت کر کے چنڈال کو بھاگنے پر مجبور کر دیا ہے۔ اب آپ بہت احتیاط کریں کیونکہ بیکال جی نے ہمیں جو مدت بتائی تھی کہ اس میں چنڈال کو مار دیا جائے وہ بہت کم رہ گئی

ہاتھوں تمہاری موت چکی ہے۔“ دلشاد نے کہا۔
 ”دلشاد.....“ شولما نے گھبراتے ہوئے کہا۔ ”میں نے تمہارے کام میں مداخلت تو نہیں کی ناں۔ لیکن مجھے معلوم نہ تھا کہ چنڈال کو مارنے والے آدمی تم ہو۔ ورنہ میں تمہارا نام اس طرح سے نہ لیتی۔“

”ٹھیک ہے شولما میں تمہاری بات پر یقین کرتا ہوں..... لیکن اب چنڈال کہاں گیا ہے۔ یہ مجھے تم بتاؤ گی۔ کیونکہ مجھے معلوم ہے کہ اس کے سب ٹھکانوں کا علم صرف تمہیں ہے۔“ دلشاد نے کہا۔

”ٹھیک ہے دلشاد میں تمہیں چنڈال کا ٹھکانہ ضرور بتاؤں گی کیونکہ میں نے ایک غلطی کی ہے کہ دوبارہ تم سے ٹکری ہے۔ لیکن یہ بات بھی سنتے جاؤ کہ اگر تمہاری جگہ کوئی اور ہوتا تو میں چنڈال کا پتہ ہرگز نہ دیتی۔ خیر اس بات کے بدلے میں تمہیں میری حفاظت کی ذمہ داری لینی پڑے گی۔“ شولما نے کہا۔

”مجھے تمہاری شرط منظور ہے۔“ دلشاد نے کہا۔ پھر شولما نے دلشاد کو چنڈال کا پتہ بتادیا اور خود دلشاد کی بتائی ہوئی جگہ پر جانے لگی۔ جبکہ دلشاد چمڑے کے آئینہ سے یوں کھیل رہا تھا۔ جیسے اسے اپنی فتح کا یقین ہو۔

☆.....☆.....☆

چاروں طرف سبز درخت تھے۔ درمیان میں ایک بڑی سفید پانی کی آبشار بہہ رہی تھی۔ دلشاد نے ہاتھ منہ دھولے تھے اور اب وہ پاؤں دھو رہا تھا کہ اچانک اسے اپنے پیچھے کوئی آواز سنائی دی۔ دلشاد نے جیسے ہی مڑ کر دیکھا۔ اسے سردار جن خیام دکھائی دیا۔ ”خیام تم لیکن اس طرح یہاں“

”دلشاد شاید آپ بھول گئے ہیں کہ ہم جن ہیں اور ہمارے لئے فاصلے کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔“ خیام نے کہا۔

”اور ہاں میں تو بھول ہی گیا تھا۔ لیکن آپ اس وقت انسانی شکل میں ہیں ناں۔ اچھا بتائیں خیریت ہے۔“ دلشاد نے کہا۔

”ہاں دلشاد خیریت ہی ہے۔ آپ کو ایک ضروری

ہے۔ اس لئے آپ خیال رکھیں اور ہاں پہلے آپ شولما کو بابا خیر دین کے گھر پر مار دیں اور اس کے بعد شولما کے روپ میں جا کر چنڈال کو ختم کر دیں۔“

”تم فکر مت کرو خیام انشاء اللہ میں چنڈال کو موت کے گھاٹ اتار کر ہی دم لوں گا۔“ دلشاد نے کہا اور اس کے ساتھ ہی خیام جن نے اجازت مانگی اور وہ درختوں میں گم ہو گیا۔

☆.....☆.....☆

دلشاد بابا خیر دین کے گھر موجود تھا۔ بابا خیر دین اور دلشاد باتیں کر رہے تھے۔ اتنے میں کلثوم چائے لے کر آگئی۔ شولما بھی وہاں موجود تھی۔ ”شولما“ دلشاد نے کہا۔

”میں تمہارا زندگی بھر احسان مند رہوں گا۔ تم آج اگر میری مدد نہ کرتی تو میں کیسے چنڈال تک پہنچ پاتا۔“

”احسان کی بات مت کرو تم نے بھی تو مجھے میری غلطی پر معاف کر دیا تھا اس لئے حساب برابر۔“

شولما مجھے ناگ رجب نے ایک ہار لاکر دیا ہے جو کہ اصلی ہیروں کا ہے۔ یہ خوب صورت بھی ہے اور کراماتی بھی، تم اگر اسے پہن لو گی تو چنڈال تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔ اس کا کوئی جادو تم پر اثر نہیں کرے گا۔ لو تم اسے پہن لو۔“ دلشاد نے شولما کو ایک خوب صورت ہار دیتے ہوئے کہا۔

”واؤ..... دلشاد یہ تو بہت خوب صورت ہے۔“

شولما نے ہار پہنتے ہوئے کہا۔ ہار کا پہننا تھا کہ ہار آہستہ آہستہ شولما کی گردن کے ارد گرد تنگ ہونا شروع ہو گیا۔ آہستہ آہستہ شولما کو بھی اس کا احساس ہو گیا۔ ”دلشاد یہ..... یہ ہار..... میری گردن.....“ ہار بہت تنگ ہو گیا تھا۔ دلشاد نے شولما سے کہا۔ ”یہ تمہاری موت کا سامان ہے شولما۔ تم نے مجھے دھوکہ دینا چاہا تھا اور اب خود ہی پھنس گئی جیو..... جیو اب تمہارا چنڈال بھی تمہیں نہ بچا پائے گا۔“ دلشاد نے کہا۔

”دلشاد..... مجھے..... معاف..... آ..... آ..... ہا..... ہا..... اور اس کے ساتھ ہی شولما دم گھٹنے کی وجہ سے ہلاک ہو گئی۔

”دلشاد بیٹا یہ سب کچھ کیا تھا۔“ خیر دین نے پوچھا۔ ”بابا یہ غدار دھوکے باز تھی۔ یہ یہاں سے آپ کی بیٹی کلثوم کو اغوا کرتی اور پھر بعد میں مجھے چنڈال کی مدد سے شیطان کے کالے ہنجرے میں قید کروا دیتی اور آخر کار میری موت واقع ہو جاتی۔ لیکن اچھا ہوا کہ مجھے سب کچھ پتہ چل گیا۔ ورنہ نہ جانے اب کیا ہوتا۔“

دلشاد نے کہا۔ ”اچھا بابا آپ اپنا خیال رکھئے گا میں چلا ہوں۔“ دلشاد نے خیر دین سے اجازت لی۔ ”خدا تمہاری حفاظت کرے دلشاد بیٹا..... جاؤ فی امان اللہ۔“ خیر دین نے دعا دی اور دلشاد صحن کے دروازے سے باہر نکل گیا۔

☆.....☆.....☆

چاروں طرف سرخ زمین تھی اور سرخ پہاڑ، البتہ درخت ہرے تھے۔ دلشاد سرخ پہاڑوں کے درمیان ایک بڑے پتھر پر بیٹھا ہوا تھا کہ اچانک دو سفید کبوتر اس کے سامنے ایک درخت پر بیٹھ گئے۔ وہ کچھ دیر دلشاد کی طرف دیکھ کر گرگراتے رہے۔ اور پھر چلے گئے۔ یہ بابا کا الدین شاد کے اہنات کئے ہوئے کبوتر تھے۔ جو کہ دلشاد کی مدد کے لئے آئے تھے۔ کبوتروں کے جانے کے بعد دلشاد بھی آہستہ آہستہ ایک طرف چلنے لگا۔ کچھ دیر بعد وہ کانٹے دار جھاڑیوں کے بیچ پھنسا رہا تھا۔ یہ راستہ آہستہ آہستہ اوپر کی جانب جا رہا تھا۔ تھوڑی سی دیر بعد دلشاد ایک ٹیلے کے اوپر نظر آ رہا تھا۔ یہاں سے بائیں جانب دلشاد نے جو بھی نظر دوڑائی تو اسے ایک الال رنگ کا گول پہاڑ نظر آیا۔ جس کے چاروں طرف کالے درخت تھے۔ دلشاد نے اپنی جیب سے ایک سفید رومال نکالا اور اسے نیچے رکھ دیا۔ دوسرے ہی لمحے رومال بڑھتا گیا اور ایک قالین کی شکل اختیار کر گیا۔ اب دلشاد اس قالین پر بیٹھ گیا اور اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ آنکھوں کا بند ہونا تھا کہ قالین ہوا میں اڑا اور دلشاد سمیت نیچے سرخ پہاڑ کی جانب اترنے لگ لگا۔ کچھ ہی دیر بعد دلشاد الال رنگ کے پہاڑ کے پر موجود تھا۔ اب وہ آہستہ آہستہ ایک چھوٹے سے سوراخ

کی طرف جھک کر دیکھ رہا تھا۔ دلشاد نے جیسے ہی آگے دیکھا وہ سوراخ کافی بڑا تھا۔

دوسرے ہی لمحے دلشاد سوراخ میں داخل ہو گیا۔ داخل ہوتے ہی وہ آہستہ آہستہ چلنے لگا۔ اندر کا راستہ بڑا وسیع تھا۔ تھوڑی دیر چل کر جب سوراخ کا راستہ دائیں جانب مڑ رہا تھا تو دلشاد رک گیا۔ اس نے کچھ پڑھ کر خود پر پھونکا تو دوسرے ہی لمحے اس کی شکل تبدیل ہونے لگی۔ اور پھر آہستہ آہستہ اس نے شولما کی شکل اختیار کر لی۔ اب وہ بالکل شولما کی طرح تھا۔ وہ جیسے ہی دائیں جانب مڑا تو اسے ہلکی ہلکی روشنی دکھائی دینے لگی۔ کچھ دیر آگے چلنے کے بعد اسے صاف آگ نظر آئی جو کہ بہت سی لکڑیوں کو لگی ہوئی تھی۔

آگ کے آگے ایک دیوہیکل نما آدمی جھکا ہوا تھا۔ جس کے سر سے ایک لمبی چوٹی لٹکی ہوئی نظر آرہی تھی۔ اس آدمی کی تین آنکھیں نظر آرہی تھیں۔ یہ چنڈال تھا۔ جو آگ کی پرستش میں مصروف تھا۔ دلشاد آگے بڑھ رہا تھا کہ اچانک چنڈال نے اپنا سر اٹھایا اور گرجدار آواز میں کہا۔ ”آؤ... آؤ... ہماری محافظ شولما ہم تمہارا ہی انتظار میں تھے۔ کیا تم وہ مالا لے آئی ہو۔ جس کا ہم نے تم سے کہا تھا۔“

”ہاں چنڈال آقا میں وہ مالا لے آئی ہوں۔ لیکن میں نے اس مالا کے دانوں کے اوپر کالی ڈوری کا کپڑا لپیٹ دیا ہے تاکہ کسی کو بھی اس مالا کی اصلیت کا علم نہ ہو سکے۔“ دلشاد نے شولما کی آواز میں کہا۔

”یہ تم نے بہت اچھا کیا شولما اب تم آؤ اور یہ مالا ہمارے گلے میں ڈال دو۔ ہم طاقتور اور محفوظ بن کر اس دلشاد کے بچے کو ایسا سبق سکھائیں گے کہ وہ یاد کرے گا۔ اس نے ہمیں یہاں اس لال غار میں چھپنے پر مجبور کیا ہے۔“ چنڈال نے سرخ آنکھوں سے دلشاد کو دیکھتے ہوئے کہا۔

اور پھر دلشاد آہستہ آہستہ چنڈال کے پیچھے آ یا اور اس نے محتاط طریقے سے کالی ڈوری میں لٹکا ہوا تعویذ جو کہ بالکل ایک مالا کی طرح لگ رہا تھا۔ چنڈال کے گلے

میں ڈال دیا۔

تعویذ کا چنڈال کے گلے میں ڈالنا تھا کہ چنڈال نے اتنی بھیانک اور زوردار چیخ ماری کہ دلشاد کو اپنے کان بند کرنے پڑے۔ دوسرے ہی لمحے چنڈال دھڑام سے گرا اور بے ہوش ہو گیا۔

چنڈال جیسے ہی گرا دلشاد نے اوپر سے کچھ پڑھ کر پھونکا اور اب وہ اپنی اصلی شکل میں آ گیا۔

دوسرے ہی لمحے اس نے اپنی جیب سے ایک قیمتی نکالی اور چنڈال کی چوٹی سے تین بال کاٹ لئے۔ اور پھر انہیں خوردس پیمپل کے پتے میں لپیٹ دیا جو کہ وہ اپنے ساتھ لایا تھا۔ دوسرے ہی لمحے دلشاد نے اس پتے کو پہلے سے موجود آگ میں پھینک دیا۔ بتوں کا آگ میں گرنا تھا کہ بے ہوش چنڈال ایسے کاہنے اور پھڑ پھڑانے لگا جیسے کئی ہوئی مرغی پھڑ پھڑاتی ہے۔ اور پھر جب بپا اچھی طرح جل گیا تو چنڈال ٹھنڈا ہو گیا۔ لیکن ٹھنڈا ہونے سے پہلے چنڈال کے منہ سے آواز نکلی۔ ”ہا... ہا... تو دنیا کا ایک حقیقی انسان تھا۔ دلشاد لیکن تو نے آخر کار مجھے مار دیا... افسوس کہ تو بچ گیا افسوس۔ لیکن یہ بھی سچ ہے کہ اگر ایک چیونٹی بھی ہاتھی کے کان میں گھس جائے تو وہ آخر ہاتھی کو موت کے گھاٹ اتار دیتی ہے اور تو نے مجھے بھی موت سے ہٹا کر دیا۔“ چنڈال مر گیا تھا۔

دلشاد نے اوہری قبلہ کی طرف رخ کر کے سجدہ کیا اور پھر دعا مانگی اور خدا کا شکر ادا کیا کیونکہ اس نے ایک نیک کام کیا تھا۔ ایک بہت بڑے شیطان کو دنیا سے ختم کر دیا تھا اور مسلمان جنات کو شیطان چنڈال کے ظلم و ستم سے آزاد کر دیا تھا۔

دوسرے لمحے دلشاد آہستہ آہستہ سرخ غار سے باہر جانے لگا کیونکہ چنڈال کے مردہ جسم سے بہت گندی بدبو پورے غار میں پھیل رہی تھی کہ وہاں کوئی انسان سانس نہیں لے سکتا تھا۔





نادیدہ مخلوق

طاہرہ آصف - ساہیوال

ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دینے والا اندھیرا دل کو دہشت زدہ کر رہا تھا اور ایک جگہ آگ روشن تھی چند بچے اس جگہ بیٹھے تھے ایک بزرگ اس جگہ آگئے اور ان کے ایک عمل سے اچانک وہ بچے دھواں بن گئے کہ پھر.....

کوئی مانے یا نہ مانے لیکن یہ حقیقت ہے کہ نادیدہ مخلوق کا وجود رہتی دنیا تک رہے گا

پورا ہو جاتا اور جب کسی بات پر لڑائی ہو جاتی تو جھٹ ائی کو شکایت لگا دیتی کہ ”جب آپ سب سو رہے تھے تو بھائی دھوپ میں پتنگ اڑا رہا تھا“ اسے جو ڈانٹ پڑتی سو پڑتی وہ بھی میرا کان مروڑ کر اور بال سمجھ کر بھاگ جاتا۔
رات جب سب سونے لگتے تو میں ابو کے پاس آ جاتی، ان کے ساتھ لیٹ کر کہانی کی فرمائش ہوتی ابو نے لاتعداد کہانیاں سنائیں، ابو مطالعے کے بے حد شوقین تھے اور سنانے کے لئے کہانیوں کی کمی نہ تھی۔

آج جب میں خود ماں ہوں اور رات میں بچوں کو سلاتے لگتی ہوں تو میرے بچے بھی کہانی کی فرمائش کرتے

بچپن تو زندگی کا وہ حسین ترین دور ہے جس کی یادیں تمام عمر ساتھ رہتی ہیں، بچپن میں والدین سے جو بے تکلفی ہوتی ہے وہ بھی با شعور ہونے کے بعد رخصت ہو جاتی ہے، ماں کا بچے کو گود میں لینا پیار کرنا رات کو امی ابو کے ساتھ سونا یہ سب بچپن کا حصہ ہیں، میرا بچپن بھی ایسی حسین یادوں سے بھرا ہوا ہے..... بھائی دوپہر میں چھت پر پتنگ اڑانے آتا تو میں دبے پاؤں پیچھے آ جاتی، جس کا وہ بہت برا سنا تا مگر میں ڈھیٹ بنی رہتی پھر پتنگ کو کئی دینا بھائی کے لئے بار بار پانی لینے جانا ایسی خدمات سے میری بھی دوپہر کٹ جاتی اور بھائی کا پتنگ بازی کا شوق بھی

رو کر اپنی ماں کو یاد کرتی تھی، اسے لگتا تھا کہ جیسے حقیقت میں اس کی ماں نے آ کر اسے گلے سے لگایا ہو۔ وہ انتہائی پرسکون ہو جاتی اور اکثر جائے نماز پر ہی روتے روتے اس کی آنکھیں بند ہو جاتی تھیں اور وہ غینہ کی آغوش میں چلی جاتی تھی.....

☆.....☆.....☆

”اٹھو بڑی بی، آج کھانا نہیں پکانا کیا۔۔۔؟“
سہلی نے حقارت آمیز لہجہ میں کہا۔ اور بیگم و جہت نہ چاہتے ہوئے بھی اٹھ کھڑی ہوئیں۔ ”ہاں، وہ۔۔۔۔۔ وہ میں بس آنے ہی والی تھی۔۔۔۔۔!“

”اچھا بس۔ اب روز کی طرح اپنی صفائیاں دینا مت شروع کر دینا۔ جلدی سے کھانا بناؤ، اور ہاں صحن میں بہت گند ہو رہا ہے۔ وہ بھی صاف کر دینا، کامران کے آنے سے پہلے، سمجھ آگئی میری بات۔۔۔۔۔“ سہلی نے حکم سناتے ہوئے کہا اور پاؤں پختی ہوئی باہر نکل گئی۔ اس نے گھر کی تمام خادماؤں کو نکال دیا تھا وہ گھر کا سارا کام بوڑھی ساس سے ہی کروانا چاہتی تھی۔ بیگم و جہت کی آنکھوں میں آنسو بھرا آئے۔ نہ وہ انکار کر سکتی تھیں نہ ہی شکایت۔۔۔۔۔ انتہائی بے بس ہو گئی تھیں وہ۔۔۔۔۔

ہائے اس درد میں جائیں تو کہاں جائیں ہم جی تو کرتا ہے کہ اب جاں سے گزر جائیں ہم اپنے حالات کا شکوہ بھی کریں تو کس سے؟ اب تو سوچا ہے کہ راہوں میں پتھر جائیں ہم۔۔۔۔۔ اپنی آنکھیں صاف کرتی ہوئی وہ گھر کے کام میں مصروف ہو گئیں۔

☆.....☆.....☆

رفیق 3 دن کے لئے شہر گیا تھا۔ اور ثمنہ نے ذرا سکھ کا سانس لیا تھا۔ لیکن وہ بہت بیمار تھی۔ اس کی تیار داری کرنے والا وہاں کوئی نہ تھا۔ اسے سخت بخار تھا۔ اور اس میں اتنی ہمت نہ تھی کہ وہ اٹھ کر باہر جاتی اور اپنے لئے دوا خرید سکتی۔۔۔۔۔ بے بس ولا چار۔ ثمنہ انتہائی مایوسی دے بسی کے عالم میں بستر پر پڑی تھی۔ آج اسے بھر سے اپنی ان دیکھی ماں کی ہستی کی یاد آ رہی تھی۔ وہ

تصور میں خود کو ہوا میں اڑتا ہوا محسوس کر رہی تھی۔ اس کی پلکیں بھیگی ہوئی تھیں۔ وہ اپنی ماں کو دیکھنے کے لئے بہت بے چین ہو رہی تھی۔۔۔۔۔ ”اے اللہ میری ماں سے ملا دے مجھے۔۔۔۔۔ میں انہیں دیکھے بغیر مرنا نہیں چاہتی۔۔۔۔۔“ اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ لیکن اس خالی گھر میں ثمنہ کی آواز سننے والا، اس کے آنسو پونچھنے والا کوئی نہیں تھا۔

”ماں۔۔۔۔۔ آپ کہاں ہیں۔۔۔۔۔ اے اللہ میری ماں کو کسی مشکل میں مت ڈالنا۔۔۔۔۔ مم۔۔۔۔۔ مجھے میری ماں سے مل۔۔۔۔۔ ملا دے۔۔۔۔۔“ ثمنہ نے آخری ہچکی لی اور ساکت ہو گئی۔۔۔۔۔

لیکن یہ کیا۔۔۔۔۔ تھوڑی دیر پہلے جس درد کی شدت اور جسم کی تھکاوٹ اس پر حاوی تھی اب اس کے برعکس وہ خود کو بہت ہلکا پھلکا اور توانا محسوس کر رہی تھی۔۔۔۔۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ لیکن دوسرے ہی لمحے اسے حیرت کا جھٹکا لگا کیونکہ اس کا جسم اس کے سامنے بے سدھ و حرکت بستر پر دراز تھا۔۔۔۔۔ تو۔۔۔۔۔ پھر وہ۔۔۔۔۔ اس نے اپنے جسم کو چھونا چاہا لیکن اس کا ہاتھ آ رہا تھا ہو گیا۔۔۔۔۔

ثمنہ اپنے جسم کے پاس ہی بیٹھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ بہت دل گداز اور دردناک منظر تھا جہاں مرنے والے کے پاس سوائے اس کی اپنی روح کے رونے والا بھی کوئی نہیں تھا۔۔۔۔۔

”بیٹی۔۔۔۔۔“ ایک باوقاری آواز نے ثمنہ کو اپنی طرف متوجہ کر دیا۔ وہ ایک ادھیڑ عمر بزرگ تھے۔ سفید لمبی داڑھی اور ہاتھ میں تسبیح تھا اسے وہ چہرے پر ایک خوب صورت مسکراہٹ لئے پیار اور شفقت سے ثمنہ کو دیکھ رہے تھے۔

”جیسا قدرت کے ہر راز میں کوئی نہ کوئی مصلحت ہوتی ہے۔ تم اب زندہ لوگوں میں سے نہیں ہو۔ تم پر دنیا میں جو کچھ جتنی وہ سب تو مجھے معلوم نہیں ہاں مگر میں اتنا جانتا ہوں کہ وہ رب ذوالجلال تم پر بہت مہربان ہے۔ اس نے تم پر خاص عنایت کر کے تمہاری روح کو کچھ مہلت دے دی ہے تاکہ تمہاری ایک آرزوئے تمام

ہیں تو میں انہیں زیادہ تر وہی کہانیاں سناتی ہوں جو کبھی خود ابو کے پاس لیٹ کر سنی تھیں، ان کہانیوں سے میرے ابو کی یادیں وابستہ ہیں جو اب ہم میں نہیں ہیں۔

خیر بات ہو رہی تھی کہانیوں کی جب تک میں چھوٹی تھی ابو سے دیو جن پر یوں بادشاہ ملکہ شہزادوں اور جانوروں کی کہانیاں سنیں لیکن جیسے جیسے شعور آتا گیا تو خود بھی بچوں کا ادب پڑھنا شروع کر دیا۔

ایک بار سردی کی رات تھی امی اون اور سلاٹیاں لے کر کچھ بن رہی تھیں، دوسری چار پانی پر ابو سونے کے لئے لیٹ چکے تھے، میں حسب معمول ابو کے پاس آئی اور رکھا۔ ”ابو کہانی سنائیں۔“

ابو کو غالباً کوئی نئی کہانی، ذہن میں نہیں، مگر تو انہوں نے پہلے سے سنائی ہوئی شاہ بہرام کی کہانی سنانا شروع کی تو میں نے ٹوک دیا۔ ”نہیں ابو یہ پہلے سنی ہوئی ہے آپ آج مجھے کوئی اور کہانی سنائیں جو بائبل سچ ہو، مجھے سچی کہانی سنی ہے۔“ تب ابو نے مجھے یہ کہانی سنائی جو کہ پاس بیٹھی امی نے بھی سنی۔

ابو نے بتانا شروع کیا۔ ”یہ واقعہ ان کے نانا کا ہے۔“ یعنی دادی کے والد کا ابو نے کہا۔

”پرانے وقتوں میں سفر کے لئے بسوں اور گاڑیوں جیسے وسائل نہیں ہوتے تھے زیادہ سے زیادہ یکہ ہی چلتے تھے، وہ بھی مخصوص روٹ پر، امیر لوگ ذاتی گھوڑے رکھتے تھے جبکہ عوام عام طور پر پیدل ہی سفر کرتے، یا پھر یکہ کام آتا، یہ بھی غالباً بیسویں صدی کی ابتدا سے پہلے کا زمانہ تھا اس دور میں رواج تھا کہ شادی بیاہ سے لے کر وفات تک ہر غم خوشی میں لازمی شرکت کی جاتی تھی، تمام دور، نزدیک کے عزیز اقربا بلائے جاتے اور آتے تھے۔

ابو کے نانا کے کچھ عزیز ایک دوسرے گاؤں میں تھے جو خاصہ دوری پر تھا۔ ان کے یہاں شادی میں شرکت کے لئے نانا صبح صادق کے وقت نماز کے بعد روانہ ہوئے اور پیدل سفر کرتے ہوئے دوپہر سے کچھ پہلے جا پہنچے۔ ابو کے نانا بہت سفید پوش شخص تھے، گھوڑے کی استطاعت نہیں تھی ویسے بھی اس دور میں روزمرہ کی خوراک سادہ مگر

بہت خالص اور طاقت بخش ہوتی تھی۔

لوگ بھی محنتی اور نومند ہوتے تھے پیدل سفر کرنا کوئی معنی نہیں رکھتا تھا ابو کے نانا وہاں شادی میں شامل ہوئے، سردیوں کے دن تھے، شام جلدی ہو جاتی تھی، عصر کے وقت تک رخصتی ہوئی تو انہوں نے بھی نماز کے بعد واپسی کے لئے اجازت چاہی، اہل گھرانہ نے انہیں اصرار کیا کہ جاتے وقت رات ہو جائے گی وہ وہیں رک جائیں اور اگلے روز چلے جائیں مگر نانا نے قیام پر آمادگی کے بجائے واپس آنے پر اصرار کیا۔

خیر نانا اپنا سفید مردانہ کھیس اوڑھ کر روانہ ہوئے، سردی غضب کی تھی، جلد مغرب ہو گئی اور مغرب کے بعد رات چھانے لگی، ابو کے نانا تیز قدموں سے راستہ طے کر رہے تھے لیکن رات نے آلیا اور چاند نکل آیا، انہیں امید تھی کہ عشاء کی اذان تک وہ گھر پہنچ جائیں گے لیکن سردی نے بے حالی کر رکھا تھا وہ سوچ رہے تھے کہ کہیں نہ کہیں رات میں کھیت کو پانی لگانے والے کسی کسان سے مل بھٹھیر ہو جائے تو وہ آگ تک ٹاپ لیں کیونکہ رات میں پانی لگانے والے کسان آگک جا لیتے تھے۔

ساتھ ساتھ سردی کے بچاؤ کا بھی حل نکل آئے، وہ تازہ دم ہو جاتے اگر آگ تک ٹاپ لیتے اور آگے جلد پہنچ جاتے۔ چلتے چلتے انہیں کہیں روشنی دکھائی دی تو وہ اس جانب چل دیئے تاکہ کچھ آگ تک ٹاپ لیں وہ چلتے چلتے وہاں پہنچے تو دیکھا کہ آگ کا بڑا سا لاؤ بھل رہا ہے اور بڑے سے گھیرے میں بچے اس آگ کے گرد بیٹھے ہیں تمام کے تمام بچے ہی تھے۔

نانا جلدی سے ان کے گھیرے میں جا کر بیٹھ گئے اور سلام کر کے ہاتھ آگ کی جانب کر دیئے، بچوں نے سلام کا جواب نہیں دیا بلکہ غور سے نانا کو دیکھنے لگے، وہ ہاتھ آگے کر کے آگ تک ٹاپتے تو وہ بچے بھی ہاتھ آگے کرتے، وہ پاؤں آگ کے قریب کرتے تو وہ بھی پاؤں ان کی نقل میں اٹھا کر ویسا ہی کرتے۔

غرض جو نانا نے آگ کے قریب بیٹھ کر کیا انہوں نے بھی کیا۔ پہلے نانا نے غور نہیں کیا، وہ سمجھے کہ بچے ہیں

”جہ سے لگا دو بس.....!“

اور کالی داس خوش ہو گیا۔ اس نے بیگم و جہنم کرنے کے لئے ایک خطرناک عمل شروع کر دیا۔ دن اس شیطانی عمل کے اختتام پر بیگم و جاہت کی واقع ہونا تھی۔ جبکہ دوسری طرف عمل اودھورا چھوڑ۔ کالی داس اور سلمیٰ کی جان کو خطرہ تھا۔ کالی داس نے باقی تمام معاملات بس پشت ڈال کر پیسوں کی لالچ اس مکروہ عمل کو اسی رات سے شروع کر دیا۔

☆.....☆.....☆

آج بیگم و جاہت کی طبیعت بہت عجیب آہور ہی تھی۔ ان کے دل کی دھڑکن بار بار تیز ہو جاتی۔ اور وہ اپنی اکھڑتی سانسوں کو ترتیب دینے کے لئے ایک گھونٹ پانی وقفے وقفے سے پی لیتیں۔ رات 12 بجنے والے تھے۔ کامران اور سلمیٰ سو چکے تھے۔ باہر ہلکی بوند باندی جاری تھی۔ ایسے میں کوئی ان کا ہمدرد نہ تھا جو انہیں ایک کپ چائے بنا کر دیتا۔ جس کی اس سردی میں انہیں انتہائی طلب ہو رہی تھی۔

معاذ وازہ ہلکی سی جہ چڑاہٹ کے ساتھ کھلا اور انہیں لگا جیسے صحن میں سے کوئی گزرا ہے اسے وجود کو میٹھتے ہوئے وہ ہنسنے لگیں اور صحن میں آگئیں لیکن وہاں کوئی نہ تھا۔ ہوا کا ایک سرد جھونکا انتہائی قریب سے گزرا اور خوف سے ان کے پورے جسم پر جھرجھری ہوئی۔ اچانک کچن کی طرف سے ایک انتہائی بھیاں بک چیخ سنائی دی اور ساتھ ہی کچن کی لائٹ خود بخود آن ہو گئی۔ ان کے دل کی دھڑکن بڑھ گئی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے کسی کو بہت اذیت سے مارا گیا ہو۔ چونکہ کامران اور سلمیٰ کا کمرہ ذرا فاصلے پر تھا اور وہ گہری نیند میں تھے اس لئے انہیں آواز نہیں سنائی دی۔ ڈرتے ڈرتے بیگم و جاہت ہمت کر کے کچن کی طرف بڑھنے لگیں۔ وہاں اس وقت کون ہو سکتا ہے؟ بہر حال بیگم و جاہت کچن میں آ ہی گئیں لیکن

”اب رہا واری سے سلمیٰ کی طرف دیکھا۔“
”زندگی تمہاری اجیرن ہو چکی ہے یا کسی اور کی۔“ سلمیٰ نے چہرے پر سوالیہ نظر ڈالتے ہوئے بابا سے پوچھا۔ اور جواباً سلمیٰ نے اپنے آنے کا اصل مقصد کہہ سنایا۔

”بس بابا اب میری جان چھڑا دو اس عورت سے..... اب ویسے بھی دنیا میں اس کا کیا کام۔“
”دنیا میں ہر بندہ اپنے مقررہ وقت پر آتا اور جاتا ہے۔ ہم بھلا کون ہوتے ہیں کسی سے اس کی زندگی چھیننے والے..... میرا تمہیں مشورہ ہے کہ ذہن سے اس شیطانی سوچ کو نکال دو۔ اپنی سانس کو ماں سمجھ کر اس کی خدمت کرو۔ میں یہاں مخلوق خدا کی خدمت کو بیٹھا ہوں نہ کہ کسی بے گناہ کو ناحق ایذا پہنچانے۔ یہ تعویذ لو اور اپنے سبکے کے نیچے رکھ دینا۔ انشاء اللہ تمہارے دل سے یہ شیطانی سوچیں خود بخود ختم ہو جائیں گی۔“ بابا نے کہا اور ایک تعویذ سلمیٰ کے ہاتھ میں تھما دیا۔

☆.....☆.....☆

سلمیٰ کا مسئلہ جوں کا توں برقرار تھا۔ وہ تعویذ اس نے کاٹ کر پہلے ہی ردی کی ٹوکری میں پھینک دیا تھا۔ اور اب بیگم و جاہت کے وجود کو مٹانا اس کی ضد بن چکا تھا۔ اور اپنی اس ضد کو پورا کرنے کے لئے وہ اب ایک بہت گھٹا و نا منصوبہ بنا چکی تھی۔ اس نے سانس پر کالا جادو کرانے کا فیصلہ کر لیا۔ اس مقصد کے لئے اس نے ایک ہندو سادھو سے رابطہ کیا اور اسکے ہی دن وہ اس سادھو کی جھونپڑی میں موجود تھی۔

”ہوں..... تیرا کام ہو جائے گا۔ مجھے ایک خاص عمل کرنا پڑے گا اس کے بعد تیری سانس کا کام تمام۔“ کالی داس کے چہرے پر بھیاں بک آنی لگی۔
”ہم تو یہاں بیٹھے ہی تم جیسوں کی سیوا کے لئے ہیں۔ تم

اور سردی میں آگ تاپ رہے ہیں مگر جب ان کی حرکات دیکھیں اور ارد گرد کے ماحول پر نظر ڈالی تو جان گئے کہ یہ انسانی بچے نہیں کیونکہ اس دیرانے میں انسان کہاں۔

اب وہ جانے کے لئے کھڑے ہوئے تو تمام بچے بھی کھڑے ہو گئے تو نانا نے سوچا کہ اگر وہ چل پڑے تو یہ بچے بھی ان کے ہمراہ ہو جائیں گے اور وہ کسی منیست میں پھنس سکتے ہیں۔ نانا واپس بیٹھ گئے۔

آج کل تعلیم تو عام ہے مگر شعور اور آگاہی عام نہیں، نانا نے جنات کے بارے میں سن رکھا تھا، وہ جانتے تھے کہ اگر وہ خوفزدہ ہوئے تو مشکل میں پڑ جائیں گے، وہ اطمینان سے بیٹھ گئے اور آگ تاپنے لگے۔

جنات آگ سے تخلیق ہوئے ہیں اور آگ سے دور رہتے ہیں اسی بات کو ذہن میں رکھ کر نانا نے آگ سے ایک جلتی لکڑی نکالی اور احتیاط سے اپنی دونوں ٹانگوں کے درمیان کر لی۔

وہ پاؤں کے تل زمین پر بیٹھے تھے جنات کے بچوں نے دیکھا تو بغیر سوچے سمجھے ان کی نقل میں جلتی لکڑی نکال کر ہر ایک نے اپنے نیچے کر لی۔

آگ ان سے کس ہوئی تو وہ چیختے ہوئے گیند کی طرح آسمان کی طرف اٹھل گئے۔

نانا جلدی سے اٹھے اور تیز قدموں سے وہاں سے نکل لئے، آیت الکرسی کا ورد کرتے وہ تقریباً بھاگنے کی رفتار سے گھر کی جانب چل دیے اور بلا خروہ گھر آ گئے، اس قصے میں ان کی ذہانت نمایاں ہوتی ہے، انہوں نے گھبرانے کے بجائے سمجھداری سے جنات کے بچوں سے نجات حاصل کی۔

اس کے بعد مجھے حقیقی پراسرار واقعات سننے کا شوق ہو گیا، میں نے کچھ روز بعد پھر ان کو کوئی حقیقی قصہ سنانے کو کہا، تب ابو نے مجھے یہ واقعہ سنایا۔ اس واقعے میں جن بزرگ کا ذکر ہے۔ ان سے ابو کا رشتہ مجھے اب یاد نہیں اگر ابو حیات ہوتے تو دوبارہ معلوم کر لیتی لیکن اب یہاں انہیں اپنے دادا کے والد فرض کر لیتے ہیں۔

ابو کے بقول پردادا کو نامعلوم وجوہات کی بنا پر

گاؤں سے باہر جانا پڑا جہاں کچھ دن قیام کے بعد وہ واپس آ رہے تھے۔ چلتے چلتے رات ہو گئی۔ انہوں نے مختصر راستہ یعنی شارٹ کٹ استعمال کرنے کا سوچا جو کہ ایک قبرستان سے ہو کر جاتا تھا، گھر جلد پہنچنے کے خیال سے وہ قبرستان میں داخل ہو تو گئے لیکن رات کا وقت اور وہ تنہا کچھ دل پر اثر ہو گیا۔ پردادا نے سوچا اگر ان کے ساتھ کوئی اور ہوتا تو یوں اکیلے اس خوفناک قبرستان سے گزرتا مشکل نہیں ہوتا، باتوں میں راستہ کٹ جاتا، انہوں نے بلند آواز سے آیت قرآنی پڑھنے لگے، مقصد یہ تھا کہ اپنی آواز میں آیت قرآنی سنتے ہوئے راستہ ملے ہو جائے گا، انہوں نے ابھی چند آیات ہی پڑھی ہوں گی کہ یکایک عقب سے گھوڑے کی ٹاپ سنائی دی گردن گھما کر پیچھے دیکھا تو ایک گھڑ سوار آتے معلوم ہوا، قریب آ کر گھڑ سوار نے دادا جی کو پر تپاک انداز سے ”السلام علیکم“ کہا۔

دادا نے ”والسلام علیکم“ کہا۔

گھڑ سوار درمیانی عمر کا صحت مند آدمی تھا۔ بہت متحرک شخصیت تھی۔ اس نے پردادا کے برابر گھوڑا اڑایا اور گفتگو شروع کر دی، تمام راستہ باتیں کرتے ہوئے ملے ہو گیا حتیٰ کہ باتوں میں معلوم ہی نہ ہوا اور وہ بالکل گاؤں کے قریب آ گئے۔

پھر گھڑ سوار نے پردادا سے کہا: ”میاں جی آپ کی منزل تو آگئی اب مجھے اجازت دیجئے۔“ ہاتھ بڑھا کر مصافحہ کیا اور گھوڑا موڑ لیا۔ ابھی وہ چند قدم ہی چلا تھا کہ پردادا کو گھوڑے کی آواز سنائی دینا بند ہو گئی، انہوں نے فوراً مڑ کر دیکھا تو کچھ بھی نہیں تھا، وہ بہت حیران ہوئے کہ اتنی جلدی بھلا گھوڑا دور جا کر نکا ہوں سے اوجھل کیسے ہو سکتا ہے، ابھی تو دو چار لمحے ہوئے ہیں، گھڑ سوار کو مڑے ہوئے وہ ہوا میں تو تحلیل نہیں ہو گیا کیا۔

خیر دادا گھر آئے، نماز عشا ادا کی اور سو گئے، اگلے روز انہوں نے یہ بات اپنے والد سے بیان کی تو انہوں نے کہا: ”بیٹا چونکہ رات کو تم تنہا تھے اور اس وحشت و خوف میں اللہ کے کلام سے مدد چاہی تو اللہ نے انسان اور گھوڑے کی مشکل میں اپنے فرشتے کو بھیجا، وہ باتیں کرتا

کی جان بھی جیسے نکل گئی تھی۔ وہ بہت زیادہ خوفزدہ تھی۔
دوسرے دن کالی واس کی بھیا تک موت کی خبر
نے اس کے رہے سہے اوسان بھی خطا کر دیے اور وہ
بیگم و جاہت کے قدموں میں گر کر اپنی زندگی کی بھیک
مانگنے لگی۔

”معاف کر دو اماں تمہیں خدا کا واسطہ مجھے
معاف کر دو۔۔۔“ وہ گڑ گڑا کر معافی مانگ رہی تھی
جبکہ بیگم و جاہت حیرت سے اسے دیکھ رہی تھیں کہ آخر
یہ سب کیا ماجرا ہے اور سلمیٰ نے مختصر سا سارا واقعہ اپنے
شیطانی منصوبوں کی تمام روداد ان کے گوش گزار کر دی۔
”اٹھو بیٹا۔ میں تمہیں معاف کرتی ہوں۔ بس
اللہ سے معافی مانگو۔ لیکن۔۔۔“ بیگم و جاہت نش و منہ
میں پڑ گئیں۔ اور کچھ لمحوں کے وقفے کے بعد بولیں۔
”لیکن وہ آتما والی بات کا کیا مطلب ہے؟

میرے ساتھ بھی کئی مرتبہ ایسے واقعات پیش آئے ہیں
جو میں نے تم سب سے چھپائے ہیں۔۔۔“
”پتہ نہیں اماں لیکن کالی واس نے بتایا تھا کہ اس
آتما کا آپ سے کوئی خونی رشتہ ہے۔۔۔“ سلمیٰ کی
بات پر بیگم و جاہت چونک پڑیں۔

”خونی رشتہ۔۔۔!“ ابھی وہ یہ سوچ ہی رہی
تھیں کہ ایک انجانی سی نسوانی آواز نے ان کی توجہ کا رخ
موڑ دیا اور وہ آواز کی سمت دیکھنے لگیں۔

”اماں۔۔۔!“ وہ ایک بہت پیاری تازک سی
لڑکی تھی۔ جو سفید چمکتے لباس میں ملبوس، آنکھوں میں
آنسو لئے بیگم و جاہت کی طرف دیکھ رہی تھی۔۔۔

”میں آپ کو یاد ہوں اماں۔۔۔؟“ لڑکی نے
سوالیہ انداز میں بیگم و جاہت کو دیکھا اور پوچھا۔ اور بے
اختیار بیگم و جاہت اپنا دل تمام کر رہ گئیں۔

”میری بیٹی۔۔۔“ ان کی آنکھوں میں آنسوؤں
کا سیلاب اٹھ آیا۔

یہ وہی بچی تھی جسے بچپن میں ہی انہوں نے کسی کو
سوٹپ دیا تھا۔

”ہاں اماں۔۔۔ میں آپ کی وہی بیٹی ہوں جسے

آپ نے کسی کو دے دیا تھا۔ آپ کے وجود کو، آپ کے
پیار کو ساری زندگی ترستی رہی میں۔۔۔۔۔ مرتے وقت بس
ایک ہی خواہش تھی میری اللہ سے کہ میں اپنی ماں کو
دیکھوں، آپ کو دیکھ کر مجھے بہت سکون ملا اماں۔۔۔۔۔!“
”کیا۔۔۔؟ تو اس دنیا میں نہیں رہی۔۔۔؟“

میں تیری مجرم ہوں بیٹا۔۔۔۔۔!“ میں نے بھیک میں بھی
تجھے پیار نہیں دیا اور تو سر کر بھی۔۔۔“ عداامت اور مایوسی
سے بیگم و جاہت کھڑی نہ رہ سکیں اور دو زانو بیٹھ گئیں۔
زبان بند ہو گئی تھی ان کی۔ کہتیں بھی تو کیا کہتیں۔ کچھ بچا
ہی نہیں تھا کہنے کو۔

”نہیں اماں آپ ایسا مت کہیں۔ میری زبان
تو بس ماں کہنے کے لئے ترستی رہی۔ آپ کو دیکھ لیا بس
مجھے اتنا سکون مل گیا جو زندہ رہ کر بھی کبھی حاصل نہ
کر پائی۔ مگر آپ کی جان بچانے کے لئے مجھے دی گئی
مہلت میں تو سب کچھ کر دی گئی۔ بھابھی نے واقعی بہت برا
کیا۔ لیکن وہ اپنی غلطی پر شرمندہ ہیں میں ان کو معاف
کرتی ہوں۔ آپ کو کوئی خطرہ نہیں ہے بھابھی مگر مجھ
سے وعدہ کر دو۔۔۔۔۔ میری ماں کا خیال رکھو گی۔۔۔۔۔“

”میں وعدہ کرتی ہوں تم سے۔۔۔۔۔!“ عداامت
بھرے لہجے میں سلمیٰ نے جواب دیا۔

”ایک وہ وقت تھا جب میں تجھے سینے سے لگانا
نہیں چاہتی تھی اور آج تجھے سینے سے لگانا چاہتی ہوں
بھی تو۔۔۔۔۔“

”اماں شاید اسی میں اللہ کی رضا ہو۔ اب میں
چلتی ہوں۔ آج تمہاری بیٹی بہت سکون سے جا کر اپنے
خالق حقیقی سے ملے گی۔۔۔۔۔“ بیگم و جاہت اور سلمیٰ کی
آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

عزم و ہمت کی محبت کی صدا ہے بیٹی
ہر زمانے میں شجاعت کی ندا ہے بیٹی
یہ جہاں بارہا جھٹلائے تیری عظمت کو
تو ہی ہر گھر میں اجالے کی ردا ہے بیٹی



ہوا تم کو یہاں تک چھوڑ گیا اور جیسے ہی تم مڑے اور کچھ قدم چلے وہ اپنا فرض پورا کر کے غائب ہو گیا، وہ انسان ہوتا تو جاتے ہوئے معلوم ہوتا، اس واقعہ کے بعد دادا نے رات میں تنہا سفر کرنے سے توبہ کر لی۔

اسکول کی زندگی میں بھی ہم تمام بچے کہانیوں کے متلاشی تھے جس دوست کے ہاتھ میں کوئی کتاب یا رسالہ دیکھا تو جھٹ مانگ لیا، ہمیشہ ایک دوسرے سے کہانیاں لے کر پڑھتے لیکن نویں جماعت میں میری دوست بننے والی لڑکی کو جس کا نام انشمن تھا کبھی دلچسپی لیتے نہیں دیکھا، ایک بار میں نے انشمن سے پوچھا: ”تمہیں کتابیں پڑھنا کیوں پسند نہیں؟“

اس نے جواب دیا: ”مجھے بالکل کتابیں پڑھنے کا شوق نہیں اگر تمہیں ہے تو میرے گھر میں بہت سی کتابیں ہیں جو میری امی پڑھتی ہیں، کہو تو لا دیا کروں۔“ اندھا کیا چاہے دو آنکھیں اس کے مصداق میں سے نوراً خواہش ظاہر کر دی۔

ایک دن اس نے مجھے اپنے گھر مدعو کیا میں نے گھر آ کر امی سے اجازت مانگی، انہوں نے بھائی کے ساتھ جانے کی تاکید کے ساتھ اجازت دے دی۔ چھٹی کے دن میں نئی کتب کے اشتیاق میں تیار ہو کر بھائی کے ساتھ انشمن کے گھر پہنچی وہ مجھے اپنے ہاں دیکھ کر بہت خوش ہوئی، اس کی والدہ بھی مجھے بہت محبت سے ملیں۔

بھائی کا ارادہ مجھے چھوڑ کر واپس جانے کا تھا، لیکن انشمن کے بڑے بھائی نے انہیں مہمانوں کے کمرے میں بیٹھا لیا اور خود کہانی دینے لگے، خیر بہت اچھی ملاقات رہی ساتھ ہی ان کی امی کے ذوق کا اندازہ ہوا، وہ بہت ادبی ذوق والی خاتون تھیں، گھر سنبھالنے کے ساتھ ساتھ مطالعہ کو بھی بھرپور وقت دیتیں، ان کے پاس میں نے باقی کتب کے ساتھ پراسراریت کے موضوع پر بھی بہت سی اچھی اور تحقیقی کتابیں دیکھیں اس بارے میں، میں نے ان سے سوال کیا تو انہوں نے کہا: ”میں خود عملی زندگی میں اس تجربے سے گزر چکی، اسی لئے یہ موضوع میرے لئے بہت خاص ہے۔“

میں نے ان سے کہا: ”وہ مجھے بھی اس تجربے کی کہانی سنائیں۔“ تو انہوں نے بلا تردد مجھے یہ بات سنائی۔ ”فرزاندہ آنٹی کے مطابق 82ء کے آغاز میں ان کی شادی ہوئی، شادی غیر خاندان میں ہوئی تھی، اس لئے وہ اپنے سرسالیوں کے مزاج سے قطعی ناواقف تھیں، ان کی ساس نے ان کا رشتہ تو بہت اہتمام اور چاہت سے کیا، شادی بھی معقول انداز میں کی لیکن طبیعتاً ان کا تعلق اس طبقہ سوچ سے تھا جو بہو کو حریف کی نظر سے دیکھتے ہیں اور اس کی خامیوں اور خوبیوں کو پرکھنے بغیر روز اول سے محاذ بنا لیتے ہیں۔“

انہیں شادی کے روز سے اگلے ہی دن ولیمہ کے دن ساس کے تیور بہت جارحانہ محسوس ہوئے اور پھر انہوں نے ہمیشہ ان سے نہایت متعصبانہ رویہ روارکھا۔ ان کی ساس جتنی تیز تھیں ان کے شوہر اتنے ہی سادہ اور والدہ سے دبے والی طبیعت کے تھے۔

خیر وہ صبر کے ساتھ گزارہ کرتی رہیں لیکن ایک بات اپنے گھر یعنی شوہر کے گھر آنے کے بعد محسوس کی کہ ان کی ساس نے انہیں گھر کا سب سے بڑا کمرہ دیا جبکہ انہیں فراخ دلی کچھ عجب لگی دوسرا یہ کہ وہ شادی کے فوراً بعد انہیں اپنے کمرے میں وہ جب بھی تنہا ہوتیں انہیں بہت زیادہ خوف و ڈر محسوس ہوتا جبکہ باقی گھر میں ایسی کوئی کیفیت نہیں ہوتی، انہوں نے اس سے نجات کے لئے نماز اور تلاوت کی پابندی کر لی۔ اگرچہ شادی سے قبل بھی وہ پابند شرع تھیں لیکن شادی اور شوہر میں مصروف ہو کر کچھ غفلت آ گیا لیکن جلد ہی انہوں نے یہ معمول درست کر لیا، ساتھ ہی کمرے کی صفائی پر بہت توجہ دی ان کے بقول وہ ہمیشہ سے سلیقہ اور صفائی پسند طبیعت کی مالک ہیں، یہی اصول انہوں نے اپنے کمرے کے لئے رکھا جبکہ باقی گھر کے افراد معمول کی لگی بندھی صفائی تو کرتے لیکن طہارت کی باریکدوں پر کم توجہ دی جاتی۔

خیر ان کی طہارت اور مذہبی امور کی پابندی سے ڈر خوف کی کیفیت تو ختم ہو گئی لیکن کمرے میں انہیں اکثر اپنے علاوہ کسی کی موجودگی کا احساس ہوتا، شوہر ساتھ

سر چھپا کر اٹھنے لگتے ان درختوں پر ان کے خون آلود پنچوں کے نشانات صاف دکھائی دیتے تھے۔ یہاں چاروں طرف مردہ گوشت کی بدبو پھیلی رہتی۔ رہی کسی کسر دلدل سے اٹھتی ہوئی بدبودار ہوا پوری کر دیتی۔

اس لئے شہر کا کوئی شریف آدمی ادھر کا رخ نہیں کرتا تھا۔

لوگ دور سے اس پرانے مکان کو دیکھتے اور زیر لب بڑبڑاتے ہوئے دوسری طرف منہ پھیر لیتے۔ مکان کا بیرونی پھاٹک کب سے ٹوٹ چکا تھا۔ اندر داخل ہوتے ہی مردار خور پرندوں کی مکروہ آوازیں سنائی دیتیں۔ طویل برآمدے کے دونوں طرف چھوٹے بڑے کمرے تھے جن کے دروازوں پر رنگ آلود تالے پڑے رہتے، آخری حصے میں لکڑی کی گول گھومتی ہوئی سیرھیاں تھیں جن سے گزر کر دوسری منزل تک پہنچا جاسکتا تھا، ان کی لکڑی اس قدر بوسیدہ تھی کہ پاؤں رکھتے ہی جہ جہانے لگتی۔ نیم تاریک سیرھیوں کو عبور کرتے ہی وہاں کمرہ آتا، جو پرانے کپڑوں، قدیم طرز کے فرنیچر اور لکڑی کے بڑے بڑے صندوقوں سے بھرا ہوا تھا۔ اس کی دیواروں پر شیر چیتے اور دوسرے جنگلی جانوروں کے سر آرائش کے طور پر لگائے گئے تھے۔

کمرے کے عین درمیان میں چھت سے ایک بلوری فانوس لٹک رہا تھا جس کے رنگ گردش زمانہ کے ہاتھوں معدوم ہو چکے تھے۔ اس ہال کا دوسرا دروازہ ایک ایسے برآمدے میں نکلتا تھا جس میں ہر وقت مکمل تاریکی رہتی تھی، یہاں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر بجلی کے قہقہے لگے ہوئے تھے۔ جن میں سے ایک استعمال کے قابل تھا اور دھند میں لپٹی ہوئی صبح کی سورج کی طرح ماحولی کو روشن کرنے کی پوری کوشش کر رہا تھا۔ ٹپلی منزل کی طرح اس برآمدے کے دونوں طرف بھی بہت سے کمرے تھے لیکن وہ سب کے سب مقفل رہتے فرش دکھائی دیتا تھا جس پر بھبھکی چھپکیاں منہ کھولے خوراک کی تلاش میں ماری ماری پھرا کرتیں۔ یہاں پہنچ کر برآمدہ ختم ہو جاتا تھا آگے مکان کا وہی حصہ دکھائی دیتا جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ یہاں

سے درختوں کی ٹہنیاں اس قدر قریب تھیں کہ پرندوں کو ہاتھ بڑھا کر پکڑا جاسکتا تھا۔ تاہم ان کی گول سرخ آنکھوں اور خون میں سے ہوئے غلیظ جسموں کو دیکھ کر کسی کی ہمت نہیں پڑتی تھی۔

لکڑی کے پل سے گزر کر اس عمارت کے واحد آباد کمرے تک پہنچا جاسکتا تھا۔ کمرے کی دیواروں پر بھانت بھانت کی بے شمار کھواریں، خجریز سے اور ڈھالیں آویزاں تھیں انہیں دیکھ کر بخوبی اندازہ کیا جاسکتا تھا کہ اس جگہ رہنے والے شخص کا مشغلہ قدیم اسلحہ جمع کرنا ہے، جنوب کی سمت ایک کھڑکی کھلتی تھی۔ جس میں سے دلدل کی جھاڑیاں نظر آتی تھیں۔

مانسی میں انجان مسافر جھاڑیوں کو دیکھ کر یہ سمجھتے کہ ابھی دلدل شروع نہیں ہوئی۔ اور مزے مزے گھاس پر چلتے ہوئے اس جگہ آ پہنچتے تھے جہاں سے واپس جانا ناممکن تھا۔ پلک جھپکنے میں ان کی چینی اور گرد و نواح کے مردار خور پرندوں کا شور سنائی دیتا، تھوڑی دیر کے لئے جس جگہ وہ غرق ہوتا وہاں بڑے بڑے پلے دکھائی دیتے اور پھر غائب ہو جاتا۔

نیچتے چلاتے پرندے غرق ہوتے ہوئے جسم سے گوشت نوچ کر اپنی اپنی راہ لیتے اور جلد ہی فضا میں بھیاٹک خاموشی چھا جاتی، اس خطرے کے پیش نظر گزشتہ سال لوہے کا ایک جنگلہ لگادیا گیا تھا تاکہ اجنبی لوگوں کو دلدل کا پتہ لگ سکے۔

اس روز آسمان پر گہرے بادل چھائے ہوئے تھے، رات بھر زور کی بارش ہوئی تھی اس لئے چاروں طرف جل تھل ہو رہا تھا اور دلدل سے مینڈکوں کی آوازیں آرہی تھی۔ مکان میں اداسی چھائی ہوئی تھی۔ مردار خور پرندے بارش میں بھیگنے کی وجہ سے چپ چاپ شاخوں پر بیٹھے تھے۔ رات کے وقت برآمدے میں دو تین آوارہ کتوں نے ڈیرہ جمالیا تھا۔

صبح کے دس بجے ہوں گے جب رجنی مکان میں داخل ہوئی وہ تیکھے نقوش اور چھریا بدن کی ایک خوبصورت عورت تھی۔ اس کی عمر چھپیس سال کے لگ بھگ تھی۔ اس

معرکہ کی جنگ کی جس کا مقصد محض بہو کو بیٹیوں اور خود کے سامنے بالکل نیچے لگ کر رہنے کا عندیہ دینا تھا۔

اس دن وہ بہت ٹوٹی ہوئی اور دل گرفتہ تھیں، اپنے کمرے میں جا کر دیر تک روتی رہیں اور مصمم ارادہ کر لیا کہ اب وہ بالکل اس گھر میں نہیں رہیں گی۔ یہاں تک کہ روتے روتے وہ بھوکی ہی سو گئیں۔

سخت سردی کا موسم تھا اور وہ بغیر لحاف اوڑھے لیٹ گئی تھیں، کسی نے ان سے کھانے کا نہ پوچھا، وہ ایسی حالت میں تھیں کہ بھوک جلد لگ جاتی اور برداشت نہیں ہوتی۔

رات بارہ بجے کے بعد وہ اچانک یورین آنے کی حاجت کے لئے اٹھ گئیں، دیکھا تو لحاف ان کے اوپر تھا جبکہ انہیں ٹھیک سے یاد تھا کہ لحاف نہیں اوڑھا تھا، خیر وہ داش روم سے باہر آ کر ہاتھ منہ دھو کر پکن کی طرف آئیں تاکہ کچھ کھاپی لیں، دیکھا تو پکن مقفل تھا انہیں شدید دکھ ہوا، اوپر سے غضب کی بھوک لگی ہوئی تھی وہ واپس کمرے میں آئیں تو لاسٹ آن کی دیکھا تو بیڈ پر ایک ٹرے رکھی ہوئی تھی وہ حیرانی کے ساتھ ٹرے میں دیکھا تو تین طرح کا کھانا تھا انہیں چونکہ بھوک تھی وہ فوراً کھانے لگ گئیں بہت لذیذ کھانا سیر ہو کر کھایا اور برتن ایک طرف رکھ کر سو گئیں۔

صبح فجر سے پہلے خواب دیکھا کہ ایک نہایت نفیس اور شائستہ عورت انہیں مخاطب کر کے کہتی ہے۔ ”فرزانہ گھبراؤ نہیں یہ تکلیفیں عارضی ہیں، کامیابی تمہیں ہی ملے گی، کبھی واپس جانے کا نہ سوچنا، یہ سب تدبیریں تمہیں نکالنے کے لئے ہی کی جا رہی ہیں اور ہم بھی تم سے خوش ہیں، تم بہت نیک ہو۔“

اس کے بعد آنکھ کھلی تو اذان ہو رہی تھی، وہ انھیں اور نماز ادا کی، تلاوت کی۔

رات کے واقعہ کے برعکس ان کی طبیعت بہت ہلکی پھلکی تھی حیران کن بات یہ تھی کہ رات کے کھانے والے برتن بھی غائب تھے، وہ فارغ ہو کر معمول کے کاموں میں لگ گئیں، ساس صبح انہیں ہشاش بشاش دیکھ

ہوتے تو بہت احسن و خوبی سے وقت گزرتا لیکن جب تنہا ہوتیں تو لگتا کہ ان کے ساتھ کوئی اور بھی ہے، ساس صاحبہ نے اکثر کمرے میں آ کر جائزہ لیتا اور سوال کرتا۔ ”تم یہاں ٹھیک ہو، دل لگ گیا۔“ انہیں عجیب تو لگتا لیکن مائل جاتیں۔

ایک روز جب ساس گھر پر نہیں تھیں تو سب سے چھوٹی نند نے ان سے پوچھا۔ ”بھابھی آپ کو ہمارے ہاں آئے دو ماہ ہو گئے ہیں۔ آپ کو کبھی اپنے کمرے میں ڈر و خوف تو نہیں لگا۔“

فرزانہ نے اناس سے سوال کیا۔ ”تم یہ کیوں پوچھ رہی ہو؟“

تو اس نے بتایا۔ ”بھابھی امی سے نہ کہنا بات یہ ہے کہ ہمارا یہ کمرہ کچھ بھاری ہے، امی کہتی ہیں کہ اس کمرے میں کوئی نادیدہ شے ہے۔ ہم تو چند بار یہاں رات سوئے تو بہت بری طرح ڈر گئے، امی کو تو دو بار پھنر بھی پڑ چکا ہے، ہم تو یہ کمرہ استعمال ہی نہیں کرتے تھے۔“ وہ بچی تھی۔ سادگی میں تمام بات اگل دی تو انہیں سمجھ میں آیا کہ ان کی ساس صاحبہ کی فراخ دلی کا سبب کیا ہے لیکن چونکہ ان کے ساتھ کچھ غلط نہیں ہوا تھا سو وہ بالکل نہیں گھبرائیں۔

اسی دوران ان کا پاؤں بھاری ہو گیا، اس خوشگوار امر نے بھی ان کی ساس کی طبیعت پر کوئی مثبت اثر نہیں ڈالا بلکہ ان کے اس کمرے میں کسی شکوہ و شکایت کے بغیر اتنا عرصہ خیر خیریت سے رہنے پر اناجڑی گئیں، انہیں لگا کہ اپنے کمرے پر جو کوئی بھی قابض ہے اس نے گھر کے مالک افراد سے تو سخت رویہ رکھا جبکہ وہ نئی آنے والی خوش اسلوبی سے رہ رہی ہے، اس بات نے انہیں زیادہ تلخ کر دیا۔

فرزانہ کبھی بھی اس اذیت بھری زندگی سے گھبرا کر اپنے والدین کے گھر واپس جانے کا سوچ لیتیں، یہاں تک کہ ایک روز ان کی طبیعت خاصی ماساز تھی، شوہر شہر سے باہر کاروباری سلسلے میں گئے تھے۔

موقع غنیمت دیکھ کر ساس صاحبہ نے نہایت

ہوئے بھی کہ وہ ایک لفظ بھی نہیں سن سکتا۔ عاجزانہ لہجے میں بولی۔ ”مجھے معاف کر دو میں بیمار ہو گئی تھی۔“

لوٹھڑے میں حرکت پیدا ہوئی شامو نے سر ذرا اوپر اٹھایا اور دیوار سے دے مارا دیوار اس کا مطلب سمجھ گئی جب کبھی وہ کچھ کہنا چاہتا تو اسی طرح دیوار سے سر ٹکرایا کرتا تھا۔ اس نے میز پر سے ہینسل اٹھائی اور اس کے دانتوں میں دے دی اور کاپی کھول کر اس کے چہرے کے قریب لے گئی۔ ہینسل آہستہ آہستہ کاغذ پر پھرنے لگی۔ تھوڑی دیر بعد شامو کا سر تھک کر نیچے ڈھلک گیا اور ہینسل اس کے منہ سے نکل کر فرش پر گر پڑی۔

رجنی نے کاپی اٹھائی میز سے میز سے شکستہ حروف میں لکھا تھا۔ ”کہاں گئی تھی؟“

رجنی نے ہینسل اٹھائی اور لکھا۔ ”میں بیمار تھی اس لئے اسپتال چلی گئی تھی آج صبح جونہی ہوش آیا اٹھ کر چلی آئی۔ تمہیں بہت تکلیف ہوئی ہوگی مجھے معاف کر دو۔“

شامو اسے پڑھ کر مطمئن نہیں ہوا کھانے کو دیکھتے ہی اس کی آنکھوں میں چمک پیدا ہو گئی۔ رجنی لے گئے بنا کر اس کے منہ میں ڈالنے لگی۔ کھانے کے بعد اس نے شامو کے کپڑے اتار دیئے صاف کپڑے پہنانے سے پہلے اس نے ایک نظر اس کے مفلوج جسم پر ڈالی اس کی دونوں ٹانگیں جڑ سے کٹ چکی تھیں، زخم چونکہ بھر چکے تھے اس لئے دھڑکا نچلا حصہ اب گول میند کی طرح دکھائی دے رہا تھا۔ اسے متلی سی ہونے لگی، لمبیض پہناتے وقت اس نے بازوؤں کی طرف دیکھا ایک بازو کندھے سے ذرا نیچے تک موجود تھا۔ اس پر بوجھ ڈال کر شامو اپنا دھڑا سا اوپر اٹھالیا کرتا تھا، دوسرا بازو دوسرے سے غائب تھا، کھانے کے بعد شامو کی آنکھیں دوبارہ غضب آلود ہو گئی تھیں۔

رجنی نے اسے خوش کرنے کے لئے آخری حربہ آزما تے ہوئے آنکھیں بند کر لیں اور جی کڑا کر کے اس کی پیشانی چوم لی۔ گرم گرم گوشت کو محسوس کرتے ہوئے اسے بیمارگی پر رونا آ گیا اور سسکیاں لیتی ہوئی باہر نکل گئی۔

لکڑی کے پل پر کھڑے ہو کر اس نے چاروں طرف دیکھا اسے بے اختیار وہ دن یاد آ گئے جب اس کی شادی ہوئی تھی۔ اس وقت شامو پچیس سال کا ایک صحت مند نوجوان تھا وہ فوج میں ایک معمولی سپاہی تھا۔ لیکن اس سے کیا فرق پڑتا تھا وہ دونوں ایک دوسرے سے بے انتہا پیار کرتے تھے۔ دن بھر وہ اسی پل پر کھڑا ہو کر اس کا انتظار کرتی اس کا چہرہ سرخ ہو جاتا اور وہ ایک ہی سانس میں سیڑھیاں اترتی ہوئی پھاٹک تک پہنچ جاتی، اس وقت یہ گھراؤ سا ویسا نہ تھا اس کے باغ میں پھول کھلا کرتے تھے جن پر بے شمار تلیاں منڈلاتی تھیں۔ سارا گھر شیشے کی طرح چمکتا تھا اس کے پتی کو بھی محاذ پر جانا پڑا۔ جنگ کے دوران میں وہ اسے ہر ہفتے خط لکھا کرتا اور ایک دن اس کی ساری خوشیاں اس سے چھین گئیں۔

دبتر جنگ سے اطلاع ملی تھی کہ اس کا بچہ ایک بم پھٹنے سے زخمی ہو گیا ہے اور وہ اسپتال آ کر اسے دیکھ سکتی ہے۔ وہ آنسو بہاتی اسپتال گئی، فوجی اسپتال میں ایک بڑے چمک پر اس کا بچہ لیٹا تھا۔ اسے دیکھ کر خوف کے مارے اس کی چیخ نکل گئی۔ چھ فٹ لمبے صحت مند نوجوان کی جگہ بستر پر ایک مسخ شدہ صورت پڑی تھی جو پہلی نظر میں ذبح کیا ہوا جنگلی جانور معلوم ہوتی تھی۔

ڈاکٹر نے اسے سمجھایا لوگوں نے اسے تسلی رشتہ داروں نے صبر کی تلقین کی اور وہ سب کچھ چپ چاپ برداشت کر گئی۔ اس کی چیخ کے بعد کسی نے اس کے منہ سے شکایت کا ایک لفظ بھی نہیں سنا، وہ جنگ میں اس ٹوٹے ہوئے کھلونے کو سینے سے لگا کر گھر لے آئی۔

اخبارات نے کالم لکھے، عوام نے تعریفی خطوط بھیجے ایک مدت تک ان کا گھر ملاقاتیوں سے بھر رہا۔ اخبارات کے رپورٹر، افسانہ نگار قومی لیڈر، فوجی افسر، ہمدرد، عورتیں بچے اور بوڑھے اس کھلونے کو دیکھنے کے لئے آتے رہے۔ اس ہنگامے سے وہ بہت خوش ہوئی، خطابات اور انعامی شوقیلیٹ دیکھ کر وہ پھولنے لگتا، کل تک وہ ملک کی ایک گناہم شخصیت تھی، لیکن آج ملک کے گوشے گوشے میں اس کا چہرہ تھا اخبارات دھڑا دھڑا اس کی تصویریں

حافظ کہہ کر غائب ہو گئیں۔

میں نے ان کے جانے کے بعد ساس امی کو آواز دی تو وہ ڈرتے ڈرتے اندر آ گئیں۔ پونادیکھا تو حیرت سے آنکھیں کھلی رہ گئیں بولیں۔ ”فرزانہ دایہ تو میرے ساتھ ہے یہ سب کس نے کیا اور یہ تمہارے کمرے میں وہ بد صورت بلا کون تھی؟“

میں نے بات بنائی کہ ”امی مجھے کچھ معلوم نہیں میں تو یہ کبھی کہہ نہیں آپ لائی ہیں۔“

دایہ کو بھی بھاگنے کی پڑی تھی وہ یہ کہہ کر بھاگ گئی کہ ”سارا کام تو ہو گیا اب میری کیا ضرورت۔“

خیر ساس صلیب کچھ خاموش ہو گئیں۔ اس واقعہ کے بعد ساس نے مجھے کبھی شک نہیں کیا بلکہ کہنے لگیں کہ ”بچہ سال بھر کا ہو رہا ہے، اب دوسرے بیٹے کی شادی کرنی ہے تم انگ گھر کر لو۔“ یہ بات سب سے قہقہہ انگیز تھی وہ خود الگ ہونے کا۔ کہہ رہی تھیں۔ میں تو پہلے ہی تیار تھی۔ شوہر نے پہلے کرایہ پر گھر لیا لیکن بعد میں حالات اتنے اچھے ہوتے گئے کہ تین سال کے اندر گھر ذاتی لے لیا اب ہمارے پاس اللہ کا دیا سب کچھ ہے۔

بعد میں وہ چھوٹے دیوڑھی بیوی بیاہ کر لائیں تو اسے بھی دینی کمرہ دیا لیکن وہ ایک مہینہ سے زیادہ نہ ٹک سکی، اٹنا جینا ماں کو مار پیٹ کر اسے وہ کمرہ دے دیا اور خود دوسرے کمرے پر قابض ہو گیا، ساس چند ماہ بیمار رہ کر اللہ کے گھر چلی گئیں۔

میں نے اس کمرے میں ڈھائی سال کا عرصہ گزارا لیکن اپنے اچھے اعمال اور مذہبی رجحان کی بدولت فلاح پائی جبکہ میرے علاوہ جو بھی مکتب ہوا تباہ ہو گیا، اس تجربے کے بعد سے میرا دھیان اب ان موضوعات پر بہت بڑھ گیا ہے اور یہ کتابیں اسی پر موضوع ہیں، آپ لے کر پڑھ سکتی ہیں۔“ میں نے دو تین بہترین کتب اور کچھ رسالے لئے اور بھائی کے ساتھ گھر آ گئی۔



کہہ بکا تھی رہندیں بھی جو یہ سوچ رہی تھیں کہ اب بھابھی سامان اٹھا کر چلتی بنے گی اسے گھر کے کام کرنا دیکھ کر حیران ہو گئیں۔

یہاں تک کہ ان کے زچگی کے دن قریب آ گئے وہ اپنے سیکے جانا چاہتی تھیں، والدہ اور بھائی لینے بھی آئے مگر ساس نے رواج کا حوالہ دے کر نہ دیا کہ ”پہلی زچگی سسرال میں ہوگی۔“ جانے سے روک دیا، والدہ نے بھی کہا کہ وہ خود آ جائیں گی ہوں وہ پھر سسرال میں رہ گئیں۔

ساس نے دایہ کو بلوا کر سارے احوال معلوم کر لیا۔ دو دن بعد انہیں محسوس ہوا کہ وقت قریب آ رہا ہے تو انہوں نے ساس کو خبر کی تو اس نے کہا کہ ”صبر کرو ابھی کچھ وقت ہے۔“

دوپہر کے وقت کچھ تکلیف میں اضافہ ہوا تو وہ یہ کہہ کر دایہ کو لے کر آتی ہوئی چلی گئیں۔ شوہر اپنے کام پر گئے ہوئے تھے، گھر پر فون کی سہولت ابھی آئی نہ تھی۔ چھوٹی نندا اسکول گئی ہوئی تھی اور بڑی گھر کے کام کر رہی تھی۔

ساس کو گئے خاصہ وقت گزر گیا لیکن نہ خود آئی نہ دایہ۔

وہ اپنے کمرے میں آ کر شدت تکلیف سے بے حال ہو کر زمین پر لیٹ گئیں۔

اچانک ایک عورت جس نے عمدہ لباس پہن رکھا تھا، نہایت خوب صورت لیکن صورت سے نا آشنا بھیجی بھیجی خوشبو اس کے وجود سے آرہی تھی، ان کے قریب آ کر بیٹھ گئی اور پیشانی پر ہاتھ رکھ کر بہت شفقت سے تسلی دی اور کہا۔ ”گھبراؤ نہیں میں آ گئی ہوں۔“

اس نے کچھ پڑھ کر پھونک ماری تو لگا سارے جسم و جاں میں راحت اتر گئی، پھر اگلا تمام مرحلہ اس نے اپنے ہاتھوں انجام دیا۔

اس دوران ہی ساس دایہ کو لے کر آ گئیں، لیکن کمرے کے اندر جیسے ہی آئیں، فوراً گھبرا کر پلٹ گئیں، اللہ نے بہت صحت مند اور صحیح و سالم جینا عطا کیا، تمام کام بہت خوبی سے مکمل کرنے کے بعد خاتون نے ایک مگلاس میں کوئی مشروب دیا اور سہارے سے بیٹھا کر پلایا اور اللہ

شام تک رجنی کی حالت سنبھل گئی اور اسے اپنے کئے پر ندامت محسوس ہوئی۔ اس نے بڑی محنت سے اچھی اچھی چیزیں پکائیں اور بڑے پیار سے شامو کو کھلانے لگی۔ شامو نے مزاحمت کی اور ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے تختی سے ہونٹ بند کر لئے لیکن وہ تازہ کھانے کی خوشبو نے جلد ہی اسے بے بس کر دیا۔

بستر پر لیٹے لیٹے رجنی نے آنکھیں کھول کر چاروں طرف دیکھا کمرے میں اندھیرا تھا کھڑکی کے راستے اندر آتی ہوئی چاند کی کرنیں شامو کے چہرے اور سینے پر پڑ رہی تھیں۔ اس کی آنکھیں ابھی تک چھت کبگھور رہی تھیں جیسے وہ کیا سوچ رہا تھا۔

رجنی دھیر سے بولی دفعتاً اسے خیال آیا کہ وہ اس کی تین دن کی غیر حاضری کے متعلق سوچ رہا ہے۔ اس نے ناگواری سے گوشت کے اس ڈھیر کی طرف دیکھا اچانک ایسا محسوس ہوا کہ وہ اس شخص سے شدید نفرت کرتی ہے۔ یہ وہ شخص تھا جس کے لئے وہ تین سال سے اس بے ہودہ جگہ پر رہتی تھی جہاں اسے کسی سے گفتگو کئے بغیر عرصہ گزر چکا تھا یہ وہی تھا جس کے لئے وہ زندگی کی تمام سربقوں سے کنارہ کش ہو کر دن بھر اس کے اپناج والا چار بسم کے پاس بیٹھی رہتی تھی اور اب وہی شخص اسے بدکردار سمجھ رہا تھا۔ وہ اب سب کچھ برداشت کر سکتی تھی لیکن ایک مشرقی عورت کی طرح اپنی آبرو کے متعلق ایک لفظ سننا بھی اسے گوارا نہ تھا۔ اس نے اپنے ہونٹ تختی سے بند کر لئے اور اپنے آپ کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی لیکن نفرت کا دھارا پورے زور سے شور سے بہہ نکلا تھا۔ اس کا سارا جسم کانپنے لگا۔ یوں محسوس ہوا جیسے اس کے اندر آگ جل رہی ہے اور جب تک وہ اس کی منہوں آنکھوں کو ختم نہ کر دے یہ آگ ٹھنڈی نہیں ہو سکتی۔

ایک جست میں وہ شامو کے معذور جسم پر جا چڑھی اس نے آخری مرتبہ ان آنکھوں کی طرف دیکھا۔ ان میں بے پناہ غصہ تھا۔ نفرت اور حقارت تھی رجنی نے منٹھیاں کھول دیں اور دونوں انگوٹھے تختی سے اکڑا کر پوری قوت سے اس کی آنکھوں میں ٹھونس دیئے،

وہ پاس بیٹھی انہماک سے یہ تماشا دیکھتی رہی، شامو تکلیف سے سر زور زور سے دیوار پر مارنے لگا، بار بار وہ اپنے بازو نڈھلاتا کہ چیونٹے کو گراسکے۔ لیکن اس کی گول مول نڈ کو ترک کرتے دیکھ کر رجنی کی آنکھیں وحشیانہ جذبے سے جھٹکنے لگیں دوسرے کی تکلیف پر خوش ہونے کی انسانی جبلت جاگ اٹھی تھی۔ اس نے دیوار پر سے قین چار چیونٹے پکڑے اور شامو کے رخسار پر رکھ دیئے۔ ذرا سی دیر میں وہ سب کے سب اسے کاٹ رہے تھے۔ اب وہ بری طرح ٹپ رہا تھا، سارا درد اس کی آنکھوں میں سمٹ آیا تھا جو تکلیف سے پیٹ رہی تھیں وہ انتہائی بے چارگی سے اپنی دکھ سکھ کے ساتھی کو دیکھ رہا تھا جو اس کی محتاجی پر جی کھول کر فیس رہی تھی۔

اچانک رجنی ڈر گئی اگر یہ شخص حرکت کرنے کی طاقت رکھتا تو اس کی ہڈیاں نوچ لیتا۔ اس نے چیونٹیوں کو ہاتھ سے مسل دیا اور اس کے چہرے کو دھواں لگا دی۔ اس شام وہ ڈاکٹر سے ملی جس نے اسے بتایا کہ دماغی توازن درست نہیں۔ بہت سی دوائیں لے کر وہ واپس آئی اور تکیہ میں منہ چھپا کر تنہا رات بھر روتی رہی۔

.....

تین سال گزر گئے اس طویل عرصے میں اس کی حالت ابتر ہوتی چلی گئی۔ شروع میں اس کی جنونی کیفیت کبھی کبھار ختم ہو جایا کرتی تھی لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ کیفیت اس کی فطرت ثانیہ بن گئی۔ اب وہ بات بات پر شامو کو زانتی۔

ایک روز بازار میں اس نے ایک شخص کو دیکھا جو اپنی بیوی کو انتہائی بے دردی سے پیٹ رہا تھا۔ اس کے اندر چھپی ہوئی نفرت جاگ اٹھی۔ مردوں سے انتقام لینے کا جذبہ شدت پکڑ گیا حتیٰ کہ گھر پہنچ کر اس نے شامو کا چہرہ پھٹروں سے سرخ کر دیا۔ اس کے منہ سے بے بپ کی آواز نکلتی رہی۔ تکلیف کی شدت سے اس کے لقمے جیسے جسم میں ارتعاش سا پیدا ہو گیا وہ بے چینی اور کرب سے سر دیوار سے ٹکرائے لگتا حتیٰ کہ سر سے خون بہنے لگا اور پھر تک آ کر وہ آنسو بہانے لگا۔



بیٹی

شگفتہ ارم درانی - پشاور

لالچی کالے جادو کے عامل نے عورت کو موت سے ہمکنار کرنے کے لیے عمل شروع کر دیا کہ اچانک ایک ہاکیڑہ طاقتور روح اس کے سامنے آدھمکی اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے عامل کا عمل الٹ ہو کر عامل کو موت سے ہمکنار کر دیا۔

حقیقت میں اور واقعی بیٹیاں والدین کے لئے دل کا سرور اور آنکھوں کی ٹھنڈک ہوتی ہیں

کے جلوے ہر طرف سے بیدار ہو کر اپنے پروردگار کی تسبیح بیان کرنے لگتے ہیں۔ بیگم و جاہت کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ وہ اپنے مالک سے اپنے گناہوں کی معاف مانگ رہی تھیں۔ بچے دنوں کی یادیں مسمی فلم کی طرح کے دماغ کی اسکرین پر ابھرنے لگیں۔
”بیٹی..... پھر سے بیٹی..... پتہ نہیں تو

صبح کی روشن کرنیں ہر طرف اچالا پھیلا رہی تھیں۔ چڑیوں کی چھبھاہٹ کی دفریب آوازیں ہر گھر کے در و بام پر دستک دینے لگی تھیں۔ بیگم و جاہت جیسے نماز پر بیٹھی اپنے رب سے دعائیں مانگ رہی تھیں۔ یہ وقت ہی اتنا خوشگوار اور پرسکون ہوتا ہے کہ اکاونہا سے بے خبر ہو کر بس اپنے خالق و

وہ واقعی پراسرار قوتوں کا مالک تھا، اس کی حیرت انگیز اور جادوئی کرشمہ سازیاں آپ کو دنگ کر دیں گی

مگزشتہ قسط کا خلاصہ

حضور میں تو حکم کا غلام ہوں، مجھے اپنے دوش میں کرنے والا غافل جو حکم دے گا وہ میں کرنے پر مجبور ہوں۔ آپ جب اپنے علم سے مجھے حاضر کر سکتے ہیں تو یہ بھی معلوم کر سکتے ہیں کہ مجھے اس کام پر لگانے والا کون ہے اور کس شکتی کا مالک ہے۔ یہ سن کر رولو کا بولا میں تو معلوم کر سکتا ہوں لیکن اگر تو بیان کر دے گا تو رام داس بھی سن لیں گے جو کہ اس مسائل سے متاثر ہیں۔ یہ سن کر ہیولہ بولا۔ مہاراش آپ کی بات کو میں رو نہیں کر سکتا مگر آپ سے میری بنتی ہے کہ میں جس کے دوش میں ہوں اس سے آپ مجھے آزاد کرادیں نہیں تو وہ مجھے بہت کشت دے گا۔ رولو کا بولا تو فکر نہ کر، میں تجھے اس سے آزادی دلاؤں گا اور پھر وہ تیری گرد کو بھی نہیں پاسکتا، یہ سننے کے بعد ہیولہ چند لمحے خاموش رہا، پھر اس نے ساری اکتھا سادی کہ رام داس کا چچیرا بھائی تلمسی داس نے یہ سب کرایا ہے اور یہ کرنے والا ایک سادھو ہے جو کہ فلاں جنگل میں بیٹھا ہے، اس کے بعد رولو کا نے اس بیوے کو اس سادھو سے آزادی دلا دی اور کیا ہوا عمل الٹ دیا تو اس عمل نے تلمسی داس کی زندگی اجیرن کر دی۔ مگر تلمسی داس بھی کایاں تھا ایک گیانی نے اسے بتا دیا کہ یہ عمل تم پر ایک بہت بڑے گیانی نے الٹ دیا ہے اور اس عمل کا توڑ وہی کر سکتا ہے۔ خیر رونے دھونے کے بعد اس گیانی نے بتا دیا کہ تمہارا عمل الٹ کس نے کیا ہے لہذا تلمسی داس سسکتا بلکہ رولو کا کے پاس آیا اور رولو کا کے پاؤں پڑا تو رولو کا کو اس پر رحم آ گیا اور پھر رولو کا نے تلمسی داس کو تمام اذیتوں سے ٹھیک کر دیا، ادھر زالوشا..... جنگل سے نکلنے کے بعد ایک گاؤں میں پہنچا جہاں کہ ایک بہت ہی بڑا سایہ دار برگد کا درخت تھا، اس درخت کے نیچے بیٹھ گیا، ایک سادھو کا روپ دھار کر اور گاؤں والوں کو اپنی جناتی طاقتوں کے عمل بوتے پر چند چمکار دکھلانے تو گاؤں والے اس کے گرد بیٹھ ہو گئے، دراصل زالوشا کا اصل مقصد یہ تھا کہ اس گاؤں میں سادھو کے روپ میں بیٹھ کر رولو کا، اتیش اور مانی پر نظر رکھے گا اور موقع ملے ہی سب سے پہلے رولو کا کو نقصان پہنچائے گا، مگر رولو کا اپنے کمرے میں بیٹھا اور پل پل کی سادھو کی خبریں رولو کا کو مل رہی تھیں۔ رولو کا کے ہونٹوں پر بڑی معنی خیز مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ (اب آگے پڑھیں)

دالوں کو چند چمکار دکھا کر گاؤں کے لوگوں کو اپنا گردیدہ بنالوں کا اور اس طرح میں آرام سکون سے پڑا رہوں گا، اور پھر در پردہ اپنے دشمن رولو کا دینو بابا اور مانی کے خاتمے کے لئے کوئی مضبوط منصوبہ مرتب کروں گا اور موقع ملے ہی سب سے پہلے یہ رولو کا جو کہ میرے اور اتیش کے درمیان کود پڑا ہے اسے ختم کر دوں گا۔

اور جب رولو کا ختم ہو جائے گا، اس کے بعد اتیش اور مانی کی کیا حیثیت ہوگی، ان دونوں کو تو جنگی بجا کر زندہ درگور کر دوں گا۔

رولو کا کے منہ سے نکلا۔ "زالوشا....."

چاہے تو کتنے ہی روپ بدل لے، میری نظروں سے پوشیدہ نہیں رہ سکتا۔

رولو کا اس کے بعد اپنی گردن جھکا کر بیٹھ گیا، ایسا لگتا تھا کہ وہ بہت دور کی سوچ رہا ہے اور پھر چند منٹ بعد ہی رولو کا نے اپنا سراو پر کواٹھا یا۔

اب رولو کا کے سامنے زالوشا کی ساری حقیقت کھل کر آگئی تھی کہ "زالوشا..... اس گاؤں میں سادھو کا روپ دھار کر کیوں بیٹھا ہے۔"

دراصل زالوشا نے یہ سوچ لیا تھا کہ "گاؤں

خوشخبری

طلسماتی انگٹھی ایک عظیم تحفہ ہے۔ ہم نے سورہ یاسین کے نقش پر فیروزہ، یمنی، عمیق، پکھراج، لا جورد، نلیم، زمرد، یاقوت پتھروں سے تیار کی ہے۔ انشاء اللہ جو بھی یہ طلسماتی انگٹھی پہنے گا اس کے تمام بگڑے کام بن جائیں گے۔ مالی حالات خوب سے خوب تر اور قرضے سے نجات مل جائے گی۔ پسندیدہ رشتے میں کامیابی، میاں بیوی میں محبت، ہر قسم کی بندش ختم، رات کو نیکے کے نیچے رکھنے سے لاٹری کا نمبر، جادو کس نے کیا، کاروبار میں فائدہ ہوگا یا نقصان معلوم ہو جائے گا۔ آفیسر اپنی طرف مال، مافران اولاد، ٹیک، میاں کی عدم توجہ، حج یا حاکم کے غلط فیصلے سے بچاؤ، مکان، فلیٹ یا دکان کسی قابض سے چھڑانا، معدے میں زخم، دل کے امراض، شوگر، برقان، جسم میں مرد عورت کی اندرونی بیماری، مردانہ کمزوری، ناراض کوراضی کرنے یہ سب کچھ اس انگٹھی کی بد ہوگا۔ یاد رکھو سورہ یاسین قرآن پاک کا دل

رابطہ: صوفی علی

092826-0333-2327650

M-20A الرحمان ٹر

پر ذرا ترس نہ کھایا۔ وہ لاتوں اور گھونسوں سے استے بے حال کر کے پیچھا ہوا باہر نکل گیا۔ ”مر جائیں پر۔ جان چھوٹ جائے گی میری۔“

وہ نشہ کرتا تھا۔ روزگار اس کا ایک معمولی سی ورکشاپ پر سائیکلیں ٹھیک کرتا تھا۔ ورکشاپ اس کے مالک کی تھی جو روز اس کی بری طرح سرزنش کرتا تھا۔ ورکشاپ سے وہ جو کچھ کمانا تھا وہ جوئے پر لٹا دیتا تھا۔

شمینہ سے اس کی شادی کو ڈیڑھ سال کا عرصہ ہو چکا تھا۔ لیکن شمینہ کے ہاں ابھی اولاد نہیں ہوئی تھی وہ اپنی ایک رشتے کی خالہ کے پاس چل بڑھ کر جوان ہوئی تھی۔ اس کی ماں کون تھی۔ کہاں تھی۔ اس کے بارے میں خالہ نے نہ صرف یہی بتایا تھا کہ وہ بچاری دکھوں کی ماری بہت مجبوری میں اسے خالہ کی گود میں ڈال گئی تھی۔ یہ جھوٹ خالہ نے صرف اس لئے بولا تھا کہ کہیں شمینہ کو ”ماں“ کے وجود سے نفرت ہی نہ ہو جائے۔ بہر حال شمینہ وہیں بڑی ہوئی گئی اور خالہ سے ’ماں‘ کی باتیں سن سن کر اس کے ذہن میں ’ماں‘ کا ایک بہت پیارا خاکہ بن گیا جس سے اسے ہمیشہ محبت، پیار اور شفقت کی خوشبو آتی تھی، وہ اپنے تصور میں اپنی ماں کو دیکھا کرتی تھی۔ وہ ماں جو جنت سے بھی بڑھ کر ہوتی ہے، جس کی گود میں اسے اتنا سکون مل سکتا ہے کہ وہ خوشی خوشی موت کو بھی گلے لگالے۔

شمینہ جب کبھی بہت اداس ہوتی تھی تو اپنی ان دلیلیں ماں کو تصور میں لا کر خود کو تسلی دیتی تھی کہ ایک نہ ایک دن وہ بھی اپنی ماں کو دیکھے گی اسے جس ماں کا پیار ملے گا۔ اور وہ خوش ہو جائی تھی۔ پھر اس کی شادی رفتی سے ہو گئی اور وہ بیاہ کر رفتی کے گھر چلی آئی لیکن رفتی جیسے خود سر اور جاہل انسان نے اسے چھین کا ایک سانس بھی نہ لینے دیا اور اس پر مظالم کی انتہا کر دی۔ اس کی شادی کے دوسرے ہی مہینے اس کی خالہ چل بسی اور اب وہ رفتی کے قلم و ستم پہنے کے لئے بالکل تیار ہو گئی تھی

میں جو کچھ بھی کرتا ہے یہ تیرے لئے ٹھیک نہیں۔ تو اپنی حرکتوں کو چھوڑ دے، اور اب اگر تو نے اندھیرے کھیل کھیلنا تو تیرے حق میں اچھا نہیں ہوگا۔“
یہ سنتے ہی ٹھا کر کی گردن شرمندگی سے جھک گئی اور پھر ٹھا کر نے اپنا سر سادھو کے پاؤں پر رکھ دیا اور بولا۔

”مہاراج ٹھا کر دیں۔۔۔ میں آج ہی سے سب کچھ چھوڑ دوں گا۔ آپ مجھے معاف کر دیں۔“
سادھو اور ٹھا کر میں یہ باتیں بہت دھیمی آواز میں ہو رہی تھیں۔ اس کے بعد سادھو نے ٹھا کر کے سر پر اپنا ہاتھ پھیرا اور بولا۔ ”ٹھیک ہے تو اپنی بات پر قیام رہنا۔“

پھر ٹھا کر نے اپنے بندوں سے کہا کہ ”مہاراج کے لئے برگد کے درخت سے تھوڑا ہٹ کر ایک کٹیا بنادی جائے تاکہ مہاراج رات سے اس کٹیا میں آرام کریں۔“ یہ سنتے ہی ٹھا کر کے آدمیوں نے جھٹ پٹ ایک شاندار کٹیا تیار کر دی۔

ٹھا کر نے مہاراج سے کہا۔ ”مہاراج آپ کے لئے کٹیا میں نے تیار کرادی اور اس میں آپ کے آرام سکون کے لئے سارے انتظامات کر دیئے گئے ہیں۔ آپ جب چاہیں کٹیا میں جا کر آرام کر سکتے ہیں۔ اور ویسے بھی آج کل وقفے وقفے سے پانی برس رہا ہے۔ لیکن یہ آپ کا چنکار ہے کہ بارش کا پانی اس درخت پر نہیں گر رہا ہے، ویسے مہاراج میں اپنا ایک بندہ آپ کی سیوا کے لئے چھوڑے جا رہا ہوں، آپ کو جس چیز کی بھی ضرورت ہوگی یہ فوراً حاضر کر دے گا۔“

اور پھر سادھو مہاراج کی اجازت سے ٹھا کر اس جگہ سے واپس آ گیا۔ ٹھا کر کا بندہ سادھو مہاراج کے پاس بیٹھ گیا، مہاراج کے منہ سے کوئی لفظ کسی کام کے لئے نکلا اور وہ جھٹ وہ کام کر دے۔ لیکن سادھو مہاراج گاؤں والوں کی چٹا سنتے رہے اور ہاتھ کے ہاتھ اس مصیبت سے چھٹکارا کے لئے حل بتاتے رہے۔

شام سے پہلے مہاراج اس بندے سے

پھر رولو کا دل ہی دل میں خوش ہونے لگا، اس کے بعد اس کے منہ سے آواز نکلی۔ ”زالو شا تو بھی کیا یاد کرے گا، میں تیرے ساتھ چوہے اور بلی والا کھیل کھیل کر ایسا نڈھال کروں گا کہ ایک قدم چلنے سے بھی قاصر ہو جائے گا۔۔۔۔۔ سادھو بن کر چند دن تو عیش کر لے، پھر میں تجھے اس حال میں کروں گا کہ تو سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ کھڑا ہوگا۔“

ادھر جب ٹھا کر برگد کے درخت کے پاس پہنچا تو یہ دیکھ کر حیران ہو گیا کہ سارا گاؤں سادھو مہاراج کے پاس موجود ہے، اور سادھو مہاراج گاؤں والوں کو بھاشن دے رہے ہیں۔

ٹھا کر کو قریب دیکھ کر گاؤں والے ایک طرف کو ہٹ گئے تاکہ ٹھا کر صاحب سادھو مہاراج کا درشن کریں اور ان کے چرن چھوئیں اور ایسا ہی ہوا۔
ٹھا کر نے سب سے پہلے مہاراج کو پر نام کیا اور پھر مہاراج کے سامنے جھٹ کر ان کے پاؤں کو ہاتھ لگایا اور پھر اپنے دونوں ہاتھوں کو اپنے سر پر پھیر لیا۔

پھر ٹھا کر گاؤں والوں سے مخاطب ہوا۔ ”گاؤں والو! تم لوگ کیا اسی طرح مہاراج کا درشن بھی کرتے رہو گے یا مہاراج کے لئے جل پانی اور بھوجن کے لئے کوئی اپائے کیا بھی ہے کہ نہیں۔“

یہ سن کر گاؤں والے خاموش رہے تو ٹھا کر نے پھر کہا ایک نوجوان سے۔ ”تو میرے گھر بھاگا بھاگا جا اور ٹھا کر ان سے کہنا کہ ”مہاراج کے لئے گرم گرم پوریاں ترکاری اور لسی بھی تیار کر دیں۔ اور یہ تمام چیزیں لے کر ترنت آ جا۔“

یہ سنتے ہی سادھو مہاراج نے کہا۔ ”ٹھا کر مجھے ان چیزوں کی ضرورت نہیں۔۔۔ میں کھانے پینے سے بہت دور ہوں۔۔۔ میں نے تو دنیاوی چیزوں کو تیاگ دیا ہے۔ تم میرے لئے کوئی بھی چیز نہ منگاؤ، مجھے گیان دھیان میں لگا رہنے دو۔“

پھر سادھو نے ٹھا کر کو اپنے بہت قریب بلایا اور ٹھا کر کے کان میں کہا۔ ”ٹھا کر تو رات کے اندھیرے

نے پاس بیٹھتے ہوئے کہا۔
 ہے۔ اماں مجھے بس ایک کپ چائے لادو جاؤ.....
 انہیں جلد از جلد سکن بھیجنا چاہتی تھی۔ جیکم و جاہت انہیں
 اور جلدی سے کچن کی طرف بڑھ گئیں۔ جبکہ دوسری
 طرف سلٹی کے چبرے پر کمرہ مسکراہٹ پھیل گئی۔
 ساس کے جانے کے فوراً بعد ہی وہ انہی اور ان
 سے انہیں جلتا

کے پیچھے چل پڑی سیو ملہ وہ چلا گیا۔
 دیکھنا چاہتی تھی۔ لیکن یہ کیا.....
 کچن پر نظر پڑتے ہی سلمیٰ کے چہرے کا رنگ
 بدل گیا۔ تمام کھڑکیاں دروازے حسب معمول پو پٹ
 تھیں۔

بدل گیا۔ تمام کھڑکیاں دروازے
 کھلے تھے۔ مش و بج کے عالم میں دل سوس کر
 سسلی عجیب سے نکلنے لگا تو اچھی طرح دروازے
 پر غمتی انگلیں آخر یہ کیسے ممکن تھیں۔ اور کمر میں اور کوئی تھا بھی
 نہ کہ کسی کے آئی تھی۔

نہیں۔ تو یہ سب.....
 سلمیٰ برابر اپنا وار خالی جانے پر انتہائی پریشان
 تھی۔ اسے کچھ میں نہیں آ رہا تھا کیا خروہ کس طرح راستے
 سے ہٹاؤ گا۔ وہ ہر صورت میں اپنی ساس کو راستے
 سے ہٹاؤ چاہ رہی تھی۔ لیکن ہر مرتبہ اس کا وار کوئی ان دیکھی
 قوت کا کام بنا دیتی۔ انہی سوچوں کے مانے مانے میں
 سلمیٰ کو ”سبع الرحمان“ کا خیال آیا جو اس کے پڑوس میں
 رہتے تھے اور لوگوں کے مسائل اللہ کے حکم سے حل کر
 دیتے تھے۔ سلمیٰ کے چہرے پر اطمینان کی لہر دوڑ گئی اور وہ
 دن وہ ”سبع الرحمان“ کے آستانے پر موجود تھی۔
 ”کہو بیٹی کیسے آنا ہوا..... کیا پریشا
 تمہیں.....؟“ ”سبع الرحمان“ نے سلمیٰ سے

آئے گا۔ عا پو چھا۔ میری زندگی
 دس سچاؤں بابا۔ اس لیے

نے اجیرن کر رکھی ہے۔ ایک سانس یہ
میرے لئے.....“ سٹپنی نے چہرے پر
ہوئے بولنا شروع کیا لیکن درمیان میں
رک گیا۔

اب اس دنیا میں ہی پوری ہو جائے۔ اور تم اپنی ماں کو
دیکھ سکو۔۔۔۔۔!“ بابا کی بات پر شمینہ کی آنکھوں میں خوشی
کی چمک آگئی اور وہ خوشی سے نہال ہونے لگی۔ ”لیکن
اتنا یاد رکھنا بیٹا۔۔۔۔۔ اس مہلت کے دوران تم کسی کو ناحق
ایذا نہیں پہنچاؤ گی۔“

یاد رکھنا چاہیے.....
 ”میں وعدہ کرتی ہوں بابا..... میں ایسا
 کچھ نہیں کروں گی جس سے مخلوق خدا کو پریشانی ہو، لیکن
 میں اپنی ماں کے پاس کیسے جاؤں گی.....؟ میں نے تو
 انہیں دیکھا تک نہیں ہے۔“ شمیمہ نے پریشانی سے کہا۔
 ”یہ سب میں تمہیں بتاتا ہوں، اپنی آنکھیں بند
 کرو.....“ اور شمیمہ نے آنکھیں بند کر لیں۔

وہ اپنے ساس سے انتہائی بیزار تھی اور مزید اسے گھر میں
برداشت نہیں کر سکتی تھی اس لئے آج اس نے بیگم
وجاہت کو راستے سے ہٹانے کا ارادہ کر لیا۔ کاران کے
آفس جانے کے بعد وہ سیدھی کچن میں گئی اور تمام
کچرکیاں اور روشن دان بند کر کے اپنے کمرے میں چلی
گئی۔ وہ بہت مطمئن اور پرسکون تھی کیونکہ اس طرح کی
موت وہ آسانی سے کسی حادثے کا رنگ دے سکتی تھی
اور اس طرح اس کا نام بھی نہ آتا۔۔۔۔۔ لیکن مارنے

وہ اس طرح اس کا نام اس
والے سے بچانے والا بہت بڑا ہے۔
وہ اگر ایک بار بھی پلٹ کر کچن کی طرف دیکھ لیتی تو
اس کے ہوش اڑ جاتے کیونکہ کچن کے دروازے کھڑکیاں
دھیر سے دھیر سے خود بخود کھلتے چلے جا رہے تھے۔
”کیاں، اوایاں کہاں ہوں تم.....“ بیڈ پر بیٹھی وہ چلا

”ہاں بیٹا بولو..... میں پودوں کو پانی دے رہی تھی۔“

دیکھ کر گاؤں کے جوان عیش عیش کر اٹھتے تھے۔ گورارنگ، جھیل سے زیادہ گہری غزالی آنکھیں، دلکش دلفریب گلاب کی پنکھڑی جیسے ہونٹ، کمر سے نیچے تک بل کھاتی ہوئی ٹانگن زانیں، چال مستانی اور کسا کسا بدن، دیکھنے والوں کی دل کی دھڑکنیں تیز کر دیتا تھا۔

رکمنی پر نظر پڑتے ہی مہاراج تو رکمنی کی دلکشی میں جیسے کھو گئے تھے۔ وہ ایک نیک رکمنی پر نظریں جمائے ہوش و حواس سے بیگانے تھے۔

”مہاراج.....“ رکمنی کے منہ سے نکلا تو جیسے مہاراج چونک گئے اور منہ سے نکلا۔ ”رکمنی تو آگئی..... مجھے سب پتہ ہے..... تیرا باپ تم دونوں ماں بیٹی کو چھوڑ کر چلا گیا۔ اب تم دونوں ماں بیٹی غربت کی چکی میں پس رہی اور غربت کی وجہ سے تجھے کوئی ”بر“ نہیں مل رہا۔ خیر کل کا سورج تیرے لئے خوشیوں کا پیغام لے کر طلوع ہوگا۔ بس یہ یاد رکھ کہ ”کمرے کی سیوا..... تو کھائے گی میوا۔“

رکمنی ہولی۔ ”مہاراج آپ کو تو سب کچھ معلوم ہے میں کیا بتاؤں..... بس آپ مجھ پر دیا کر دیں..... تاکہ ہمارے کشت کے دن ختم ہو جائیں..... میں پوری زندگی آپ کے لئے پرارتھنا کروں گی۔“

دراصل زالوشا..... جو کہ سادھو کے روپ میں تھا۔ وہ تو ویسے بھی جوان تھا۔ رکمنی کی الہڑ جوانی قیامت خیز، کسا کسا جسم نے زالوشا کے جذبات کو بھڑکا دیا تھا۔ مہاراج کی آواز سنائی دی۔ ”رکمنی میرے قریب آ..... تاکہ میں تیری بے سکونی کو سکون میں بدل دوں اور غربت کو تجھ سے دور بھگا دوں۔“

رکمنی مہاراج کے سامنے بیٹھ گئی تو مہاراج نے رکمنی کا ہاتھ پکڑا اور بولے۔ ”ارے تو کہاں بیٹھ رہی ہے ادھرے میرے قریب بیٹھ۔“ اور پھر مہاراج نے رکمنی کا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچا تو رکمنی کھینچی چلی گئی۔ اور مہاراج کے نرم گداز بستر پر جیسے گر گئی۔

مہاراج نے رکمنی کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر اسے سہلانا شروع کر دیا۔ رکمنی کے پورے جسم میں

جیسے چیونٹیاں سی ریٹکنے لگیں۔

مہاراج کا ہاتھ ذرا اور اوپر کو بڑھا..... اس کے بعد مہاراج کا ہاتھ رکمنی کی گردن تک پہنچ گیا۔ اور پھر مہاراج نے اس کی گردن کو سہلانا شروع کر دیا۔

دو جوان جسم پہلو بہ پہلو تھے۔ رکمنی کے جسم میں جیسے بھونچال سا آنے لگا۔ اس کی بیجانی کیفیت اندرونی طور پر ہلچل مچانے لگی۔

مہاراج کے ہاتھ اب گردن سے ہوتے ہوئے اس کے گالوں کو سہلارہے تھے۔ پھر مہاراج کی انگلیاں رکمنی کے ہونٹوں پر گداز پیدا کرنے لگیں اور ساتھ ہی ساتھ اس کے پونٹوں پر بھی ہلکا دباؤ پڑنے لگا۔ رکمنی کا پورا بدن ڈولنے لگا۔ اس کے پورے جسم میں جیسے کرنٹ سادوڑنے لگا۔

مہاراج کی آواز دور سے آتی ہوئی محسوس ہوئی۔ ”رکمنی.....!“

رکمنی کے منہ سے نکلا۔ ”جی مہاراج۔“

”رکمنی آج تو نہال ہو جائے گی..... دولت تیرے گھر کی باندی ہوئی۔ آج رات تیرا سارا کشت دور ہو جائے گا۔“

”رکمنی۔“ تجھے کوئی اعتراض تو نہیں۔ تو اندر سے خوش تو ہے ناں۔“

”جی مہاراج! میں آپ کی سیوک ہوں۔“

پھر مہاراج نے ہولے سے رکمنی کو بستر پر لٹا دیا۔ اور اپنے گرم ہونٹ رکمنی کے ہونٹوں پر رکھ دیئے، ایسا ہوتے ہی رکمنی اندر سے پوری طرح کانپ سی گئی۔ رکمنی کے دونوں پونٹے بوجھل ہو کر بند ہو گئے تھے۔ رکمنی اپنا سدھ بدھ کھو چکی تھی۔ وہ جذبات کے سمندر کے گرداب میں حال سے بے حال ہو چکی تھی۔

مہاراج نے اسے نچوڑ کر رکھ دیا تھا۔ وہ جذبات کے طوفان میں پتے کی طرح اڑتی پھر رہی تھی۔ اس کے لمبے لمبے سانس اسے اٹھل پھل کر رہے تھے۔ اور پھر وہ یکدم نڈھال ہو کر بے سدھ ہو گئی۔ اسے کچھ ہوش

کالی داس نے قہر برساتی نظروں سے چمپا سے پوچھا جو اس کی خاص داسی تھی اور اس کا ہر حکم بجا لاتی تھی۔
”مہاراج اس عورت کی رکھشا ایک آتما کر رہی ہے اور وہ بہت شگفتی شالی ہے۔ رات کو اس نے شکر کو بھی مار ڈالا ہے۔“

”کیا...؟ آتما...؟ یہ تم کیا کہہ رہی ہو...؟
کیسی آتما...؟“

کالی داس کے چہرے پر ہوائیاں سی اڑنے لگیں۔ وہ درمیان میں پھنس چکا تھا۔ عمل اودھورا چھوڑنے پر اسے اپنی موت سامنے نظر آ رہی تھی اور آتما کے بارے میں وہ بے خبر تھا۔ دوسرے دن ہی اس نے سلمیٰ کو بلایا۔
”اے لڑکی۔ تو نے ہمیں پہلے کیوں نہیں بتایا کہ بڑھیا کے ساتھ کوئی آتما ہے...؟“ کالی داس نے غصے سے پوچھا۔

”کیا مطلب...؟ کیسی آتما...؟“ سلمیٰ نے حیرانگی سے پوچھا۔ ”میرے پیروں کے ذریعے مجھے معلوم ہوا ہے کہ اس کی رکھشا ایک شگفتی شالی آتما کر رہی ہے۔ اس نے رات ہمارے ایک بہت خاص پیر کو بھی مار ڈالا ہے۔ تو پہلے بتا دیتی تو ہم کوئی اپانے کر لیتے لیکن اب ہم اس عمل میں اتنا آگے بڑھ گئے ہیں کہ واپس نہیں آ سکتے۔“
”کیا مطلب...؟“ سلمیٰ نے ڈرتے ہوئے پوچھا۔

”ہم دونوں کی جان کو خطرہ ہے۔ یہ کوئی عام جادو نہیں۔ کالا جادو ہے۔ اور اس کو اودھورا چھوڑنے والے سب لوگ جان سے جاتے ہیں۔“ کالی داس خود بھی انتہائی پریشان دکھائی دے رہا تھا۔

”اس آتما کے ہوتے ہوئے بڑھیا کا کوئی بال بھی بیکا نہیں کر سکتا۔ اور بڑی بات تو یہ ہے کہ اس آتما کے ساتھ بڑھیا کا خونی سمبندھ ہے۔ اور جو سمبندھ بھگوان نے خود جوڑا ہے اس میں بہت شگفتی ہوتی ہے تو تو جان سے جائے گی ہی میں بھی تیری بے وقوفی کی وجہ سے۔ تو جا یہاں سے۔۔۔۔۔ جا پہلی جا۔۔۔۔۔“ کالی داس چیخنے لگا اور سلمیٰ وہاں سے بھاگ کر گھر آ گئی۔ لیکن اس

وہاں کوئی ہوتا تو نظر آتا نا۔۔۔۔۔ عظیم وجاہت نے لائٹ آف کرنے کے لئے ہاتھ بڑھایا لیکن چوہے کے سپائڈ پر گرما گرم چائے کا بڑا کپ دیکھ کر چونک گئیں۔۔۔۔۔ ”یہ... یہ چائے کس نے بنائی...؟“

حیرت سے ان کے ذہن میں سوالات ابھرنے لگے۔
وہ دھیرے دھیرے چائے کی طرف بڑھیں۔۔۔۔۔ اتنی سردی میں رات کے اس وقت جن میں کون آ کر چائے بنا گیا۔۔۔۔۔؟

بہر حال مزید کچھ سوچے کچھ بغیر انہوں نے جلدی سے چائے کا کپ اٹھایا۔ لائٹ آف کی اور اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئیں۔

چائے پی کر جیسے ان کی روح بھی تروتازہ ہوئی۔ انہیں انتہائی سکون مل رہا تھا۔ انہیں اپنی پڑوسن نجمہ کی بات یاد آ گئی۔ ”بھئی سردی میں جب طبیعت خراب ہونے لگتی ہے تو میری بیٹی کے ہاتھ کی ایک کپ چائے پی کر میں تو جیسے بالکل توانا ہو جاتی ہوں۔۔۔۔۔!“
اور پھر سوچوں کا سمندر اس دن کے گرد پکڑ لگانے لگا۔ جب انہوں نے اپنی ننھی بیٹی کو کسی اور کے سپرد کر دیا تھا۔ اور پھر کبھی اس کے بارے میں سوچا بھی نہ تھا۔ آج ان کے دودھ بیٹے تھے لیکن ان دونوں کو ماں کی تکلیف، پریشانی یا کسی چیز کا خیال نہیں تھا۔ بس فکر تھی تو اپنی بیویوں کی۔۔۔۔۔ اپنے پیسے کی۔۔۔۔۔ بنانے وہ معصوم جسے پیدا ہوتے ہی کسی کے حوالے کر دیا گیا تھا وہ کہاں تھی کس حال میں تھی...؟

یہ خیالات سوچتے ہوئے نہ جانے کب ان کی بھیگی پلکیں بند ہوئیں اور وہ نیند کی وادی کی سیر کرنے لگیں جبکہ ثمنینہ ان کے سامنے بیٹھی ان کے چہرے کو دیکھ دیکھ کر سکون پاتی رہی۔۔۔۔۔!

☆...☆...☆

”مہاراج آپ کا ہر حکم سر آنکھوں پر لیکن یہ سب میرے بس میں نہیں ہے۔ چمپا نے بے بسی سے سر ہٹکاتے ہوئے کہا۔

”آخر کیوں...؟ اس کا مسئلہ ہے تمہیں...؟“

لوگ ہر طرح کی باتیں کرتے ہوئے خوف کی حالت میں اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔
اور اس طرح رولوکانے زالوشا کے وجود کو ہمیشہ
ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا تھا۔

☆.....☆.....☆

حکیم وقار اپنے کمرے میں بیٹھے تھے، آج
چھٹی کا دن تھا، ان کے سامنے ایک کتاب پڑی تھی، اور
وہ اپنے خیالوں میں گم تھے کہ اتنے میں رولوکانے کے
کمرے میں داخل ہوا۔

حکیم وقار کی آنکھیں کھل گئیں تو وہ مسکراتے
ہوئے بولے۔ ”آئیے حکیم صاحب..... تشریف
رکھیں..... دراصل میں آپ ہی کا انتظار کر رہا تھا کہ
آپ آئیں تو دونوں مل کر چائے پیئیں۔“

دونوں نے ایک دوسرے سے مصافحہ کیا.....
رولوکانے حکیم وقار کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ تو
حکیم وقار نے آواز دے کر ملازم سے کہا کہ ”دو کپ
چائے لاؤ۔“

میز پر کتاب دیکھ کر رولوکانے بولا۔ ”حکیم صاحب
لگتا ہے یہ کوئی دلچسپ کتاب ہے اور یہی وجہ ہے کہ
آپ کی میز پر پڑی ہے۔ اگر اچھی ہے تو مجھے بھی
سنائیں..... ویسے بھی آج چھٹی کا دن ہے، اور میں بھی
آج فارغ ہوں۔“

اتنے میں ملازم دو کپ چائے لے آیا اور
دونوں کے سامنے رکھ کر چلا گیا تو حکیم وقار بولے۔
”آپ چائے پیئیں اس کے بعد میں کتاب شروع کرتا
ہوں۔“ کتاب کا مصنف لکھتا ہے کہ ”یہ واقعہ حقیقت
پر مبنی ہے۔“ اور پھر چائے پینے کے بعد حکیم وقار کتاب
پڑھنے لگے۔

کتاب کا نام ہے۔ ”نیل کنٹھ۔“

کرامت کا باپ بڑھئی تھا اور ایک قصبے میں رہتا
تھا۔ اس کا نام سلامت تھا۔ وہاں پر زیادہ آبادی
کسانوں اور کاشت کاروں کی تھی، سلامت مل اور
دوسرے کاشت کاری کے اوزار بنانے کا ماہر تھا اور اس

کے سوا کوئی دوسرا یہ کام کرنے والا نہ تھا اس لئے اس کے
پاس کام کی کمی نہ تھی، سارے کسانوں اور کاشت کاروں
کو اس کی ضرورت پڑتی تھی اس لئے سب ہی آتے
تھے، سلامت نہایت مناسب اجرت پر سب کا کام کر دیا
کرتا تھا اگر وہ چاہتا تو زیادہ بھی کما سکتا تھا۔ کیونکہ ہر
کسان شہر جا کر تو کام نہیں کروا سکتا تھا اس سے کام
کروانے پر مجبور تھا مگر سلامت نے کبھی کسی کی مجبوری
سے فائدہ نہیں اٹھایا اور اپنی جائز مزدوری ہی وصول
کی۔ اس کی اس اصول پرستی کی وجہ سے سب اس کی
عزت کرتے تھے اور اس قصبے میں سلامت غریب
ہونے پر بھی باعزت زندگی گزار رہا تھا۔

کرامت اسی جگہ پیدا ہوا تھا اور جب چار سال
کا ہوا تو اس کا نام قصبے کے اسکول میں لکھوا دیا گیا اور
دینی تعلیم اس کی ماں کرنے لگی، کرامت شروع میں
پڑھنے میں تیز نہ تھا، مگر عمر کے ساتھ ساتھ اس کا شوق
بڑھتا گیا اور وہ اپنی کلاس کا اچھا لڑکا مشہور ہوتا گیا۔ یہ
اسکول صرف پرائمری تک تھا۔ چھٹی کلاس میں پڑھنے
کے لئے دوسرے اسکول میں جانا پڑتا تھا۔ پانچویں
کلاس کرامت نے بڑی نمایاں پوزیشن لے کر پاس کی
اور وہ ہائی اسکول میں داخل ہو گیا۔ سلامت کی خواہش
تھی کہ کرامت پڑھ کر سرکاری ملازمت کرے اور بڑا
آفیسر بن جائے، اتفاق سے کرامت کا کوئی بہن یا بھائی
نہ تھا اس لئے والدین کی پوری توجہ کا مرکز بھی وہی تھا۔

وہ جس علاقے میں رہتے تھے وہ نہایت کھلا
علاقہ تھا چاروں طرف کھیت تھے اور باغات تھے۔
یہاں پر بچوں کے کھیلنے کودنے کو بہت جگہ تھی باغات میں
پھل فروٹ بھی تھا اور چھوٹا موٹا شکار بھی مل جاتا تھا۔

لڑکے ٹولیاں بنا کر شام کو یا اسکول کے بعد نکل
کھڑے ہوتے اور خوب تفریح کرتے تھے زیادہ بڑی
جگہ نہ تھی، اس جگہ کے ہر لڑکے کو سب جانتے تھے اس
لئے ان سے کچھ نہیں کہتے تھے، ان کی شرارتوں پر ڈانٹ
بھی دیا کرتے، اور ضرورت پڑی تو مار بھی دیا کرتے
تھے، مگر کوئی لڑکا اس کی شکایت گھر پر نہیں کرتا تھا اس



خونی انتقام

محمد خالد شاہان - صادق آباد

ٹنڈ منڈ درخت پر بیٹھے خونی جانور جیسے ہی کسی جانور کو سامنے دیکھتے تو اس پر ٹوٹ پڑتے اور اپنے خونی پنجے اور خونی چونچ سے اسے ادھیز کر رکھ دیتے اور پھر وہ ہو گیا جو کہ تصور نہیں کیا جاسکتا تھا۔

حقیقی خواہشات کا پروردہ شخص جب اس کی خواہش کی تکمیل نہ ہوئی تو اپنا ہوش کھو بیٹھا

انتظار کرتے رہتے تاکہ ان کے جسم سے گوشت کی ایک آدھ بوٹی اڑالائیں۔ جونہی وہ کسی جانور کو دلدل میں دھنستے ہوئے دیکھتے تو اپنی منہوس آواز میں چلاتے ہوئے اس سمت میں اڑ جاتے۔

تھوڑی دیر بعد جب وہ واپس آتے تو ان کے پنجوں میں تازہ گوشت کا ایک آدھ ٹکڑا ہوتا۔ ٹنڈ منڈ درختوں پر بیٹھے کردہ دعوت اڑاتے اور پھر اپنے لمبے لمبے گندے پروں میں

دلدل کے شمال میں کھنی جھاڑیوں سے گمراہ ہوا وہ پرانی طرز کا مکان تھا جس کی دیواروں سے سفیدی جھڑ چکی تھی۔ سورج کی کرنیں بھول کر بھی ادھر کا رخ نہیں کرتی تھیں۔ اس لئے سارا دن کمروں میں اندھیرا رہتا۔ باہر احاطے میں بھی سبزے کا نام و نشان نہ تھا۔ اگلے وقتوں کے چند ٹنڈ منڈ درخت تھے جن کی تنگی شاخوں پر مردار خور پرندے دلدل میں پھنس کر مرنے والے جانوروں کا

کرتے تھے۔ "جیسے کہ میں نے بتایا
 تھا کہ میں نے یہ سب کچھ دیکھا ہے۔"
 "آپ کو کبھی یہ سب کچھ یاد ہے؟"
 "جی ہاں، میں نے یہ سب کچھ دیکھا ہے۔"
 "آپ کو کبھی یہ سب کچھ یاد ہے؟"
 "جی ہاں، میں نے یہ سب کچھ دیکھا ہے۔"
 "آپ کو کبھی یہ سب کچھ یاد ہے؟"
 "جی ہاں، میں نے یہ سب کچھ دیکھا ہے۔"
 "آپ کو کبھی یہ سب کچھ یاد ہے؟"
 "جی ہاں، میں نے یہ سب کچھ دیکھا ہے۔"
 "آپ کو کبھی یہ سب کچھ یاد ہے؟"
 "جی ہاں، میں نے یہ سب کچھ دیکھا ہے۔"
 "آپ کو کبھی یہ سب کچھ یاد ہے؟"
 "جی ہاں، میں نے یہ سب کچھ دیکھا ہے۔"
 "آپ کو کبھی یہ سب کچھ یاد ہے؟"
 "جی ہاں، میں نے یہ سب کچھ دیکھا ہے۔"
 "آپ کو کبھی یہ سب کچھ یاد ہے؟"
 "جی ہاں، میں نے یہ سب کچھ دیکھا ہے۔"

میں نے یہ سب کچھ دیکھا ہے۔
 "آپ کو کبھی یہ سب کچھ یاد ہے؟"
 "جی ہاں، میں نے یہ سب کچھ دیکھا ہے۔"
 "آپ کو کبھی یہ سب کچھ یاد ہے؟"
 "جی ہاں، میں نے یہ سب کچھ دیکھا ہے۔"
 "آپ کو کبھی یہ سب کچھ یاد ہے؟"
 "جی ہاں، میں نے یہ سب کچھ دیکھا ہے۔"
 "آپ کو کبھی یہ سب کچھ یاد ہے؟"
 "جی ہاں، میں نے یہ سب کچھ دیکھا ہے۔"
 "آپ کو کبھی یہ سب کچھ یاد ہے؟"
 "جی ہاں، میں نے یہ سب کچھ دیکھا ہے۔"
 "آپ کو کبھی یہ سب کچھ یاد ہے؟"
 "جی ہاں، میں نے یہ سب کچھ دیکھا ہے۔"
 "آپ کو کبھی یہ سب کچھ یاد ہے؟"
 "جی ہاں، میں نے یہ سب کچھ دیکھا ہے۔"
 "آپ کو کبھی یہ سب کچھ یاد ہے؟"
 "جی ہاں، میں نے یہ سب کچھ دیکھا ہے۔"

مشکل نہ تھا کہ اسے یہاں پڑے ہوئے کافی وقت گزر چکا ہے وہ آنکھیں ملاتے ہوئے اٹھ بیٹھی۔ سبزی کی ٹوکری اٹھاتے وقت وہ تنجیدگی سے سوچنے لگی کہ ڈاکٹر کے بیان کے مطابق کہیں واقعی اس کا داغ تو نہیں چل گیا۔ لکڑی کے پل پر پہنچ کر اس نے کمرے کی طرف دیکھا اسے یہاں سے گئے تین دن گزر چکے تھے۔

اصل میں پرسوں جب وہ بازار کے لئے گھر سے نکلی تو اس کے سر میں شدید درد ہو رہا تھا۔ راستے میں اچانک بے ہوش ہو کر گر پڑی چند راہ گیروں نے اسے اٹھ کر اسپتال پہنچا دیا۔ آج صبح اسے وہاں سے چھٹی ملی لیکن اس کا پتی تو ان باتوں سے بے خبر تھا۔ وہ یقیناً اسے تصور وار سمجھے گا یہ سوچ کر وہ ملول ہو گئی اور چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی یہاں فرنیچر بہت کم تھا صرف ایک میز تھی جس پر لکڑی کا ایک پرانا سیلپ رکھا تھا۔ کمرے پر پرانی لکڑی کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی ایک کونے میں کھردری چٹائی پر بستر بچھا ہوا تھا جس کی چادر پر جا بجا بڑے بڑے عدد صید کھائی دے دیے تھے۔

کھانے اور خون کے طے جلدی جب اس بستر پر اس کا پتی پڑا تھا۔ دور سے دیکھتے پر وہ لپڑے کا ایک تھیلا معلوم ہوتا تھا جس میں کسی جانور کا ذبح کیا ہوا گوشت بھرنے لایا ہوا۔ اس جیتے جاگتے لوتھرے کے دونوں بازو اور ٹانگیں غائب تھیں۔ اس کا چہرہ جگہ جگہ سے نیچا ہوا تھا وہ ایک میلی چادر میں لپٹا ہوا تھا جو نا اہلیت سے بھرپوری تھی اور بری طرح بدبو چھوڑ رہی تھی بازو اور ٹانگوں کے بغیر گوشت پوست کے اس ڈھیر کا نام شامو تھا۔

بکھی وہ بھی تندرست و توانا نوجوان تھا جنگ کے دور میں بم کے ایک حادثے نے اس کی بولنے اور سننے کی صلاحیتوں کے ساتھ ساتھ بازو اور ٹانگیں بھی چھین لی تھیں، صرف دو آنکھیں باقی تھیں جن کے دم سے اس کا تعلق اس جیتی جاگتی دنیا سے قائم تھا۔

رجنی اس پر جھک گئی اس کی آنکھیں شدید غصے سے سرخ ہو رہی تھیں اگر اس کے بس میں ہوتا تو وہ رجنی کا گلا گھونٹ دیتا۔ وہ خوف زدہ ہو کر پیچھے ہٹی اور یہ جانتے

کے مرجھائے ہوئے چہرے سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہ تھا کہ وہ پچھلے کئی ماہ سے سخت اذیت میں مبتلا ہے۔ ہاتھ میں سبزی کی ٹوکری اٹھائے وہ بڑی بے پروائی سے چل رہی تھی۔ اس کے کانوں میں ابھی تک بوڑھے میجر کے الفاظ گونج رہے تھے جو اس نے تھوڑی دیر قبل کہے تھے۔ ”مادام آپ جس تنہی اور جانفشانی سے اپنے پتی کی خدمت کرتی رہی ہیں اس کی تعریف کے لئے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ اگر آپ کی جگہ کوئی اور ہوتی تو کب کا پاگل ہو جاتی۔ اتنی چھوٹی عمر میں آپ با آسانی دوسری شادی کر سکتی تھیں مگر وہاں جی آپ نے تو کمال ہی کر دیا بھی بیوی ہو تو ایسی ہو۔“

ٹوکری زمین پر رکھتے ہی رجنی کے ہونٹوں پر ایک تلخ مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس کی آنکھیں ایک وحشیانہ جذبے سے چمک اٹھیں۔ اس نے اپنے ہاتھوں کی طرف دیکھا ان میں تناؤ پیدا ہو رہا تھا آہستہ آہستہ اس کے دونوں ہاتھ اپنی گردن کی طرف اٹھ گئے۔ یوں محسوس ہوتا جیسے کوئی بدروح اس کے ہاتھوں میں داخل ہو کر انہیں اس قاتلانہ حرکت پر مجبور کر رہی ہے۔ اگلے ہی لمحے وہ خود اپنا گلا گھونٹ رہی تھی۔ اس کے ہاتھوں کی گردن اتنی مضبوط تھی کہ اس کا جسم کوشش کے باوجود انہیں روکنے سے قاصر تھا۔ وہ متضاد طاقتیں اس کے جسم میں ایک دوسرے سے برسرِ پیکار تھیں۔ ہاتھ پوری قوت سے گلا دبا رہے تھے اور بانی جسم کا چھڑانے کی ناکام کوشش کر رہا تھا، اس کی آنکھیں باہر کو نکل آئیں۔ منہ سے خون بہنے لگا۔

اچانک اس کے حلق سے ایک چیخ نکلی اور دونوں ہاتھ گلے سے ہٹ گئے۔ اس نے حیرت سے ان کی طرف دیکھا وہ خشک اور بے جان تھے۔ خون کی پتلی سی لکیر اس کی تھوڑی تک پہنچ چکی تھی۔ اس نے انگلی پر ذرا سا خون لگایا اور اسے چاٹنے لگی پھر بلند آواز میں قہقہے لگاتے ہوئے وہ دیوانہ وار گھومنے لگی۔ اچانک اس کا سر برآمدے کی دیوار سے ٹکرا گیا اور وہ بے ہوش ہو کر زمین پر گر پڑی۔ جب اس کی آنکھیں کھلی تو وہ برآمدے کی میٹھیوں پر پڑی تھی۔ دھوپ کی شدت سے یہ اندازہ لگانا

— ١٠٠ —

کرامت بولا۔ ”ابا آپ کی شخصیت میرے لئے ہمیشہ مشعلِ راہ رہی ہے میں فخر سے اپنے دوستوں کو بتاتا ہوں، مجھے کبھی ذرا سی جھجک اور شرم نہیں آتی کہ میں ایک بڑھئی کی اولاد ہوں، میں فخر کرتا ہوں آپ پر۔“

آج کرامت پر صاف واضح ہو گیا کہ اس کا
دوست نیل کنٹھ اس سے کس طرح بات کرتا ہے وہ
حیران تو تھا مگر اس حیرت کو کوئی نام وہ نہیں دے سکتا تھا
اور نہ کسی کو بتا سکتا تھا کہ ایک پرندہ نیل کنٹھ اس کا
دوست ہے اور اس سے دینی طور پر بات بھی کرتا ہے یہ
انوکھا رابطہ تھا انوکھا کھیل تھا، انوکھی بات تھی اس کی اس
بات پر کون یقین کرتا، لوگ سن کر اس کا مذاق بناتے اس
لئے اس نے فیصلہ کیا کہ وہ یہ بات کسی کو نہیں بتائے گا۔

شام تک وہ نہر کے کنارے اور باغات میں
پھرتا رہا اپنے بچپن کی یادوں کو تازہ کرتا رہا اور نیل کنٹھ
اس کے قریب ہی رہا۔ شام ہو گئی تو وہ نیل کنٹھ کی طرف
منہ کر کے بولا۔

وہ اور آ کے بڑھ گیا اور وہی سوکھا درخت، کرامت نے سوچا یہ درخت کب سے سوکھا کھڑا ہے۔ اور اور اس درخت کی ایک نیچی ٹہنی پر نل کٹھ گیا۔ ”یہ وہی میرا دوست نل کٹھ“ ہے اس نے دل میں سوچا اور اس کے قریب چلا گیا۔ ٹہنی پر سے نل کٹھ اڑا نہیں کاٹلی سے بیٹھا رہا۔

کرامت اس کے نزدیک چلا گیا اور بولا.....
 ”یار تم وہی ہو میرے دوست یا کوئی اور، بات یہ ہے کہ تم
 سب ایک جیسے تو ہو میں کیسے پہچانوں کہ تم وہی ہو یا
 دوسرے ہو۔“ اور پھر خود ہی ہنسنے لگا۔

نیل کٹھ نے دونوں پر پھیلا کر ایک انگڑائی لی اور بہت قریب ہونے پر بھی اڑا نہیں، کرامت کی طرف دیکھنے لگا۔ کرامت کی اور اس کی نظریں آپس میں ٹکرائیں اور کرامت کو یقین آ گیا کہ یہ وہی نیل

”اچھا دوست اب میں جاتا ہوں پھر شہر سے آیا
تو تم سے ملنے ضرور آؤں گا۔ تم یہیں پر ملنا۔ تمہاری یاد تو
مجھے آئے گی مگر میں اس کا ذکر کسی سے نہیں کروں گا۔“

اور نیل کٹھن نے پر پھیلانے کرامت کے سر
کے اوپر سے گزرتا ہوا چلا گیا اور کرامت واپس گھر
آ گیا۔ اس حیرت انگیز ملاقات کا ذکر وہ کس سے کرتا
حسب وعدہ خاموشی سے واپس شہر آ گیا۔ اور اس نے

شائع کر رہے تھے۔ ایک ادیب نے تو سپاہی کی پتی کے نام سے ایک چھوٹی سی کتاب بھی لکھ دی جس میں اس کے پتی سے اس کی وفاداری اور ہمت و استقلال کو افسانوی رنگ میں بیان کیا گیا تھا۔ چھ ماہ اسی ہنگامے میں گزر گئے۔

رجنی نے پتی کی خدمت میں دن رات ایک کر دیئے۔ آہستہ آہستہ ملاقاتیوں کی تعداد کم ہونے لگی۔ حتیٰ کہ سال کے آخر تک بالکل ختم ہو گئی۔ لوگ بہادر سپاہی اور اس کی وفادار پتی کو بھول گئے۔ شامو کے رشتہ داروں نے بھی اسے فراموش کر دیا۔ خود لڑکی کے ماں باپ کبھی کے مریچکے تھے اب وہ تنہا سارا دن گوشت کے اس جاندار کو کھڑے کے پاس بیٹھی رہتی۔ اس کا تعلق بیرونی دنیا سے ختم ہوتا چلا گیا۔ دن میں صرف ایک مرتبہ وہ سودا سلف خریدنے بازار جاتی۔

شامو پہلے پہل تو اپنی حالت پر دل ہی دل میں کڑھتا، دانتوں میں مینسل دبا کر اس نے اپنی کڑھن کا اظہار ایک آدھ فقرے میں کیا بھی لیکن وقت گزرنے سے ساتھ ساتھ اس کا احساس مرنے چلا گیا شروع شروع میں وہ ان اخبارات کو پڑھتا جن میں اس کے بہادرانہ کارنامے درج ہوتے تھے۔

حکومت کی طرف سے اسے ایک خلائی تمغہ دیا گیا تھا وہ اس کے سر ہانے پڑا رہتا تھا، تھوڑی تھوڑی دیر بعد وہ گردن موڑ کر اس پر نظر ڈالتا اور دیر تک دیکھتا رہتا۔ اس نے فوجی اعزاز کو دیکھ کر اس کے مجروح ہونٹوں پر مسکراہٹ کھلنے لگتی جو اس کے بدنما چہرے کو اور زیادہ خوف ناک بنا دیتی۔ تاہم آہستہ آہستہ اس کی دلچسپی ختم ہوتی چلی گئی۔ یہاں تک ایک روز اس نے خلائی تمغہ دانتوں میں داب کر فرش پر دے مارا۔ اب اس کی دلچسپیوں کا واحد مرکز کھانا تھا اس کی بھوک روز بروز بڑھتی چلی گئی۔ حتیٰ کہ رجنی تک آگئی جب وہ اسے کھانا دینے سے انکار کرتی وہ روز روز سے اپنا سردیوار سے مارنے لگتا۔ دن رات اٹھنے بیٹھنے سے معذور ایک گونگے بہرے انسان کے پاس بیٹھنا کوئی آسان کام نہ تھا لیکن وہ ایک فرض شناس پتی کی طرح سب کچھ برداشت کرتی رہی۔ زندگی

بڑی بھلی گزرتی رہی۔

دوسرے سال کے آغاز میں اسے محسوس ہوا کہ وہ غیر شعوری طور پر شامو سے بے نیاز ہوتی جا رہی ہے۔ بات یہاں تک محدود رہتی تو شاید وہ اتنی متفکر نہ ہوتی لیکن ایک روز اس نے واضح طور پر محسوس کیا کہ شامو کی بے بسی دیکھ کر اسے خوشی ہوتی ہے۔ اسے کھانے کے لئے منہ کھولتے دیکھ کر اس کی حیوانیت جاگ اٹھتی اور اس کے جی میں آتا کہ وہ کھانے کی بجائے کوئی اور چیز اس کے منہ میں ٹھونس دے، ایک بار تو اس نے چنسی بھر مٹی اس کے منہ میں بھر دی۔ شامو کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ وہ ڈر گئی لیکن فوراً سنبھل گئی بھلا یہ گوشت کا لٹھڑا اور اس کا کیا باگاڑ سلگتا ہے، اب اسے ایک مشغلہ مل گیا، وہ اس کے سامنے بیٹھ جاتی اور اسے دکھا دکھا کر کھانا کھاتی۔ بے چینی سے شامو کی پتلیاں اوپر اوپر حرکت کرتیں۔ زبان کی لپ لپ اس پر سن کر وہ دیوانہ وار قہقہے لگاتی اور خالی پیچ اس کے منہ میں ٹھونس دیتی۔ وہ کروٹ بدلتے کی کوشش کرتا اور اسے روکنے کے لئے دائیں ہاتھ کا ذرا سا ٹنڈ اوپر اٹھاتا جو اس کے جسم کا واحد حرکت والا حصہ تھا۔ جب وہ کسی طرح باز نہ آتی تو شامو سختی سے اپنا منہ بند کر لیتا۔ اس کی آنکھوں سے بڑے بڑے آنسو گرتے جسے دیکھ کر وہ رک جاتی اور خالی نظروں سے اسے گھورتے لگتی۔

اچانک اسے اپنی بے ہودہ حرکت کا شدت سے احساس ہوتا اور وہ دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا کر سسکیاں لینے لگتی۔ ایسے میں دوبارہ اس کی پیشانی پر دم کرا اپنی غلطی کے لئے معافی مانگتی۔ لیکن محبت کا یہ جذبہ جلدی سرد پڑ جاتا اور وہ اسے تنگ کرنے کے لئے نئی نئی تجویز سوچنے لگتی۔

ایک روز تو اس کا پاگل پن انتہا کو پہنچ گیا۔ ہوا یوں کہ جہاں وہ رہتا تھا سیاہ دلدلی چیونٹیوں کی ایک قطار اکھڑے ہوئے پلاسٹر کے نشیب و فراز سے عبور کرتی ہوئی چھت کی طرف حرکت کر رہی تھیں۔ اچانک ایک چیونٹی راستہ بدل کر شامو کی گردن پر جا چڑھی اور کان کی لو سے گزرتے ہوئے ہوار خسار تک آن پہنچی۔ دلدلی چیونٹی تھی جس کے جڑے انتہائی تیز تھے رخسار کے گوشت کو نسبتاً نرم پاتے ہوئے اس نے اپنے جڑے اس میں گاڑ دیئے

جانتا ہوں میں نے گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا ہے، کمشنر تم مجھے بچہ سمجھتے ہو۔“

”ابھی تم نے صرف پانی پیا ہے میں تم کو شربت پلاؤں گا، تم نے میری ہمدردی کی کیا بات کی ہے۔“ کرامت بولا۔

”وہ بہت خوب صورت عورت ہے تعلیم یافتہ بھی ہے، یہ ہے وجہ ہمدردی کی۔“

”تم واقعی نہایت منہ پھٹ اور اجڑ آدمی ہو، میں نے تم دونوں کے درمیان راضی نامہ کرانے کی ذاتی کوشش اس لئے کی ہے کہ تم مسلمان ہو، میں اس بات کو اسکیڈل بنانا نہیں چاہتا تھا اور تم نے نہایت بے غیرتی سے مجھ پر ہی الزام لگا دیا اب تم پیشی پر آنا اور اپنا فیصلہ من لیتا۔“

وہ غصے سے کھڑا ہوا اور بولا۔ ”دیکھ لوں گا تجھے بھی میں بے ہاتھ پیر کا نہیں ہوں۔“ اور وہ چلا گیا۔

کرامت جانتا تھا کہ احمد یار بڑا زمیندار ہے اور نہایت گری فطرت کا مالک بھی ہے وہ کچھ بھی کر سکتا تھا۔ وہ گھر آ گیا اور کھانا وغیرہ کھا کر بستر پر لیٹ گیا گرمیوں کے دن تھے، پنکھا چل رہا تھا۔ اور کھڑکیاں کھلی تھیں، ابھی اس کو نیند نہیں آئی تھی اس کی نظر کھڑکی کی طرف گئی تو اس نے دیکھا کہ کھڑکی کی جالی پر ایک پرندہ موجود ہے وہ اٹھ کر بیٹھ گیا اور غور سے اس کو دیکھنے لگا، کمرے کی روشنی میں صاف نظر آ رہا تھا کہ وہ نسل کٹھ ہے۔

کرامت اس کو دیکھ کر خوش ہو گیا اور بولا۔ ”خوب آئے میرے دوست مجھے تمہاری ضرورت تھی۔“

نیل کٹھ نے پر پھیلائے اور کرامت کی طرف دیکھا اور نیل کٹھ کا جواب کرامت کی سمجھ میں آ گیا۔

وہ کہہ رہا تھا۔ ”تم نے اپنی سی کوشش کر لی مگر سوکھی لکڑی سیدھی نہیں ہوتی اب تم کچھ نہ کرنا میں کروں گا۔“

کرامت نے پوچھا۔ ”تم کیا کرو گے یہ تو بتاؤ۔“

نیل کٹھ نے پھر پر پھیلائے اور جواب کرامت کے ذہن میں موصول ہوا۔

احمد یار میں ذرا الجھن تھی، کرامت نے ہر طرح کوشش کی مگر کامیابی نہ ملی۔

آمنہ خاتون نے کہا۔ ”کمشنر صاحب میں یہ نہیں کہتی کہ میرے باپ نے میرے ساتھ اچھا نہیں کیا، اس نے تو ظاہری نام نمود دیکھا تھا زمینداری دیکھی تھی اور میرے مستقبل کو بہتر کرنے کی کوشش کی تھی مگر شادی کے بعد مجھے اندازہ ہوا کہ یہ ظاہری طور پر جو کچھ نظر آتا ہے ویسا نہیں ہے۔ اس کی حویلی میں کئی جوان عورتیں رہتی ہیں وہ اس کی بیویاں نہیں ہیں، مگر بیویاں ہی ہیں۔ میں نے بہت برداشت کیا ہر طرح اس کو خوش رکھنے کی کوشش کی، خود پر جبر کیا مگر وہ نہ مانا۔

عورت اپنی ہر چیز تقسیم کر سکتی ہے مگر شوہر کو نہیں تقسیم کرتی، وہ ہر حالت میں اس کو اپنے آئینل میں باندھ کر رکھنا چاہتی ہے، میں جب ناامید ہوئی تو میں نے طلاق کا مطالبہ کیا ہے اس کے بعد مجھے ہر طرح دھمکا یا گیا، میرے باپ کو مار ڈالنے کی کوشش کی گئی وہ خود کو زمین کا خدا سمجھتا ہے سب کو اپنی جاگیر خیال کرتا ہے میں ایک پڑھی لکھی عورت ہوں اس کے اجڑ پن کے کاموں سے تنگ آ کر میں نے فیصلہ کیا تھا اور آج میں سمجھتی ہوں کہ میرا فیصلہ غلط نہ تھا اس کی حویلی میں آج بھی کئی عورتیں ہیں اس کو میری ضرورت نہیں ہے بس ہٹ دھری ہے مگر میں نے طے کر لیا ہے کہ مر جاؤں گی اگر اس کی حویلی میں نہیں جاؤں گی۔“

کرامت کے لئے کوئی راستہ میل ملاپ کرانے کا نہیں تھا اس نے آخری حجت تمام کرنے کو زمیندار احمد یار کو طلب کر لیا اور کہا۔ ”آمنہ بیگم تمہارے ساتھ جانے پر راضی نہیں ہے بولو کیا کہتے ہو؟“

احمد یار بولا۔ ”زندہ نہیں جائے گی تو لاش لے جاؤں گا حویلی تو جانا پڑے گا۔“

”تم میرے سامنے اس قسم کی باتیں کر رہے ہو جانتے ہو میں کون ہوں؟“

”ہاں جانتا ہوں آج تم ہوکل نہیں ہو گے اور تمہاری جگہ دوسرا آ جائے گا، تمہاری ہمدردی کو بھی میں

کی طرف بڑھا، دروازے کے سامنے پہنچ کر تلواریں اس نے فرش پر رکھ دی اور دوبارہ واپس ہو کر دوسری تلوار دروازے تک پہنچانے میں اسے تیس منٹ لگے، فرش پر گھسنے سے اس کا سارا جسم خون میں نہا گیا۔

نڈ باز و اور دانٹوں کی مدد سے اس نے دونوں تلواروں کو دروازے کے عین سامنے ایک دوسرے کے سہارے اس طرح کھڑا کیا کہ باہر سے آنے والا جو بھی پت کھولے ان کا شکار ہو جائے۔ اب وہ گھسٹا ہوا کھڑکی کی طرف بڑھا کمرے کا سارا فرش اس کے خون سے سرخ ہو رہا تھا دوسری آنکھ بھی بوجھ پڑنے سے ناکارہ ہوئی جا رہی تھی کسی نہ کسی طرح وہ کھڑکی تک پہنچ ہی گیا دانٹوں سے پت پکڑ کر وہ تانگوں کے نڈ پر کھڑا ہو گیا اور ایک ہی جھٹکے میں کھڑکی پر چڑھ گیا۔ اب وہ کھڑکی میں لیٹا ہوا تھا نیچے دروازے میں نظر آ رہی تھی۔

بار بار وہ اپنی زخمی آنکھ کھولتا اور دروازے کی طرف دیکھ لیتا۔

وقت دھیرے دھیرے کھسک رہا تھا، رجنی ڈاکٹر کے پاس پہنچی تو وہ ایک مریض کے آپریشن میں مصروف تھا۔ اس نے وعدہ کیا کہ وہ فارغ ہوتے ہی اس کے گھر پہنچ جائے گا، یہاں مزید ٹھہرتے بیکار سمجھ کر وہ اگلے پیروں گھر کی طرف بھاگی۔ تیز رفتاری سے سیڑھیاں عبور کرتے ہوئے وہ کمرے کے دروازے پر جا پہنچی۔ ایک لمحے کے لئے رکی اور اس نے سوچا کہ وہ رد کر اپنے تصور کی معافی مانگے گی۔

کمرے کا دروازہ اسی طرح بند تھا جیسا کہ وہ چھوڑ کر گئی تھی۔ اس نے جھٹکے سے دروازے کو کھولا اور تیزی سے اندر داخل ہوئی۔ بے اختیار اس کے منہ سے ایک دلخراش چیخ نکلی۔ تیز دھار تلواریں اس کے آریار ہو چکی تھیں۔ کھڑکی میں پڑے ہوئے گوشت کے ڈھیر میں حرکت پیدا ہوئی اور اگلے ہی لمحے خون میں نہایا ہوا ایک جسم کھڑکی سے نیچے گر پڑا۔



تکلیف کی شدت سے شامو کا جسم اپنی جگہ سے ایک ایک فٹ اچھلنے لگا۔ اس کا منہ کھل گیا اور حلق سے غرغرا کی آوازیں نکلنے لگیں۔ اس کی آنکھوں سے سرخ گاڑھا خون بہہ نکلا۔ تھوڑی دیر میں پتے کے بعد وہ بے ہوش ہو گیا اور پھر وہ بے حس و حرکت نظر آنے لگا۔ رجنی نے انگوٹھے باہر نکال لئے اور چادر سے ہاتھ صاف کر کے شامو کی طرف دیکھا اس کی ایک آنکھ پوری طرح کھلی جا چکی تھی، چکی میں سے زرد زرد پانی بہہ رہا تھا۔ دوسری آنکھ صرف زخمی ہوئی تھی کیونکہ جذبات کی شدت سے اس کا انگوٹھا درست نشانے پر نہیں تھا۔ اس کی آنکھ کا صرف ایک کونہ زخمی ہوا تھا اور اس میں سے خون رس رہا تھا۔

اچانک اسے خوف نے آن لیا۔ یہ اس کا پتی تھا اس کا محبوب پتی جو اس سے بے پناہ محبت کیا کرتا تھا جس کی اس نے تین سال دل و جان سے خدمت کی تھی۔ بے اختیار اس کا دل بھرا آیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ گونگا بہر اور معدہ درتو وہ پہلے ہی تھا۔ لیکن اس کی اس حرکت نے اسے اندھا بھی بنا دیا۔ اب وہ کیسے زندہ رہے گا۔ وہ سسکیاں لیتی ہوئی باہر کی طرف بھاگی اور ایک ہی سانس میں سیڑھیاں عبور کرتے ہوئے نیچے پہنچ گئی۔

تھوڑی دیر بعد وہ اسپتال کی طرف جانے والی سڑک پر تیزی سے دوڑ رہی تھی، شامو کے جسم میں حرکت ہوئی۔ اس کی داہنی آنکھ ذرا سی کھلی اور سیاہ پتلی دائیں بائیں حرکت کرنے لگی۔

اچانک نڈ باز کا سہارا لے کر وہ فرش پر اوندھے منہ لیٹ گیا اور تھوڑی فرش پر ٹکا کر اس نے جسم کو ذرا سا آگے بڑھایا۔ سخت فرش پر گھسنے سے اس کے چہرے سے خون بہنے لگا لیکن وہ بڑھتا چلا گیا۔ دوسری دیوار تک پہنچتے ہوئے وہ لہو لہان ہو چکا تھا۔ یہاں سے اس نے سارا ور لگا کر اپنے جسم کو کھڑا کر لیا، دیوار کا سہارا لے کر اس نے دانٹوں سے تلوار اتاری اور زمین پر پھینک دی۔ گردن نیچی کر کے اس نے دوسری تلوار اتاری اور اپنے آپ کو زمین پر گرادیا۔

کچھ دیر تک وہ ساکت رہا پھر گھسٹا ہوا دروازے

اس نے ضروری سامان ٹرک میں ڈالا خود بھی اس ٹرک میں اور بچے والدین بھی کیونکہ حالات اتنے خراب تھے کہ اس کا اپنے علاقے سے نکلنا ناممکن تھا وہ مشہور آدمی تھا۔ اس کے بہت دشمن تھے، اور جو دوست تھے ان پر بھی بھروسہ کرنا مناسب نہ تھا صرف ایک دوست تھا۔

نیل کلٹھ جو اس کا بے لوث دوست تھا اور اس نے اس کے بھروسے پر ہی سہارن پور سے دلی تک کا سفر کرنا تھا، دلی جانا ضروری تھا، کچھ سرکاری کام اور کاغذات حاصل کرنا تھے۔ علاقے کے بلوائی جانتے تھے، کراست جانے والا ہے، انہوں نے اس راہ میں پوری پوری رکاوٹیں کھڑی کر دی تھیں، ہر موڑ پر آدمی موجود تھے اس کا ڈرائیور ایک ریٹائر فوجی تھا اور مسلمان تھا اس کے گھر کے تمام افراد شہید ہو چکے تھے، ٹرک میں سامان اس طرح رکھا گیا تھا کہ درمیان میں جگہ تھی، وہاں پر گندے ڈال دیئے تھے اور سب ان پر بیٹھ گئے۔

کراست ڈرائیور کے ساتھ تھا اور اس کے پاس بھری ہوئی دو بندوقیں تھیں، ٹرک پرانا ضرور تھا مگر فوجی تھا اور نہایت مضبوط اور طاقتور تھا اس کے علاوہ ڈرائیور نے اس کو اس سفر کے لئے تیار بھی کیا تھا، سامان خان ڈرائیور دن بھر کراست کے پاس رہا تھا اور ٹرک کی ایک ایک چیز چیک کرتا رہا۔

شام کو نکلنے کا پروگرام تھا سلیمان خان بولا۔ ”سر کھانے کا دو تین وقت کا اور پانی کا پورا بندوبست ہونا چاہئے، آگے کے حالات کا پتہ نہیں ہے سنا ہے پانی پت اور سونی پت میں حالات بہت خراب ہیں۔ امرتسر کی طرف لدھیانہ اور اس کے اطراف میں سکھ بلوائی قتل عام کر رہے ہیں۔ دلی پہنچ گئے تو پھر آگے کی طرف کا راستہ تلاش کر لیں گے آپ سرکاری کاغذات لے لیتا۔“

کراست نے کہا۔ ”سلیمان خان تم بے فکر ہو کر سفر کرو، خدا تمہاری اور میری فیملی کی حفاظت کرے گا۔“

سلیمان خان بولا۔ ”تمہاری بات درست ہے میں نے برما کے محاذ پر سینکڑوں کو مارا اور زندہ آگیا، مگر

اپنی فیملی کو نہ بچا سکا صرف آدھے گھنٹے کو باہر گیا تھا واپس آیا تو کچھ نہیں تھا گھر کی جگہ جلا ہوا رکھ کا ڈھیر تھا اور اس میں سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ مگر میں پھر بھی رو دیا نہیں ہوں، میں فوجی ہوں، مقابلہ کرنا جانتا ہوں اور مرنا جانتا ہوں مجھے موت کا ڈر نہیں ہے، آپ اپنا خیال رکھنا اور اگر میں مر جاؤں تو آپ کو خود یہ ٹرک چلانا ہوگا میں نے آپ کو اس کے بارے میں بتا دیا ہے۔“

اور رات آٹھ بجے یہ قافلہ روانہ ہوا پہلے موڑ پر ہی کچھ لوگ ڈھائے باندھے ہاتھوں میں ہتھیار لئے سڑک پر آگئے اور رکنے کا اشارہ کیا۔ سلیمان خان نے ذرا اسپینڈ کم کی اور قریب پہنچ کر سڑک کا انجن زور سے غرایا اور ان کے اوپر سے گزر گیا کئی زمین پر گر پڑے ٹرک بہت تیز تھا ان سے دور ہوتا گیا، دو تین میل چلے تھے کہ پھر رکاوٹ آئی مگر ٹرک اس رکاوٹ کو بھی توڑ گیا۔

کراست دیکھ چکا تھا کہ ٹرک کے اوپر نیل کلٹھ پرواز کر رہا ہے، جب بھی خطرہ ہوتا تھا وہ ٹرک کے قریب آ جاتا تھا اور کسی نہ کسی طرح ٹرک خیریت سے گزر جاتا تھا، دلی شہر کے اطراف میں قتل و غارت گری کا بازار تھا، آنے والوں اور جانے والوں کو قتل کیا جا رہا تھا، ان کا اسباب اور عورتوں کو اغوا کیا جا رہا تھا، مردوں کے قتل سے خون کی ندیاں بہہ رہی تھیں، سڑک سرخ تھی جا بجا لاشیں پڑی تھیں، ان پر گندہ منڈلا رہے تھے، زخمی آہ وزاری کر رہے تھے اور کراست کا دیوہیکل ٹرک چلا جا رہا تھا۔ اس پر گولیاں بھی برسائی گئیں، راستے میں رکاوٹیں بھی کھڑی کی گئیں مگر یہ ملٹری میک ٹرک ان رکاوٹوں کو توڑتا گزر گیا۔

بہت دفعہ تو ایسا ہوا کہ بلوائیوں کو یہ فوج کا ٹرک نظر آیا اور وہ اس کو دیکھ کر خود بھاگ گئے۔

دلی شہر کی حالت بھی خراب تھی ہر طرف افراتفری اور لوٹ مار کا بازار گرم تھا۔

ٹرک اجیری گیٹ کی پولیس چوکی پر رکا، کراست اتر کر اندر گیا، اور اس نے بتایا کہ وہ کون ہے تو پولیس نے ٹرک کو چاروں طرف سے گھیر کر اپنی حفاظت



سمان خان بولا۔ ”رات کو بھی کھانے کا اچھا بندوبست تم نے کر دیا تھا۔“
”غلطی ہو گئی معاف کریں۔“

سمان خان بولا۔ ”آپ کچھ نہ کریں میں خود یہ کام کر لوں گا۔“

دھیان چند بولا۔ ”آپ لوگ پاکستان جا رہے ہیں، آخری خدمت ہمیں بھی کر لینے دیں۔“
”تم نے تو آخری خدمت کر لی دھیان چند اب اور نہ کرو تو بہتر ہے۔“ سمان خان بولا۔

”سمان نے ٹرک اشارٹ کیا اور جامع مسجد کی طرف روانہ ہوا جگہ جگہ دکانیں اور مکان جل کر کالے سیاہ پڑے تھے، روڈ پر اکا دکا گاڑیاں تھیں اور بازار بند تھا، جامع مسجد کے ہوٹل بھی بند تھے، سمان خان نے ٹرک ایک ہوٹل کے سامنے روکا وہ ہوٹل شاید کسی ہندو کا تھا ایک دو آدمی اندر موجود تھے۔

سمان خان نے کہا۔ ”کھانا چاہئے مل جائے گا۔“ کاؤنٹر پر جو آدمی تھا وہ بولا۔

”کھانا تو مشکل ہے پکانے والا کوئی نہیں آیا۔“
سمان خان بولا۔ ”دبے تو ہیں سات آٹھ

پرائیوٹ جکوارڈ کام چل جائے گا۔“
کاؤنٹر والا بولا۔ ”ہاں یہ ہو سکتا ہے تم ذرا انتظار

کرو میں بندوبست کرتا ہوں۔“
سمان خان نے دس کا نوٹ کاؤنٹر پر رکھ دیا

اور بولا۔ ”میں گاڑی پر ہوں تم انتظام کرو میں ابھی آتا ہوں۔“ گاڑی کے ارد گرد چار پانچ آدمی کھڑے تھے مگر

قریب نہیں آ رہے تھے، ان کے ارادے خطرناک لگتے تھے۔ سمان خان کو دیکھ کر وہ سب چلے گئے، سمان

خان نے سوچا میں ٹرک پر نہیں جاتا تو یہ کچھ بھی کر سکتے تھے۔ سامان لوٹ لیتے ٹرک کو آگ لگا دیتے مگر یہ

قریب نہ آئے، سمان خان نہیں جانتا تھا کہ کرامت کا دوست ٹرک کی حفاظت کر رہا تھا اس نے کسی کو ٹرک کے

قریب نہ آنے دیا، ان کے دلوں میں خوف پیدا کر دیا۔
سرکاری دفاتر بند تھے، تبادلے کے کاغذات

کہاں سے ملتے، تین دن گزر گئے مگر ٹرانسفر لیٹر کے ملنے کی کوئی امید نظر نہ آتی تھی اور بغیر اس کے کرامت جانا نہیں چاہتا تھا۔ رات کو اس نے تصور کے پردے پر ٹل کلتھ سے پوچھا۔ ”یہ کیا ہو رہا ہے میرے ساتھ کوئی تعاون نہیں کر رہا ہے میں کیا کروں؟“

ٹل کلتھ نے جواب دیا۔ ”کشور نندن تمہارے رینک کا آدمی ہے وہی یہ کام کرتا ہے مگر بہت متعصب

اور مسلمانوں سے نفرت کرنے والا ہے۔ ہندو ہے اس نے جان بوجھ کر تم کو روکا ہوا ہے۔ مگر وہ کل خود تمہارے پاس آئے گا اور سارے ڈاکومنٹ تم کو دے گا۔“

کرامت سکون سے سو گیا، سویرے ناشتہ کیا

یہ تھا کہ کشور نندن آ گیا اور بولا۔ ”سوری کرامت صاحب میں بہت مصروف تھا اس لئے دیر ہو گئی یہ

آپ کے کاغذات ہیں، آپ کو پاکستان میں پریشانی نہیں ہوگی۔“

کرامت نے فائل لے کر تمام کاغذات کو چیک کیا پھر کہا۔ ”یہ فائل تو مکمل پڑی تھی مگر آپ کے دفتر میں

کوئی ہوتا ہی نہیں ہے پھر آپ کہاں مصروف ہوتے ہیں۔“

نندن ذرا شرمندہ نہ ہوا بولا۔ ”یار اب تو تم جارہے ہو خوش خوش جاؤ تلخ باتوں کو بھول جاؤ۔

تمہارے لیڈروں نے آخر اپنا ملک بنا ہی ڈالا اب تمہارا ہمارا کیا جھگڑا۔“

”یہ تو تم نے ٹھیک کہا جھگڑا تو کچھ نہیں ہے مگر تمہارے رویے سے اندازہ ہوتا ہے کہ تم لوگوں نے

پاکستان کے وجود کو تسلیم نہیں کیا اور جب تسلیم نہیں کیا تو آگے بھی آپ لوگ مشکلات پیدا کریں گے اس کو ختم

کرنے یا نقصان پہنچانے کی کوشش کریں گے، معاف کرنا نندن صاحب میں نے یہ اندازہ یہاں کی قتل

گری اور آفیسروں کے رویے سے قائم کئے ہیں، شاید درست نہ ہوں۔“ کرامت نے کہا۔

”نندن غصے کر بولا۔ ”ایسی بات نہیں ہے، میں آپ کے لئے ٹرانسپورٹ کا بندوبست کر دوں۔“

بولے۔ ”کٹیا میں جا کر دیا جلا دے اور دیا جب جل جائے تو آ کر مجھے بتا دے۔“

یہ سنتے ہی وہ بھاگا ہوا گیا اور کٹیا میں دیا جلا کر ترنت آیا اور مہاراج سے بولا۔ ”مہاراج میں نے دیا جلا دیا ہے آپ اگر چلنا چاہیں تو چلیں۔“

سادھو مہاراج نے لوگوں سے کہا۔ ”لوگو! میرے آرام کا سے ہو گیا ہے، اور رات سے کوئی بھی میرے پاس نہ آئے۔۔۔۔۔ کل دن سے، میں پھر تم لوگوں سے ملوں گا، دراصل رات کا اندھیرا پھیلتے ہی میں گیان دھیان میں لگ جاتا ہوں، اچھا اب تم لوگ اپنے اپنے گھروں کو جاؤ۔“

اور یہ سنتے ہی گاؤں کے سارے لوگ اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے اور سادھو مہاراج اپنی کٹیا میں آ گئے۔

رات کا اندھیرا پورے گاؤں پر مسلط تھا، تمام گھر کے لوگ میٹھی نیند میں تھے۔ مگر ایک ایسا گھر بھی تھا جس میں دو عورتیں جاگ رہی تھیں، ایک ماں اور دوسری اس کی بیٹی جو اس سال رکنی۔

رکنی سے اس کی ماں بولی۔ ”ارے جنم جلی میری بات مان اور تو سادھو مہاراج کے پاس اس سے چلی جا۔ مہاراج کی سیوا کر کے اپنا جیون سنوار لے، تیرا باپ مر گیا۔۔۔۔۔ غربت ہمارے لئے چھوڑ گیا۔۔۔۔۔ اور غربت کی وجہ سے تیری جوانی اکارت جا رہی ہے۔ تو گاؤں کی سب سے سندر تیری ہے مگر کوئی آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا کہ ہم غریب ہیں۔“

سادھو مہاراج بہت پہنچے ہوئے ہیں۔ دن بھر لوگوں کے سامنے چمٹکار پر چمٹکار کرتے رہے، میری بات مان لے، مہاراج نے تجھ پر دیا کر دیا تو تیرا جیون سنور جائے گا۔ ایسا کر کے منہ ہاتھ دھو کر صاف صاف چولی اور چندری پہن لے۔

مہاراج کو اپنی پتا سنا کر ان کے دل میں گھر کر لینا اور ویسے بھی تو اچھی بھلی بات کر لیتی ہے۔ اور ہاں یہ یاد رکھنا کہ اس بات کی کسی کو بھٹک نہ لگے۔۔۔۔۔ میرا

من کہتا ہے کہ مہاراج ضرور تجھ پر کر پا کریں گے۔ اچھا اب تو جلدی سے کپڑے بدل لے۔ منہ ہاتھ بھی ذرا اچھی طرح دھو لینا۔“

خیر رکنی نے ماں کی بات مان لی۔ وہ خود بھی چاہتی تھی کہ ان کے گھر سے غربت دور ہو جائے، اس کا بھی بیواہ کسی اچھی جگہ ہو جائے۔ غربت کی وجہ سے اس کی اٹھتی جوانی کو کوئی آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا تھا۔ کوئی آدھا گھنٹہ میں رکنی دھلی ہوئی چندری اور چولی پہن کر تیار ہو گئی۔

اور پھر دونوں ماں بیٹی گھر سے نکل کر مہاراج کی کٹیا کی طرف بڑھنے لگیں۔ کوئی پندرہ منٹ کا راستہ تھا۔ دونوں کٹیا کے قریب پہنچ گئیں۔ ماں بولی۔ ”میں برگد کے درخت کے پاس بیٹھتی ہوں تو مہاراج کی کٹیا میں جا۔“ یہ سن کر رکنی بولی۔ ”ماں اگر مہاراج نے بھگا دیا تو؟“

”ماں بولی۔“ ”ارے ایسا نہیں ہوگا۔۔۔۔۔ مہاراج بہت دیا لو ہیں۔۔۔۔۔ میرا من اندر سے کہہ رہا ہے کہ مہاراج تیری قسمت ضرور بدل دیں گے۔ تو گھبرا نہیں ارے پاگل مطلب کے لئے تو نہ جانے کیا کیا کرنا پڑتا ہے۔“

رکنی کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ رات کا اندھیرا قرب و جوار کو بہت ڈراؤنا بنا رہا تھا۔ ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا تھا مگر مہاراج کی کٹیا میں دیا جل رہا تھا۔

خوف و ہراس کے جنگل میں پھنسی عڑھا ل قدم اٹھاتی ہوئی رکنی کٹیا کے دروازے پر پہنچ گئی کہ اتنے میں اندر سے آواز آئی۔ ”رکنی اندر آ جا۔“

اپنا نام سن کر رکنی اچنبھے میں پڑ گئی کہ ”مہاراج نے اپنے گیان سے میرا نام بھی معلوم کر لیا۔ مہاراج واقعی بہت چمٹکار والے ہیں۔“

خیر رکنی کٹیا میں داخل ہو گئی۔ اندر جاتے ہی رکنی نے مہاراج کو پر نام کیا، اپنے دونوں ہاتھ جوڑ کر تو مہاراج نے بھرپور نظر سے رکنی کا جائزہ لیا۔

رکنی پر جوانی اس قدر مہربان ہوئی تھی کہ رکنی کو

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✧ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریچ
- ✧ ایڈ فری لنکس، لنکس کو پیسے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا
- ✧ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو مائیل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر ویو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✧ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریچ
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

رہے بعد پھر ایک دیر
دیا۔ اور سنان خان اتر کر جانے سے پہلے بولا
”آپ بھی تھک گئے ہوں گے میں
دیکھتا ہوں آپ ٹرک کے قریب ہی رہنا۔“
کرامت بھی اتر پڑا اور ٹرک کے پیچھے گر
آواز دی۔

سنان خان اس طرف چلا گیا جدھر دکا تیر
آ رہی تھیں۔
روڈ اور حالات دونوں ہی خراب تھے اس
پر لگتا تھا کم گاڑیاں آتی تھیں اس نے اس کی مرمت
دیکھ بھال پر توجہ نہیں کی تھی، آبادیاں بھی دور
تھیں، رستہ نام آتے آتے تین روز گزر چکے تھے۔ رات
بڑا شہر تو نہیں ہے مگر شہر ہے آبادی ملی جلی ہے یہاں
آنے میں بڑا چکر کاٹنا پڑا تھا مگر یہاں پر اس تھا باز
کھلے تھے۔

ایک سرائے نما ہوٹل کے سامنے سنان خان
نے ٹرک روکا اور ایک بڑا سا کمرہ لے لیا اور
کر اندر پہنچایا۔

یہ سنان خان بھی آیا ہوں
رہے ہیں اور تاشقند بھی کرتے ہیں۔
”دیکھ لینا علاقہ پر امن ہے کہ نہیں۔“ کرامت
نے کہا۔

یہ کوئی بڑی جگہ نہ تھی، سنان خان نے ایک گھنے
درخت کے سائے میں ٹرک روک دیا اور نیچے اتر پڑا
نیچے اتر کر بولا۔ ”مگر جگہ تو پر امن لگتی ہے آپ بھی آ جاؤ
اور ابا اماں کو بھی اتار لو تاشقند کریں گے۔“

سنان خان بازار کی طرف چلا ہی تھا کہ اس
کے پاس ایک آدمی تیزی سے چلتا ہوا آیا اور بولا۔
”تمہارا نام سنان خان ہے؟“

سنان خان حیرت سے بولا۔ ”تم کو کیسے
پتہ چلا۔“

”ڈرائیور صاحب یہ بات نہ پوچھیں یہ
بتائیں تم کرامت صاحب کو لے کر بسکے جا رہے ہو۔“
وہ آدمی بولا۔

نہ رہا۔ اور جب اس کے حواس بحال ہوئے تو مہاراج کی آواز سنائی دی۔ ”رکمنی۔“
”جی مہاراج۔۔۔۔۔“

”رکمنی آج تو پوتر ہو گئی۔۔۔۔۔ تو نے میرا سن خوش کر دیا۔ میں بھی تجھے خوش کر دوں گا۔ بھولے سے بھی تو اپنی زبان کسی اور کے سامنے نہ کھولنا۔ اب تو جا۔۔۔۔۔ صبح ہونے والی ہے، تیری ماں برگد کے درخت کے نیچے بیٹھی ہے۔ اسے ساتھ لے کر جلدی سے گھر چلی جا۔۔۔۔۔ اور کل کی رات گزار کر جب صبح تو سو کر اٹھے گی تو تیرا گھر دھن دولت سے بھرا ملے گا۔ اور بہت تھوڑے دنوں میں تیرا بیاہ بہت اچھی جگہ ہو جائے گا۔“ اور پھر مہاراج کی بات سنتے ہی رکمنی نڈھال قدموں سے چلتی ہوئی کٹیا سے نکل گئی۔ ماں اپنی جگہ بیٹھی ہوئی ملی۔

ماں تجربہ کار اور جہاں دیدہ تھی۔ ساری حقیقت کو جان گئی رکمنی کی حالت اور چال دیکھ کر۔

اور پھر ایسا ہی ہوا جیسا کہ مہاراج نے کہا تھا۔ دوسرے دن رکمنی کا گھر سونے چاندی سے بھر گیا تھا۔ اس کے بعد تو رکمنی مہاراج کی دیوانی ہو گئی۔۔۔۔۔ اب وہ خود اپنی ماں سے بولتی۔۔۔۔۔ ”ماں میں تو مہاراج کے پاس جا رہی ہوں۔۔۔۔۔ کیونکہ سیوا کرنے سے میوہ ملتا ہے۔“

برگد کے درخت کے نیچے بیٹھے سادھو مہاراج کو ایک ہفتہ ہو گیا تھا۔ چوتھے دن سے مہاراج جب درخت کے نیچے بیٹھے تو نہ جانے کہاں سے ایک زہریلا بہت لمبا سانپ آ کر مہاراج کی گردن میں اپنا پھن کاڑھ کر لپٹ جاتا اور اسے دیکھ کر گاؤں والے اور بھی مہاراج کے عقیدت مند ہونے لگے تھے۔

اب تو ہر رات پاپ ہونے لگا تھا۔ اندھیرا پھیلنے ہی رکمنی کی کٹیا میں آ جاتی اور رات بھر مہاراج کی سیوا میں گزار دیتی۔ دراصل مہاراج نے اپنی خفیہ طاقتوں سے رکمنی کو مسح کر لیا تھا۔ اور مہاراج چونکہ جناتی طاقت والے تھے۔ گاؤں والوں کے لئے سادھو مہاراج لیکن حقیقت میں زالوشا۔

ادھر رولوکا نے حتی فیصلہ کر لیا کہ اب

زالوشا۔۔۔۔۔ عرف سادھو مہاراج کا خاتمہ کر دینا چاہئے۔ ٹھیک دسویں دن مہاراج صبح سویرے اپنی کٹیا سے نکل کر آئے اور برگد کے درخت کے نیچے بیٹھ گئے۔ دن کے گیارہ بجتے ہی لوگوں کی بھیڑ لگ گئی۔

سوا گیارہ بجے وہ سانپ نہ جانے کدھر سے ریختا ہوا آیا اور مہاراج کی گردن کے گرد لپٹ گیا۔ اور یہ روز کا معمول تھا کہ سانپ خود بخود آ کر مہاراج کی گردن میں لپٹ جاتا تھا۔

آج رولوکا نے مہاراج کے بیٹھے ہی مہاراج عرف زالوشا۔۔۔۔۔ کے گرد ایک مضبوط حصار قائم کر دیا تھا اور ساتھ ہی ساتھ اب مہاراج کی زبان بھی بند کر دی تھی۔ مہاراج بولنے سے قاصر تھے۔

ٹھیک ساڑھے گیارہ بجے، سانپ کا دھڑ اور سراو پرکواٹھنے لگا اور مہاراج کی گردن کے گرد سانپ کا گھیرا کسنے لگا۔ یہ دیکھ کر لوگوں کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

سانپ اوپر کواٹھتے اٹھتے اپنے سروا لے حصے کو ایک شاخ کے گرد پیٹنے لگا، اس کے بعد لوگوں نے دیکھا کہ مہاراج کی گردن کو سانپ کی دم نے اپنے گھیرے میں جکڑ لیا تھا، پھر سانپ نے اپنے پورے وجود کو اوپر کو کھینچنے لگا اور اس طرح مہاراج اوپر کواٹھنے لگے۔

مہاراج اب بے سدھ ہو چکے تھے۔ مہاراج کی دونوں آنکھیں باہر کواہل پڑی تھیں۔ اور پھر یک بیک مہاراج کے پورے جسم میں شعلے بھڑک اٹھے اور مہاراج دھڑام سے نیچے کو گرے، ان کا پورا وجود بھڑکتے ہوئے شعلوں میں غائب ہو چکا تھا۔

اس جگہ جمع سارے لوگ حیران و ششدر تھے کہ یہ ہوا تو کیا ہوا۔

اور پھر چند منٹ میں شعلے ختم ہو گئے تو لوگوں نے دیکھا کہ اس جگہ تھوڑی سی راکھ پڑی تھی کہ اچانک تیز ہوا چلی جس نے اس راکھ کو اڑا کر ختم کر دیا۔

اور درخت پر جو مہیب خوفناک اور درہشت ناک سانپ شاخ سے لپٹا تھا وہ بھی غائب ہو چکا تھا۔ اب

۔۔۔

۔۔۔ سنا جھ پالیا ہوں، ادھوری بات کو اور بڑھاتا ہے یہ بیماری اس قسم کی ہے علاج نہیں ہے۔“

”سر میں پوری بات سمجھ نہیں سکا۔“

بولے۔

”عقل و دانش سے اوپر بھی کچھ ہے ایسی پراسرار دنیا کا وجود ہے کبھی کبھی اس پر اسرار کوئی وجود ہمارے درمیان آ جاتا ہے۔ وہ نظر سے اور ہوتا کچھ اور ہے، اس کے باوجود کہ وہ قرآن سے مگر پھر بھی دور ہوتا ہے اس کے بارے میں سمجھ مشکل ہوتا ہے، اس لئے اس سے پوچھا نہیں جا سکتا اس لئے نہیں پوچھا جاتا کہ وہ بتلائے گا نہیں یہ را اس کو کھولے گا سوال کرنے والا بھی گھاسٹے میں جواب دینے والا بھی نقصان میں۔ اس نے جو ہے نہ تم بولونہ میں بولوں والا معاملہ ہوتا ہے۔ ص ذ کچھ سمجھ کے مطابق چلتے۔۔۔

۔۔۔ ہمارا موتی نیند بلاتی ہے۔ یہ علاقہ لو غیر آباد سا لگتا ہے۔“

۔۔۔ ان خان بولا۔ ”ایک بات پوچھوں سر آپ ناراض تو نہیں ہوں گے۔“

”نہیں ناراضگی کی کیا بات ہے، میں تم کو کافی حد تک سمجھ چکا ہوں پوچھو کیا پوچھتے ہو؟“

”سر میں نے اس طویل سفر میں یہ بات محسوس کی ہے کہ آپ آگے کے سفر کے بارے میں بالکل ٹھیک ٹھیک انداز سے قائم کرتے ہیں، میرا خیال ہے ان حالات میں کسی بھی مقام کے بارے میں اندازہ لگانا نہایت مشکل ہے کیونکہ لوگوں کی نظریں اس طرح بدلی ہیں کہ دوست دشمن ہو گئے ہیں زندگی بھر کی دوستیاں پاکستان کے وجود میں آتے ہی دشمنی میں بدل گئی ہیں۔ پھر آپ کے انداز سے درست ہیں۔“

copied From Web

2015



لئے کہ شکایت کرنے کی صورت میں اس کے والدین اس کو اور بھی ڈانٹتے تھے کہ تو نے ضرور کچھ شرارت کی ہوگی۔ اس ماحول میں بچے شرارت تو کرتے تھے مگر بڑوں کی نظروں سے بچ کر بڑے سب لوگ تھے، سب ان کو برے کام سے روکنے اور مارنے کا حق رکھتے تھے، بچوں کو سب سے ڈرنا پڑتا تھا، پھر بھلا بچوں سے غلط کام کیسے ہو سکتے تھے، ہر بڑے کی نظر ان پر رہتی تھی، بچہ کسی کا ہو ہر کوئی اپنا سمجھ کر ان پر نظر رکھتا تھا۔

ایسا ماحول اور انسانوں کا ایسا رویہ پڑھ کر شاید آج کا انسان حیرت کرے اور کرے گا۔ مگر راوی یہی حقیقت بیان کرتے ہیں کہ ایسا ہی ماحول تھا اور اسی ماحول کی یہ کہانی بیان کرتے ہیں کہ کرامت ساتویں میں بڑی اچھی پوزیشن لے کر گیا۔ اسکول میں ہی دوستوں کے ساتھ شکار کا پروگرام بن گیا اور چھٹی کے بعد اس نے کتابیں ایک لڑکے کے ہاتھ گھر بھیج دیں اور چھ لڑکے اپنی اپنی غلیلوں کے ساتھ شکار پر تل پڑے، کیوں کہ باغات کا سلسلہ شروع ہو جاتا تھا۔ مگر وہ آگے بڑھتے گئے آگے ایک نہر تھی، مگر پانی زیادہ نہیں ہوتا تھا، تین لڑکے مچھلی کے شکار کرنے نہر کے کنارے بیٹھ گئے۔

کرامت کے ساتھ شمشاد اور احمد رہ گئے وہ غلیل کے شکاری تھے۔

شکار تو ان کو فاختہ اور تیتروں کا کرنا تھا اور ان کی تلاش میں نہر سے آگئے تھے۔

ایک پرندہ ہے اس کو نیل کلٹھ کہا جاتا ہے اس میں کئی رنگ ہوتے ہیں اور بڑا خوب صورت نظر آتا ہے مگر زیادہ رنگ نیلے ہوتے ہیں اس کی پرواز زیادہ نہیں ہوتی اڑتا ہے اور دس بیس گز اڑ کر پھر زمین پر بیٹھ جاتا ہے اور ایسا لگتا ہے کہ بڑا کمزور ہے پکڑا جائے گا، بچے کے تعاقب میں میلوں دوڑتے ہیں اور وہ ان کو راتا رہتا ہے۔

شمشاد کو نیل کلٹھ نظر آ گیا اور وہ اس کے قریب چلا گیا مگر جب ذرا فاصلہ رہ گیا تو وہ اڑ گیا اور بیس

بچیں قدم کے بعد پھر زمین پر بیٹھ گیا شمشاد پھر دبے پاؤں اس کی طرف بڑھا اور بڑی ہوشیاری سے اس کے قریب پہنچ گیا، مگر پھر نیل کلٹھ اڑ گیا اور آگے بیس بچیں قدم دور بیٹھ گیا، کرامت نے کہا۔ ”شمشاد کیا کر رہا ہے یہ تو تجھے دوڑاتا رہے گا، ہاتھ نہیں آئے گا۔“

شمشاد بولا۔ ”ذرا فاصلہ رہ گیا تھا اب کے پکڑ لوں گا۔“ اور وہ دبے قدموں پھر اس کی طرف چلا۔ مگر وہی ہوا۔ حمزہ بولا۔ ”چھوڑ اس کو سامنے جھاڑیوں میں شکار ملے گا۔“

شمشاد نے نیل کلٹھ کی طرف منہ کر کے کہا۔ ”اچھا دوست خوش رہ تو نے خوب دوڑایا میں جاتا ہوں۔“

احمد بھی قریب آ گیا اور بولا۔ ”اب تو اس سے اس طرح کہہ رہا ہے جیسے یہ تیری بات سمجھ رہا ہے۔“ یہ سن کر کرامت نے کہا۔ ”کہنے میں کیا برائی ہے۔ دوست کہا ہے دشمن تو نہیں کہا۔“

تینوں ہنستے ہوئے جھاڑیوں کی طرف چلے گئے۔ جھاڑیوں میں انہوں نے کچھ شکار کیا اور بیر کھائے اور واپس ہوئے، واپسی میں ایک سوکھے درخت پر وہی نیل کلٹھ بیٹھا تھا۔

شمشاد بولا۔ ”یار یہ کامل ست اور نہایت کمزور سا نظر آنے والا پرندہ بھی خوب ہے ہر کوئی اس کی طرف دوڑتا ہے اور پکڑتا چاہتا ہے مگر یہ کسی کے ہاتھ نہیں آتا۔“ حمزہ بولا۔ ”یہ کامل نظر آتا ہے مگر ہے نہیں اور

اس کی ہوشیاری بھی تم نے دیکھی ہے کہ جب دو چار قدم تم اس سے دور ہوتے ہو تب اڑتا ہے تاکہ تمہاری پکڑنے کی امید باقی رہے اور تم دوبارہ اس کی طرف دوڑو، اس طرح تم کو یہ دوڑاتا ہے، یہ کسی کے ہاتھ نہیں آتا، یہ بچوں سے کھیلتا ہے، شاید اس کو بھی اس کھیل میں مزا آتا ہے۔“

احمد بولا۔ ”ہاں یار یہ تو تم نے درست کہا میں نے نہیں دیکھا کہ کسی نے نیل کلٹھ کو پکڑا ہو۔“ وہ اس سوکھے درخت کے نیچے سے گزر گئے اور

دیں۔ اور وہ چلا گیا۔

جیسے ہی وہ کھانے سے فارغ ہوئے رحمت علی آگیا اور اس نے کہا۔

یہ چار ٹکٹ سرسوتی جہاز کے ہیں وہ چار دن کے بعد برتھ پر آجائے گا آپ لوگ سوار ہو جائیں۔“ کرامت بولا۔ ”آپ نے بڑی مہربانی کی ہے اس کی قیمت بتادیں۔“

رحمت علی ہنس کر بولا۔ ”میں نے خریدے ہوں تو قیمت بتاؤں، کل شام کو مسجد کے دفتر میں ایک آدمی آیا تھا اس نے آپ کے نام کے یہ ٹکٹ بھی دیئے اور آپ تک پہنچانے کی ڈیوٹی لگائی۔ مجھے تو حیرت ہے کہ فرسٹ کلاس کے کیمین کے ٹکٹ اس نے کس طرح حاصل کر لئے۔“

کرامت نے کہا۔ ”میں سمجھ گیا ہمارا ایک بھروسہ اور دوست بمبئی میں ہے اس نے یہ کام کیا ہوگا۔“

”بہر حال جس نے بھی یہ کام کیا ہے بہت بڑا کام کیا ہے۔ میں نے بھی کوشش کی تھی اور کسی بھی کلاس کے ٹکٹ حاصل کرنے کی کوشش کی تھی مگر صرف وعدہ کیا گیا تھا۔“

کرامت سمجھ چکا تھا کہ یہ کام کس نے کیا ہے۔ اور کچھ کچھ سہان خان بھی اندازے لگا رہا تھا۔

کرامت کے ابا بولے۔ ”تم نے کبھی اپنے بھائی کے دوست کا ذکر نہیں کیا۔“

کرامت بولا۔ ”میرے نزدیک وہ قابل ذکر نہیں تھا اس لئے ذکر نہیں کیا تھا۔“

”مگر آج تو اس نے ثابت کر دیا کہ وہ قابل ذکر ہے۔“ ابا بولے۔

سہان خان نے کہا۔ ”ابا کبھی کبھی ناقابل ذکر بھی بڑے کام کر جاتے ہیں۔“

سرسوتی جہاز برتھ پر لگ گیا اور لوگوں کا اثر ہام لگ گیا۔ ٹکٹ بلیک میں فروخت ہونے لگے، مگر فرسٹ کلاس کے مسافروں کو الگ راستے سے جہاز پر ان کے

سہن میں پہنچا دیا گیا۔ رات کو اس کی ردا گئی کرامت ذیک پر کھڑا سمندر کا نظارہ کر رہا تھا کے تصور کے پردے پر نیل کلٹھ موجود تھا۔

کرامت نے کہا۔ ”نیل کلٹھ میں تمہارا

شکریہ ادا کروں تم نے حق دوستی خوب نبھایا اور تمہارے لئے کچھ نہ کر سکا میں تم سے شرمندہ ہوں۔

نیل کلٹھ بولا۔ ”دوستی کا مطلب ایسا نہیں ہے، یہ کاروبار نہیں ہے دوستی ہے۔ میں نے دوستی کی

کاروبار نہیں کیا تھا۔ آج تم مجھ سے جدا ہو رہے۔ اب میں تمہارے کسی کام نہ آسکوں گا، اگر تمہارا آ

ہندوستان میں ہو تو مجھے میرے پرانے مقام پر تلافی کرنا، آواز دینا میں آجائوں گا۔“ جہاز کے ہونے کے

آواز آگئی اور نیل کلٹھ بولا۔ یہ ہماری تمہاری آخری ملاقات ہے۔“

کرامت اداس اداس واپس کیمین کی طرف روانہ ہوا۔ پھر نیل کلٹھ بولا۔ بہر حال میں کوشش کروں

گا کہ ایک نہ ایک دن، میں تمہارے سامنے انسانی شکل میں ملوں، میں یہاں سے کیمین دور نہیں جاسکتا، کیونکہ

میرا تعلق جس مخلوق سے ہے، تو ہماری بھی ایک حد بندی ہوتی ہے، ہم اس حد سے کیمین دور نہیں جاسکتے۔“ اور

تصوراتی رابطہ ختم ہو گیا۔

دلو کا آنکھیں بند کئے سن رہا تھا۔ پھر حکیم وقار کی آواز سنائی دی۔ ”حکیم صاحب کتاب ختم شد ہو گئی۔“

یہ سن کر دلو کا بولا۔ ”بہت خوب جواب نہیں! مصنف نے دریا کو گزے میں بند کر دیا ہے۔ یہ بالکل

حقیقت ہے کہ جنات مختلف شکلیں اختیار کر لیتے ہیں۔ دیکھنے والوں کے لئے کچھ اور حقیقت میں کچھ اور

ہوتے ہیں۔ اور یہ بھی حقیقت ہے کہ ان کے علاقے بھی الگ الگ ہوتے ہیں اور وہ اپنی حدود میں رہتے

ہیں۔ خیر مصنف نے حقیقت کو بہت اچھے طریقے سے بیان کیا ہے۔“ پھر حکیم وقار اور دلو کا اپنی اپنی جگہ سے

اٹھ گئے۔ (جاری ہے)

کہا ہے۔“

تین میچ بھیجی میں ہوئے اور عینوں میں کرامت کی ٹیم جیت گئی اب پونا کا نمبر تھا۔

پونا کی ٹیم بھی کمزور نہ تھی مگر صرف ایک میچ برابر کر سکی دو ہار گئی۔ اب اور شہروں کے لوگوں کو خیال آیا کہ یہ چھوٹے شہر کی ٹیم اور بڑے شہروں کی ٹیموں پر حاوی آرہی ہے۔ تو انہوں نے سیاسی چال بازیاں شروع کر دیں اور اعتراضات اٹھادیئے مگر کچھ نہ ہوا۔ الہ آباد لکھنؤ اور پھر دلی کی ٹیم بھی ہار گئی، جنوب میں حیدر آباد اورنگ آباد میں اچھے کھلاڑی تھے مگر نو آئیز اور نوجوان کی شاندار کارکردگی کے سامنے ان کی نہ چلی، کرامت کی ٹیم جھنڈے گاڑتی آگے بڑھتی رہی۔

پنجاب میں بھی اچھی ہاکی کھیلی جاتی ہے مگر پھر بھی کوئی ٹیم کرامت کی ٹیم پر گول نہ کر سکی، وہ سب کرامت کی حیرت انگیز کارکردگی سے پریشان تھے وہ پوری فیلڈ میں نظر آتا تھا اور حملے کے وقت گول میں موجود ہوتا تھا اس کا ذیغ بے داغ تھا، ڈی میں اس نے کبھی فاول نہیں کیا تھا۔

ہاری ہوئی ٹیموں نے اس کو زخمی کرنے کی کوشش کی مگر وہ مسکراتا رہا اس کو کچھ نہ ہوا۔ اس نے کسی کو مارنے یا غصہ اتارنے کی کوشش نہیں بلکہ اپنے کھیل پر توجہ کی اور اپنی ٹیم کی کمزوریوں پر نظر رکھی، ہر میچ کے بعد وہ لڑکوں کی میٹنگ بلاتا اور ان کو بتاتا کہ کس نے کس مقام پر غلطی کی ہے، اس طرح اس کے کھلاڑیوں کی غلطیاں دور ہوتی گئیں اور کرامت کی ٹیم جب واپس آئی تو وہ ایک بہترین ٹیم تھی اس کے لڑکے کم عمر اور پھر تیلے تھے اور ان کا قائد ایک مکمل ہاکی کا کھلاڑی تھا۔ واپس آنے کے بعد کرامت کی عزت کا لچ میں اور شہر میں بہت بڑھ گئی۔

مگر کرامت کے والد کی خواہش تھی کہ کرامت تعلیمی میدان میں بھی نمایاں رہے، دورے کی واپسی کے بعد وہ گھر آ گیا، سارے لوگوں نے اس کا بڑا شاندار استقبال کیا اور اس کے والد کو مبارکباد دی۔

روح

جسم کی کوئی حیثیت نہیں۔ زندہ رہنے والی چیز تو روح ہے، اگر زندگی میں کبھی ان دونوں میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا پڑے تو جسم کو کبھی اولیت مت دینا، اس پر لگے داغ اور اذیت کے تمام نشانات کبھی نہ کبھی اپنی موت مر جاتے ہیں لیکن روح کا معاملہ بالکل الگ ہے، اسے کبھی داغ دار مت ہونے دینا، ورنہ ساری زندگی جہنم کا ایندھن بنے رہو گے۔

(شرف الدین جیلانی - شہد والد یار)

شام کو کھانے کے بعد اس کے والد نے کہا۔ ”بیٹا یہ کھیل تو چند روز کے ہوتے ہیں میں نہیں چاہتا تھا کہ تمہاری ساری توجہ کھیل پر لگ جائے اور تعلیم سے تم غافل ہو جاؤ، اصل چیز تو تمہاری تعلیم ہے اس پر توجہ کرنے کی ضرورت زیادہ ہے۔“ کرامت نے کہا۔ ”ابا میں تعلیم کی طرف سے غافل نہیں ہوں۔“

والد نے کہا۔ ”میں جانتا ہوں تم لا پرواہ نہیں ہو، مگر ابھی کم عمر ہو، گہرائی کی باتیں تمہاری سمجھ میں نہیں آئیں گی، شہرت اور لوگوں کی واہ واہ تم کو بھٹکا سکتی ہے، تم اپنے مقصد کو بھول سکتے ہو تم جانتے ہو میری زندگی کے تم کسین خواب ہو، میں نے زندگی بھر لکڑی چھیلی ہے اس لکڑی سے اوزار بنائے ہیں اور اپنا کام ایمانداری سے کیا ہے اور تمہارے پیٹ میں حلال کی روٹی ڈالی ہے تم اب خود پڑھ لکھ کر مجھ سے زیادہ جانتے ہو تم نے اتنی کم عمر میں پورا ہندوستان گھوم لیا ہے اور میں کبھی باہر نہیں گیا۔ اس پر بھی میری عمر کا تجربہ تو ہے، تعلیم بہت کچھ سکھاتی ہے انسان کے دماغ کے بند دریچوں کو کھول

نہ پا لروہ بھولے پر بہت گھڑا اور اسے ڈھونڈنے کے لئے واپس بھیج دیا۔

شام سے رات ہو گئی مگر بھولا آیا نہ بکری حتیٰ کہ رات گزر گئی مگر بھولے کا کوئی اتہ پتہ نہیں۔ اگلے دن سب گاؤں والوں نے مل کر اسے ڈھونڈا مگر وہ کہیں نہ ملا۔

ہمارے گاؤں سے ذرا دور ایک کھنڈر تھا، بزرگوں کا کہنا تھا کہ کسی زمانے میں یہ جگہ ہندوؤں کی عبادت گاہ تھی پھر نبھانے وہ سب کہاں چلے گئے اور پھر آہستہ آہستہ یہاں مسلمان آباد ہو گئے۔ اب وہ مندر ویران پڑا تھا ادھر گاؤں کے لوگ بہت کم جاتے تھے۔ گاؤں والے بھولے کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر تھک گئے۔

ایک دن ہم لڑکوں نے جھاڑی کے پاس خون کے چھینٹے دیکھے جو سورج کی حرارت کے باعث سیانسی مائل ہو گئے تھے، ہم نے گاؤں کے امام صاحب کو بتایا تو وہ پریشان ہو گئے اور دیگر گاؤں کے لوگوں نے یہ خیال کیا کہ ہونہ ہو بھولے کو کسی بھوت پریت نے مار دیا ہے کیونکہ وہ مندر سالوں سے ویران پڑا ہے اس لئے اس میں کسی آسیب نے بسیرا کر لیا ہوگا۔

اس واقعہ سے گاؤں میں خوف و ہراس پھیل گیا اور دیگر والدین کی طرح میری والدہ نے بھی مجھے اس مندر کی طرف نہ جانے کی نصیحت کی جسے میں نے

۔۔۔ درود ہی ہم چار لڑکوں پر مشتمل یہ قافلہ جانب رواں ہو گیا، اس قدر پچھڑے ہوئے سور آگ اٹھتی دوپہر میں ہم لڑتے قدموں اور پسینہ وجود لئے آگے ہی آگے بڑھ رہے تھے اور ہم اس کے بالکل نزدیک پہنچ گئے۔

وہ قدیم خستہ حال مندر تھا جو یقیناً اپنے دور بہت ہی مضبوط اور خوب صورت رہا ہوگا لکڑی کا بہتر بڑا دروازہ جو کہ بند تھا۔ اس پر کسی قسم کا کوئی بھی وغیرہ نہ لگا تھا مگر جب ہم نے اس دروازے کو اندر طرف دھکیلا تو ہمارے دانتوں تلے پسینہ آ گیا، بالآخر ہم چاروں نے مل کر اس دروازے کو کھول دیا ایک زوردار آواز کے ساتھ وہ دروازہ کھلا اور خاموش فضا زوردار آواز ابھری۔۔۔۔۔ پھر وہی سکوت چھا گیا۔

جیسے ہی ہم دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئے ایک عجیب دل کو متلا دینے والی بدبو نے ہمارا استقبال کیا۔ ہمارے ذہن میں تھا کہ جہاں سالوں سے کسی روح کا گزرنہ ہوا ہو اس جگہ کڑی کے بے شمار جالو، گندگی اور خلافت کا ڈھیر ہوگا۔ مگر حیرت انگیز طور پر ہالی نما سارا مندر بے حد صاف تھا، یوں لگتا تھا کہ جیسے کوئی ابھی ابھی اس کی صفائی کر کے گیا ہو۔ مندر دیواروں پر بڑے عجیب قسم کے چہرے بنے ہوئے تھے رنگ برنگ کے انسانوں کی بدھیت تصویریں۔۔۔۔۔ فرش پر لاتعداد چھوٹے چھوٹے مٹی کے پیالے نما چرا

والد کی نصیحت کے مطابق اپنی پوری توجہ تعلیم پر مرکوز کر دی اور تعلیمی میدان میں آگے بڑھتا رہا۔

اور یہ حیرت انگیز تبدیلی اس نے محسوس کی کہ جہاں اس کو کوئی مشکل درپیش ہوئی اس کے ذہن کے پردے پر نسل کلٹھ اڑتا ہوا آیا اور اس کی سمجھ میں اس مشکل کا حل آ گیا امتحانات میں بھی اس کے ساتھ یہی ہوا اور وہ نہایت شاندار تعلیمی ریکارڈ کے ساتھ فارغ ہوا اب اس کے سامنے مقابلے کا امتحان تھا۔

اس کے بعد وہ esp آفیسر بن جاتا۔ یہاں پر مقابلہ سخت تھا اس مقابلے میں وہ اکیلا مسلمان تھا اس کو اس مجبوری کی وجہ سے شامل کیا تھا کہ اس کا ریکارڈ بہت شاندار تھا مگر ہندو اس کے ساتھ اس کے باوجود بھی تعصب کر رہا تھا اور پر سب ہی ہندو تھے کسی کی مرضی نہ تھی کہ وہ esp آفیسر بنے اس کے باوجود وہ اس مقابلے میں موجود تھا۔ اس کے ذہن کے پردے پر نسل کلٹھ موجود تھا اور سب صحرائں اس کے خلاف ہونے پر بھی کچھ نہ کر سکے اور وہ کامیاب ہو گیا۔

اس کی کامیابی گویا قبضے کی کامیابی تھی رضا علی کی عزت میں ایک دم اضافہ ہو گیا اب وہ صرف بڑھتی نہ رہا۔ لوگوں کی نظروں میں احترام آ گیا۔ بیٹے نے باپ کے مقام کو اونچا کر دیا تھا۔

بیٹا کشن بن گیا تو باپ نے اس کی عزت کی خاطر کام کرنا بند کر دیا۔ ماں باپ کی عزت بڑھ گئی۔ اور پھر کرامت کو ایک نئے مقام پر جانا پڑا۔ ملازمت ہی ایسی تھی جانا تو تھا۔

والد نے مجبوری میں اپنا گھر چھوڑا اور بیٹے کے ساتھ پہلی بیسٹ بریلی آگئے، سرکاری رہائش گاہ ملی اور نوکر چاکر۔ والد یہاں پر خوش نہ تھے، ماں بھی خوش نہ تھی وہ جلد از جلد کرامت کا گھر پسانا چاہتی تھی، مگر یہ نئی جگہ تھی، کسی سے جان پہچان نہ تھی، سب عزیز تو پرانے شہر میں تھے۔ کرامت کی ذمہ داریاں زیادہ تھیں۔ روز ہی اس کے پاس نئے نئے کیس آتے تھے۔

ایک کیس اس کے پاس آ گیا یہ ایک مسلمان

عورت کا کیس تھا اس کا خاوند عورت کو طلاق دینا نہیں چاہتا تھا اور عورت اس کے پاس رہنا نہیں چاہتی تھی۔ عورت کا موقف تھا کہ ”یہ آدمی نہایت اجڑا اور گنوار ہے وہ ایک تعلیم یافتہ عورت ہے آدمی کا سلوک اچھا نہیں ہے۔“

مگر آدمی ضدی اور زمیندار تھا وہ کسی حالت میں عورت کو چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔

دونوں کے بیانات سے یہ بات ظاہر ہوتی تھی کہ دونوں میں لچک نہیں ہے، مرد نے اپنی انا کا مسئلہ بنایا ہوا ہے اور عورت اس کی شکل سے بیزار تھی، راضی نامے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی۔ کرامت نے دونوں کو الگ الگ بلا کر سمجھایا مگر دونوں طرف ضد موجود تھی۔

احمد یار زمیندار تھا اس کا ایک مقام اس کی جگہ پر تھا اگر وہ طلاق دے دیتا تو عورت کی جیت ہو جاتی اور احمد یار کی عزت مٹی ہو جاتی اس نے کرامت کو اکیلے میں کہا۔ ”کشن صاحب یہ تو آپ بھولی جاؤ کہ میں اس کو طلاق دوں گا کیونکہ یہ بات اب بھیل چکی ہے کہ وہ مجھ سے طلاق لینا چاہتی ہے۔ آپ اس علاقے میں نئے ہو آپ کو پتہ نہیں ہے کہ یہاں کے ریت رواج کیا ہیں، میں ایک خاندانی آدمی ہوں میرے خاندان میں اب تک ایسا نہیں ہوا ہے، وہ میری حویلی میں میری بیوی بن کے آگئی تھی، اور اس کے ماں باپ نے خوشی سے شادی کی تھی، میں کہتا ہوں یہ بات اس کے ماں باپ کو پتہ تھی آج بھی میں ویسا ہی ہوں۔“

احمد زمیندار لوگ ہیں۔ ”وہ کہتی ہے میں اجڑا ہوں پڑھا لکھا نہیں، میرے مشغلے اس کو پسند نہیں، میں اس کے لئے اپنے دوستوں کو نہیں چھوڑ سکتا، وہ حویلی میں رہے اس کے لئے نوکر چاکر ہیں، مالکن بن کر موبج کرے اور طلاق کا نام نہ لے، جو عورت حویلی میں آ جاتی ہے وہ ہماری ہو جاتی ہے اس کو ہم کسی دوسرے کے لئے نہیں چھوڑتے یہی ہمارا دستور ہے ہماری خاندانی ریت ہے۔“

عورت ہے اس کے سیاہ لباس اس کے بال جیسے تھے جو اس کی کمر پر لہرا رہے تھے۔ ”اے کون ہو.....؟“ میں نے اسے آواز دی۔

مگر اس نے نہ پیچھے مڑ کر دیکھا نہ کوئی جواب دیا بلکہ سیدھ میں چلنے لگی تو فطری تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر میں بھی اس کے پیچھے چل پڑا۔ کیونکہ میرا مقصد یہ معلوم کرنا تھا کہ وہ کون ہے؟ اور اس قبرستان میں کیا کر رہی ہے؟ وہ عورت سامنے ہی چلتی جا رہی تھی یہ دیکھ کر میں پوری طرح چونکا کیونکہ اس کا رخ مندر کی جانب تھا وہ آگے ہی آگے چلتی جا رہی تھی..... اب وہ مندر سے تھوڑے سے فاصلے پر تھی۔ میں بھی اس کے پیچھے تھا۔ ایک دم سے میں نے ٹھوکر کھائی اور خود کو سنبھالنے کی میں نے بہت کوشش کی اور میں نے اپنے کو سنبھالا اور نیچے دیکھا کہ مجھے کس شے سے ٹھوکر لگی ہے۔ زمین بالکل صاف تھی مگر مجھے پاؤں پر بڑی زور کی چوٹ لگی تھی درد کی لہر اس قدر تیز تھی کہ ایک لمبے کے لئے اس پر اسرار عورت کا خیال میرے ذہن سے نکل گیا اور جب یاد آیا کہ میں کسی عورت کا پیچھا کرتے ہوئے یہاں تک آیا تھا تو میں فوراً الٹ ہو گیا مگر اب وہاں میرے علاوہ اور کوئی بھی موجود نہیں تھا۔ مندر کا دروازہ ہنوز بند تھا اور ارد گرد دور تک ویرانہ تھا میں نے مندر کے چاروں طرف دیکھا مگر مجھے وہ عورت دکھائی نہ دی اور پھر میں تھک ہار کر اپنے گھر واپس آ گیا مگر میرے ذہن سے اس عورت کا نظر آنا اور پھر ایک دم سے غائب ہو جانا فراموش نہ کر سکا۔

پھر تو اس کے بعد مندر کے پاس جانا میرا روز کا معمول بن گیا یہ الگ بات ہے کہ میں اسے کھولنے اور اندر جانے کی ہمت نہ کر پاتا۔

ایک روز میں کسی وجہ سے مندر نہ جا سکا تو سارا دن عجیب سی بے چینی مجھے رہی جانے کیوں مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ کوئی مقناطیسی کشش مجھے اپنی طرف کھینچ رہی ہے اور پھر مجھ پر جیسے میرا اپنا اختیار نہ رہا ہو میں مندر کی جانب کھنچا چلا گیا اور میں اس وقت چونکا جب مجھے کسی

نے میرا نام بے کر پکارا۔ میں نے گردن موڑ کر آواز کی سمت دیکھا تو مسجد کے پیش امام صاحب مجھ سے کچھ کہہ رہے تھے..... مجھے کچھ بھی سنائی نہیں دے رہا تھا بس امام صاحب کا چہرہ کسی دھندلی تصویر کی مانند لگ رہا تھا۔ پھر جیسے میرے اعصاب پر حاوی وہ غیر مرئی قوت اتر گئی تو ایک دم سے مجھے ہر شے واضح دکھائی دینے لگی۔

مسجد کے امام صاحب پریشانی کے عالم میں مجھ سے میری طبیعت کا پوچھ رہے تھے میں نے انہیں مطمئن کیا اور ان کے ساتھ ہی باتیں کرتے ہوئے واپس مڑ گیا مگر جاتے وقت میں نے مندر پر ضرور نظر ڈالی تھی۔

.....

اگلے دن کا سورج بہت ہی قیامت خیز ثابت ہوا، میرا دوست جیرا غائب ہو گیا تھا، بھولے کی طرح جیرا کا بھی کوئی پتہ نہ لگ سکا اس کے گھر والے اور ہم سب نے مل کر اسے بہت ڈھونڈا مگر بھولے کی طرح اس کا بھی کوئی سراغ نہ مل سکا بھولے کے بعد جیرے کا غائب ہو جانا گاؤں والوں کے لئے باعث پریشانی تھا جیرے کے گھر والوں کا صدمے سے برا حال تھا۔

میں ان کے گھر گیا اس کی والدہ جیرے کی کشیدگی سے بہت بیمار تھیں اس کی والدہ کا کہنا تھا ”کچھ دنوں سے جیرا کچھ عجیب قسم کی حرکتیں کر رہا تھا وہ اکثر خود سے ہی باتیں کرتا رہتا رات کو بعض اوقات پورے گھر میں پھرتا گاؤں کے کچھ لوگوں نے بتایا کہ ہم نے کئی مرتبہ جیرے کو مندر کے پاس دیکھا ہم اس سے پوچھتے کہ وہ وہاں کیوں جاتا ہے.....؟ مگر وہ ٹال دیتا۔

اس واقعہ کے بعد گاؤں میں ایک بار پھر خوف و ہراس اور تشویش کی لہر دوڑ گئی گاؤں کی گلیوں میں آوارہ پھرتے بچے بھی گھروں میں دیک گئے گاؤں میں کام کرنے والے افراد بھی جلد ہی اپنا کام ختم کرتے اور جلد اپنے گھروں کو لوٹ آتے۔

ایک دوپہر کھانا کھا کر میں یونہی گھر سے باہر نکلا..... اس وقت کڑکٹی دوپہر میں کم لوگ ہی باہر نکلتے، اس وقت بھی ویرانی ہی تھی۔ گاؤں سے باہر نکل کر میں

”تمہارے لئے وہ بہترین بیوی ثابت ہوگئی، تمہاری اولاد اس کے بطن سے ہوگی ورنہ کرو، اور شادی کرلو۔“ اب کرامت کے لئے انکار کی ذرا گنجائش نہ تھی اس کے دوست نیل کلٹھ کا مشورہ تھا۔

اور پھر یوں ہوا کہ نہایت سادہ طریقے پر دونوں کا عقد ہو گیا اور آمنہ خاتون کرامت کی بیوی بن کر اس کے گھر آ گئی۔ اور کرامت کا تاولہ سہارن پور ہو گیا۔

وہ اپنی جائے پیدائش سے دور ہوتا جا رہا تھا مگر اس کے باوجود ہر مشکل وقت میں نیل کلٹھ اس کے پاس آ جاتا تھا۔ وقت بدل رہا تھا، سیاسی حالات تبدیل ہو رہے تھے۔ ہندو مسلمانوں کو برداشت نہیں کر رہا تھا، انگریزوں کا بستر گول ہو رہا تھا، مسلمان آفیسر پر ہندوؤں کی نظریں تھیں۔ اور کرامت ایک نہایت ہی اندرونی خلاتے میں ڈیوٹی پر تھا اس کے چاروں طرف ہندو تھے، متعصب ہندو لیڈروں نے اس کے خلاف خوب پروپیگنڈا کیا تھا اس خلاتے سے کرامت کا ٹکنا ناممکن نظر آ رہا تھا اس وقت اس کے دو بچے تھے اور دونوں لڑکے بہت چھوٹے تھے، حالات پوری طرح اس کے خلاف تھے اور وہ سخت پریشان تھا کہ اس کے ذہن کے پردے پر نیل کلٹھ اڑتا ہوا آ گیا اور بولا۔

”پریشان نہ ہو۔“

”میں تمہارے پاس ہوں، مجھے پتہ ہے تمہارے خلاف صرف اس لئے یہاں کے لیڈر ہیں کہ تم مسلمان ہو، مگر یہ تمہارا کچھ نہیں کر سکیں گے دو تین دن میں اس ملک کے لئے بڑے نقصان ہوں گے۔ اس کے بعد تم اپنے لئے جو فیصلہ کرو گے میں تمہارا ساتھ دوں گا۔“

مگر رات کو اس کے بنگلے پر بلوائیوں نے حملہ کر دیا۔ وہ اس کو اور اس کے بیوی بچوں کو تلاش کرتے رہے اور یہ لوگ آرام سے اپنے کمرے میں سوتے رہے وہ سب اندھے ہو گئے اور کرامت کو تلاش نہ کر سکے۔

اور پھر ہندوستان تقسیم ہوا، کرامت نے پاکستان جانے کا فیصلہ کر لیا اور وہ دلی کے لئے روانہ ہوا

”وہ تمہارے خلاف کل سے کارروائی کرے گا تم پر قاتلانہ حملہ کرانے کا اپنا اثر سوخ استعمال کرے گا، دولت خرچ کرے گا اس نے جاتے ہی سارے پروگرام بنائے ہیں مگر وہ کچھ نہ کر سکے گا تم بے فکر ہو کر سو جاؤ۔“ اور نیل کلٹھ کھڑکی سے غائب ہو گیا۔

اس کے جانے کے بعد کرامت بولا۔ ”واہ میرے دوست! تم نے تو مجھے بے فکر کر دیا!!“

نیل کلٹھ نے جو کہا تھا وہی ہوا، کرامت کے خلاف کچھ نہ ہوا البتہ احمد یار کے بارے میں پتہ چلا کہ اس کی زبان اکثر گئی ہے وہ بات کرنے کے قابل نہیں ہے حکیم ڈاکٹر علاج کر رہے ہیں، مگر مرض سمجھ میں نہیں آ رہا تھا، احمد یار کے کرامت کے خلاف سارے پروگرام دھڑے دھڑے رہ گئے۔

احمد یار کا مرض اور بڑھا اور اس پر سخت خطرناک پاگل پن کے دورے پڑنے لگے۔ وہ ڈاکٹروں کو مارنے لگا، سول اسپتال پہلی بھیبت میں داخل کر دیا گیا اور وہاں پر ڈاکٹروں کے بورڈ نے اس کو خطرناک پاگل قرار دے کر پاگل خانے میں داخل کر دیا۔

اور آمنہ کو ایک طرف کارروائی کے بعد خلا مل گیا۔

اس کیس کے بعد کئی اور بھی پریشان کن حالات نے کرامت پر حملہ کیا مگر وہ حیرت انگیز طور پر صاف بچ گیا۔ آمنہ کو دوسری شادی کرنے کا اختیار عدالت نے دے دیا تھا۔

ایک دن ایک آدمی اس کے گھر آ گیا اور وہ اس کے والد سلامت سے ملا، شام کو سلامت نے بتایا کہ ”آمنہ کا باپ آیا تھا، آمنہ نے اب تک شادی نہیں کی ہے، وہ تمہارے لئے پیغام لائے تھے اس میں آمنہ کی مرضی بھی شامل ہے، سوچ لو، وہ طلاق یافتہ عورت ہے عمر تو زیادہ نہیں ہے، مگر تم کنوارے ہو۔“ یہ خبر کرامت کے لئے تعجب خیز تو تھی مگر اس نے جواب نہیں دیا۔

اسی رات نیل کلٹھ اس کے پاس تھا اور اس کا ذہنی رابطہ کرامت سے ہوا تو نیل کلٹھ نے کہا۔

پر گرا۔۔۔۔۔ ہند ہوتی آنکھوں نے نیم جھری سے ٹوٹی کے
بھائیوں اور امام مسجد سمیت دیگر گاؤں والوں کو مندر کی
جانب بھاگتے دیکھا۔ اس کے بعد میں ہوش و خرد سے
بیگانہ ہو گیا۔

☆.....☆.....☆

جب مجھے ہوش آیا تو جانے کیا وقت تھا کمرے
میں نیم تاریکی تھی۔ آہستہ آہستہ میرے حواس ٹھکانے
پر آ گئے۔ شعور کی حالت میں آتے ہی مجھے وہ منظر
یاد آیا۔ ٹوٹی کا غائب ہونا۔۔۔۔۔ میرا اسے ڈھونڈنا۔۔۔۔۔
سب کو بتانا۔۔۔۔۔ پھر یہ نہیں کیا ہوا؟ ٹوٹی کا خیال آتے
ہی میں تڑپ کر اٹھا۔۔۔۔۔ تیزی سے کمرے سے باہر نکلا۔
وہ میرا اپنا ہی گھر تھا جو بالکل خالی تھا میں اس
بات پر غور کئے بغیر ہی کہ امی اور میری بہنیں کہاں ہوں
گی؟ باہر کو لپکا پھر مجھے لگا میرے پیچھے کوئی ہے۔
ایسی احساس کے تحت میں نے مڑ کر دیکھا
اور کھڑا کا کھڑا ہی رہ گیا۔

سیاہ لباس میں ملبوس وہ وہی عورت تھی
جو قبرستان میں مجھے نظر آئی تھی۔۔۔۔۔ اب بھی اس کی
بالوں سے ڈھکی پشت میری طرف تھی۔

”کون۔۔۔۔۔؟“ میں نے لرزتی آواز میں اسے
مخاطب کیا۔ وہ دھیرے سے مڑی اور میرے سامنے
آ گئی۔ اس کے سیاہ لمبے بالوں نے چہرے کے بائیں
حصے کو مکمل طور پر ڈھانپ رکھا تھا اور چہرے کا دایاں
حصہ بے حد حسین تھا، اس کی سیاہ آنکھ مجھ پر مرکوز تھی
اور جو میں نے اس کی آنکھ میں جھانکا تو نبھانے مجھے کیا
ہو گیا میں مبہوت ہو کر رہ گیا۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ
کہتا یا وہ کچھ بولتی میرے پیچھے دروازہ ایک دم سے
بجلا۔۔۔۔۔ میں نے بے اختیار گردن موڑ کر پیچھے دیکھا۔۔۔۔۔
پھر اگلے ہی لمحے اس جانب دیکھا جہاں وہ پراسرار
عورت کھڑی تھی یہ دیکھ کر میری سانس لمحہ بھر کر رک گئی
کہ وہ جگہ اب بالکل خالی تھی وہاں کوئی عورت تو کیا۔۔۔۔۔
کوئی نشان بھی نہ تھا۔۔۔۔۔ دروازہ ایک بار پھر بجاتا تو میں
جیسے ہوش کی دنیا میں واپس آ گیا۔

آہستہ آہستہ چلتا ہوا ایک درختوں کے سامنے میں کھڑا
ہو گیا جانے کس خیال کے تحت میں اس سمت
آ گیا جہاں مندر واضح نظر آ رہا تھا، پھر میں نے اس
طرف ایک شخص کو جانا دیکھ کر بری طرح چونکا۔۔۔۔۔ بھلا
اس وقت اس قدر دیر ان جگہ پر کون جاسکتا ہے؟

میں الجھتے ہوئے اسے پہچاننے کی کوشش کرنے
لگا۔ اور یہ اندازہ لگا کر میں بری طرح چونکا کہ وہ میرا
دوست ٹوٹی تھا۔ جو خراماں خراماں چلتا ہوا مندر کے
نزدیک پہنچتا جا رہا تھا۔ میں نے اسے پوری شدت سے
آواز دی۔ ”ٹوٹی۔۔۔۔۔ ٹوٹی؟“ مگر وہ ارد گرد سے بے
نیاز مندر کا دروازہ کھول چکا تھا۔۔۔۔۔ یہ دیکھ کر میرے
ہاتھ پاؤں پھول گئے اور میں بے اختیار چلاتا ہوا مندر
کی جانب اندھا دھند دوڑ پڑا۔ مگر میرے پیچھے سے پہلے
ہی وہ مندر میں داخل ہو گیا، میں سر پٹ دوڑتا وہاں تک
پہنچ گیا۔۔۔۔۔ پھولی سانسوں اور دھڑکتے دل کے ساتھ
دروازہ کھول کر اندر گیا اور یہ دیکھ کر میری جان نکل گئی
کیونکہ مندر بالکل خالی تھا۔

میں نے خود اپنی آنکھوں سے ٹوٹی کو اندر جاتے
دیکھا تھا مگر اب اس کا کوئی نشان بھی نہیں تھا۔ مندر میں ا
ن عجیب تصویروں اور بچے ہوئے بے شمار ویوں کے سوا
کچھ بھی نہیں تھا۔ میں پاگلوں کی طرح ”ٹوٹی ٹوٹی“ آواز
لگاتا ہوا مندر میں چکراتا رہا مگر ٹوٹی نے نہ ملنا تھا اور نہ وہ
ملا تو آنسو بہاتا اور گرتا پڑتا میں گاؤں کی جانب بھاگا۔

میں اس قدر وحشیانہ انداز میں چلا رہا تھا کہ گاؤں
کے لوگ مجھے دیکھتے ہی پریشان ہو گئے۔ میں ”ٹوٹی
ٹوٹی“ کہہ رہا تھا میری حالت بہت غیر تھی اور میں ہاتھوں
کے اشارے سے مندر کی جانب لوگوں کو سمجھاتا چاہتا تھا،
میرے دیگر گویاں حالت دیکھ کر گاؤں کے لوگوں کے
چہروں پر حیرت تھی اور مجھ سے کوئی بات نہیں بن رہی تھی
میرے اعصاب میرا ساتھ دینے سے انکاری تھے۔

بھولے کا غائب ہونا، پھر جبراً اور اب میرا جان
سے پیارا دوست ٹوٹی۔۔۔۔۔ جسے مندر میں موجود کوئی
مرئی قوت نکل چکی تھی۔ میں کئے شہر کی مانند زمین

میں لے لیا۔ انچارج نے بتایا کہ ”سر ہمارے پاس اتنی نفری نہیں ہے کہ ہم حالات پر قابو کر سکیں۔“

کرامت نے کہا۔ ”میں رات کو یہاں رکنا چاہتا ہوں کیونکہ شہر کا کوئی حصہ پر امن نہیں لگتا، صبح میں کچھ سرکاری کام کروں گا۔“

انچارج نے کہا۔ ”ہاں یہ میں کر سکتا ہوں کہ آپ کی حفاظت یہاں پر کر سکوں۔“

کرامت نے پوچھا۔ ”تمہارا نام کیا ہے؟“
انچارج بولا۔ ”سر میرا نام دھیان چند اگروال ہے۔“

کرامت بولا۔۔۔۔۔ ”دھیان چند میرے ساتھ دعا کرنے کی کوشش نہ کرنا اگر کرو گے تو زندگی بھر خود کو عذاب میں ڈال لو گے، میرے ساتھ میرے بچے اور ماں باپ بھی ہیں اور وہ ٹرک میں ہیں، کوئی کمرہ خالی کرو، اس میں لیٹر ڈلوادو تاکہ میں ان کو اتار دوں۔“

انچارج حیرت سے بولا۔ ”ٹرک میں تو صرف سامان نظر آتا ہے۔“

کرامت بولا۔ ”تم وہ کرو جو میں نے کہا ہے زیادہ کرید کرنے کی کوشش نہ کرو۔“

فوراً ایک کمرہ خالی ہوا اس میں دریاں ڈالی گئیں اور سب لوگ ٹرک سے اتر کر وہاں آ گئے۔

سلمان خان نے کہا۔ ”اب رات کے کھانے کا انتظام کرنا ہے، یہ کام میں خود کروں گا ان پولیس والوں پر بھروسہ نہیں کروں گا، چاندنی چوک پر یا جامع مسجد کے اطراف میں مسلمانوں کے ہوٹل ہیں۔ میں وہاں جاتا ہوں اور کھانا لاتا ہوں۔“

ٹرک کے اوپر نل کلٹھ بیٹھا تھا۔ کرامت ٹرک کے پاس آیا۔ اور بولا۔ ”تم ٹرک کے ساتھ جاؤ میں یہاں رہتا ہوں۔“

سلمان خان نے ٹرک اسٹارٹ کیا اور چلا اس کے اوپر نل کلٹھ پرواز کر رہا تھا۔

دو گھنٹے کے بعد سلمان خان کھانا لے کر آ گیا اس نے بتایا ”شہر کے حالات بہت خراب ہیں۔ سارا

بازار بند ہے مسجد کے ہوٹل بھی بند تھے، مگر ایک دکاندار مل گیا، مسلمان تھا اس نے ٹرک فوجی سمجھا اور ڈر کے مارے دکان کھولی کر روٹیاں پکائیں سالن گرم کیا اس دوران بلوائی آئے مگر ٹرک کو دیکھ کر بھاگ گئے، راستے میں بھی ایسا ہوا وہ ٹرک سے دور دور رہے، تعجب کی بات ہے ضرور اس ٹرک میں کچھ ہے لوگ اس کو دیکھ کر ڈرتے ہیں۔“

کرامت ہنس کر بولا۔ ”کیوں نہ ڈریں گے آخر سلمان خان فوجی کا ٹرک ہے۔“

”آپ کچھ بھی کہیں سر مگر میں نے محسوس کیا ہے کہ کوئی بات ہے ضرور میری سمجھ میں نہیں آ رہی مگر ہے۔“

”چلو ہوگی ماں لیا اب کھانا سب کو کھلاؤ اور آرام کرو تم بھی تھک گئے ہو گے۔“

رات کو کئی دفعہ چوکی پر حملہ کرنے کی کوشش کی گئی مگر ہر بار بلوائی گھبرا کر بھاگ گئے حالانکہ رات کو صرف چار پولیس والے تھے اور دو اہم تھے، سویرے دھیان چند آ گیا اور حیرت سے بولا۔ ”رات کچھ ہوا تو نہیں۔“

سلمان خان رات کو بار بار اٹھا تھا اس کی نیند خراب ہوئی تھی، غصے میں بولا۔

”ایسا لگتا ہے تم نے تو پورا انتظام کیا تھا۔ مگر کچھ ہوا نہیں۔“

دھیان چند بولا۔ ”میں سمجھا نہیں خان صاحب آپ نے کیا کہا۔“

”سب کچھ سمجھ رہے ہوتا آخر پولیس والے ہو مگر میں بھی ایک فوجی ہوں، چھپ کر وار نہیں کرتا، بہادری سے لڑتا ہوں، بلوائی بار بار پولیس چوکی پر حملہ کرتے رہے اور آپ اپنے گھر آرام کرتے رہے۔ وقت بدل رہا ہے، دھیان چند در نہ تم جیسے افسر دس سلوٹ مارتے، یہ تیرے سامنے کون ہے تجھے پتہ ہے۔“

دھیان چند شرمندگی سے بولا۔ ”آپ ناراض نہ ہوں میں آپ کے لئے ناشتے کا انتظام کرتا ہوں۔“

کوئی خواب دیکھ رہا تھا۔

جل گیا مگر وہ پھر بھی بچ گئی وہ جادوؤں نے میں بہت ماہر ہو چکی تھی اپنے عمل کے زور پر گھر سے نکلتی اور ہر رات کسی نہ کسی چھوٹے بچے کو اغوا کر لیتی، اس کے بعد وہ اس بچے کو مار کر اس کا خون شیطان کے قدموں میں ڈالتی تاکہ اس کی جادوئی طاقت میں مزید اضافہ ہو اور اس بات کی خبر اس کے باپ کو ہوگئی تو اس کے باپ نے مختلف پنڈتوں کے ساتھ مل کر اسے مار کر اس کی روح کو اسی مندر میں قید کر دیا۔ کیونکہ اگر وہ زندہ رہتی تو اپنا خونی کھیل جاری رکھتی۔

ایک طویل عرصہ بعد بھولے نے اس جگہ قدم رکھا اور شاید وہ زخمی تھا اور اس کے زخموں سے خون ٹپک رہا تھا، بھولے کے خون سے وہ جگہ تر ہوگئی جہاں وہ چلہ کرتی تھی اور پھر اس عورت کی بدروح آزاد ہوگئی اور پھر اس نے اپنا خونی کھیل شروع کر دیا کیونکہ اب اس کی روح بغیر خون کے نہیں رہ سکتی تھی۔

اس طرح جیرا اور ثوی بھی اس کا شکار ہو گئے اور اگلا نشانہ تم تھے مگر خوش قسمتی سے میرا عمل پورا ہوا اور میں تم تک پہنچ گیا۔“ سید صاحب یہ بول کر میرے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرا۔ پھر ہم دونوں گاؤں میں واپس آ گئے۔ سید صاحب مسجد میں چلے گئے اور میں اپنے گھر واپس آ گیا۔

دوسرے دن گاؤں کے تمام لوگ مندر پہنچ گئے، سید صاحب اور امام صاحب بھی لوگوں میں موجود تھے پھر سید صاحب کے اشارے پر لوگوں نے مندر کو آگ لگا دی اور یوں لوگوں کی اس آئینی مندر سے جان چھوٹ گئی۔

آج اتنے سالوں کے بعد وہ مندر جب بھی مجھے نظر آتا ہے تو بھولا، جیرا اور ثوی کی یاد بری طرح مجھے غمزہ کر دیتی ہے۔ میں آج اپنی زندگی میں گمن ہوں مگر جب کبھی مجھے اس پراسرار عورت کا خیال آتا ہے تو میرا خون برف کی مانند ٹھنڈا ہو جاتا ہے۔

وہ چیخ رہی تھی اور کوئی اس پر کچھ پھینک رہا تھا۔ پھر وہ ایک دم دھواں بن گئی۔ بہت سی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ ہر کوئی مجھ پر جھکا۔ ”اٹھ جاؤ۔“ کی آواز سنائی دی..... پھر جیسے ایک دم بوندیں پڑنے لگیں ننھی ننھی بوندیں میرے چہرے پر برس رہی تھیں۔ اور میں اپنی آنکھیں ملتا ہوا اٹھ کر بیٹھا۔ میرے سامنے سید صاحب ہاتھ میں پانی کا گلاس لئے کھڑے تھے اور مجھے ہوش میں لانے کے لئے پانی کا چھیننا میرے چہرے پر ڈال رہے تھے۔ ”شکر ہے تم ہوش میں آ گئے۔“ وہ سیدھے ہو کر بولے۔

”اب میرا ذہن آہستہ آہستہ بیدار ہو چکا تھا، تمام واقعہ ایک بار پھر مجھ پر واضح ہوا۔“

”تو کیا وہ سب حقیقت تھا، عورت کے سامنے بیٹھنا اور پھر نیند کا غلبہ..... سید صاحب کا اس عورت کو قابو میں کرنا۔“ میں حیرت سے سوچ رہا تھا۔

”تم وہ پہلے انسان ہو جو اس پراسرار عورت سے بچ گئے ورنہ جو بھی یہاں آتا ہے بچ کے نہیں جاتا۔“

”وہ کون تھی.....؟“ میں نے سید صاحب سے پوچھا۔

”وہ ایک ہندو پنڈت کی بیٹی تھی..... جسے کالے علم سیکھنے کا بے حد شوق تھا چونکہ پنڈت کی بیٹی تھی اس لئے جانتی تھی کہ اس کا شوق کبھی پورا نہ ہو سکے گا مگر اتفاق سے اس کی شادی ایک ایسے لڑکے سے ہوگئی جس کی ماں بھی کالے علم کی ماہر تھی اور اس نے اپنی ساس سے کالام سیکھا اور جب بھینٹ دینے کی باری آئی تو اس نے اپنے شوہر اور ساس کو مار ڈالا۔ پھر آہستہ آہستہ اس نے گاؤں کے لوگوں کا جینا حرام کر دیا تو سب نے مل کر اس عورت اور اس کی ساس کے گرد..... جس سے اس نے بھی کالام سیکھا اس کو مارنے کا فیصلہ کیا۔

پھر ایک رات لوگوں نے اس کے چلے والی جگہ پر آگ لگا دی جس سے اس کے گرد اور چیلے تو بچ کر بھاگ گئے۔ مگر اس عورت کے چہرے کا ایک حصہ



پر چلیں تو پھر سمندری راستے سے کراچی جانا ہوگا۔
”مگر اب تک یہ راستہ محفوظ ہے۔“ سلمان
خان نے بتایا۔

”بھئی پہنچ کر تم کو اپنا ٹرک چھوڑنا ہوگا یا
فروخت کرنا ہوگا۔“ کرامت نے کہا۔

”اگر بک گیا تو ٹھیک ہے اور نہ بکا تو سڑک پر
کھڑا کر دوں گا اور آپ کے ساتھ کراچی جاؤں گا، اب
اس ملک میں رہنے کو دل نہیں کرتا، وہاں اپنی حکومت
ہوگی، آزادی ہوگی محنت کروں گا اور پھر ٹرک بنالوں کا
کم از کم اتنی قربانی تو میں بھی دے سکتا ہوں۔“

کرامت نے کہا۔ ”تمہارا جذبہ بڑا قیمتی ہے
میں تمہارے ساتھ ہوں فکر نہ کرو، اور بھئی کا راستہ پکڑ لو
اگر کوئی راہ میں آئے تو روند ڈالو۔“

نندن کے خواب و خیال میں یہ بات نہ تھی کہ
کرامت رات کو روانہ ہو جائے گا۔ دلی کی سڑکیں
سنان پڑی تھیں مگر چوراہوں پر ٹیسرے موجود تھے ان
کے منہ خون لگ گیا تھا، انسانیت کو وہ لوگ بھول چکے
تھے ان کے ہاتھوں میں ہتھیار تھے وہ کسی بھی گاڑی کو
روک کر لوٹ لیا کرتے تھے۔ قانون اور پولیس نے ان
کو پھوٹ دے رکھی تھی۔ یہ دس بارہ آدمیوں کا ٹولہ تھا وہ
براہر مہادیو اور بے کالی کے نعرے لگاتے سڑک پر آگئے
اور ٹرک روکنے کا اشارہ کرنے لگے، مگر ان کے قریب
پہنچ کر ٹرک کا طاقتور انجن زور سے گر جا اور ان پر سے
ٹرک گزر گیا، ٹرک کو ہلکا جھٹکا تو لگا مگر وہ سڑک پر گر
پڑے اور بری طرح زخمی ہوئے۔

دلی شہر سے نکلتے تین مقامات پر ایسا ہوا اور
وہ گزر گئے، سلمان خان ماہر ڈرائیور تھا وہ ان کو دیکھ کر
اسیڈ کم کرتا تھا اور یہ تاثر دیتا تھا کہ ٹرک رک رہا ہے اور
قریب پہنچ کر ان پر چڑھ جاتا تھا۔

ٹرک کے مارٹر خون میں لت پت تھے، خون کی
ہولی ہو رہی تھی جو بھاری تھا مار رہا تھا جو کمزور تھا، مر رہا
تھا لٹ رہا تھا ہزاروں عورتیں ہندوؤں اور مسکھوں کے،
قبضے میں تھیں اور موت کی دعائیں کرتی تھیں، دلی ایک

کرامت نے کہا۔ ”میرے پاس ٹرک ہے،
میں اس میں ہی دلی آیا ہوں اور دلی سے باہر بھی اسی
میں جاؤں گا۔“

نندن بولا۔ ”میں خدمت کرنا چاہتا تھا خیر آپ
کی مرضی آپ کب روانہ ہوں گے؟“
”کہہ نہیں سکتا ابھی دلی میں کچھ عزیزوں سے
ملاقات کرنی ہیں۔“

”میں اس لئے پوچھ رہا تھا کہ آپ کی سیکورٹی کا
بندوبست کرتا۔“ نندن بولا۔

”میں خود اپنی سیکورٹی کر سکتا ہوں، آپ یہ
مہربانی نہ کریں اور اپنے انتظامات واپس لے لیں تو اچھا
ہے میں بھی اسی رینک کا آدمی ہوں، آپ کی پاور اور
پھیلاؤ کو جانتا ہوں۔“ کرامت نے کہا۔

”آپ کو کسی نے میرے بارے میں بہکا دیا
ہے۔“ نندن بولا۔

”اگر ایسا ہے تو بھی میں اپنی سیکورٹی خود
کروں گا۔“

”آپ کی مرضی۔“ اور نندن برا سا منہ بنا کر
چلا گیا۔

اس کے جانے کے بعد سلمان خان کرامت
کے پاس آگیا اور بولا۔ ”اس کے ارادے ٹھیک نہیں
ہیں، آج رات کو ہی نکل جائیں تو بہتر ہے، میں نے کئی
پیشروں پرپ سے ٹینک فل کرا لیا ہے اور دو کین بھی
بھرنے ہیں کافی لمبے سفر کے لئے پیشروں ہے اس
بد معاش کو موقع نہیں دینا ہے۔“

”تو پھر کس طرف کا راستہ اختیار کرتا ہے؟“
کرامت نے پوچھا۔

”پنجاب کا راستہ تو بہت خطرناک ہے
راجستھان میں راجاؤں سے ہیں ان میں جاؤں کی
حکومت ہے، بھرت پور ان میں سب سے آگے ہے
صرف بے پور کا راجہ ایسا ہے جس نے امن رکھا ہوا ہے،
وہاں تک جانے کو دوسری ریاستوں سے گزرنا پڑے گا
اور وہی خطرناک ہوگا۔ اور اگر کوئی بوندی رستم کی لائن

عدد بیوی ہی میرا کل اثاثہ تھیں۔

یہ ان دنوں کی بات ہے جب میرے پاس اپنے کام کا بہت زیادہ دباؤ تھا۔ اکثر بیشتر مجھے اپنے کام کے سلسلے میں رات دیر تک اپنے آفس میں رکنا پڑتا تھا۔ کیونکہ میرا ایک ماول زیر طبع تھا اس وجہ سے زیادہ لیٹ گھر پہنچنا میرا معمول بن گیا تھا۔

اس رات میں قریب قریب رات کے ڈیڑھ بجے آفس سے باہر نکلا، موسم انتہائی خوش گوار تھا۔ میں اپنی گاڑی کو انتہائی سکون سے ڈرائیو کرتا ہوا گھر جا رہا تھا مجھے گھر جانے میں عجلت نہ تھی جہاں اتنی دیر وہاں تھوڑی اور سہی بے خیالی میں نہ جانے کیسے میری گاڑی اس سڑک پر آگئی تھی جس پر سفر کرتا سٹی گورنمنٹ کی طرف سے ممنوع تھا۔

رات تو رات دن میں بھی اس سڑک سے گزرتے ہوئے لوگ ڈرتے تھے کافی چوڑی اس سڑک کی وجہ شہرت کیا تھی، لوگ کیوں ڈرتے تھے اس کے بارے میں مختلف روایات منسوب ہیں۔

لیکن سب سے زیادہ جس وجہ نے شہرت پائی اس کا تعلق سیٹھ دھنی رام سے تھا، سیٹھ دھنی رام کی ایک بیٹی تھی جس کا نام شاردہ تھا شاردہ ایک ڈرائیور کو بیٹے سے محبت ہوگئی، ڈرائیور کے بیٹے کو پالنے شاردہ کے لپٹن میں اپنی محبت کا ثبوت چھوڑ دیا تھا اور موت کے خوف سے وہاں سے بھاگ گیا۔ شاردہ کوئی ماہ تک ڈر کے مارے چپ رہی۔ لیکن ماں بننے کے وقت بات چھپی نہ رہ سکی شاردہ ڈر کے مارے وہاں سے بھاگی، اسی سڑک پر پہنچ کر شاردہ کا اتنا شدید ایکسڈنٹ ہوا کہ وہ موقع پر ہی جاں بحق ہوگئی۔

تب سے لوگوں کو شاردہ کی روح نظر آتی۔ ”جس کے ہاتھ میں ایک بچہ ہوتا۔“ اس کے علاوہ اور بھی بہت سی باتیں لوگوں نے اس سڑک سے منسوب کر رکھی تھیں۔ لیکن ان تمام باتوں پر میں یقین نہیں رکھتا تھا۔

چنانچہ گاڑی کے اس سڑک پر آ جانے کے باوجود میں بغیر کسی خوف کے آگے ہی آگے بڑھتا رہا۔ سڑک پر بہت اندھیرا تھا صرف کار کی ہیڈ لائٹس کی مدد سے میں ڈرائیونگ کر رہا تھا اچانک مجھے دور سڑک پر کوئی کھڑا نظر آیا

جو کہ بالکل سڑک کے درمیان میں کھڑا تھا۔ ایک لمحے کے لئے مجھے خوف محسوس ہوا اور وہ سارے پراسرار واقعات میرے ذہن میں گھوم کر رہ گئے، اس سڑک سے جڑی پراسراریت مجھے یاد آگئی لیکن میں نے اس کو اپنے ذہن سے جھٹک دیا۔ ”شاید کوئی پریشان حال شخص ہے جو کہ اس طرح مدد کا طالب ہے۔“ میں نے گاڑی بالکل اس کے قریب جا کر روک دی، یہی شاید میری سب سے بڑی بھول تھی نوارد آہستہ آہستہ چلتا ہوا میرے قریب آیا۔

کار کی روشنی میں، میں نے اس کا چہرہ دیکھا۔ وہ ایک 22-23 برس کی پرکشش لڑکی تھی۔

”صاحب..... جی..... میرے بچے کو بچالو..... بہت بیمار ہے۔“

”کہاں ہے تمہارا بچہ؟“ میں نے انسانی ہمدردی کے جذبے کے تحت پوچھا۔

میری بات سن کر وہ ایک لمحے کے لئے رکی اور دوسرے لمحے وہ فیس پڑی اس کی ہنسی انتہائی مکروہ تھی۔

اس بل بھی مجھے احساس نہ ہوا کہ یہ آجی چکر ہے۔

”کہاں ہے تمہارا بچہ؟“ میں نے پوچھا۔

”یہاں.....“ یہ کہہ کر اس نے اپنا خوب صورت ہیٹ عریاں کر دیا اس کے بعد جو منظر میری آنکھوں کے سامنے آیا وہ انتہائی حیرت انگیز اور ناقابل فراموش خوف ناک تھا جسے دیکھ کر میں اپنی چیخوں پر قابو نہ کھ سکا۔

اس لڑکی کے پیٹ سے خون میں اتھڑے ہوئے ایک بچے کا سر باہر نکل رہا تھا میں سمجھ گیا اگر میں نے فرار اختیار نہ کی تو میری لاش کسی کو بھی نہ ملے گی بچے کا سر نصف کے قریب باہر آچکا تھا۔ اسی لمحے میں نے اس لڑکی کو ہاتھ مار کر ایک زوردار دھکا دیا تو وہ چیختی ہوئی سڑک پر جاگری اور لمحہ ضائع کئے بغیر میں نے گاڑی اسٹارٹ کر دی۔

وہ لڑکی چیختی ہوئی میری گاڑی کے پیچھے دوڑی اور میں نے گاڑی کی اسپید حرید بڑھا دی۔

”میں تجھے نہیں..... چھوڑ دوں گی..... تو نے میرا بچہ مار دیا۔“ وہ لڑکی چیختی ہوئی گاڑی کے پیچھے بھاگ رہی تھی۔

امام کو حالات بتائے اور پھر انہوں نے تدفین کا بندوبست کر دیا اور مسجد کے ساتھ قبرستان میں تدفین ہو گئی۔

سلامت بیوی کے اس طرح جدا ہونے پر بہت ادا اس ہو گئے۔ ”کرامت بیٹا تمہاری ماں کے نصیب میں اپنا پاک وطن دیکھنا نہیں تھا ارے ذرا اور رک جاتی اس کی مٹی کو تو چوم لیتی کیا پتہ میں بھی دیکھ پاؤں گا کہ نہیں۔“

رات اسی گاؤں میں گزارنی تھی اور اس کے ذہن کے پردے پر نسل کلثم موجود تھا۔

نیل کلثم نے کہا۔ ”عبر کرد تمہارا سفر بہت کٹھن ہے، میں نے تمہارے دلی کے دشمن کو بھٹکا کر بیکانیر کے ریگستان میں پہنچا دیا ہے آگے اچھن ہے تم وہاں پر سکون سے دو چار دن آرام کرنا میں آگے کا راستہ دیکھ لوں گا۔“

اچھن شہر کا ماحول ہی الگ ہے نہایت پرسکون یہ لوگ مہابیر دیوتا کو مانتے ہیں۔ اور کپڑوں کا کم سے کم استعمال کرتے ہیں ان کے ہتھکڑی یا ترا کو ٹٹلتے ہیں تو بدن پر صرف ایک لنگوٹی لگاتے ہیں کان ناک پیلی مٹی سے بند کر دیتے ہیں اور سارے بدن پر بھی مٹی کی تہہ چڑھا لیتے ہیں۔ اور ہر ایک کے کاندھے پر مینگی ہوتی ہے۔ مینگی کے دونوں طرف ان کی ضرورت کا سامان ہوتا ہے اور وہ اچھن سے کتنی بھی دور ہوں، پیدل ہی سفر کرتے ہیں۔ اور ٹولیوں کی جھل میں ہوتے ہیں۔ مہینوں کے سفر کے بعد یہ ہم بم بولے کے نعرے لگاتے اچھن میں داخل ہوتے ہیں ان کے پیر سوچ جاتے ہیں مگر یہ اچھن پہنچ کر پھر بھی خوش ہوتے ہیں اور مہابیر دیوتا کے درشن کرتے ہیں۔ یہ لوگ امن پسند ہیں نہ کسی سے لڑائی کرتے ہیں اور نہ کسی کے معاملے میں دخل دیتے ہیں یہ جیسی کہلاتے ہیں۔

ایک ہفتہ کے بعد فل کلثم نے اطلاع دی کہ اب آگے سفر کرو کچھ شہر پسند بھی ہے آگے تھے۔ مگر وہ اب نہیں ہیں اور کرامت کا قافلہ روانہ ہوا سڑک پر آنا ضرور تھا مگر سدا خان جیسا آدی اس کی دیکھ بھال

بہت چھوٹے تھے۔ والدین بوڑھے تھے جو کرنا تھا وہ حمزہ اودہ اور سدا خان کو کرنا تھا۔ سب کے لئے کھانے کا بندوبست کیا، کئی دن کی بے آرا می اور سفر کی تھکان نے ان سب کو بے حال کر دیا تھا۔

رات کے کھانے کے بعد سدا خان بولا۔ ”سر پیٹروں کا بندوبست یہاں سے ہی کرنا ہے اور گاڑی کی بھی چیکنگ کرانی ہے آگے پتہ نہیں کیا حالات ہوں یہ سکون کی جگہ ہے۔“ کرامت نے سدا خان کو ایک ہزار روپے دیئے اور کہا۔ ”جو کرنا ہے کرالو فکر نہ کرو دو چار دن رکنا بھی پڑے تو بھی یہاں رکنا جاسکتا ہے۔“ سدا خان بولا۔ ”آگے ایک شہر ہے جو کہ صرف ہندوؤں کا ہے اس کا خیال رکھنا ہوگا۔“

”وہ کون سا شہر ہے؟“ کرامت نے پوچھا۔ ”اچھن یہ خالص ہندو شہر ہے۔“ سدا خان نے بتایا۔

کرامت نے جواب دیا۔ ”سدا خان تم بے فکر رہو وہ جیوں کی یا تر ہے۔“

تم کو پتہ ہے ان کا اصول ہے کہ یہ کسی جاندار کو نہیں مارتے، یہاں تک کہ کیڑے مکوڑوں تک کو نہیں مارتے ان کے مذہب میں کسی کی جان لینا پاپ ہے یہ ہندو تو ہیں مگر ان کے اصول بہت الگ ہیں یہ لوگ انسانی اعضا کی پوجا کرتے ہیں اور بہت ہی امن پسند ہوتے ہیں۔“

”تو بھی ہم کو اپنی تیاری تو کرنا ہوگی۔“ سدا خان نے کہا۔

گاڑی کا کام کرانے میں اور پیٹروں جمع کرنے میں تین روز لگے اور وہ آگے روانہ ہوئے، راتام گزرتے ہی ایک حادثہ ہوا اور اچانک کرامت کی والدہ کی حالت بگڑی اس وقت یہ لوگ ایک گاؤں کے قریب تھے اور اس سے پہلے کہ کچھ علاج ہو ان کا انتقال ہو گیا۔

گاڑی گاؤں کے بازار سے ہٹ کر کھڑی ہوئی، اتفاق سے اس گاؤں میں مسلمانوں کی آبادی تھی اور ایک مسجد بھی تھی، سدا خان خان ووڑ کر مسجد میں گیا اور اس نے

ہوئے تو میں خود ہی مسکرایا۔ ”تو گویا یہ خواب تھا لیکن بڑا ہی خوف ناک اور ہشت ناک تھا۔“ لیکن نہ جانے کیوں مجھے سر میں بہت درد محسوس ہو رہا تھا۔ اس کے بعد میں کافی دیر تک جاگتا رہا پھر سو گیا۔

صبح کافی دیر سے میری آنکھ کھلی، سر میں درد ابھی تک محسوس ہو رہا تھا ایسے لگ رہا تھا کہ رو کی شدت سے میرا سر پھٹا جا رہا تھا۔ خیر جیسے تیسے باہر آیا تو میں نے دیکھا کہ زوہیب دروازے پر کھڑا چیونگم چبا رہا ہے ایسا کرتے وقت اس کے چہرے کی رکیں ابھرتی تھیں یوں لگتا تھا کہ اس کے جبڑے تھک چکے ہوں۔

زوہیب کی یہ حرکت دیکھ کر میرا بند پریشاں ایک دم باہی ہو گیا۔ ”صبح زوہیب کی یہ حرکت بہت ہی معیوب لگتی، سر میں شدید درد کی وجہ سے زوہیب کا یہ عمل مجھے اور بھی برا لگا۔“

”زوہیب..... تمہیں ذرا بھی تمیز نہیں ہے۔ کہ صبح صبح۔“ میں نے انتہائی سخت لہجے میں کہا۔

یہ دیکھ کر میں انتہائی حیرت زدہ رہ گیا کہ زوہیب کی آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے جبکہ اس کے جبڑے مسلسل چیونگم کی جگالی میں مصروف تھے۔

”مم..... مم..... میں خود سے ایسا نہیں کر رہا ابو۔“ زوہیب نے پھنسی پھنسی آواز میں کہا۔

”کیا مطلب..... ہے تمہارا.....؟ تم ایسا نہیں کر رہے ہو تو پھر کون کر رہا ہے؟“ میں نے حیرت زدہ لہجے میں پوچھا۔

”ابو..... یہ چیونگم مجھے چبا رہا ہے۔“ فوری طور پر مجھے کچھ سمجھ نہیں آیا کہ اس کی احمقانہ بات کا میں کیا مطلب نکالوں۔

پھر بھی مجھے معلوم تھا کہ زوہیب مجھ سے جھوٹ نہیں بول سکتا جبکہ زوہیب کی حالت بالکل میرے سامنے تھی اس کی آنکھیں پھٹی ہوئی چہرہ وحشت زدہ ویران جبکہ جبڑے بالکل نیلے پڑے ہوئے تھے۔

”ضرور کوئی نہ کوئی گڑبڑ ہے۔“ دھننا مجھے وہ رات یاد آگئی جس رات اس سڑک

پر ایک غیر انسانی مخلوق سے میرا پلا پڑ گیا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں پھر کچھ سوچ کر میں نے میز پر ایک کاغذ بچھا دیا۔

”چیونگم اس پر تھوک دو۔“ زوہیب نے چند لمحوں تک ایسا کرنے کی کوشش کی پھر وہ ہانسا ہو کر بری طرح سے رونے لگا تھا۔

میرے لئے یہ صورت حال بالکل نئی اور خوف ناک تھی میں نے زوہیب کو منہ کھولنے کا اشارہ کیا اور انگلی اس کے منہ میں ڈال دی وہ لچلچاسا چیونگم میری انگلی سے لپٹ گیا۔ کراہیت تو بہت ہوئی لیکن معاملہ اپنی اولاد کا تھا۔

میں نے اس گندھے ہوئے چیونگم کو باہر کھینچنے کی کوشش کی لیکن وہ بار بار پھسل جاتا یوں لگتا تھا کہ زوہیب کے منہ میں کوئی زندہ مخلوق ہو میں نے بڑی تنگ و دو کے بعد اس منگوں چیونگم کو باہر کاغذ پر پھینچ دیا اس چیونگم کے باہر آتے ہی میں نے اپنے بیٹے کے چہرے پر بے حد سکون دیکھا۔

”تمہاری یہ حالت کب سے ہے۔؟“ میں نے زوہیب سے پوچھا۔

”پچھلی رات سے۔؟“ اس نے دھیرے دھیرے کہنا شروع کیا۔

”پچھلی رات یہ میرے منہ میں تھا میں نے نیند کی جھونک میں اسے نکال کر باہر پھینک دیا۔ صبح آنکھ کھلی تو یہ میرے منہ میں تھا اور جبڑے حرکت کر رہے تھے اور جب سے یہ چیونگم باہر ہی نہیں آیا۔“ پچھلی رات کی بات سن کر میں چونک پڑا وہ عجیبی شے یقیناً یہی چیونگم ہوگا۔ میں کاغذ کو لپیٹ کر کچرے کے ڈبے میں ڈالنے کے لئے کاغذ کی جانب بڑھا ہی تھا کہ میری آنکھیں حیرت اور خوف سے کھلی کی کھلی رہ گئیں میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ حقیقت میں ایسا بھی ہو سکتا ہے۔ ایسا تو فلموں یا کہانیوں میں ہوتا ہے وہ منظر تھا ہی اتنا خوف۔

کاغذ پر موجود چیونگم بے ہنگم انداز میں مل رہا ہے ہلتے ہلتے اپنا حجم بڑھا رہا ہے۔ چیونگم کا حجم اتنا بڑا ہو چکا تھا کہ وہ میز سے اتر کر فرش پر رینگ رہا تھا دھننا زوہیب کے حلق سے دل خراش چیخ نکلی..... پہلے تو مجھے کچھ سمجھنا آیا کہ

نقصان ہوگا، اس سے آگے میں کچھ نہیں کہوں گا۔“ کرامت نے کہا۔

”اور میں پوچھوں گا بھی نہیں کیونکہ دنیا میں ایسے بے شمار حسرت انگیز پراسرار ناقابل یقین واقعات رونما ہو چکے ہیں جن کے بارے میں آج تک کوئی توجہ پیش نہیں کی جاسکی۔“ سہان خان نے جواب دیا۔

”کرامت نے کہا۔ ”تمہارا شکریہ سہان خان کہ تم نے میری اشاراتی زبان کو سمجھ لیا اور مجھے کسی امتحان میں نہیں ڈالا۔“

”سر میں اتنا تو جانتا ہوں کہ انسان کے کچھ نہ کچھ راز ایسے ضرور ہوتے ہیں جن کو وہ ہی جانتا ہے کسی اور کو نہیں بتا سکتا۔“ سہان خان نے جواب دیا۔

”ایسا لگتا ہے اس روڈ پر کوئی گاؤں آباد ہے ہی نہیں۔“ کرامت نے کہا۔

”اب بمبئی قریب ہے اگر روڈ ٹھیک ہوتا تو ہم لوگ بمبئی پہنچ چکے ہوتے۔“

مرانھی لباس اور تہذیب نظر آنے لگی تھی۔ بمبئی کے مضافات کی آبادی نظر آرہی تھی سہان نے کہا۔ ”اب ہم بمبئی میں ہیں اور ہم محمد علی روڈ پر ہی رکیں گے۔ وہ خالص مسلمانوں کی آبادی ہے۔ رہنے کو ٹھکانا بھی مل جائے گا۔“

اب شہر شروع ہو گیا تھا سہان نے ایک جگہ ٹرک روک کر محمد علی روڈ کا پتہ کیا اور پھر روانہ ہوا۔ زیادہ دیر نہ لگی اور ٹرک ایک مسجد کے سامنے سہان خان نے روک کر کہا۔ ”آئیے پہلے رہنے کا بندوبست کرتے ہیں۔“ دونوں نیچے اتر پڑے اور مسجد کے اندر چلے گئے۔ جب وہ واپس آئے تو ان کے ساتھ ایک نوجوان باریش فحش بھی تھا۔ باہر آ کر وہ بولا۔ ”سامان زیادہ ہے تو مزدور بلانا ہوں گے۔ آپ کتنے دن قیام کریں گے؟“ کرامت نے کہا۔ ”رحمت علی صاحب ہمارا قیام تو ٹکٹ ملنے سے مشروط ہے۔“

رحمت علی بولے۔ ”یہ آپ نے درست کہا جہاز کے ٹکٹ نہیں مل رہے ہیں۔ لوگ ایک ایک مہینے سے

پڑے ہیں۔“

سہان خان نے کہا۔ ”ٹرک میں زیادہ سامان نہیں ہے نظر آتا ہے اندر کمرہ ہے اور بچے ہیں۔“ رحمت علی نے حیرت سے کہا۔ ”ذرا بھی شک نہیں ہونا کہ اندر بھی کوئی ہے خیر آپ لوگ ان کو اتاریں اور میرے ساتھ آئیں، آرام کریں، انشا اللہ سب بہتر ہوگا، آپ لوگ لمبا سفر کر کے آئے ہیں، آرام کی ضرورت ہے۔“ کرامت اور سہان خان نے سلامت اور بچوں کو اتارا۔

کرامت کی بیوی بولی۔ ”میرے تو پیرا کڑ گئے ہیں مجھے معلوم ہے کہ اب دو چار دن چلوں گی پھروں گی تو نارمل ہو جاؤں گی۔“

دو کمرے کا مکان ان کو رحمت علی نے دے دیا اور کہا۔ ”کھانے کے لئے یہ ہے کہ آپ لوگ مسجد کے ساتھ ہوٹل ہے وہاں کھالیں اور فیملی کے لئے آئیں نہایت مناسب ریٹ پر یہ انتظام یہاں کے مسلمانوں نے کیا ہے۔ اور اگر کسی امداد کی ضرورت ہو تو وہ بھی انتظام ہو سکتا ہے اسی شہر کے محیرہ حضرات نے اس کا بھی بندوبست کر دیا ہے آپ بے فکر ہو کر رہیں، آپ کی ضرورت ہم پوری کریں گے۔“ کرامت نے رحمت علی کا شکریہ ادا کیا۔

کرامت اس سے پہلے بھی ایک دفعہ بمبئی آیا تھا یہ اس وقت کی بات تھی جب وہ پڑھتا تھا اور کھیلے آیا تھا، آج وقت بدل گیا تھا آج وہ دوسرے حالات میں آیا تھا اس پر ایک ذمہ داری تھی اس وقت اس پر کوئی ذمہ داری نہ تھی، آج کے کرامت میں اور اس وقت کے، کرامت میں بڑا فرق تھا۔

سینان کے ٹرک کا سودا ہو گیا اور ٹرک بک گیا۔ آمنہ خاتون اور سلامت بھی بہتر نظر آنے لگے، بچے بھی چاک و چوبند تھے۔ کرامت اور سہان خان ٹکٹ حاصل کر رہے تھے، رات کو کرامت اور سہان کے ساتھ سلامت بھی کھانا کھانے ہوٹل گئے، رحمت علی ان کا انتظار کر رہا تھا، کرامت کو دیکھ کر بولا۔ ”آپ کی امانت

رہا تھا۔

مجھے جب ہوش آیا تو میں نے دیکھا کہ رخسانہ اور زوہیب مجھ پر جھکے ہوئے ہیں۔

”وہ..... وہ..... چیونگم۔“ میں نے گھبرا کر پوچھا۔
”آپ نے باہر پھینک دیا تھا.....“ رخسانہ نے مسکرا کر کہا۔

”وہ تو واپس آ گیا تھا ناں۔“

”کیا کہہ رہے ہیں آپ.....“ رخسانہ نے گھبرا کر پوچھا۔

”وہ..... کیا کہہ رہی ہو..... مجھے سمجھ نہیں رہا۔“ میں نے کہا۔

”آپ اور ہم زوہیب کلنانے کے بعد باتیں کر رہے تھے کہ بلاوجہ آپ چیختے چیختے بے ہوش ہو گئے۔“ رخسانہ بولی۔

میرا منہ..... رخسانہ کی بات سن کر احمقانہ انداز میں کھل گیا لیکن رخسانہ کا لہجہ اور چہرے کے تاثرات اس کی سپائی کا ثبوت دے دے تھے۔ لیکن ایک بات ضرور تھی میں اتنا ضرور جانتا تھا کہ وہ اتنی آسانی سے مجھے چھوڑے گی نہیں وہ مجھ سے بدلہ ضرور لے گی۔ کیونکہ اس کی نظر میں، میں اس کے بچے کا قاتل تھا۔

☆.....☆.....☆

رات کے 12 بجے کا وقت رہا ہوگا۔ میں زوہیب کی وجہ سے پریشان تھا میں جانتا تھا کہ وہ میرے بچے کو ضرور مار دے گی۔ مجھے کچھ کرنا تھا زوہیب کو بچانا تھا۔

دفعتاً یکے بعد دیگرے زوہیب کی خوفناک چیخیں سنائی دینے لگیں وہ چیخیں اتنی خوف ناک اور دل دہلا دینے والی تھیں کہ پورا گھر ملازموں سمیت زوہیب کے کمرے میں جمع ہو گیا زوہیب کی آنکھیں اوپر کو جڑھی ہوئی تھیں۔ جبکہ چیونگم اس کے منہ میں تھا جسے وہ چبا رہا تھا۔ اس کے منہ سے خون جاری ہو چکا تھا اس کی آنکھیں خوف اور وحشت سے پھٹی ہوئی تھیں کہ میں زوہیب کی مدد کرنے آگے بڑھا مگر اس کے ایک ہی وارے میں لم لیٹ ہو گیا شرفو کسی زمانے میں پہلوانی اور کشتی کرتا تھا اور بڑی جی دار قسم کا

انسان تھا۔

مگر میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ شرفو زوہیب کے دھکے سے اڑتا ہوا پنکھے کے پردوں سے جا ٹکرایا۔ رخسانہ کے حلق سے خوف ناک چیخ نکلی اور تیرا کر گر پڑی۔

پنکھے کے تیز رفتار پردوں نے شرفو کی گردن کاٹ دی تھی اور اس کا بے جان لاش فرش پڑا تھا۔ دوسرے ملازمین یہ منظر دیکھ کر چیختے ہوئے بھاگ کھڑے ہوئے جبکہ دھنودھاں کھڑی بڑی عجیب نظروں سے اس لاش کو دیکھ رہی تھی۔

زوہیب انتہائی حقارت اور نفرت بھری نظروں سے اس لاش کو دیکھ رہا تھا زوہیب کی آنکھوں میں عجیب قسم کا خوف ناک تاثر تھا۔ زوہیب اب آہستہ آہستہ میری جانب بڑھ رہا تھا۔

”جواد ہٹ جائیں یہاں سے.....“ رخسانہ چیختی ہوئی بولی۔

لیکن میں نے شاید سنا نہیں..... اب زوہیب مجھ تک پہنچ چکا تھا زوہیب نے مجھے گریبان سے پکڑ کر اٹھایا اور بے حد حقارت سے گھورنے لگا اسی لمحے مسجد کا لاؤڈ اسپیکر بول پڑا۔

وہ صدا جس پر ہم کبھی بھی دھیان نہیں دیتے میری جان بچانے کا سبب بن گیا۔ اذان کی پرکشش اور دلوں کو چھوینے والی آواز زوہیب کے کانوں سے ٹکرائی اور زوہیب بے ہوش ہو کر گر پڑا۔

بے ہوش زوہیب کے چہرے پر معصومیت اور کرب بیک وقت پایا جاتا تھا۔ رخسانہ ٹھنٹی ہوئی آئی اور چیخ چیخ کر رونے لگی۔ مجھ سے اپنے لخت جگر کی یہ حالت دیکھی نہیں جاتی تھی ہم نے کسی کا کیا بگاڑا تھا جو ہم کو یہ دن دیکھنے پڑے تھے شرفو کی بے گناہ لاش الگ پولیس کی منتظر تھی۔ جبکہ زوہیب کے بے ہوش ہو جانے کے بعد میں اور رخسانہ بہت کوشش کر کے اس چیونگم کو نکالنے کی کوشش میں تھے مگر ہم ناکام رہے یوں لگتا تھا کہ جیسے کسی نے منہ میں پتلی ڈال دی ہو..... بے ہوشی میں بھی جڑے حرکت میں تھے۔

”مالک..... مجھ سے چھوٹے سرکار کی حالت دیکھی



پراسرار مندر

عاصمہ احمد - جنڈانوالہ - بھکر

کھنڈر نما مندر کا دروازہ کھلتے ہی اس جگہ موجود گاؤں کے سارے لوگ حیران و پریشان ہو گئے کیونکہ صدیوں سے ویران مندر میں بے شمار دیئے جل رہے تھے اور ان دیوں کے درمیان ایک مجسم آتما بیٹھی تھی۔

رات کے گھناٹوپ اندھیرے میں جنم والیے والی پرہوں، پرہیت اور ڈراؤنی کہانی

مگر یہ ایک ایسا واقعہ ہے جس نے گاؤں کے لوگوں کو تو ہراساں کیا ہی مگر میرے جیسے سر پھرے نوجوانوں کو بھی خوفزدہ کر دیا۔ ہم جو گاؤں والوں کی باتوں کا مذاق اڑاتے تھے اس واقعہ کی شروعات اس طرح سے ہوئی۔ گاؤں میں ایک لڑکا جس کا اصل نام تو عاشق تھا مگر وہ فطرتاً بہت ہی بھولا اور اگر بے وقوف کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا، اسے ہم سب گاؤں والے بھولا

یہ ان دنوں کی بات ہے جب میری عمر یہی کوئی تیس سال کے لگ بھگ تھی، میں ایک گاؤں میں اپنی ماں اور تین بہنوں کے ساتھ رہتا تھا، اس گاؤں کے لوگ بہت ہی سچے، کھرے، سادہ اور پر خلوص تھے مگر ایک عادت جو بزرگوں سے لے کر کم سن بچوں میں بھی کوٹ کوٹ کر بھری تھی وہ ان میں تو ہم پرستی تھی، وہ ہر ایک انہونی کے بارے میں مختلف قیاس کرتے۔

”کیسے.....؟“ میں نے بے تابی سے پوچھا۔

”ایک جاپ کرنا ہوگا..... تم کو مالک۔“

”مجھ کو۔“ میں نے حیرت سے پوچھا۔

”ہاں..... تم کو مالک..... کیونکہ تم یہ جاپ کرو گے

اور وہ آتما میرے قبضے میں آ جائے گی..... اور میں دھنواں

ہو جاؤں گا۔“ اس نے خیالی پاؤں پکاتے ہوئے کہا۔ اس کی

بات سن کر میں نے کہا۔ ”تم اس آتما کے ساتھ کچھ بھی کرو

مجھے کوئی واسطہ نہیں۔“

میری بات سن کر جگن کے ماتھے پر شکنیں نمودار

ہو گئیں۔

”مالک بچہ تمہارا اور عمل بھی تمہیں کرنا ہوگا۔“

”اچھا.....“ میں نے سر جھکا کر کہا شاید میں بھول

گیا تھا کہ بچے کی محبت میں جو کام کرنے جا رہا ہوں وہ کام

مطلوبہ ہے اور گناہ ہے۔

”مجھے کیا کرنا ہوگا.....؟“

”تمہیں قبر میں لیٹ کر ایک رات گزارنی

ہوگی..... قبر وہ جو کم از کم 5 سال پرانی ہو۔“

”قبر میں ایک رات.....“ میں نے زبرد کر کہا۔

”ہاں مالک..... ایک رات..... جو میں بتاؤں گا وہ

تمہیں پڑھنا ہوگا۔“ میں بھول گیا تھا کہ میں ایک مسلمان

ہوں اور مسلمان قبروں کا احترام کرتے ہیں لیکن مجھے بیٹے کی

محبت نے اندھا کر دیا تھا، میں جو کرنے جا رہا تھا وہ خلاف

قانون تھا اور خلاف قدرت تھا، لیکن میری آنکھوں پر تو پنی

بندھی تھی۔

☆.....☆.....☆

رات کے تقریباً بارہ بج چکے ہوں گے گہری تاریکی

چھائی ہوئی تھی چاروں طرف ہوکا عالم تھا..... سردی کی

شدت میں اضافہ ہو چکا تھا میں جگن کے ساتھ قبرستان کے

باہر کھڑا تھا۔ ”وہ قبر کہاں ہے.....؟“ میں نے سرسرائی ہوئی

آواز میں جگن سے پوچھا۔

”اندر.....“ جگن نے ہاتھ کے اشارے سے کہا

میں اور جگن مارچ لائٹ کی روشنی میں اس قبر تک پہنچ گئے۔

دفن کسی الو کی بھیا تک آواز سے میرے پورے جسم میں

سر طہر دوڑ گئی۔

”میں باہر بیٹھ کر گندی ہلکیوں کو تمہاری سست آنے

سے دوں گا۔“ ”مگر.....!“

”اگر..... مگر..... کچھ نہیں..... وہ کوئی معمولی آتما

نہیں..... اگر تمہاری جان چھوٹ جائے گی تو..... وہ میری

ہوگی..... میں اپنے سارے کام سیدھے کر لوں گا۔“ اس

کے لہجے میں بے پناہ پیارا لہجہ آیا تھا۔

وہ ایک بہت پرانی قبر تھی۔ جگن نے اس قبر کو بالکل

صاف کر دیا ہر انسان کو قبر میں ضرور لیٹنا پڑتا ہے اپنے اعمال

کا حساب ضرور دینا پڑتا ہے..... مگر میں زندہ ہی اس میں

لیٹ گیا تھا جگن کے بتائے ہوئے منتر پڑھتے ہوئے جیسے

میں سب کچھ بھول گیا تھا نہ جانے کتنی دیر گزری ہوگی کہ مجھے

ایسا لگا کہ کوئی میرے اوپر آ رہا ہو..... میں نے گھبرا کر

آنکھیں کھول دیں۔

لیکن وہاں کوئی نہ تھا چند لمحوں کے بعد میں نے

دیکھا کہ میں ایک اق دوق صحرا میں کھڑا ہوں۔ پیاس کی

شدت سے میرے حلق میں کانٹے پڑ رہے تھے دفعتاً

میں نے ایک چٹخ کی تیز آواز سنی جو کہ میرے بالکل پیچھے

سے سنائی دی تھی۔ جیسے ہی میں مڑا میرے حلق سے چیخیں

نکل گئیں اور میں نے بھاگنا شروع کر دیا..... بھاگتے

بھاگتے میرا پیر پھسلا اور میں لڑکھڑا کر گر پڑا وہ منجوس پرندہ

جھمکائی دے کر مجھ پر حملہ آور ہوا میں نے اپنے چہرے

کو بچانے کے لئے دونوں ہاتھ آگے کر دیے پرندے کے

بنجوں کی رگڑ سے میرے دونوں ہاتھوں سے خون بہنے لگا میں

نے درد کی شدت سے آنکھیں کھول دیں۔

شاید یہ اسی شیطانی قوت کا کمال تھا جس سے میں

اپنے بچے کو بچانا چاہ رہا تھا۔ میرے بازوؤں سے خون بہہ

رہا تھا کچھ ہی لمحوں گزرے ہوں گے مجھے ایسا لگا کہ میں

فضاؤں میں پرواز کر رہا ہوں..... میری آنکھوں کے سامنے

نیلے نیلے تارے رقص کرنے لگے میں نے گھبرا کر

آنکھیں میس تو میرے سامنے کا منظر اب دوسرا تھا۔

میں ایک انتہائی پرانی اور بوسیدہ عمارت میں

موجود تھا یہ عمارت عام عمارتوں سے مختلف تھی اس کا طرز تعمیر

میں نے محسوس کیا کہ مندر میں پھیلی ناگوار ہوا ان ہی چراغوں کی بدولت ہے ہمارے دل میں جو خوف اور ڈر کنڈلی مار کے بیٹھا تھا اب وہ قدرے زائل ہو گیا اور ہم چاروں حیرت سے گھوم پھر کر اس مندر کو اب دیکھ رہے تھے۔

مندر میں کہیں بھی بھولے کا کوئی نشان نہ تھا نجانے وہ غریب کہاں غائب ہو گیا تھا.....؟ یہ بات سوچتے اور کرتے ہم چاروں مندر کے دروازے کو اچھی طرح بند کر کے واپس آ گئے۔

گھر واپس آ کر میں نے کچھ بھی ظاہر نہ ہونے دیا اور معمول کے مطابق دن گزر گیا شام کے بعد میں نے رات کا کھانا کھایا اور حسب معمول ریڈیو پر اپنا پسندیدہ پروگرام سنتا رہا۔ امی اور میری تینوں بہنیں سو گئیں تو میں بھی ریڈیو بند کر کے سونے کی کوشش کرنے لگا، چونکہ گرمی کا موسم تھا اس لئے ہم سب صحن میں چار پائیاں بچھا کر سوتے تھے۔ میری چار پائی کے ساتھ ہی باجی چھوٹی سی میز پر پانی رکھ دیتی تھیں تاکہ رات میں کسی کو پیاس لگے تو وہ اٹھ کر پانی پی لے۔ پاس ہی میں نے اپنا ریڈیو بھی رکھ دیا تھا۔

ابھی میں نے دوسری طرف کر دٹ لی ہی تھی کہ ریڈیو پوری شدت سے آن ہو گیا، میں نے کرنٹ کھا کر پیچھے مڑ کر دیکھا اور جلدی سے اٹھ کر اسے بند کر دیا۔ میرا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ میں پھر سونے کے لئے لیٹ گیا، لاشعوری طور پر میرا خیال ریڈیو میں ہی اٹکا تھا کہ اب بجے کہ تب بجے۔ مگر جب کافی دیر گز گئی تو مجھے تدرے اطمینان ہوا اور میں پھر سونے کی کوشش میں لگ گیا۔ ابھی مجھ پر غنودگی طاری ہوئی تھی کہ ایک بار پھر ریڈیو کی آواز اندھیرے اور خاموش رات میں گونجی۔ میں شیشا کے اٹھ بیٹھا۔ ڈرتے ڈرتے ایک پھر اسے بند کیا..... میں بری طرف کانپ رہا تھا، میرا ان رواں لرز رہا تھا۔ حیرت انگیز طور پر میری امی بہنیں گہری نیند سو رہی تھیں۔ ”حالانکہ ذرا سے کھٹکے کی از پر میری امی کی آنکھ کھل جاتی تھی تو ریڈیو کی فل

آواز پر وہ کیوں نہ جاگیں۔؟“ سوچتے الجھتے میں پھر سونے کی کوشش کرنے لگا مگر اب مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے میرے سر ہانے کوئی بم رکھا ہے جو کسی بھی پھٹ سکتا ہے۔ پھر نجانے کب میں سو گیا۔ نیند میں بھی میں ریڈیو بند کرتا اور وہ پھر بج اٹھتا۔

صبح میری آنکھ اس وقت کھلی جب سورج کی آسمان پر راجدھانی تھی دن کا اجالا پوری طرح ہر سو پھیل چکا تھا، دھوپ ہمارے کچے صحن میں دبے پاؤں آتی جا رہی تھی باورچی خانے میں برتنوں کی آوازیں آرہی تھیں۔

میرا سب سے پہلا خیال آن ہوتے ریڈیو کی جانب گیا مگر کوئی بھی مناسب سراسر میرے ہاتھ نہ لگا۔

میں اٹھا نہ ہاتھ دھو کر جلدی سے ناشتہ کیا اور دوستوں کے پاس گیا کہ اگر ان کے ساتھ بھی کوئی غیر معمولی بات ہوئی ہے تو وہ ضرور مجھے بتائیں گے کیونکہ ہم چاروں ہی اس دوران مندر میں گئے تھے۔ مگر ان تینوں میں سے کسی نے بھی کوئی اس قسم کی بات نہ کی تو میں نے بھی بتانا مناسب نہ سمجھا اور کچھ دیر کے بعد گھر واپس آ گیا۔

☆.....☆.....☆

اس کے بعد ایک ہفتہ بالکل خیریت سے گزر گیا اور کوئی بھی ایسی بات نہ ہوئی جس سے میں خوف اور پریشانی کا سامنا کرتا۔

ہمارے گاؤں کے نزدیک ہی ایک اور گاؤں تھا جہاں میری امی کی منہ بولی بہن کا بیٹھ فوت ہو گیا، امی کا جانا ضروری تھا امی کے ساتھ میں بھی وہاں گیا، نماز جنازہ کے بعد امی نے مجھ سے کہا کہ میں گھر واپس چلا جاؤں کیونکہ وہ دو دن رکیں گی میں نے ہائی بھر لی اور اپنے گھر واپس آ گیا۔ دونوں گاؤں کے درمیان فاصلہ زیادہ نہیں تھا اور باقی دنوں کی بہ نسبت موسم بھی کافی خوش گوار تھا اس لئے پیدل چلتا ہوا اپنے گھر کی جانب رواں تھا۔ راستے میں ہمارے گاؤں کا قبرستان تھا، میں وہاں سے گزر رہا تھا کہ اچانک وہاں سیاہ لباس میں ملبوس ایک وجود کو دیکھ کر بری طرح چونکا۔ اس کی پشت میری جانب تھی اور میں نے اندازہ لگایا کہ وہ کوئی

کچھ لمحوں بعد آپریشن تھیمٹر کا دروازہ کھلا اور آپریشن
تھیمٹر سے اسٹریج پر زوہیب باہر آیا، اپنے بچے کو دیکھ کر میرا
دل باغ باغ ہو گیا اس کے پورے منہ پر پٹی بندھی پڑی
تھی..... اور وہ کافی ٹھیک لگتا تھا۔

☆.....☆.....☆

دیوار پر ظاہر ہونے والے وہ مناظر غائب ہو گئے،
میں نے اپنے بیٹے کی زندگی کا سودا اپنی موت سے کر لیا تھا۔
میں وہ مناظر دیکھنے میں اتنا گمن رہا کہ میں بھول گیا کہ وہ
لڑکی اور وہ دونوں بھائی غائب ہو چکے تھے۔

بختا پورے ہال میں اندھیرا چھا گیا میں ادھر ادھر
دیکھتا ہوا آگے بڑھنے لگا..... پھر اچانک مجھے کسی نے زور کا
دھکا دیا پھر مجھے ایسا لگا کہ جیسے کسی نے مجھے تھام لیا ہو۔ میں
اب تک قید ہوں بھوک و پیاس کا احساس تک نہ ہو چکا ہے۔
بس اتنا معلوم ہے کہ میں اس لڑکی کی ہوس پوری
کرنے کی مشین بن چکا ہوں نہ جانے کب مجھے اس قید
سے خلاصی ملے گی، نہ معلوم کب اپنے بچے کو گلے لگانے کی
آس پوری ہوگی..... ہوگی بھی یا نہیں، دنیا کی نظروں میں
تو میں ویسے ہی مر چکا ہوں۔

قارئین کرام.....! میں اس کہانی کا مصنف آپ
سے مخاطب ہوں یہ کہانی جس کا راوی جواد حیدر ہے سچ
ہے یا جھوٹ میں نہیں جانتا اس کہانی کا مسودہ مجھے
UP مارکیٹ کراچی کے ایک ریڑھی سے مسودے کی صورت
میں ملا تھا جو کہ خاصا بوسیدہ اور کافی غلٹ میں تحریر کردہ
تھا، ایسا لگتا تھا کہ جیسے کسی کو جلدی ہے رجسٹر کے بوسیدہ
صفحات پر کئی جگہ خون کے سوکھے دھبے ہیں؟ جواد کا کیا
ہوا؟ اس روح کے ساتھ کیا ہوا؟ ان باتوں کا جواب اس
مسودے میں نہیں؟ اس کہانی کو میں نے دوبارہ تیار کیا
اور غیر ضروری باتوں کو حذف کر کے آپ تک پہنچا دیا۔
اب فیصلہ کرنا آپ کے ہاتھ میں ہے کہ یہ داستان سچ ہے
یا جھوٹ لیکن باپ کی محبت کی عکاسی کرتی اس داستان
کے متعلق اپنی رائے ضرور دیجیے گا۔



کر میرے چہرے پر لرزے کی کیفیت طاری ہوگئی۔
”خود کو بچاتا ہوں تو بیٹا مرتا ہے..... مجھے اپنی موت
تو منظور ہے لیکن بیٹے کی نہیں۔“ میں نے سوچا۔

”ٹھیک ہے..... مجھے تمہاری شرط منظور ہے.....
میں اپنے بیٹے کو صحیح سلامت دیکھنا چاہتا ہوں ابھی اور اسی
وقت.....“ میں نے افسردہ لہجے میں کہا۔
”میری بات سن کر وہ کھل اٹھی۔ اس نے دیوار کی
جانب اشارہ کیا۔

دیوار جیسے کسی سینما اسکرین کی طرح روشن ہوگئی۔
وہ ایک اسپتال کا منظر تھا..... آپریشن تھیمٹر کے باہر
بہت سارے لوگ جمع تھے جو کہ سارے میرے ملازمین تھے
جبکہ رخسانہ پریشانی کے عالم میں باہر کھڑی تھی اس کے
چہرے پر سوگواری کی سی کیفیت تھی۔

چند لمحوں بعد آپریشن تھیمٹر کا دروازہ کھلا اور ڈاکٹر
باہر آیا۔ ”مبارک ہو..... مسز جواد آپ کے بیٹے کی حالت
خطرے سے باہر ہے۔“

”شکر ہے خدا کا.....“ رخسانہ نے تشکرانہ انداز میں
کہا۔ ”مگر مسز جواد اس کی یہ حالت ہوئی کیسے، جڑے اس
حد تک سوج گئے کہ کھانا پینا مشکل ہو گیا۔“

”معلوم نہیں ڈاکٹر صاحب..... شاید کسی کیڑے
وغیرہ نے کاٹ لیا ہوگا۔“

”خیر..... خطرے کی کوئی بات نہیں..... کھانے
میں صرف ٹھوس غذاؤں سے گریز کریں اپنے شوہر کو بلوائیں
کہاں ہیں۔“ ڈاکٹر نے سنجیدہ لہجے میں پوچھا۔

ڈاکٹر کی بات سن کر رخسانہ کے چہرے پر اسی
طاری ہوگئی۔

”ان کی لاش کل قبرستان سے ملی۔ ان کے ساتھ
ایک لور لاش بھی تھی نہ معلوم وہ قبرستان کیا کرنے گئے
تھے“ رخسانہ کی آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے اور وہ پھوٹ
پھوٹ کر رودی۔

”اوہ..... سوری مسز جواد ٹیک کیئر۔“ یہ کہہ کر
ڈاکٹر دوسری طرف چلا گیا مگر رخسانہ کے آنسو تھمنے کا کام نہیں
ہی لے رہے تھے۔



آرزوئیں اس طرح بھی پوری ہو جایا کرتی ہیں

اسماء الحسنی۔۔۔۔۔ کامیابی کا راستہ

ہر مشکل کا حل بذریعہ موکلات جس پریشانی کی وجہ سے آپ کی زندگی موت سے بھی بدتر ہوگئی ہو اور ہر عامل نامکام ہو گیا ہو ہم سے مشورہ ایک بار ضرور لیں عامل وہ جس علم سمات سمندر پار چلے گئے و سفلی جادو ختم پتھر سے پتھر دل محبوب تابع ہوگا اولاد فرمان بردار خاوند سے بے رخی بچوں کے اچھے رشتے اور کاروبار میں کامیابی وہ لوگ مالوس نہ ہوں بلکہ اپنی آخری امید سمجھ کر سید فرمان شاہ سے رابطہ کریں انشاء آپ محسوس کریں گے ایک فون کال نے ہماری زندگی بدل دی

پریشانیوں سے چھٹکارہ ہمارا ہر عمل دنیا کے ہر کونے میں اثر کرتا ہے

جادو چلانا ہو یا ختم کرنا ہو

شادی کرنی ہو یا رکوانی ہو

اولاد کا نہ ہو یا ہو کر مر جانا

شوہر یا بیوی کی اصلاح

کاروباری بندش

گھریلو ناچاقی

دیگر مسائل

جنات کا سایہ

سید فرمان شاہ کا پیغام جو لوگ سوچتے رہتے ہیں۔ وہ ہمیشہ دکھی رہتے ہیں پلک جھپکنے سے پہلے کام مہم جو بگڑے کام بگڑے

سسرال میں بھوسب کی آنکھ کا تار این سکتی ہے ہر کام 100% رازداری کے ساتھ

زندگی کی کوئی بھی خواہش ہے کسی کو پانے کی تمنا اپنوں کی بے رخی سے دکھی ہیں یا میاں بیوی کی رنجش کو ختم کرنا ہے

خواہش

کلام الہی سے ہر پریشانی کا حل پہلے تعویذ سے آپ کی اجزی ہوئی زندگی میں بہار ایک فون کال پر آپ کے مسائل کا حل ایک فون کال پر

غرض کوئی بھی جائز خواہش ہے تو پوری ہوگی انشاء اللہ

میں آپ سے ایک فون کال کی دوری پر موجود ہوں فون ملائیے اور آزما لیجئے

ایک بار ہمیں خدمت کا موقع دیں کامرانیاں آپ کے قدم چومیں گی اور آپ یقیناً بہترین اور خوشسوار زندگی کا لطف اٹھائیں گے۔ نوٹ: جو خواتین و حضرات خود نہیں آسکتے وہ عمر بیٹھے فون کریں اور ہم سے کام لیں انشاء اللہ کامیابی ہوگی۔

وہ علم ہی کیا جس میں اثر نہ ہو۔ وہ آنکھیں کی کیا جن میں شرم نہ ہو۔ وہ علم ہی کیا جس میں اثر نہ ہو۔ وہ زبان ہی کیا جس میں اثر نہ ہو۔

اچھرہ شاپ مین بازار اچھرہ لاہور پاکستان

0300-6484398

سید فرمان شاہ

الْبھن ہونے لگی، آخر ایک روز کیفے کے کیمین میں چائے پیتے ہوئے میں نے اس سے پوچھ ہی لیا۔

”یہ کیا بات ہے عمر صاحب؟ آپ ہمیشہ ایک ہاتھ میں دستانہ پہنے رہتے ہیں، اور آپ کسی سے ہاتھ بھی نہیں ملاتے، سچ پوچھیں تو شروع شروع میں مجھے آپ سے کتراتے کی وجہ بھی یہی تھی۔“

اس کی کھوئی کھوئی آنکھیں کچھ اور دھندلی ہو گئیں اور وہ بو جھل سے لہجے میں بولا۔

”آپ میری بد اخلاقی کی وجہ سے ہی مجھ سے کتراتے ہیں، لیکن میں مجبور ہوں، اگر میں آپ سے مصافحہ کرتا تو میرے ہاتھ کا لیس محسوس کر کے آپ کو اتنی کراہیت آتی کہ آپ مجھ سے نفرت کرنے لگتے، میرا خیال ہے مجھے اب آپ سے چھپانا نہیں چاہئے۔“ یہ کہہ کر اس نے دستانہ اتار کر اپنا ہاتھ میرے سامنے کر دیا۔

”اوہ خدایا!“ مجھے جھرجھری سی آ گئی۔ بڑا ہی بھیا تک ہاتھ تھا۔ بالکل سیاہ، خشک اور جھریوں بھری کھال، سوکھی سوکھی مخروطی اور نوکیلے ناخنوں والی انگلیاں، مجموعی طور پر وہ کسی بہت بڑے پرندے کا بڑا سا پنجہ معلوم ہوتا تھا، اگر صرف اتنا ہی ہوتا تو شاید میں نہ چونکا، لیکن واضح طور پر میں نے یوں محسوس کیا، جیسے ان مخروطی انگلیوں کے نوکیلے ناخنوں والے سروں سے خون کی بوندیں ٹپک رہی ہوں، میں نے بے اختیار میز کی سطح کو دیکھا۔ وہ بالکل صاف اور خشک تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے خون کی بوندیں ٹپک کر ہوا میں تحلیل ہو رہی ہوں، بلاشبہ اس کی دل کش شخصیت کے ساتھ اس غیر انسانی گھناؤنے ہاتھ کی موجودگی بڑی کراہیت آمیز تھی۔

”دیکھا آپ نے؟ کتنا بھیا تک ہاتھ ہے آج سے ایک سال پہلے یہ ایسا نہ تھا؟“

عمر نے دستانہ پہنتے ہوئے کہا۔ یہ میرے لئے دوسرا حیرت انگیز انکشاف تھا۔

”کیا مطلب؟ یعنی پہلے یہ ٹھیک تھا؟“ میں نے پوچھا۔

”جی ہاں..... بالکل اسی ہاتھ کی طرح!“

وہ چوبیس پچیس سال کا ایک گورا چٹا عام سے نقوش کا صحت مند آدمی تھا۔ لیکن اپنے چہرے مہرے کے اعتبار سے نجانے کیوں تھکا تھکا سا نظر آ رہا تھا اور اس کی آنکھوں میں انجانے تفکرات کے سائے تھے۔ اس کے بعد سر راہ کئی مرتبہ اس سے ملاقات ہوئی، مگر میں دور سے ہی سلام دعا کر کے گزر جاتا، کیونکہ وہ اپنا دایاں ہاتھ پتلون کی جیب میں ڈالے ہوتا تھا اور مجھے اس کے اس انداز سے چڑھسوس ہوتی تھی، مجھے یقین تھا کہ اس سے ملنے کے لئے رکا بھی تو وہ مجھ سے ہاتھ نہیں ملائے گا، لیکن ایک بار اس نے مجھے فردوس مارکیٹ میں روک لیا۔

”کیا بات ہے جناب؟ اب تو آپ مجھ سے دور دور ہی رہتے ہیں؟ یوں کترا کر گزر جاتے ہیں، بیسے مجھ سے ناراض ہوں۔“

”نہیں! ایسی تو کوئی بات نہیں؟“

میں نے خوش اخلاقی سے مسکراتے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

”در اصل میں بہت مصروف ہوتا ہوں۔“

”اب ایسی بھی کیا مصروفیات، آئیے ایک کپ چائے ہو جائے۔“

اس نے بائیں ہاتھ سے میرا بازو پکڑ کر تقریباً کھینچا، اور مجھے اس کے ساتھ نعمت کدہ میں آنا ہی پڑا، ہوٹل میں چائے کا کپ اٹھانے کے لئے جب اس نے اپنا دایاں ہاتھ جیب سے نکالا تو میں نے دیکھا کہ اس نے سبز رنگ کا سوتی دستانہ پہن رکھا ہے۔

”گر میوں میں دستانہ؟ عجیب لگی ہے۔“ میں نے سوچا، مگر اس کی وجہ نہیں پوچھی۔

میں نے خود کوئی جواز سوچ لئے تھے۔ ”ممکن ہے اس کا ہاتھ بد صورت ہو، اس پر برص کے دھبے ہوں یا پھر اسے کوئی خاص مرض ہو، جس کی وجہ سے دستانہ پہننا پڑتا ہو۔“ اگر میں نے اسی روز دستانہ پہن دیکھا ہوتا تو اتنی توجہ نہ دیتا، لیکن اس کے بعد بھی وہ مجھے جب بھی ملا، دستانہ ہی پہنے ہوا، اس کے علاوہ میں نے اسے کسی اور سے بھی مصافحہ کرتے نہیں دیکھا، تب مجھے اس کے بارے میں

اچانک دروازہ کھولا..... محلے کا ایک بچہ پیش امام صاحب کا پیغام لایا تھا کہ مجھے امام صاحب بلارہے ہیں۔ یہ سنتے ہی میں چلا ہوا مسجد کے پاس بنے حجرے میں چلا آیا۔ جہاں امام صاحب اکثر اوقات گاؤں کے لوگوں کو اللہ رسول کی باتیں بتاتے کرتے تھے اس جگہ کئی لوگ پہلے سے تشریف فرماں تھے۔

بس ایک چہرہ جو مجھے انجان لگا وہ ایک بزرگ کا تھا۔ ”بیٹھو بیٹا۔“ میں انہیں سلام کر کے بیٹھ گیا..... ”یہ سید کمال شاہ ہیں۔“ امام صاحب نے بزرگ کی طرف اشارہ کر کے مجھے بتایا۔ میں نے انہیں دیکھا وہ مجھے ہی دیکھ رہے تھے۔ میرے دیکھنے پر وہ مسکرائے۔ ”یہ میرے پیر و مرشد ہیں اور مندر کا طلسم توڑنے آئے ہیں۔ اور تمہاری مدد کی ضرورت بھی پڑ سکتی ہے۔“ امام صاحب نے بتایا۔

امام صاحب کی بات پر میں نے انہیں حیرت سے دیکھا۔ ”میری ضرورت؟“

”ہاں۔“ سید صاحب نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”میں رات میں ایک مخصوص عمل کروں گا۔ اس کے لئے مجھے تمہاری ضرورت بھی پڑ سکتی ہے۔ مگر تم گھبراؤ مت ایسا کچھ نہیں ہوگا جس سے تمہیں نقصان پہنچے گا۔“ وہ شاید میری اندرونی کیفیت کا اندازہ لگا چکے تھے بھی مجھے تسلی دینی چاہی۔ میں بھی انہیں مطمئن کرنے کے لئے مسکرایا۔

یہ الگ بات تھی کہ میرے اندر کی ٹوٹ پھوٹ مجھے اس کام سے روک رہی تھی اور میں وہ کیفیت سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا جو اس پر اسرار عورت کے دیکھنے پر محسوس کی تھی۔

☆.....☆.....☆

رات کا وقت تھا آسمان چمکتے ستاروں سے بھرا ہوا تھا۔ میں بے چینی سے ٹہل رہا تھا۔ سارا گاؤں اندھیرے اور سناٹے میں ڈوب چکا تھا میری نظریں مندر پر جمی ہوئی تھیں اور دل میں ہلکا ہلکا اضطراب اور بے چینی کروٹیں بدلی رہی تھی مجھے غیند کی شدت برداشت سے باہر تھی۔ مگر پھر بھی میں اپنی آنکھوں کو سہلکا ہوا کھڑا رہا۔ مجھے انتظار سید صاحب کا تھا جنہوں نے مجھے یہاں بلایا

اور خود ابھی تک نہیں آئے تھے۔ میں بدول سا ہو کر گھر جانے کے لئے مڑا کہ اچانک ایک ہیولہ حرکت کرتا نظر آیا۔ اس کا رخ میری جانب ہی تھا۔ میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اسے دیکھنے لگا۔ وہ قریب آ کر رکا۔ چاند کی مدھم چاندنی میں جو وجود نظر آیا، وہ سید صاحب تھے۔ ”آؤ.....“ وہ یہ کہتے ہوئے مندر کی جانب چلنے لگے اور میں کسی رو بوٹ کی مانند ان کے پیچھے چلنے لگا اور ہم مندر کے دروازے کے سامنے پہنچ گئے۔

مندر کے دروازوں کے دونوں ہٹ کھلے تھے..... سید صاحب اندر داخل ہو گئے اور میں ایک پل روک گیا۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا کوئی انجانی کشش مجھے اندر کی جانب کھینچ رہی ہے۔ میں نے دھیرے سے اندر اپنے قدم رکھ دیئے۔ اندر مندر میں عجیب سی مہک پھیلی ہوئی تھی دیواروں کے سامنے رکھے قہار میں تمام سنی کے دیئے روشن تھے، دیووں کی زرد روشنی میں مندر کا اندرونی منظر بڑا ہی عجیب تھا۔ دیواروں پر لگی تمام تصاویر بہت ہی ہیبت ناک محسوس ہو رہی تھیں مجھے لگا ان سب کی خوف ناک آنکھیں مجھ ہی کو گھور رہی تھیں۔

روشن چراغوں کے درمیان سیاہ لباس میں ملبوس وہی عورت جٹھی تھی اس کے سیاہ بالوں نے آج اس کا چہرہ نہیں ڈھانپ رکھا تھا اس کا چہرہ چراغوں کی روشنی میں واضح تھا..... اس کے چہرے کا ایک حصہ بے حسین تھا اور دوسرا حصہ.....؟ بے حد سیاہ تھا یوں جیسے بری طرح جھٹکس گیا ہو..... زرد روشنی میں اس وقت اس کا چہرہ بہت ہی بھیاں لگ رہا تھا اور حیرت کی بات یہ تھی کہ مجھے اس سے بالکل بھی خوف محسوس نہیں ہو رہا تھا۔

میں دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا اس کے قریب پہنچا اور سامنے بیٹھ گیا..... وہ مسکرائی وہ کچھ کہہ رہی تھی، زبان میری سمجھ سے باہر تھی، ایسا لگتا تھا کہ جیسے وہ کوئی منتر پڑھ رہی ہو۔ عجیب سحر سا تھا اس کی آواز میں، میرے ذہن پر غنودگی سی طاری ہو رہی تھی میں مدہوش سا ہو رہا تھا، پھر میں نے دیکھا وہ ایک دم اٹھ کھڑی ہوئی اور مجھ پر نیند طاری ہو گئی اور نیند کی حالت میں شاید میں

طرف دیکھا۔ ”میں بھی کچھ دیر پہلے آپ ہی لوگوں کے متعلق سوچ رہا تھا۔“

اس نے برش پلیٹ میں رکھتے ہوئے کہا۔
”ہمارے متعلق کیوں سوچ رہے تھے؟“ گوپال صاحب! میں نے پوچھا۔

”میں سوچ رہا تھا کہ آپ نے میری طرف آنے کا وعدہ کیا تھا، لیکن آپ آئے نہیں، لیکن بہر حال آپ آج ہی آگئے۔“

”بس گوپال صاحب، وقت ہی نہیں ملا، اس وقت ہمارا نفل تو نہیں ہوئے؟“

”نہیں..... بالکل نہیں، بلکہ مجھے بڑی خوشی ہوئی ہے آپ پہلے چائے پینا پسند فرمائیں گے، یا تصویریں دیکھنا؟“

”چائے وغیرہ کا تکلف نہ کریں، ہم تو صرف آپ کی گراں قدر تصاویر دیکھنے حاضر ہوئے ہیں۔“

”خیر پہلے آپ تصویریں ہی دیکھیں۔ آج کل آرٹ کی کوئی قدر نہیں جناب! آج کے دور میں آرٹسٹ بھوکے مرتے ہیں!“

میں سمجھ گیا کہ اس بے چارے کی تصویریں بکتی بکاتی نہیں ہوں گی، ویسے بھی وہ اپنے رکھ رکھاؤ سے ہی کوئی ڈھنگ کا مصور نظر نہیں آتا تھا۔ وہ ایک موم بتی ہاتھ میں لے کر ہمیں وہ تصویریں دکھانے لگا۔ جو کوٹھری کی دیواروں پر ٹیڑھی ترچھی لٹکی ہوئی تھیں۔ ایک ایک کر کے ہم نے ساری تصویریں دیکھیں، اور تب مجھے شفقت کے وہ الفاظ یاد آئے۔

”اس کی تصویریں دیکھ کر میں ایک عجیب سی بات محسوس کرتا ہوں!“

وہ عجیب سی بات یہ تھی، کہ اس کی تصویروں کو دیکھ کر ایک انسانی سی دہشت محسوس ہوتی تھی، حالانکہ ان میں سے کسی میں بھی خوفناک منظر کی عکاسی نہ کی گئی تھی۔ لیکن انہیں دیکھ کر جسم میں ایک ٹھنڈی سی لہر دوڑتی ہوئی محسوس ہوتی تھی، میں نے اس کی وجہ پر غور کیا، تو مجھے احساس ہوا کہ تقریباً سب ہی تصویروں میں کسی نہ کسی خون کا تاثر ضرور موجود تھا۔ مثلاً شیر نے کسی ہرن کا شکار کیا اور پھر اس کے خون میں تر

اپنے چہرے کو اٹھائے وہ دوسری سمت دیکھ رہا ہے۔
پھر ایک نیم مردہ عورت پینٹ کی، مگر اس کے جسم سے خون کی دھاریاں بہہ رہی ہیں۔ اسی طرح دوسری تصویروں میں بھی کہیں نہ کہیں خون کی عکاسی ضرور کی گئی تھی، اور یہ خون اس قدر حقیقی اور تازہ لگتا تھا جیسے ابھی ابھی خون کے چھینٹے تصویر پر گر گئے ہوں۔

میں نے محسوس کیا کہ خون کے اسی تاثر کو محسوس کر کے جسم پر لرزہ طاری ہو جاتا تھا، اس کے علاوہ بعض تصویریں ایسے کریہہ صورت بھیا تک جانوروں کی تھیں جنہیں میں نے حقیقتاً تو کیا، تصویروں کی حد تک بھی نہیں دیکھا تھا، یہ سب بڑے ہی ذراؤ نے معلوم ہوتے تھے۔ اور ان کے نزدیک کھڑے ہو کر ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے وہ تصویر کے فریم سے نکل کر ابھی ہم پر جھپٹ پڑیں گے، اور اپنے خوفناک دانتوں اور ناخنوں سے ہمارے جسم کا ریشہ ریشہ الگ کر دیں گے!

لیکن ملگجی سی روشنی میں ایک پراسرار سائے کی طرح ایسا وہ گوپال اپنی دھن میں مگن مختلف تصویروں کے بارے میں بتا رہا تھا۔ ”فلاں تصویر کا خیال میں نے فلاں جگہ سے حاصل کیا، فلاں تصویر میں نے فلاں واقعہ سے متاثر ہو کر بنائی۔“ وغیرہ وغیرہ!

لیکن میں اس کی گفتگو پر بہت کم دھیان دے رہا تھا۔ میرا ذہن تصویروں میں الجھا ہوا تھا۔ یقیناً ان میں چند غیر معمولی خصوصیات تھیں۔ ہم اس کی اکلوتی چار پائی پر بیٹھ گئے۔

اور وہ ہمارے منع کرنے کے باوجود ہمارے لئے اسٹوپر چائے بنانے لگا! چائے بنا کر اس نے ٹرے رکھنے کے لئے ایک اسٹول چار پائی کے قریب کھینچ لیا، اور ٹرے اس پر رکھ کر خود سامنے دوسرے اسٹول پر بیٹھ کر ہمارے ساتھ شریک ہو گیا۔

چائے کے دوران ہم دونوں اس کے ساتھ ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے، میں نے اس کی تصویروں کی بھی بڑی تعریف کی۔ جس پر اس نے بخوشی میری پسند کی کوئی بھی تصویر مجھے نذر کرنے کی پیشکش کی، لیکن میں نے



رضوان علی سومرو - کراچی

موت کا سودا

لوگ ماں کی محبت کی مثالیں دیتے ہیں لیکن باپ کو بھول جاتے ہیں باپ کی محبت بھی اولاد کے لئے لائق ہے اور یہی حقیقت پوری کہانی اپنے دلگداز اور دل فریب لفظوں سے روشناس ہے۔

چاہت و خلوص کی ایک انتہائی کہانی جو پڑھنے والوں کو سوچ کے سمندر میں غوطہ زن کر دے گی

کو فروخت کرنے کا کوئی نیا حربہ نہیں ہے۔
میں کوئی دہی یا جامل نہیں ہوں بلکہ بے حد پڑھا لکھا اور سنجیدہ طبع انسان ہوں پیشے کے اعتبار سے میں ایک کہانی کار ہوں ہمیشہ سنجیدہ اور معاشرے کے رستے ہوئے پہلوؤں پر قلم اٹھانا میری عادت رہی ہے۔ سال کے گیارہ ماہ میرا اور قلم کا رشتہ جڑا رہتا ہے مگر سال کا بارہواں مہینہ صرف اور صرف میری فیملی کا ہوتا ہے۔ میرا نام جو اودید رہے میری عمر 45 سال کے آس پاس ہے اور میری شادی کو چودہ سال ہو چکے ہیں۔ میری فیملی کچھ زیادہ بڑی نہیں ایک بیٹا اور ایک

”طاقت! توازن!“ کا قانون اپنے دور کا عظیم ترین نظریہ تھا، آج بھی اس کی اہمیت اور افادیت میں فرق نہیں آیا کچھ لوگوں کے نزدیک طاقت کا مرکز اقتدار، کچھ کے نزدیک حیثیت اور کچھ کے نزدیک پیسہ ہے۔
لیکن مٹی میں مل جانے والا انسان یہ بھول جاتا ہے کہ طاقت کا اصل سرچشمہ صرف اور صرف اللہ کی ذات ہے جو کہ پوشیدہ بھی اور ظاہر بھی بڑائی والا صرف اللہ ہے۔
میری داستان حیات جان کر آپ مجھے ایک نمبر کا بھونٹا اور مکار کہیں گے جبکہ بیشتر پڑھنے والے میری کہانی

صدیوں پر محیط سوچ کے افق پر جھلمل کرتی، قوس قزح کے دھنک رنگ بکھیرتی، حقیقت سے روشناس کراتی، دل و دماغ میں ہلچل مچاتی ناقابل یقین ناقابل غراموش امت اور شاہکار کہانی

سوچ کے نئے در سے کھولتی اپنی نوعیت کی بے مثال، لا جواب اور دلفریب کہانی

بوڑھا غور سے میرا چہرہ دیکھ رہا تھا۔ چند لمحات اسی طرح گزر گئے۔ اس کے بعد نیلس نے کہا۔

”اور یہ کتنے افسوس کی بات ہے کہ ایک ایسا شخص جو ہمارا دشمن ہے ہماری انجمنوں کا شکار ہو گیا ہے۔ بہر حال اب جو کچھ بھی ہے وہ ایک الگ بات ہے میرا خیال ہے تم از کم اسے ذہنی طور پر آزاد چھوڑ دیا جائے۔ میرے دوست رات ہو گئی ہے۔ تم آرام کرو۔ ہم لوگ تو فضول لوگ ہیں اپنی انجمنوں میں گرفتار ہیں۔“

میں نے اسی میں عافیت سمجھی کہ اپنی اس آرام گاہ میں واپس آ جاؤں اور اپنے بارے میں سوچوں۔ ویسے بھی میں یہ سوچ رہا تھا کہ یہ ایک عجیب الجھا ہوا معاملہ ہے۔ جس کا سر پاؤں میری کچھ میں نہیں آ رہا۔ لاکھ میں تاریخ کے کسی اجنبی دور میں آ گیا ہوں لیکن بھلا مجھے ان ساری باتوں کے بارے میں کیا معلوم۔

اس وقت رات غالباً اپنے تیسرے پہر میں داخل ہو رہی تھی۔ جب مجھے اپنی آرام گاہ کے باہر قدموں کی چاپ سنائی دی اور پھر کسی نے دروازہ کھول کر اندر جھانکا۔ میں جاگ رہا تھا۔ آنے والا بوڑھا شخص

”ہساں! تو نے مجھے ذلیل کیا ہے۔“ نیلس نے عجیب سے لہجے میں کہا اور تو نیسا اپنی جگہ سے اٹھ کر نیلس کے سینے سے جا لگی۔ پھر اس نے کہا۔

”اب ساری بیٹیوں کو تحفظ مل جائے گا۔ اب شاید اس سر زمین کی تقدیر بدل جائے گی۔“ وہ خوشی سے کہہ رہی تھی۔

”تو جو کہے گی میں وہی کروں گا۔ لیکن میں تنہا اس کھیل کو ختم نہیں کر سکتا۔ میں کمزور ہوں۔“

”میرے بے شمار بھائی اس کے خلاف کھڑے ہو گئے ہیں۔ ان کا سہارا حاصل کرو۔ اب ان کے ساتھ شامل ہونے کے لئے انہیں تلاش کرو جن کے خلاف تم کام کرتے رہے ہو۔“

اچانک ہی نیلس نے میری طرف دیکھا اور بولا۔

”اور تم... تمہارے ذہن میں کوئی ایسا خیال ہے کہ ہمیں کیا کرنا چاہئے۔“

ایک بار پھر میرے سر میں ٹھکی ہوئے گلے۔ میں نے دل میں کہا کہ پیارے بھائی مجھے تو یوں لگ رہا ہے

جیسے یہ بدن بھی میرا اپنا نہیں ہے۔ مجھے اچانک ہی

ذیشان عالی سے پوسٹیس بنا پڑا ہے جبکہ میں یا میرے

خاندان میں کبھی آج تک پوسٹیس نہیں پیدا ہوا۔

ہوگا۔
فارم ہاؤس میں آئے مجھے ایک ہفتہ گزر چکا تھا
اس ایک ہفتے کے دوران میری طبیعت کافی بہتر ہو گئی تھی
اور فارم ہاؤس میں میرا بیٹا زوہیب کی تفریحات میں اضافہ
ہوئی رخصانہ کا زیادہ وقت گاؤں کی

ہس وقت میں نے آیت الکرسی کی تلاوت شروع
کری۔ پھر میں کب کھر پہنچا مجھے کچھ یاد نہیں تھا۔
گھر پہنچے ہی مجھ پر انتہائی شدید قسم کا بخار پڑ گیا
رنگین میں گھومتے

تھا یعنی نولس کا باپ، جس کا نام ابھی تک میرے علم میں نہیں آیا تھا۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا تو اس نے معذرت آمیز لہجے میں کہا۔

”میں صرف یہ دیکھ رہا تھا کہ تم جاگ رہے ہو یا سو رہے ہو۔ میرا ذہن شدید الجھنوں کا شکار ہے۔ اگر تم مجھے اجازت دو تو میں اندر آ جاؤں۔“

”ہاں..... ہاں محترم بزرگ اندر آئیے۔ بھلا اس میں اجازت کی کیا بات ہے۔“

بوڑھا میرے پاس آ کر بیٹھ گیا۔ وہ میری شکل دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے کہا۔

”جو الفاظ میں ادا کروں گا اگر ان میں تمہیں کچھ ناگوار گزریں تو ایک عمر رسیدہ شخص سمجھ کر معاف کر دینا۔ اصل میں مجھے اچانک ہی یہ احساس ہوا کہ یہ ساری باتیں سن کر تمہاری آنکھوں میں اجنبیت ابھرتی ہے۔ چہرے کے نقوش کبھی نہیں بولتے۔ اگر انسان ان پر قدرت رکھتا ہو لیکن آنکھیں ہر الجھن کا انہار کر دیتی ہیں۔ اگر ان میں دیکھنے کی صلاحیت تمہارے اندر ہے۔ میں نے تمہاری آنکھوں میں ہر بات سے اجنبیت محسوس کی ہے۔ کیا تم مجھے اس کے بارے میں بتاؤ گے کہ ایسا کیوں ہے؟“

”میں آپ کے اس شہر میں اجنبی ہوں، جیسا کہ آپ کے بیٹے نے بتایا کہ میں صرف جنگل میں اسے ملا تھا اور اس کی مدد کر کے اس سے شناسائی حاصل کی۔“

”خیر..... تم جو کوئی بھی ہو، میں تمہیں بتانا چاہتا ہوں کہ ہم جس دور میں ہیں یہ دور یونانی تہذیب کا زرین عہد ہے۔ جس میں اقتصاد، عمرانی اور سیاسی ادارے اتھا کے کمال پر پہنچ گئے ہیں اور ہماری ثقافت نے بھی بعض پہلوؤں پر ترقی کر لی ہے۔ میں تھوڑی سی تمہیں معلومات فراہم کروں۔

ایشیاء کو چمک کے مغربی ساحل کے ساتھ ساتھ جزائر ایجہ کی تہذیب کی بیرونی چوکیوں سے کچھ ایسے معاملات علم میں آئے ہیں جو کچھ مشکلات کا باعث بن گئے ہیں..... مینون اور بہترین یونانی بہادر لیکٹیز کے

درمیان جھگڑا ہو گیا ہے۔ اور لیکٹیز روٹھ کر دور چلا گیا ہے۔ ابھی کچھ عرصے پہلے لڑائی میں یونانیوں کی حالت بہت خراب ہو گئی تھی۔ ہمارا جھگڑا ٹرائے سے ہے۔ ٹرائے کے دو جوان ہیکٹر اور پیٹر وکلوں قتل کر دیئے گئے ہیں۔ پیٹر وکلوں جو لیکٹیز کا انتہائی عزیز دوست تھا۔ غمزہ لیکٹیز نے انتقام میں ہیکٹر کو قتل کیا ہے اور وہ عجیب و غریب واقعات بڑی عجیب و غریب حیثیت اختیار کر گئے ہیں۔ جو ایک اور یونانی جنگ جو اوڈیسوس کو پیش آئی۔ وہ ٹرائے کی شکست کے بعد ایک انوکھی حیثیت کی حامل ہے۔

بہر حال میں یہ کہہ رہا تھا کہ جب لیکٹیز نے ہیکٹر کو قتل کرنے کے لئے قدم اٹھایا تو اسے ہتھیار پہنچائے گئے۔ اور ہتھیار پہنچانے والا اسلحہ سازی کا دیوتا تھا۔ جب لیکٹیز ہیکٹر کی لاش کو ٹرائے کی فسیل کے ارد گرد کھینچتے پھرتا تھا تو دیوتاؤں نے مداخلت کی اور کہہ سن کر اسے راضی کیا کہ ہیکٹر کی لاش مناسب تدفین کے لئے اہل ٹرائے کے حوالے کر دی جائے۔ دیوتاؤں کے ساتھ غیر معمولی گہرے روابط پر یونانی کہانیاں بڑی عجیب و غریب حیثیت رکھتی ہیں۔ یہ تو شاید تمہیں علم ہو ایک یونانی ہونے کی حیثیت سے کہ یونان میں سورج کی حرکات کو اپولو سے منسوب کیا جاتا ہے اور سمندر میں جو طوفان آتے ہیں ان کا انتساب پوسیدن سے ہوتا ہے۔ یونانیوں کا عقیدہ یہ ہے کہ انسانی عقل حکمت کی دیوی اتھنا بخشی ہے۔ لڑائی میں فتح کے دیوتا ایریز کی برکت سے حاصل ہوتی ہے اور محبت میں کامرانی کا ذریعہ ایفرودٹس ہے۔ یہ تمام دیوتا کوہ اولمپس پر رہتے ہیں اور ایک باقاعدہ خاندان کی حیثیت رکھتے ہیں۔

میں تمہیں ہیرا کے بارے میں بتاؤں کہ عجیب حیران کن کردار تھا۔ ہیرا کا کہنا ہے کہ جناب زیوس کیا آپ ایریز کے کارناموں کے بارے میں کچھ نہیں کہیں گے، میرے خیال میں تو اسے سزا ملنی چاہئے۔ بادلوں کو سیٹھنے والے زیوس نے جواب دیا۔

تھے اس لئے بستر پر جاتے ہی رخسانہ تو سو گئی تھی لیکن میری
نیند کافی ہلکی تھی۔

ایک عجیب قسم کی آواز سے میری آنکھ کھل گئی وہ
آواز کسی کے ہولے ہولے کراہنے کی تھی..... دفعتاً ایک درد
بھری چیخ میرے کانوں سے ٹکرائی میں نے الماری سے اپنا
پستول نکالا اور کمرے سے باہر نکل آیا۔

راہداری میں چاروں طرف اندھیرا تھا۔ مجھے ایسا لگا
کہ جیسے آواز راہداری کے آخری کونے سے آئی ہو..... اس
آخری کونے کی جانب زوہیب کا کمرہ تھا۔ مجھے ایسا لگا کہ
آواز زوہیب کے کمرے سے آئی ہو۔ جیسے ہی میں کمرے
میں اندر داخل ہوا تو میری آنکھیں حیرت اور خوف سے پھٹی
کی پھٹی رہ گئیں۔

میرا بچہ زوہیب چنگ سے تین چار فٹ اوپر فضا
میں معلق گھوم رہا تھا نیلی روشنی اس کے پورے جسم پر محیط
بالکل کسی چادر کی طرح تنی ہوئی تھی وہ اس نیلی روشنی کے
حصار میں جکڑا ہوا تھا پاؤں ہمارا ہاتھ نیچے وہی دونوں جڑواں
بھائی کھڑے اسے دیکھ رہے تھے۔

”زوہیب..... میرے بچے“ میں نے چلا کر آواز
لگائی۔

زوہیب کے بجائے ان دونوں نے مجھے پلٹ
کر دیکھا، دوسرے لمحے ان کی آنکھوں میں حقارت مپٹنے
لگی، دفعتاً ان کے ہاتھ سیدھے ہوئے اور مکا بن کر میری
طرف آئے۔ ان کے کئے کا دار بڑا ہی زوردار تھا میں جیسے
اڑتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا اور پوری قوت سے راہداری
کے پہلے سرے سے جا کر لیا۔ میں نے انھنے کی کوشش کی
لیکن میں اٹھ نہ سکا مجھے اپنے سر میں شدید درد محسوس ہو رہا تھا
سر کے پچھلے حصے سے چیچا ہٹ محسوس ہو رہی تھی، شاید میرا
سر پھٹ گیا تھا اور خون نکل رہا تھا۔

اچانک میری نظر فرش پر پڑی، میں نے دیکھا کہ
ایک عجیب لمبی سی چیز فرش پر رینگتی ہوئی میری جانب بڑھ
رہی ہے میرے حلق سے چیخ نکل گئی ساتھ ہی میری آنکھ
کھل گئی۔

پہلے تو خود میری سمجھ میں نہ آیا جب حواس بحال

ان کے اس طرح کے لب و لہجے سے میں چونک
ا، مجھے اپنی توہین کا احساس کچھ کے لگانے لگا۔

”دفع ہو جاؤ یہاں سے.....“ میں غصے سے
ڑا۔

”نا دل تو تم کو لکھنا ہوگا..... ورنہ تم پچھتاؤ گے۔“ یہ
ہتے ہوئے وہ کمرے سے باہر نکل گئے۔ ان کے لب
لہجے سے ان کے انداز سے ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے وہ کسی
بے ٹرانس میں آگئے ہوں۔ ورنہ وہ پلاٹ سناتے وقت
فل ٹھیک تھے۔ آخر وہ کس کے ٹرانس میں آگئے تھے؟ وہ
دن تھا جو دور ہوتے ہوئے بھی ان کے قریب تھا؟ وہ کون
ما جو ناول تو لکھوانا چاہتا تھا مگر شائع نہیں کرتا تھا۔ ان کے
سبد لے روپے نے مجھے کافی پریشان کر کے رکھ دیا تھا۔

☆.....☆.....☆

میں کسی زمانے میں چیونگم بہت شوق سے استعمال
کرتا تھا خاص طور پر ان دنوں جب میں نے سگریٹ
پھوڑنے کی کوشش کی تھی آج جب میں نے زوہیب کے
ہاتھ میں چیونگم دیکھی تو میں چونک پڑا۔

”کہاں سے آئی بیٹا؟“ میں نے زوہیب سے
ستفہار کیا۔

”ابو..... دونوں انکل نے دی ہے۔“ زوہیب
معصومانہ لہجے میں بولا۔

”میں نے تم سے کتنی بار کہا ہے کہ کسی اجنبی سے کوئی
چیز نہیں لیتے۔“

”سوری ابو۔ آئندہ خیال رکھوں گا۔“

”لو کے..... بیٹا.....“ میں نے کہا۔

کاش میں نے اسی وقت زوہیب سے وہ چیونگم
پھین لی ہوتی تو شاید میری زندگی ہمیشہ کے لئے پچھتاوا نہ
مندی۔ کاش! میں اس طرح کے دل دہلانے والے واقعات کا
حصہ نہ بنتا۔

☆.....☆.....☆

رات کا اندھیرا بڑھ چکا تھا۔ ہر طرف ہر سوناٹا
طاری تھا۔ رخسانہ زوہیب اور میں نے پورا دن مختلف قسم کی
تفریحات میں گزارا تھا۔ اسی لئے ہم لوگ کافی تھک چکے

بوڑھا مجھے پورے یونان سے روشناس کر رہا تھا۔ اس کے خیال میں یورپیسیں تھیں، لیکن اس کے فرشتے بھی نہیں جانتے تھے کہ میں کس دور کا کون سا انسان ہوں، بوڑھا کہہ رہا تھا۔

”بقراط کے دبستان نے یونان کے پرانے تصورات کو ٹھکرا دیا کہ بیماریاں صرف دعاؤں سے دور ہوتی ہیں انہوں نے علاج کے نئے طریقے دریافت کئے تھے، یہ بات کافی آگے بڑھی اور بڑے بڑے فلسفیوں نے اس میں مداخلت کی، سقراط افلاطون اور ارسطو نے غور و فکر کی کائنات انسان کو بنالیا۔ سقراط تقریباً چار سو اہتر قبل مسیح کا سنگتراش تھا، وہ پتھر کی عمارتیں بناتا تھا، اس نے پوری زندگی ایتھنز کے گھروں میں باتیں کرنے اور سننے میں گزاری دی، لیکن ان لوگوں کو مخالفت کا سامنا کرنا پڑا جو نئے نئے خیالات کے حامی تھے اور خوش فہمی اور خوش عقیدگی کو پسندیدہ نہیں سمجھتے تھے سقراط کے ساتھ بھی یہی صورت پیش آئی۔ ارسطو فوج نے اس پر شدید حملہ کیا اور اس پر الزام لگایا کہ وہ دیوتاؤں کی بے حرمتی کرتا ہے اور ایتھنز کے نوجوانوں کا اخلاق بگاڑ رہا ہے، چنانچہ اس پر مقدمہ چلا اس نے کہا کہ میں مذہبی مراسم کا ٹھیک ٹھیک پابند ہوں اور اپنی قوم کو باعزت بنادینے کا خواہش مند ہوں، اگر تم مجھے موت کی سزا دو گے تو میرا بدل تمہیں آسانی سے نہیں ملے گا، میری حیثیت کو سمجھنے کی کوشش کرو، تم لوگوں نے مجھے دولت سے وابستہ کر دیا ہے اور تمہارا کہنا یہ ہے کہ میں انسانوں کو بہکا رہا ہوں، لیکن میں تمہیں بتائے دیتا ہوں کہ مجھ جیسا انسان تمہیں دوبارہ کبھی نہیں ملے گا، لیکن اکثریت کے حکم سے سقراط کو موت کی سزا دے دی گئی اور زہر کا پیالہ لی لینے کے بعد وہ صبر سے موت کا انتظار کرنے لگا، اس نے کہا کہ تم لوگ کیوں رو رہے ہو، یہ تو عورتوں والی باتیں ہیں صبر سے کام لو، اس کا جسم ٹھنڈا ہو رہا تھا پھر اس نے اپنا چہرہ ڈھک لیا اور پھر کیڑا ہٹا کر بولا۔

”کرلیک اسکلیپس کا ایک مرغ مجھے دیتا ہے، کیا تم یاد سے میرا یہ قرض ادا کر دو گے۔“ کرڈو نے

پوچھا اور بھی کوئی کام ہے، اس سوال کا کوئی جواب نہ ملا اور ایک دو لمحے کے بعد حرکت سی ہوئی، چہرے سے کیڑا ہٹایا گیا تو سقراط کی آنکھیں پتھرائی ہوئی تھیں، کرڈو نے آنکھیں بھی بند کر دیں اور منہ بھی بند کر دیا، یہ سقراط کا انجام تھا اور پھر سقراط کے بعد افلاطون نے چار سو ستائیس قبل مسیح میں سقراط کی زندگی کے واقعات اور اس کی تعلیمات مرتب کیں۔ افلاطون ایک امیر گھرانے میں پیدا ہوا تھا، اس نے ایتھنز میں ایک درس گاہ قائم کی جسے اکاڈمی کہتے تھے اور اس نے اپنی زندگی تالیف و تصنیف میں گزاری۔“

بوڑھا خاموش ہو کر کچھ آوازیں سننے کی کوشش کرنے لگا اور میں نے بھی وہ آوازیں سن لیں، تبھی بوڑھے کی آواز ابھری۔

”کوئی آ رہا ہے اور کیا ہی دلچسپ بات ہے کہ میں اپنے بچوں سے خوفزدہ رہتا ہوں، ان کا خیال ہے کہ میں بہت زیادہ باتوئی ہوں اور یونان پرست ہوں بروقت یونان کی تاریخ میں کھویا رہتا ہوں۔“ یہ کہہ کر بوڑھا جلدی سے باہر نکل گیا، باہر کچھ باتیں کرنے کی آوازیں آرہی تھیں اور میں نے ان آوازوں کو محسوس کر لیا، ان میں ایک نسوانی آواز تھی جسے میں نے پہچان لیا، وہ تو نیسا کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا، میں دروازے سے باہر آیا تو مجھے تو نیسا نظر آئی جو مجھے دیکھ کر دلکش انداز میں مسکرا دی اور بولی۔

”میں جانتی ہوں بابا صاحب تمہیں زبردستی یونان کی پرانی باتیں سنا رہے ہوں گے۔ لیکن اب ان کی جگہ میں لینا چاہتی ہوں، بس ایک آس پر یہاں آئی تھی اور یہ سوچ رہی تھی کہ تم سے بات کروں گی، جیسا کہ میرے بھائی نیلس نے بتایا کہ تمہارے بازوؤں میں فولاد بھرا ہوا ہے اور تم ایک وحشی درندے کو با آسانی ہلاک کر سکتے ہو تو مجھے تو ایسے ہی کسی شخص کی ضرورت ہے جسے میں اپنا ہمنوا بنا سکوں کیا میرے ساتھ کچھ وقت صرف کر پاؤ گے؟“

”ہاں کیوں نہیں۔“ میں نے تو نیسا کے حسین

”یہی تو بد نصیبی ہے ہماری اور اس دور کی اس کا نام نوسکی ہے، نوسکی ہوا یہ تھا کہ نوسکی کی ماں ایک بار اپنے باپ کے ساتھ جنگل میں نکلی تھی کہ وہاں بن مانسوں کے ایک گروہ نے ان کا محاصرہ کر لیا، بندر نما انسانوں نے بڑی تباہی مچائی اور ایگائوس کے گروہ کے بے شمار انسان ختم کر دیئے۔

ایگائوس جان بچا کر بھاگا تو اس کی بیٹی وہیں پر رہ گئی اور بن مانسوں نے اسے پکڑ لیا، کوئی ایک سال کے بعد جو ہم ایگائوس کی بیٹی کو تلاش کرنے کے لئے نکلی تھی اسے اکار شہ جو ایگائوس کی بیٹی کا نام ہے دستیاب ہو گئی اور وہ لوگ اسے کل لے آئے، ایگائوس اپنی بیٹی کو دیکھ کر بہت زیادہ خوش ہوا، لیکن بد نصیبی یہ تھی کہ اس کی بیٹی حاملہ تھی اور پھر اس نے بن مانس کی اولاد کو جنم دیا جس کا نام نوسکی رکھا گیا، نوسکی بندر کا بیٹا تھا، مکمل بندر لیکن عقل و دانش والا انسان اور پھر اس کے نام کے ساتھ جو تباہی پھیلی وہ دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی، میں تمہیں اس سے زیادہ اور کچھ نہیں بتا سکتی پولیسیس ایگائوس کا نواسہ کن کیفیتوں کا حامل تھا، وہ بہت ہی گندی فطرت کا مالک ہے اور کارگرس کے بے شمار گھرانوں میں اس کی غلاظتیں پھیل چکی ہیں اور اب، اب وہ یہاں حکومت کر رہا ہے اور اس کی حکومت میں ایک شخص بھی محفوظ نہیں ہے میرے لئے اس سے زیادہ غم کی بات اور کوئی نہیں تھی کہ نوسکی میرا بھائی اس کا ملازم خاص ہے۔“

میں گہری گہری سانسیں لے رہا تھا کہ کاش اس بار بھی میں اپنی دنیا میں بخیر و خوبی واپس جاسکوں اور میری کتاب زندہ صدیاں یونان کے اس پس منظر میں ایک انوکھی کہانی سے دنیا کو روشناس کرے کاش، آہ کاش، وہ مجھ سے باتیں کرتی رہی اور میں نے دل میں سوچا کہ مجھے پوری سنجیدگی کے ساتھ اس مسئلے پر کام کرنا چاہئے اور اس کے لئے میرے پاس نوسکی ایک بہترین مہرہ تھا۔ چنانچہ دوسرے دن جب نوسکی مجھے ملا تو میں نے اسی موضوع پر بات کی میں نے اس سے کہا کہ میری

جسم کو دیکھتے ہوئے کہا لیکن دل ہی دل میں مجھے ہلسی آرہی تھی کہ میڈم تو نیسا اگر میں آپ کو یہ بتا دوں کہ میں آج سے ہزاروں کیا لاکھوں سال بعد کے دور کا انسان ہوں اور میرا نام پولیسیس نہیں بلکہ ایک نرم و نازک نام ڈیشان عالی ہے اور میں صرف ایک گلشن رائٹر ہوں، تو آپ کا سر چکرا کر رہ جائے گا اور پھر آپ مجھ سے کوئی بات نہیں کر پائیں گی تاہم ظاہر ہے مجھے کوروتی نے جس ماحول میں پہنچا دیا تھا یا میں اس کی کتاب کے جن الفاظ سے نیچے گر پڑا تھا۔ مجھے اسی دور کی باتیں کرنی تھیں جب تک کہ واپسی کا کوئی راستہ نظر آ جائے یا پھر کوروتی مجھے کسی اور شکل میں یہاں نظر نہ آ جائے، یہ سب کچھ مجھے کرنا ہی تھا۔

تو نیسا مجھے ایک جگہ لے کر بیٹھ گئی، پھر اس نے مسکراتی ہوئی نگاہوں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔
”تمہیں دیکھ کر کچھ عجیب عجیب احساس ہوتا ہے، یوں لگتا ہے جیسے تم یونان سے تعلق نہ رکھتے ہو بلکہ کوئی اجنبی انسان ہو۔“

”میں نے کہا نا کہ میں بہت دور سے آیا ہوں، ایک سیاح ہوں جو دنیا کے سفر پر نکلا ہے اور مختلف چیزوں کو دیکھتا ہوا یہاں تک پہنچا ہے۔“
”یہ تو بہت اچھی بات ہے، بہت ہی اچھی بات ہے، اگر تم اس سرزمین کو ایک عجیب و غریب شخصیت سے نجات دلا دو تو میں سمجھتی ہوں کہ یہ تمہارا عظیم کارنامہ ہوگا، تمہیں معلوم نہیں کہ وہ وحشی درندہ انسانوں کے ساتھ کیا سلوک کرتا ہے اور دکھ کی بات تو یہ ہے کہ انسان اسے صرف اس لئے قبول کئے ہوئے ہیں کہ اس نے ایک ایسی عورت کے پیٹ سے جنم لیا ہے جو شہنشاہ کی بیٹی تھی، آؤ میرے ساتھ آؤ۔“

وہ میرا بازو پکڑے پکڑے اپنی خواب گاہ میں آگئی، اس نے بیٹھتے ہوئے کہا۔ ”ہاں میں تمہیں اس کے بارے میں بتا رہی تھی۔“

”تم نے مجھے عجیب و غریب بات بتائی ہے کہ ایک جانور نما شے انسان کے جسم سے پیدا ہوئی ہے۔“

کہا اور پولیس میری شکل دیکھنے لگا پھر بولا۔

”ہاں کہو۔“

”کیا تم مجھے بھی اورکاشہ کے یا نو سکی کے محل میں کوئی جگہ دلا سکتے ہو؟“

”کیا مطلب؟“

”میں وہاں نو سکی کا خادم خاص بننے کا خواہش مند ہوں۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا اور پولیس حیران انداز میں مجھے دیکھنے لگا پھر بولا۔

”میں تمہیں ایک بات کہوں، تم درحقیقت میری سمجھ میں نہیں آئے، آج تک میں تمہیں سمجھنے میں ناکام رہا ہوں۔“

”میری ان باتوں کو چھوڑو، تم مجھے سمجھ کر کیا کرو گے، اگر تمہیں مجھ پر بھروسہ ہے تو میں تمہیں یقین دلانا ہوں کہ میری ذات سے تمہیں کوئی الجھن نہیں ہوگی۔“

”مجھے یقین ہے میرے دوست، میں تمہاری ہر خواہش کی تکمیل کروں گا۔“

”تو پھر تم میرے لئے محل میں جگہ نکالو، کیا یہ ایک مشکل عمل ہوگا؟“

”نہیں، میں اتنے ہی اختیارات رکھتا ہوں، میں تمہیں نو سکی کے مخصوص محافطوں میں جگہ دلاؤں گا ہوں اور اس پر کسی کو اعتراض نہیں ہوگا کیونکہ تقرریوں کا محکمہ میرے ہی سپرد ہے۔“

”تب ٹھیک ہے یہ تو بہت اچھی بات ہے۔“

”تمہیں میرے ساتھ چلنا ہوگا۔“ اس نے کہا اور میں نے گردن ہلا دی، لیکن اپنی خواب گاہ میں پہنچ کر میرے لئے بہت ہی دلچسپ سوالات ذہن میں آکھڑے ہوئے تھے، میں یونان قدیم میں ہوں اور بوڑھے بزرگ نے مجھے یونان کی تاریخ کے بارے میں بہت کچھ بتایا تھا، میں قدیم یونان سے واقفیت حاصل کر رہا تھا، دور کا تعین بھی ہوتا جا رہا تھا، بوڑھے شخص کی عمر کے بارے میں مجھے صحیح طور پر اندازہ نہیں ہو رہا تھا لیکن یہ ضرور اندازہ تھا کہ وہ بہت ہی اعلیٰ صلاحیتوں کا مالک ہے اور قدیم یونان سے لے کر اب تک کے

یونان میں اس نے خاصا وقت گزارا ہے اور اس کے بارے میں معلومات حاصل کی ہے، مزے کی بات یہ تھی کہ میں بے شک اتفاقیہ طور پر پراسرار کتاب کے ان الفاظ پر گر پڑا تھا جن پر یقیناً یونان لکھا ہوگا۔

کسی بھی زبان میں مجھے اس کے بارے میں کوئی اندازہ نہیں تھا کہ کتاب پر جو الفاظ کندہ ہیں وہ کون سی زبان کے ہیں، البتہ مزے کی بات یہ تھی کہ میں جس دور میں بھی ہوتا اور جس علاقے میں بھی ہوتا وہاں کی زبان بخوبی بول اور سمجھ سکتا تھا اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ میری شخصیت ہی بگڑ چکی تھی، پولیس میں کون تھا، یونان کی تاریخ میں پولیس کا کیا مقام تھا اس کے بارے میں کچھ نہیں معلوم تھا مجھے لیکن نو سکی کے بارے میں جو کہانی میرے علم میں آئی تھی وہ ناقابل یقین سی تھی، البتہ اس کی دلکشی سے انکار نہیں کیا جاسکتا تھا۔ اورکاشہ بن مانسوں کی صحبت میں رہی تھی، پتہ نہیں اس بن مانس کے لئے اس کے دل میں کیا جذبات تھے جس کی اولاد کو اس نے نو سکی کی حیثیت سے جنم دیا تھا، جدید دنیا میں اس داستان کا تصور کر کے مجھے خود پر ہنسی آنے لگی، دقت نے اگر مجھے موقع دیا اور میں نے زندہ صدیاں کتابی شکل میں لکھیں تو کیا لوگ اس پر یقین کر سکیں گے، لیکن لوگوں کے بارے میں میں تو کچھ نہیں کہنا جاسکتا، آپ کچھ بھی لکھ دیں، ان میں کچھ لوگ اس سے مشتاق ہوں گے، کچھ اسے صرف تفریحی کہانی سمجھ کر پڑھیں گے اور کچھ برا بھلا کہیں گے کہ رائٹر نے کیا اونگی ہوئی چھوڑی ہیں۔

لیکن جناب ذیشان عالی کے ساتھ جو کچھ پیش آ رہا تھا وہ ذیشان عالی ہی جانتا تھا، البتہ میں نے اپنے جسم اور اپنی جسمانی طاقت پر بھی غور کیا تھا اور مجھے ہنسی آئی تھی، بلکہ میں نے دل میں سوچا تھا کہ پولیس کی حیثیت سے اس وقت جو جسم میرے پاس ہے وہ امریکی ریسر بروک لسنر یا روسی ریسر بروک سے کم نہیں ہے بلکہ اگر اس حیثیت میں میرا سامنا بیک وقت ان دونوں سے بھی ہو جائے تو میں ان کی ایسی تیسی کر کے رکھ سکتا

ملاقات اس کی بہن سے ہوئی اور اس نے مجھے سارے معاملات میں تفصیلات بتائیں۔

”ہاں..... میں تمہیں اپنے دل کی بات بتانا چاہتا ہوں پولیس، اب جبکہ میری بہن نے میرے دل میں سوئے ہوئے انسان کو جگا دیا ہے تو میں چاہتا ہوں کہ واقعی نیوسکی کے خلاف کوئی قدم اٹھایا جائے، اب میرے ذہن میں اس کے خلاف بغاوت جنم لے رہی ہے۔ رشتے کتنے مضبوط ہوتے ہیں اور انسان کس قدر کمزور۔“

”میں سمجھتا ہوں نیوسکی کہ انسان کو رشتوں سے متاثر ہونا چاہئے اور نہ اپنی کمزوری اور طاقت سے، بات حق کوئی کی ہو تو وہ صرف یہ فیصلہ کرے کہ وہ کون سے راستے کو بہتر سمجھتا ہے۔“

”تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو لیکن میں تمہیں حیرانی سے یہ بات بتاؤں کہ وہ صرف بدن ہے ایک جانور کا بدن، اس کی اصل حیثیت اور اصل زبان اس کی ماں کا ارکاشہ ہے۔“

”اوہ کمال کی بات ہے، کمال کی بات ہے، ارکاشہ یعنی ایگائوس کی بیٹی۔“

”ہاں اسی کی بات کر رہا ہوں۔“

”لیکن کیوں وہ ایسی کیوں ہے جبکہ وہ تو انہی لوگوں میں سے ایک ہے۔“

”یہ بھی ایک نفسیاتی عمل ہے میرے دوست۔ ارکاشہ جو انہی بے پناہ خوب صورت تھمی ظاہر ہے۔ اس کے دل میں بھی بہت سے خیالات اور خواہشیں ہوں گی لیکن اس کے شکم میں پرورش پانے والا وجود ایک بن مانس کا وجود تھا، ظاہر ہے اس کا دل اس کے احساسات ٹوٹے ہوئے ہوں گے اور اسے اپنے باپ سے شکایت ہوگی کہ ایگائوس نے اسے کس طرح جانوروں کے حوالے کر دیا، بس یوں سمجھ لو کہ وہ اپنے کچلے ہوئے احساسات کا بدلہ لے رہی ہے۔“

”کیا ایگائوس زندہ ہے؟“ میں نے سوال کیا۔

”نہیں۔“

”اور تم، تم اس کی ملازمت کر رہے تھے۔“

”ہاں میرے دوست لیکن آج تو نیسا کی باتوں نے مجھے جگا دیا ہے۔ سچ ہی تو کہہ رہی ہے وہ کہ ایک جانور انسانی نسل کو کس بے دردی سے خراب کر رہا ہے۔ میں آج سے بالکل بدل گیا ہوں۔“

”تم نے غور نہیں کیا شاید، کیا تم اتنی جلدی اپنے احساسات کو بدل سکتے ہو پولیس؟“

”ہاں، میں بدل سکتا ہوں، میرے گھر کے لوگ بہت کم ہیں، اگر ان میں سے ایک کی زندگی ختم ہو جائے تو دوسرے بے موت مرجائیں گے، چنانچہ اگر میری بہن اس طرح کام آگئی تو میرے ماں باپ اور خود میں بھی زندہ نہیں رہ سکیں گے۔“

”تب پھر تمہارے لئے میرا ایک مشورہ ہے، تم ابھی اس سلسلے میں کوئی ایسا عمل نہ کرنا جس سے بقول تمہارے ارکاشہ کو تم پر کوئی شبہ ہو جائے، اچھا مجھے ایک بات بتاؤ کیا یونان کے اس خوب صورت شہر کے دوسرے لوگ جو یونان کا دارالحکومت ہے جس کا نام کارگس ہے، اس کے خلاف بغاوت نہیں کرتے، میرا مطلب ہے وہ لوگ جن کی بیٹیاں یا جن کے گھر کی عورتیں نیوسکی کا شکار ہو چکی ہیں۔“

”بانیوں کا ایک گردہ باقاعدہ مل رہا ہے اور اس نے شہر سے باہر اپنی رہائش گاہیں بنالی ہیں اور مستقل طور پر تیاریاں کر رہا ہے، ادھر ارکاشہ کے حکم سے ہمارے میرا مطلب ہے ارکاشہ کے سپاہی باغیوں کے اس گروہ کو تلاش کر کے جن جن کو قتل بھی کر دیتے ہیں، ویسے تمہیں حیرت ہوگی کہ نیوسکی ایک جانور ہونے کے باوجود انسانوں کی طرح بولتا ہے باتیں کرتا ہے، سوچتا ہے، بے شک اس کی اپنی کوئی زبان نہیں ہے، لیکن ارکاشہ اسے بہت سی باتوں سے آگاہ کرتی ہے، ٹھیک ہے ایگائوس کی موت کے بعد ارکاشہ کا بیٹا ہی وہاں حکمران ہے۔“

”ٹھیک ہے اس سلسلے میں کام کا آغاز کیا جاسکتا ہے۔ اچھا ایک بات بتاؤ؟“ میں نے کسی خیال کے تحت

سوچ دیزلے

ہم چراغ کی روشنی سے فائدہ اٹھاؤ۔ یہ مت دیکھو کہ وہ ”کس“ کے ہاتھ میں ہے۔

ہم وہاں رہنا آپ کی نادانی ہے، جہاں آپ کی ضرورت اور قدر نہ ہو۔

ہم حوصلہ یہ سمجھی نہیں پوچھتا کہ پتھر کی دیوار کتنی اونچی ہے۔

ہم یہ مت سوچو کہ ہمارا ”دکھ“ کتنا بڑا ہے۔ یہ دیکھو کہ ہمارا ”اللہ“ کتنا بڑا ہے۔ جو اس دکھ کو خوشی میں بدلنے والا ہے۔

ہم گزرا ہوا واقعہ گزرتا ہی تو نہیں ہے بلکہ وہ یاد بن کر بار بار گزرتا ہے۔

ہم انسان محبت صرف ایک بار کرتا ہے، باقی محبتیں اس محبت کو بھلانے کیلئے کرتا ہے۔

(ساحل دعا بخاری۔ بسیر پور)

وقار، لیکن اس کے نقوش میں کیسے نظر انداز کر سکتا تھا، مہا بھارت کے دور میں وہ مجھے ایک اور حسینہ کی شکل میں ملی تھی اور اب یہاں نہ جانے کس نام سے موجود تھی۔

کمال کی بات ہے واقعی کمال کی بات ہے، ناقابل یقین، وہ سامنے دیکھ رہی تھی اور میں یہ نہیں سمجھ پا رہا تھا کہ یہ کون ہے، بہر حال میں آگے بڑھا تو وہ ایک عجیب سی کیفیت میں اٹھ کر بیٹھ گئی، مجھے یوں محسوس ہوا جیسے اس کے اندر ایک وحشت سی پیدا ہو گئی ہو، تبھی نیوکی نے سینے پر دو ہنر مارے اور اپنے مخصوص انداز میں خوں خوں کرنے لگا، کوردتی کا چہرہ زرد ہو گیا تھا، اس نے اس انداز میں ادھر ادھر دیکھا جیسے وہ خود کو وحشت زدہ قیدی محسوس کر رہی ہو، پھر اس کے حلق سے ایک نفرت بھری آواز نکلی۔

”تو پھر آ گیا۔ ظالم کتے درندے۔“ اس کی

غراہٹیں ابھر رہی تھیں۔

بڑا بے ہنگم شور تھا اور لڑکیوں کی چیخیں ایک عجیب سا ہنگامہ پیدا کر رہی تھیں، پھر وہ بدحواس ہو کر باہر نکل آئیں، ان کے لباس نچے ہوئے تھے اور جسموں پر جگہ جگہ خون نظر آ رہا تھا، نیوکی نے انہیں بری طرح زد و کوب کیا تھا، میں حیران تھا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے، ان لڑکیوں کے چہرے زرد ہو رہے تھے، پھر کچھ سی لکھوں کے بعد نیوکی باہر آیا اور ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ پھر اس نے دونوں ہاتھ پھیلا کر کسی کو اپنے قریب آنے کا اشارہ کیا، اس سے بہتر موقع اور کیا ہو سکتا تھا چنانچہ میں تیزی سے اس کے نزدیک پہنچ گیا۔ میرے ساتھ تین محافظ اور آگے بڑھ آئے، نیوکی آگے کی جانب چل پڑا اور میں اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔

اب وہ محل کی ایک خوب صورت راہداری سے گزر رہا تھا اور ہم چاروں خادم اس کے ساتھ تھے، ایک بار پھر اس نے پلٹ کر ہم لوگوں کو دیکھا اور مجھے رکنے کا اشارہ کرتے ہوئے فوخور کے نبھانے ان خادموں سے کیا کہا غالباً اس نے انہیں روک دیا تھا اور صرف مجھے اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا تھا، پھر وہ ایک کمرے کے قریب پہنچ کر رک گیا جہاں دو پہرے دار کھڑے ہوئے تھے، ان پہرے داروں نے نیوکی کو دیکھا اور اپنے ہاتھوں میں پکڑے ہوئے بھالے نیچے گرا دیے، ساتھ ہی انہوں نے دروازہ بھی کھول دیا تھا، میں اس کے پیچھے پیچھے اندر داخل ہو گیا، کیا حسین جگہ تھی، تصور تک نہیں کیا جاسکتا تھا اس کا، کوردتی نے مجھے نبھانے کیسے کیسے ماحول سے روشناس کرا دیا تھا، کمرے میں بہت ہی اعلیٰ قسم کا فرنیچر پڑا ہوا تھا جو قدیم طرز کا تھا۔ چاروں طرف رنگین پردے لہرا رہے تھے ایک بہت ہی خوب صورت مسمری چھھی ہوئی تھی اور اس خوب صورت مسمری پر جو کوئی موجود تھا اسے دیکھ کر میری آنکھیں شدت حیرت سے کھلی کہ کھلی رہ گئیں ناقابل یقین اور نا سمجھ میں آنے والی بات یہ کوردتی تھی، یونانی لباس میں ملبوس، حسن و جمال میں یکساں، چہرے پر عجیب سی تمکنت اور

اسے کوئی مزاحیہ باب ہی سمجھ لیں، خیر اس کے بعد میں نے تیاریاں کیں اور پولیس کے ساتھ اس جگہ پہنچ گیا جہاں اس کے کہنے کے مطابق نیوکی سے ملاقات ہو سکتی تھی اور پھر میں اندر داخل ہو گیا۔ لیکن ایک محافظ کی حیثیت سے، میرے لئے یہ سب سے زیادہ حیرت ناک بات تھی کہ ایک گوریلا انسانی آواز میں باتیں کر رہا تھا اور یہ الگ بات ہے کہ وہ آواز فنی فنی فنی اور خوں خوں خوں کی تھی اور اس کے کوئی معنی نہیں محسوس ہو رہے تھے، لیکن پولیس نے ہنستے ہوئے کہا۔

”ٹھیک ہے ٹھیک، ہم کوشش کر رہے ہیں اور ہمیں اس میں کامیابی بھی ہوگی۔“

جواب میں پھر خوں خوں کی آواز سنائی دی اور مجھے تعجب ہونے لگا، اس کا مقصد یہ تھا کہ اس جنگلی گوریلے کی زبان یہاں بہت اچھی طرح سمجھی جاسکتی ہے۔ آواز پھر سنائی دی اور نیولیس نے کہا۔

”ٹھیک ہے، عالم پناہ میں جا رہا ہوں، آپ آرام کریں۔“

غرضیکہ نیولیس مجھ پر توجہ دیئے بغیر وہاں سے آگے بڑھ گیا، وہ اس اعلیٰ حیثیت کا مالک ہے یہ بات میرے ذہن میں نہیں تھی، کافی دیر خاموشی رہی اور اس کے بعد اچانک ہی میں نے ایک اور منظر دیکھا، یہ یونان کی روایتی حسینائیں تھیں، بے حد خوب صورت نزکیاں جو باریک لباسوں میں لپٹی ہوئی تھیں اور ان کا رخ نیوکی کی خواب گاہ کی جانب ہی تھا۔ وہ اندر داخل ہو گئیں، نیولیس نے مجھے دہیں کھڑے رہنے کے لئے کہا، کچھ ہی دیر کے بعد اندر سے قبہتہوں کی آوازیں سنائی دینے لگیں، ساتھ ہی ساتھ نیوکی کی خونخوار غرائیں بھی وہ شاید کسی پر بگڑ رہا تھا، ظاہر ہے وہ لوگ اس کی آوازیں سن سکتے تھے، ان کا مفہوم سمجھ سکتے تھے، لیکن مجھے یہ نہیں پتہ چل رہا تھا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ البتہ تھوڑی دیر کے بعد وہ آوازیں جو پہلے قبہتہوں کی شکل میں تھیں بدل گئیں اور اب اس میں ان لڑکیوں کی چیخیں اور کراہیں شامل تھیں جبکہ نیوکی کی

میرے بازوؤں میں فولاد تڑپ رہا تھا، خیر میں بروک لسٹریا کو ہرا کر کیا حاصل کر سکوں گا، البتہ اگر یہ صحت مجھے حاصل ہو جائے اور میں اپنی دنیا میں اسی انداز میں پہنچ جاؤں تو بس پھر حسینان وطن میرا خیال ہے میرے لئے خون خرابے پر آمادہ ہو جائیں، کیر نبھانے کب تک خیالات دل میں آتے رہے اور اس کے بعد گہری نیند سوتا رہا، جاگا تو صبح ہو چکی تھی اور تھوڑی ہی دیر کے بعد مجھے ناشتے کے لئے بلا لیا گیا، ناشتے کے بعد پولیس نے اسے تیار ہونے کے لئے کہا اور میں وہاں چل پڑا۔ یونان کا شاہی محل لازمی طور پر ان تمام انگریزی فلموں سے کہیں زیادہ خوب صورت تھا جن میں اسی طرح کی چیزوں کی نقل کی جاتی ہے اس پر کروڑوں روپیہ خرچ کر دیا جاتا ہے، کارگرس کا یہ یونانی محل اس سے بھی زیادہ حسین تھا اور میں حیرانی سے اسے دیکھ رہا تھا، میں اس سے بہت متاثر تھا۔

شاہی محل کا تقریباً سارا ہی نکاح نیولیس کے ہاتھ میں تھا اور جس جگہ نیولیس مجھے لے کر داخل ہوا وہاں سب کے سب اس کا احترام کر رہے تھے، شاہی محل کا یہ عظیم الشان کمرہ بہت ہی خوب صورت تھا اور اس میں ایک حسین تخت رکھا ہوا تھا جہاں پولیس جا کر بیٹھ گیا اور اس نے مجھے ایک الگ جگہ بیٹھنے کے لئے کہا لیکن آہستہ لہجے میں اس نے یہ بھی کہا تھا کہ وہ مجھے جو حیثیت دے رہا ہے وہ میرے شایان شان نہیں ہے لیکن اس کا پس منظر کچھ اور ہے، غرضیکہ پولیس نے چند افراد سے میرا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ میں اس کے محافظوں میں سے ایک ہوں۔

مجھے محافظوں کا لباس دیا گیا جسے پہن کر میں نے ہتھیار وغیرہ ہاتھ میں سجالے اور دل ہی دل میں خود پر ہنسنے لگا، میں نے سوچا کہ کاش مجھے کسی جنگ میں شامل ہونے کا موقع مل جائے تاکہ زندہ صدیاں میں اس جنگ کا حال بھی لکھوں اور اپنی بہادری کے کارنامے بھی بیان کروں، یہ الگ بات ہے کہ لوگ

ہولناک چیخیں ابھر رہی تھیں لیکن دروازے پر دستک نہ ہوئی، میں نے سوچا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے، لیکن پھر میرے اندر کا کہانی کار جاگ اٹھا، مجھے کوروتی کی باتیں یاد آنے لگیں اس نے کہا کہ تاریخ میں جو کچھ ہو چکا ہے وہ تاریخ کے ساتھ منسلک رہتا ہے ہم بے شک تاریخ کے ایک کردار کی حیثیت سے ماضی میں جا سکتے ہیں لیکن ہم اس تاریخ میں تبدیلی نہیں کر سکتے اور تم بھی کبھی ایسا نہ کرنا کیونکہ اس طرح تاریخ نہیں بدلی جاسکتی اور ان الفاظ کو یاد کرنے کے بعد میں باہر نکل آیا، لیکن دوسرے محافظ خاموشی سے وہیں کھڑے ہوئے تھے، میں بھی ان کے درمیان جا کھڑا ہوا۔

کچھ دیر کے بعد کوروتی یا ارکاشہ کی چیخیں مدہم ہوتی چلی گئیں پھر میں نے نو سسکی کو باہر نکلتے ہوئے دیکھا اور وہ سیدھا چلا گیا۔ دوسرے محافظ میرے ساتھ ہی کھڑے ہوئے تھے، غالباً وہ اندر کے معاملات سے لطف لے رہے تھے کیونکہ ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔

”کہاں گیا تھا وہ؟“ ایک محافظ نے پوچھا۔

”یہ بتانا کیا ضروری ہے؟“ میں نے کہا۔

”تمہارے خیال میں ہمیں معلوم نہیں ہے؟“ اس نے مسکرا کر کہا۔

”پھر مجھ سے کیوں پوچھ رہے ہو؟“ میں نے بھی مسکرا کر کہا۔

”تم کہاں تھے؟“

”اندر ہی تھا۔“

”بڑا ہی وحشی جانور ہے۔“ سپاہی نے کہا۔

”تم شہنشاہ کے بارے میں ایسا کہہ رہے ہو؟“

”شہنشاہ؟“ سپاہی نے ہنس کر کہا۔ ”ہاں ہے تو وہ شہنشاہ ہی۔“

”کیوں تمہیں اس سے اختلاف ہے؟“

”یاد اگر تم پہرے داری میں نے ہو تو محل کے

محاطات میں بھی کورے ہی ہو کیا؟“

”ہاں میں باہر کی فوجوں میں تھا، محل کے

اس کرسی پر بیٹھ گیا، تب کوروتی نے شراب پیالے میں اٹھیلی اور اس کے سامنے بڑھا دی۔ نو سسکی شراب حلق میں اٹھیلتا رہا، مجھے شدید حیرت ہو رہی تھی جبکہ کوروتی زار و قطار رو رہی تھی، اس نے روتے ہوئے کہا۔

”آہ گزرے وقت تو نے میرے ساتھ شدید دھوکہ کیا ہے، میں اس شخص کی بددعائیں اپنے ساتھ رکھتی ہوں جس کے ساتھ میں نے بے وفائی کی تھی اور بلاشبہ میں اس قابل نہ تھی کہ اس سے وفا کی جاتی، بے شک وہ بد شکل کبڑا تھا وہ مندروں میں گھسنے بجاتا تھا، لیکن اس قدر بد نما تھا وہ کہ میں اس کی صورت بھی دیکھنا پسند نہیں کرتی تھی، لیکن اب مجھے اس کا صلہ مل رہا ہے، مجھے شرم ہے کہ میں نے اس کے ساتھ بہت برا سلوک کیا ہے اور اس کے نتیجے میں مجھے یہ سزا ملی، کاش میں اس جنگلی جانور کو جہنم نہ دیتی، لیکن مجھے کیا معلوم تھا کہ یہ درندہ درندہ ہی رہے گا۔ کاش میرے ساتھ یہ سب کچھ نہ ہوتا، آہ میرے باپ، میرے منہوں باپ تو نے اسے ہلاک کیوں نہیں کر دیا۔ بول تو نے اسے ہلاک کیوں نہیں کر دیا ایسا کاش تو اسے مار دیتا۔“

لیکن نو سسکی بدستور شراب نوشی کر رہا تھا۔ دفعتاً اس نے اپنے ہاتھ سے پیالہ پھینک دیا اور صراحتی اٹھا کر منہ سے لگالی، پھر وہ غٹا غٹ کر کے ساری شراب پی گیا ایک بار پھر اس نے کوروتی کی طرف دیکھا اور پھر سینے پر دونوں ہاتھ مارنے لگا تو کوروتی بولی۔

”آہ میں کمزور ہوں لوگو! میں کمزور ہوں میں تیری ماں ہوں تو نے میرے بطن سے جنم لیا ہے لیکن تو ان باتوں کو کیا سمجھے گا، تو انسان کہاں ہے۔“

”تب گور یلا آگے بڑھا اور اس نے کوروتی کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔

”نہیں ہرگز نہیں تو میرے ساتھ یہ وحشت ناک سلوک نہیں کر سکتا۔“

ایک بار پھر نو سسکی غرانے لگا، پھر اس نے کوروتی کو پکڑ لیا، بس نبھانے کیوں میرے ذہن میں ایک آگ سی بھرنی، کوروتی چیخ رہی تھی اور نو سسکی کی

آواز میں بڑی وحشت تھی اور میرے سر میں کھلبلی ہو رہی تھی، یہ کیا چکر ہے ادھر نو سسکی اپنے سینے پر ہاتھ مار رہا تھا۔

”لعنت بھیجتی ہوں میں تجھ پر کتے، مجھے اس وقت کا افسوس ہے جب تو نے گندے کپڑے میرے بدن سے جنم لیا تھا۔“

نوسسکی نے کچھ نہ کہا بلکہ اس نے انسانوں کی طرح ایک زرنگار کرسی گھسنی اور اس پر بیٹھ گیا، میں اپنی جگہ ساکت و جامد کھڑا ہوا تھا، تب اس نے میری طرف دیکھا اور بولی۔

”تو بھی دیکھ رہا ہے وحشی غلام، درندے تجھ سے یہ نہیں ہو سکتا کہ تو اسے نکال کر باہر کر دے۔“

مجھے یوں لگا جیسے اس نے مجھے پہچانا ہی نہ ہو، اس کی آنکھوں میں قہر و غضب کی بجلیاں تڑپ رہی تھیں، میں نے گردن جھکا دی تو وہ بولی۔

”ہاں میں جانتی ہوں تو کہتا ہے کہ تو صرف ایک غلام ہے، تیری اپنی کوئی حیثیت نہیں ہے، لیکن اگر تو مجھے اس سے نجات دلا دے تو میں وعدہ کرتی ہوں کہ میں تجھے وہ حیثیت دوں گی جس کا تو تصور بھی نہیں کر سکتا، اپنا یہ چوڑا بھالا اس کے سینے میں اتار دے، میں کہتی ہوں اسے قتل کر دے، میں کہتی ہوں قتل کر دے اسے۔“

”کوروٹی کی وحشیانہ آواز ابھر رہی تھی اور صبح معنوں میں میری کھوپڑی پر جیسے بچھوڑ تک مار رہے تھے، یہ عورت یہ نوجوان لڑکی اس کی تو کچھ عمری نہ تھی اس کا حسن و جمال تو آفاقی حیثیت رکھتا تھا۔ کیا یہ اس گوریلے کی ماں ہے، کیا یہ ارکاشہ ہے، یہ کیسے ہو سکتا ہے، اس کے انداز میں شدید وحشت تھی اور وہ ایک ہی جملہ کہے جا رہی تھی۔

”ماروے اسے میں کہتی ہوں ماروے۔“

نوسسکی نے گردن گھما کر میری طرف دیکھا اس کی سرخ سرخ آنکھوں میں خوفناک چمک تھی، میں نے لرزنے کی اداکاری کی اور کئی قدم پیچھے ہٹ گیا

اور مجھے ایک دم محسوس ہوا جیسے نو سسکی مطمئن ہو گیا ہو، ادھر کوروٹی خوفزدہ نگاہوں سے مجھے دیکھ رہی تھی اور کبھی اسے، پھر وہ بولی۔

”دیکھ بدنصیب جانور میں تیری ماں ہوں، رشتے بہت بڑی حیثیت رکھتے ہیں تو نے میرے پیٹ سے جنم لیا ہے، ماں کہلاتی ہوں میں تیری سمجھا ماں کہلاتی ہوں۔“

جواب میں نوسسکی نے قریب رکھا ہوا عظیم الشان گلدان اٹھا کر زمین پر دے مارا، گویا وہ ارکاشہ کی اس بات سے نفرت کا اظہار کر رہا تھا پھر اس نے میری جانب دیکھا اور ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے مجھے دروازہ بند کرنے کے لئے کہا، میں نے دروازہ بند کر دیا لیکن میں خود وہیں کھڑا رہا میں دیکھنا چاہتا تھا کہ کوروٹی یا یونان کے اس دور میں ارکاشہ اتنی خوفزدہ کیوں ہے۔ وہ کس عذاب میں گرفتار ہے، ایک بار پھر نوسسکی نے میری جانب دیکھا اور پھر اس طرح گردن گھمائی جیسے اسے میری موجودگی کی پرواہ نہ ہو، تب اس نے ایک جانب اشارہ کیا اور میں نے اس کی طرف دیکھا وہاں شراب کے برتن رکھے ہوئے تھے، کوروٹی خوفزدہ ہونٹوں پر زبان پھیرنے لگی پھر اس نے گھمبیر لہجہ میں کہا۔

”نہیں نہیں میں تجھے شراب نہیں پلاؤں گی میں تیری ماں ہوں، تو میرے رشتے کو بھول گیا ہے لیکن میں نہیں۔“

”اچانک ہی نوسسکی اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا، وہ خونخوار انداز میں آگے بڑھ رہا تھا پھر اس کے وحشی بچے نے کوروٹی کے لباس کو پکڑ لیا اور کوروٹی اٹھ کھڑی ہوئی اس کا تقریباً سارا لباس اتر گیا تھا۔

”ذلیل کتے کہینے۔“ اس نے دونوں ہاتھ نوسسکی کے سینے پر مارتے ہوئے کہا لیکن نوسسکی نے اسے زور سے دھکا دیا اور وہ دور جا گری، تب وہ اپنی جگہ سے انھی اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے، لیکن آخر کار شراب کا برتن اسے لے کر آنا ہی پڑا۔ نوسسکی

لگیں، بڑی عمدہ بات تھی بڑا خوب صورت منصوبہ تھا، بلکہ میں تو یہ سوچنے لگا تھا کہ نوسسکی کو شکست دینے کے لئے میں نے جو طویل کارروائیاں کی ہیں وہ تو حماقت ہی تھی اسے تو اس محل میں آ کر ہی شکست دی جاسکتی تھی۔

بہر حال اگر حالات ہوں ہیں تو یوں ہی سہی، لیکن ابھی فوری کارروائی مناسب نہیں ہے، پہلے کچھ اور حالات جان لئے جائیں تو بہتر ہے۔ چنانچہ میں نے خاموشی اختیار کی، ہاں جب میری ڈیوٹی کے اوقات ختم ہوئے اور میری جگہ ایک دوسرے پہرے دار نے لے لی تو میں نوسس کے پاس پہنچ گیا۔ نوسس نے مسکراتے ہوئے مجھے دیکھا تھا اور پھر وہ بولا۔ ”تم تھک گئے ہو گے یو لیسس۔“

”تھکن کا لفظ میری لغت میں نہیں ہے۔“
”خوب ویسے تم بھی عمدہ صلاحیتوں کے مالک انسان ہو، میں نے تمہارے اندر خصوصی صلاحیتوں کو محسوس کیا ہے۔“

”شکریہ میرے دوست۔“ میں نے جواب دیا۔
”کیا تم نے ہمارے شہنشاہ نوسسکی کو دیکھا۔“
”ہاں اچھی طرح اور اس گوریلے کو اس تحت اٹھری کا عجوبہ کہا جاسکتا ہے وہ تو بڑی اعلیٰ صلاحیتیں رکھتا ہے۔“

”ہاں وہ جانتا ہے کہ وہ ناقابلِ تغیر ہے اور اسے ایگانوس سے کوئی اختلاف نہیں ہے، بہر حال چھوڑو ان باتوں کو مجھے تم سے اور بھی بہت سی باتیں کرنا ہیں، میری فطرت میں ایک نمایاں کمزوری ہے۔“
”کیسی کمزوری؟“

”اس سے قبل میں نوسسکی کا وفادار تھا اور اس کی بہتری کے بارے میں سوچتا تھا، ذہن کی بات جو کچھ بھی تھی لیکن اس میں تردد نہیں تھا، اب صورتحال دوسری ہے، اب میں اس کا مخالف ہوں چنانچہ دل چاہتا ہے کہ جو کچھ کر رہا ہوں جلدی سے کر ڈالوں۔“
”یہ جذبہ برا تو نہیں ہوتا نوسس۔“

”ہاں لیکن میں ابھی تاریکیوں میں ہوں۔“
”کیوں؟“

”میرے ذہن میں کوئی واضح لائحہ عمل نہیں ہے۔“
”ان لوگوں کے خلاف کچھ کرنے کے لئے۔“
”ہاں۔“

”پھر تم کیا چاہتے ہو؟“
”جلد از جلد باغیوں سے ملنا چاہتا ہوں۔“
”ان سے مل کر کیا کرو گے؟“
”ان کی جدوجہد میں حصے دار بنوں گا۔“
”کیا تم انہیں کوئی بڑا فائدہ پہنچا سکتے ہو؟“
”کیا مطلب؟“

”ان کی تعداد بے شمار ہے اس لئے کسی ایک آدمی کے ان میں شامل ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا، ہاں اگر کوئی عمدہ منصوبہ ان تک پہنچایا جائے تو ان کی مدد ہو سکتی ہے۔“

”عمدہ منصوبہ کیا ہو؟“
”وہ میں بتا سکتا ہوں۔“
”تو بتاؤ میرے دوست۔“

”نوسسکی کے خلاف بغاوت کا اعلان معمولی ہو گا۔“
”ہرگز نہیں، کیونکہ نوسسکی کے بے شمار ہمنوا ہیں اور پھر فوجیں تو وہی کریں گی جس کا حکم انہیں نوسسکی دے گا۔“

”تو ان فوجوں سے جنگ کے لئے باغیوں کو کس چیز کی ضرورت ہوگی؟“
”کیا مطلب؟“ نوسس نے تعجب سے پوچھا۔
”میں تمہیں بتاتا ہوں، اس کے لئے انہیں اسلحہ درکار ہو گا۔“

”اوہ یقیناً۔“
”اور مجھے یقین ہے کہ اسلحہ باغیوں کی سب سے اہم ضرورت ہے۔“
”بے شک۔“
”چنانچہ اگر تم ان کی مدد کر سکتے ہو تو مجھے ایک

معاملات سے ناواقف ہوں۔“ میں نے معصومیت سے کہا۔

”اوہ تو یہ بات ہے، مگر اب تو تماشہ دیکھ لیا۔“
”ہاں اور حیرت انگیز تماشہ۔“

”یہاں تو تم تماشے ہی دیکھتے رہو گے۔“

ایگانوس نے جو جال پھیلا یا ہے اس کا کوئی جواب نہیں ہے۔“

”کیا مطلب؟“

”تم کیا سمجھتے ہو کیا گور یا کوئی ذی ہوش

جانور ہے؟“

”پھر؟“

”وہ صرف گور یا ہے، خصوصی صلاحیتوں کا

مالک ایک جانور، اس سے زیادہ اس کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔“

”لیکن حکومت کون کرتا ہے؟“

”وہی جسے کرتا چاہئے یعنی ایگانوس۔“ دراصل

یہ گہری کہانی ہے۔“ سپاہی بہت باتوں کو معلوم ہوتا تھا۔

”میرے دوست کیا تم مجھے یہ کہانی نہیں

سناؤ گے، مجھے تفصیل جاننے کا بے حد شوق ہے اور

تمہاری بات پر حیرت بھی ہے۔“

”حیرت کیوں ہے؟“

”تم کہتے ہو کہ وہ خصوصی صلاحیتوں کا مالک

ایک گور یا ہے لیکن میں آج تک یہی سنا رہا ہوں کہ وہ

ایک باہوش شہنشاہ ہے جو بڑی عمر کی سے حکومت کر رہا

ہے گو تخت اشرافی کی تاریخ میں یہ ایک حیرت انگیز واقعہ

ہے لیکن پھر اسے حیرت انگیز یوں نہیں کہہ سکتے کہ

بہر حال اس گوریلے نے ایک عورت کے پیٹ سے جنم

لیا ہے۔ اس کے علاوہ میں نے اس کی حرکات دیکھی

ہیں ان سے یہی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کافی سمجھدار ہے۔“

”اس میں کوئی شک نہیں ہے، لیکن اتنا بھی نہیں

کہ حکومت کر سکے۔“

”لیکن یہ سب کیا ہے؟“

”ایگانوس کی سازش، دراصل حکومت کے شوق

نے ایگانوس کو انسانیت سے کافی نیچے گرا دیا ہے، اس نے اپنی بیٹی کی شادی اس شخص سے کر دی جس نے خود کو اس کا اہل ثابت کر دیا، لیکن پھر اس کے ذہن میں سازش نے جنم لیا اور اس نے ایک سازش کی، اس کی بیٹی نے ایک گوریلے کو جنم دیا اور خیال ہے یہ گوریلہ شونی کے نطفے سے نہ تھا۔ لیکن ایگانوس اور اس کی بیٹی چاہتے تھے کہ ان کی اولاد حکومت کرے چنانچہ ایگانوس نے گوریلے کی پرورش کی اور اسے کچھ خصوصی تربیتیں دیں اس طرح گوریلے نے شونی کو شکست دی اور یہی ایگانوس کا منصوبہ تھا، اب گوریلہ بظاہر شہنشاہ ہے، لیکن حکومت ایگانوس کر رہا ہے، گوریلہ ایک طاقتور جانور ہے چنانچہ اسے شکست دینے والے کا کوئی وجود نہیں ہے اور ایگانوس کی حکومت محفوظ ہے۔“ سپاہی نے کہا۔

”اوہ بڑی انوکھی بات ہے۔“

”ہاں لیکن صرف باہر کے لوگوں کے لئے۔“

”میں تو سوچ بھی نہ سکتا تھا، لیکن میرے

دوست ابھی میں نے ایک انوکھا واقعہ دیکھا ہے۔“ میں نے دلچسپی سے کہا۔

”کیا؟“

”ارکاشہ تو اس کی ماں ہے نا؟“

”ہاں لیکن ایک وحشی جانور کے لئے رشتے کیا

اہمیت رکھتے ہیں، اگر وہ کوئی انسان ہوتا تو اس سے یہ

حرکت سرزد نہ ہوتی۔“

”تو تم جانتے ہو۔“

”ہاں عام لوگ نہیں جانتے یہاں تک کہ ہمارا

آقا نیلس بھی شاید اس بات سے ناواقف ہے لیکن کون

اپنی زندگی کا خطرہ مول لے۔“

”ایگانوس کو بھی یہ بات نہیں معلوم ہوگی۔“

”سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، ایگانوس کو کیا پڑی

ہے کہ وہ اس کی طرف توجہ دے یا کسی کا حال جاننے کی

کوشش کرے وہ حکومت کر رہا ہے اور یہی اس کے لئے

کافی ہے۔“

اور میرے ذہن میں پھل پھریاں ہی چھوٹنے

اور نیلس کسی سوچ میں ڈوب گیا، پھر اس نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

”گو یہ خطرناک کام ہے، لیکن اگر تو نیسا سے اس کے لئے کہا جائے تو وہ فوراً تیار ہو جائے گی وہ اس سلسلے میں اتنی ہی پر جوش ہے۔“

”ہر تحریک کی تکمیل کے لئے خطرات سے کھینا ہی پڑتا ہے نیلس، اب اس کی چالاکی یہ ہوگی کہ وہ خود کو آرگس کی ہوس سے بچائے اور اتنی شراب پلائے کہ آرگس حواس میں نہ رہے اور اس کے لئے ایک اور ترکیب بھی ہے۔“

”وہ کیا؟“

”تم خود تو نیسا کو آرگس سے روشناس کراؤ تاکہ آرگس فوراً بدحواس نہ ہو۔“

نیلس نے میری باتوں پر خوب غور کیا پھر بولا۔

”ٹھیک ہے، فرض کرو ہم اس طرح اسلحہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائیں تو پھر اسے یہاں سے کس طرح لے جائیں گے۔“

”تمہیں روانگی کے احکامات کہاں سے ملتے ہیں؟“ میں نے کہا۔

”ایکا نوں سے۔“

”براہ راست۔“

”ہاں۔“

”اور ایکا نوں تمہارے اوپر بھروسہ کرتا ہے۔“

”ہاں وہ مجھے اپنے معتمدوں میں سمجھتا ہے۔“

”بس تو اگر تم اس سے اسلحہ حاصل کر لو تو اسے ایک تجویز پیش کرو اس سے کہو کہ تم ایک قافلہ لے کر جانا چاہتے ہو، باقی قافلے لوٹتے ہیں وہ تمہارے قافلے کو بھی لوٹیں گے اور اس طرح تم ان کے ٹھکانے کا کھوج لگا لو گے۔“

”نیلس عجیب سی نگاہوں سے مجھے دیکھنے لگا پھر اس نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ”بہت ہی عمدہ ترکیب ہے واقعی تمہارا ذہن لا جواب سوچتا ہے، میں تو اب دل سے تمہارا قائل ہوتا جا رہا ہوں۔“ میں نے

کوئی جواب نہ دیا۔

پھر جب ہم نے تو نیسا سے اس تجویز کا تذکرہ کیا تو وہ خوشی سے پاگل ہو گئی۔ ”میں ایکا نوں کے خلاف ہونے والی ہر کارروائی میں بھرپور حصہ لوں گی اور غلوں دل سے تمہاری تجاویز پر عمل کروں گی۔“ اس نے خوش ہو کر کہا۔

صورت حال کو بہت اچھی نہیں تھی، تاہم میں اور نیلس اس سلسلے میں عمل کرنے کے لئے تیار تھے، سب سے بڑی بات یہ تھی کہ خود تو نیسا نے ہمیں اس بات کا یقین دلایا تھا کہ وہ اپنا کام باآسانی کرے گی اور اپنے آپ کو محفوظ بھی رکھے گی، چنانچہ تو نیسا نکل پہنچ گئی۔ منصوبے کے مطابق میں سپاہی کی حیثیت سے نیلس کے ساتھ تھا اور نیلس تو نیسا کے ساتھ آرگس کے پاس پہنچ گیا، آرگس ہی وہ خاص شخص تھا جو اسلحہ خانے کا محافظ تھا۔ صورت ہی سے بوالہوس اور عیاش آدمی معلوم ہوتا تھا اس نے مسکراتے ہوئے ہمارا خیر مقدم کیا اور نیلس سے کہنے لگا۔

”آؤ میرے دوست نیلس، آج تمہارا گزر یہاں کیسے ہوا؟“

”بس کوئی خاص بات نہیں آرگس، تو نیسا نے کہا کہ اسلحہ خانے کی طرف سے ہوتے ہوئے چلو، سو میں یہاں آ گیا، ہاں تم خیریت سے تو ہوتا؟“

”بالکل خیریت سے ہوں دوست، ہاں میں نے تمہارے بارے میں سنا تھا کہ تم بری طرح زخمی ہوئے تھے، بڑی آرزو تھی تم سے ملنے کی تمہیں دیکھنے کی لیکن بس میری مصروفیت تم دیکھو مجھے یہاں ہر وقت رہنا ہوتا ہے اور میں دوسرے لوگوں پر بھروسہ نہیں کر سکتا اور تم نے دیکھا ہوگا کہ میرے محافظ مجھ سے اتنی دور ہیں کہ اسلحہ خانے تک ان کا سایہ بھی نہیں پہنچ سکتا میں خود ہی ہر چیز کی نگرانی کا قائل ہوں اور یہ فرض شناسی میرے نزدیک اچھی چیز ہے۔“

”بے شک بے شک آرگس تمہاری اس فرض شناسی کے حق میں ہے تو عام ہیں۔“

سوال کا جواب دو، کیا تمہاری پہنچ شاعری انوار کے اسلحہ خانے تک ہو سکتی ہے؟“

”ہاں..... گو اس کی سربراہی کسی اور کے سپرد ہے لیکن میں اسلحہ خانے تک پہنچ سکتا ہوں۔“

”اور اسلحے کا ایک عظیم الشان ذخیرہ بھی حاصل کر سکتے ہو۔“

”یہ زیادہ آسان نہیں ہوگا، لیکن کوشش کی جاسکتی ہے اور میں تمہارا مطلب سمجھ رہا ہوں، لیکن پھر ایک سوال آ جاتا ہے۔“

”کیا؟“

”ہم اسلحہ باغیوں تک کیسے پہنچائیں گے جبکہ ہمیں ان کے ٹھکانے کا کوئی علم نہیں ہے۔“

”میں اس سلسلے میں بھی تمہاری مدد کروں گا۔“

”لیکن کس طرح.....“

”میرے اوپر بھروسہ رکھو دوست، جبکہ تم اس بات کو تسلیم کر چکے ہو کہ میں بہت سی انوکھی صلاحیتوں کا مالک ہوں۔“ میں نے کہا اور نیولس کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا پھر اس نے گہری سانس لے کر کہا۔

”ٹھیک ہے، لیکن تم بھی مجھے بے حد پراسرار معلوم ہوتے ہو یو لیسس۔“

”یہی سمجھ لو۔“

”اور اب تو میرے ذہن میں ایک اور شہید جاگ اٹھا ہے۔“

”وہ بھی بتا دو۔“

”کہیں باغیوں سے تمہارا کوئی تعلق تو نہیں ہے۔“

”ہے۔“ میں نے جواب دیا۔

”اور تو کیا تم ان کے ٹھکانے سے واقف ہو۔“

”اب تم بچوں کی طرح سوالات کرنے لگے، نیولس، فی الوقت ان باتوں کو جانے دو، میرے بارے میں یہ تو سوچو کہ کیا تم سے ملاقات سے قبل میں ان معاملات میں دخل تھا۔“

”میرا خیال ہے نہیں۔“

”پھر تم خود فیصلہ کر سکتے ہو، اب میری رائے ہے کہ اس بارے میں نہ سوچو، پہلے اس کا فیصلہ کرو کہ اسلحہ خانے کے عظیم ذخائر کس طرح حاصل کئے جاسکتے ہیں۔“

”ہوں۔“ نیولس نے کہا اور دیر تک یہی سوچتا رہا پھر اس نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ”اس سلسلے میں کوئی تجویز سوچنا ہوگی۔“ اور میں خاموش ہو گیا میرا ذہن بہت سے خیالات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا، پھر میں نے اچانک سوال کیا۔

”اسلحے خانے کے محافظ کا کیا نام ہے؟“

”آرگس۔“ اس نے جواب دیا۔

”کس قماش کا انسان ہے؟“

”نیایش طبع، عورت خور جیسا کہ یہاں کے دوسرے لوگ ہیں بہت سے لوگ تو نوسسکی سے صرف اس لئے خوش ہیں کہ اس کے دور حکومت میں عورت کی عزت و عصمت بے معنی ہو کر رہ گئی ہے اور کوئی بھی شخص کسی بھی عورت پر ہاتھ ڈال سکتا ہے اس کی کسی فریاد کی شنوائی نہیں ہوتی۔“

”وہ محافظ بھی عورتوں سے متاثر ہوتا ہے۔“

”ہاں۔“

”ایسے کتنے لوگ تمہارے ساتھ ہیں نیولس جو خفیہ طور پر تمہارے لئے کام کریں اور یہ نہ سوچیں کہ تم کیا کر رہے ہو؟“

”ایسے لوگ۔“ نیولس نے کہا اور کسی سوچ میں ڈوب گیا پھر بولا۔ ”کم از کم بیس آدمی ایسے ضرور مل جائیں گے۔“

”کافی ہیں اچھا ایک بات اور بتا دو۔“

”ضرور۔“

”کیا تم اس بغاوت کی کامیابی کے لئے اپنی بہن کو داؤ پر لگا سکتے ہو، میرا مطلب ہے اس کے لئے کوئی خطرہ مول لے سکتے ہو؟“

”کیسا خطرہ؟“

”یہ کہ وہ آرگس کو اپنے جال میں پھانس لے اور ہمارے آدمی اسلحہ خانہ خالی کر دیں۔“ میں نے کہا

”ہاں کی تھی۔“

”نور علی؟“

”م“

پاکستان کی ساری کام



چنانچہ ہم لو میسا والوں پر غم نہ کیا۔
آئے، واپسی پر غم نہ کیا۔
میں پر بے حد اعتماد ہے لیکن اس کے باوجود.....
مورخاں یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس کے لیے کوئی کر خوب ہے۔
اور اس کے ماں باپ اس اسے کو دیکھ کر خوب ہے۔

Dar Digest **130** January 2015

پہاڑیوں میں۔“
 ”ان پہاڑیوں میں۔“ نولس نے تعجب سے پوچھا۔

”ہاں۔“
 ”دلیل..... لیکن.....“ نولس ایک دم ہلکا گیا۔
 ”تمہیں اتنا تعجب ہے؟“

”میں نہیں مان سکتا، ریوناؤں کی قسم میں نہیں مان سکتا، یہ پہاڑیاں تو کارگس سے بہت نزدیک ہیں اور نو سسکی کے فرشتے بھی نہیں سوچ سکتے کہ باغی اس کی شہ رگ سے اس قدر نزدیک ہیں، ہمیں تو زیادہ سفر بھی نہیں کرنا پڑا اور میں تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ میں نے جن باغیوں کی تلاش کے لئے اتنے دور دراز علاقے کا سفر کیا ہے وہ تو ہم سے اس قدر قریب ہوں گے اور بلاشبہ اگر باغی یہاں موجود ہیں تو پھر انہوں نے انتہائی مہارت کا ثبوت دے کر ایک ایسی جگہ کا انتخاب کیا ہے جس کے بارے میں کارگس کے رہنے والے سوچ بھی نہیں سکتے۔“

”کیا میں ان باغیوں سے رابطہ قائم کر لوں؟“
 میں نے نولس سے پوچھا۔

”ضرور کر لو۔“ نولس نے مسکرا کر کہا اور پھر بولا۔ ”میں تو صرف یہ جانتا ہوں کہ میری تقدیر بہت بلندی پر ہے لیکن حیثیت بدلنے کے بعد اگر تم کارگس کے باغیوں کی حیثیت سے اس وقت مجھے ملتے جب میں باغیوں کی تلاش میں تھا اور کارگس کا وفادار تھا تو اس وقت بلاشبہ باغیوں کی بد نصیبی ہوتی لیکن یوں لگتا ہے کہ بغاوت کا میاب ہو کر رہے گی اور تم میرے دوست جس قدر پر اسرار انسان تھے اس کا اندازہ تو مجھے پہلے ہی ہو چکا تھا اور میرے دوست پولیس میں اپنی باتوں سے تمہیں زیادہ پریشان نہیں کروں گا تم جلدی سے ان سے رابطہ قائم کرو۔“ اور میں نے گردن ہلا دی۔

اس کے بعد میں نے اپنے مخصوص اشارے کرنا شروع کر دیئے۔ میرے ہاتھ ایک مخصوص انداز میں چل رہے تھے، گویا ایک طویل داستان تھی جو میں

جگہ جہاں میں نے سرنگیں پھیلائی ہوئی تھیں اور یہ سرنگیں ہماری ہی کاوشوں کا نتیجہ تھیں۔ وہ جگہ یہاں سے قریب تر تھی جہاں ہم لوگ موجود تھے میں اگر چاہتا تو ایک طویل فاصلے سے نولس کو اس ٹھکانے تک لے جاتا لیکن اسلحے سے لدے ہوئے گھوڑے میرے لئے بہت قیمتی تھے۔ یہ ہماری بہت معمولی محنت سے حاصل ہوئے تھے یعنی پہلے لوہے کا حصول اور اس کے بعد ہتھیار سازی، گویا ایک طویل کام ایک مختصر سے وقت میں طے ہو گیا تھا اور ایک ایسا کام جس کے لئے ہمیں اچھی خاصی دشواریوں سے گزرنا ہوتا۔

مجھے اندازہ تھا کہ سرنگوں کے آس پاس پوشیدہ رہنے کی جگہیں اور کمین گاہیں کہاں کہاں ہیں چنانچہ تھوڑے سے سفر کے بعد ہم ایک کمین گاہ تک پہنچ گئے۔ اس دوران میں نے دوسرے اور بھی کام کئے تھے، یعنی میں نے یہ بات ذہن میں رکھی تھی کہ کارگس تک پہنچنے کا مختصر ترین راستہ کون سا ہو سکتا ہے اور اگر ہم ایک سرنگ ایسی بنالیں جو کسی قریبی سرنگ سے جا کر مل جائے تو اس کا ایک راستہ شہر میں کھلے تو اس کے لئے ہمیں کتنے فاصلے تک سرنگ کھودنا ہوگی اور اس کے لئے کیا نقشہ ترتیب دینا ہوگا۔ یہ ایک بڑا کام تھا جو ہمیں انجام دینا تھا اور سب سے بڑا کام ہو چکا تھا یعنی ہتھیاروں کی بازیابی اور نو سسکی کے لئے خاصا سخت ہوتا تھا جس میں اس کی فکرت ایک یقینی امر تھا۔ چنانچہ میں نے کمین گاہوں سے تھوڑے فاصلے پر پہنچ کر نولس کی جانب دیکھا اور مسکرا کر کہا۔

”نولس ہم باغیوں کی سرزمین تک پہنچ گئے ہیں؟“

”کیا مطلب؟“ نولس حیرت سے اچھل پڑا۔
 ”ہاں۔“

”کیا کہہ رہے ہو پولیس؟“
 ”جو کہہ رہا ہوں درست کہہ رہا ہوں، لیکن باغی

کہاں ہیں؟“
 ”باغی بہت ہی قریب موجود ہیں ان

”بالکل درست پولیس میں دراصل اس سلسلے میں مجھے تم سے ہی مشورہ لینا تھا، ظاہر ہے کوئی نہ کوئی جواب تو دیں گے ہی۔“

”ایک انوس کو اس بات کا علم ہے کہ باغیوں کے گروہ بہت زیادہ مضبوط ہیں، ان کی کارروائیاں ہماری کارروائیوں سے زیادہ موثر ہوا کرتی ہیں، چنانچہ اگر ہم اس کو کوئی کہانی سنائیں گے تو وہ اس کہانی پر شبہ نہیں کرے گا۔“

”خوب تو واپس لے جانے والے آدمی کتنے ہوں گے؟“ میں نے سوال کیا۔

”صرف پانچ..... چھٹا میں اور ساتویں تم.....“

”مناسب۔“ میں نے جواب دیا اور نیولس

دوسرے کام انجام دینے لگا۔ پھر اس نے اپنے آدمیوں کو قیام کا حکم دے دیا۔ گھوڑوں کے اوپر سے سامان اتارا جانے لگا اور یہ قافلہ قیام پذیر ہو گیا، لیکن زیادہ دیر نہ لگی تھی کہ پہاڑی چٹانوں نے گھوڑے اگلنا شروع کر دیے گھوڑے سوار اس برق رفتاری سے قافلے کے چاروں طرف جمع ہو رہے تھے کہ تعجب ہوتا تھا۔

میں نے اپنے لوگوں کی کارروائی دیکھی اور متاثر

ہوا، یہ لوگ بہت ہی زیادہ ذہانت کا ثبوت دے رہے تھے اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ اس کارروائی میں ایمر دس بھی شریک تھا۔ یقیناً اسے اطلاع دی گئی ہوگی کہ کوئی قافلہ یہاں آ کر رہا ہے اور اس سے اشارے نشر کئے جا رہے ہیں، لیکن دلچسپ بات یہ تھی کہ ایمر دس نے سرنگوں کے درمیان اتنا طویل سفر اتنی جلدی طے کر لیا تھا کیونکہ جس جگہ ہمارا خصوصی ٹھکانہ تھا وہاں سے اس سرنگ تک کا فاصلہ کافی طویل تھا اور اگر سرنگوں میں گھوڑے بھی دوڑائے جاتے تو یہ فاصلہ اتنی جلدی طے نہیں ہو سکتا تھا۔ بہر حال ہر بات سے قطع نظر یہ اعلیٰ کارکردگی کی ایک عمدہ مثال تھی یا پھر یہ بھی ممکن تھا کہ ایمر دس پہلے کہیں قریب ہی موجود ہو۔

پھر میں نے لیمبر دس کو دیکھا اور ایمر دس نے

مجھے، باغی ہمارے چاروں طرف پھیل گئے اور پھر

باغیوں کو سنار ہاتھ اور پھر میں نے اپنا اشارہ نشر کرنے کے بعد نیولس کی جانب دیکھا جو بخور میرے اشاروں کو دیکھ رہا تھا، میں نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

”نیولس، تم اپنے آدمیوں کو قیام و طعام کا بندوبست کرنے کا حکم دو۔“

”کیا تم یہاں قیام کرو گے؟“

”نیولس تم مجھے ایک بات کا جواب دو؟“ میں

نے نیولس کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔

”ضرور پولیس میں ضرور.....“

”کیا یہ سارے آدمی تمہارے قابل بھروسہ

ہیں، کیا یہ ہمارے خلاف تو نہیں جاسکتے؟“

”تم رازوں کی بات کرتے ہو پولیس میں۔“

”بالکل..... میرا مقصد یہی ہے۔“

”اور تمہارا مقصد یہ ہے کہ باغی ان کے سامنے

اپنے خفیہ ٹھکانوں سے باہر نہ آئیں۔“

”ہاں یہ بھی صحیح ہے۔“

”تو اس کے لئے میں تمہیں ایک تجویز پیش

کر سکتا ہوں۔“

”وہ کیا؟“

”ان تمام لوگوں کو باغیوں کے حوالے کر دیا

جائے اور ان میں سے صرف چند افراد ساتھ رہنے دیئے

جائیں جنہیں ہم واپس لے جاسکیں جن پر مکمل اعتماد کیا

جاسکتا ہے۔ ظاہر ہے واپس جا کر باقی لوگوں کے

بارے میں ہمیں کوئی نہ کوئی کہانی تو سنانا پڑے گی۔“

”کیا مطلب؟“

”مطلب یہ کہ جب ہم واپس ایک انوس کے

پاس پہنچیں گے تو کیا اسے یہ نہیں بتائیں گے کہ ہمارا

سارا سامان کیسے لوٹا گیا اور قافلے کے آدمی کس طرح

ہلاک کر دیئے گئے اس وقت تمہارے خیال کے

مطابق ہمیں کیا جواب دینا ہوگا۔“ نیولس نے مجھ سے

سوال کیا۔

”ظاہر ہے ایسا جواب جس سے ایک انوس مکمل

طور پر مطمئن ہو سکے۔“ میں نے جواب دیا۔

محبت

ورحقیقت زندگی تاریک ہے، سوائے اس وقت کے جب لگن ہوتی ہے اور لگن اس وقت تک لازمی ہے جب تک علم نہیں ہوتا اور ہر قسم کا علم اس وقت تک بے کار ہے جب تک عمل نہ ہو اور ہر عمل اس وقت تک کھوکھلا ہے، جب تک محبت نہ ہو، جب تم محبت کے ساتھ عمل کرتے ہو تو تم خود کو اپنے سے اور خدا سے باندھ لیتے ہو۔

(انتخاب: محمد علی رضا - سٹڈی آف دم)

”کیا میں پولیس کو پولس بھی کہہ سکتا ہوں؟“
 ”ہاں میں پولس ہی ہوں۔“ میں نے جواب دیا اور نیولس کے روٹے کھڑے ہو گئے اس کا چہرہ شدت حیرت سے سرخ ہو گیا تھا، پھر وہ کافی دیر تک کچھ نہ بول سکا، اب وہ پھر کے بت کی طرح میرے ساتھ چل رہا تھا۔ جیسے اسے اپنی ناواقفیت پر شدید حیرت ہو۔ سرنگوں کا یہ جال جتنا طویل تھا نیولس اس کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا، آخر کار اسلحہ سرنگوں میں منتقل ہو گیا اور پھر میں نے فیصلہ کیا کہ نیولس کو ان سرنگوں کی سیر کراؤں گا، میں نے اس کے پندرہ ساتھیوں کو اپنے ساتھیوں کے حوالے کر دیا اور نیولس نے انہیں یہ بات بتادی تھی کہ انہیں یہاں کس طرح رہنا ہے۔ باقی پانچ آدمی جو اسے واپس لے جانا تھے ان کو بھی اس نے منتخب کر لیا تھا، یونان ان کے لئے ایک الگ جگہ منتخب کر دی گئی تھی۔ اس کے بعد میں نیولس کو لے کر چل پڑا اور پھر میں نے نیولس کو وہ عظیم الشان غار دکھایا جو قیدیوں کی رہائش گاہ تھی اور غار میں موجود سرنگوں کے ذریعے وہ دور دور کے علاقوں میں جاسکتے تھے۔

ایمر وں دو آدمیوں کے ساتھ میرے سامنے پہنچ گیا، وہ گھوڑے سے اتر اور میرے نزدیک آ کر جھک گیا۔

”عظیم سربراہ۔۔۔۔۔“ اس نے مودبانہ انداز میں کہا۔ ”کیا حکم ہے؟“ اور میں نے نیولس کی جانب دیکھا اس کی نگاہوں میں کچھ جاننے کی چمک تھی، بہر حال میں نے اس بات کو کوئی اہمیت نہ دیتے ہوئے ایمر وں سے کہا۔

”ایمر وں، یہ سارا اسلحہ حاصل کرلو، میرا خیال ہے یہ تمہاری تمام تر فوجوں کے لئے کافی ہے۔“
 ”یقیناً، کیا یہ سارا سامان اسلحہ ہے؟“
 ”ہاں۔۔۔۔۔ تم اسے با آسانی لے جاسکتے ہو۔“
 ”اور یہ لوگ؟“ ایمر وں نے سوال کیا۔

”سب ہمارے وفادار ہیں اور سب ہمارے ساتھی۔“

”واہ۔۔۔۔۔ گویا تم نے وہاں بھی ایک حیرت انگیز کارنامہ انجام دیا ہے۔“ ایمر وں نے سوال کیا۔
 ”جو چاہے سمجھ لو، میں تجھے کچھ سوچنے سے نہ روک سکوں گا۔“ میں نے جواب دیا۔

اور ایمر وں اسلحہ سرنگوں کے ذریعے اپنے فقیہ ٹھکانوں تک پہنچانے لگا۔ نیولس کے ساتھی متحیرانہ انداز میں باغیوں کو دیکھ رہے تھے، خود نیولس کی حالت بھی حیرت انگیز تھی، وہ حیرت سے منہ پھاڑے مجھے دیکھ رہا تھا اور میں اس کی وجہ سمجھ گیا تھا، وہ ایمر وں کے الفاظ پر حیران تھا جو اس نے میری شان میں کہے گا، پھر جب میں نیولس اور اس کے ساتھیوں کو لے کر سرنگ کے اندر داخل ہوا تو نیولس نے آہستہ سے پوچھا۔

”کیا یہ درست ہے میرے دوست پولیس؟“
 ”ہاں نیولس، تم نے کبھی غور ہی نہیں کیا، کیا تم نے کبھی اس بات پر سوچا کہ باغیوں کا سربراہ کون ہے؟“

”میں نے سنا تھا کہ اس کا نام پولس ہے۔۔۔۔۔ اوہو۔۔۔۔۔ اچانک نیولس کو اپنی بات کا احساس ہوا اور اس کی آنکھیں شدت حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

نقشے اور ہدایات تو دینا ہی تھیں میں نے اسے پوری تفصیل سمجھا دی اور نولس گردن ہلانے لگا۔
 ”تو تم نے جو کچھ کیا یولس میں اس پر سخت حیران ہوں، لیکن میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ ارہ خانوں کی دادیوں نے ایک ناقابل یقین کارنامہ سرانجام دیا ہے اور وہ کارنامہ ہے تیری پیدائش اور تیری پرورش۔“
 ”حیرت چھوڑ لیمر دس، کیا تو اس اسلحے سے مطمئن ہے۔“

”اسلحہ پہلے بھی ہمارے پاس کافی موجود ہے، لیکن اس عظیم الشان ذخیرے کے بعد تو ہماری ساری ضروریات پوری ہو گئیں۔“
 ”سرنگ کا نقشہ سمجھ لیا۔“
 ”ہاں۔“

”اور اب ہادری اور تمہاری ملاقات سرنگ کے اختتام پر کارگس میں ہی ہونی چاہئے، اس کام میں تم جتنی جلدی کر لو بہتر ہے۔“
 ”تم مطمئن رہو یولس سارے کام تمہاری مرضی کے مطابق ہی ہوں گے۔“

”خوراک کی کیا کیفیت ہے؟“
 ”محفوظ ذخائر ابھی تک موجود ہیں بلکہ ان میں کافی اضافہ ہوا ہے ہمارے ساتھی بہترین غلہ اور سبزیاں پیدا کر رہے ہیں، ان کا جذبہ قابل داد ہے۔“
 ”یقیناً اس کے بعد ان کی زندگی میں جو خوشگوار تبدیلیاں آئیں گی وہ ان کی محنتوں کا ثمر ہوں گی، اس کے علاوہ یولس ہمارے ہاتھ ایسے لوگ بھی لگے ہیں جو انہی قیدیوں میں شامل تھے جو ہمارے ساتھ فرار ہوئے تھے۔“

”ادہ..... کتنی تعداد ہے ان کی؟“
 ”میں آدمی تھے۔“
 ”کہاں مل گئے؟“
 ”ویرانوں میں بھٹک رہے تھے، موت کے نزدیک تھے اگر ہم ان کی زندگی نہ بچاتے تو وہ موت کا شکار ہو گئے ہوتے۔“

یہاں ہمارا جتنا بھی وقت صرف ہوا صرف نولس کو ان علاقوں کو دکھانے میں صرف ہوا تھا اور اس کے بعد میں نے یہ کھیل ختم کر دیا اب ہم واپسی کا پروگرام بنا رہے تھے۔ نولس نے جو کچھ دیکھا اور اسے میری شخصیت کے بارے میں جو کچھ بھی معلوم ہوا وہ اس کے لئے باعث حیرت تھا اور اب وہ اکثر حیران ہی رہا کرتا تھا، اکثر وہ تنہائی میں میری شکل دیکھا کرتا تھا، ایک دو بار میں نے اس سے پوچھا تو وہ کہنے لگا۔

”میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا یولیس کہ تم کون اور کیا ہو گے، افسوس میں تمہارے ساتھ اتنی اچھی طرح پیش نہیں آیا جتنا مجھے آنا چاہئے تھا۔“
 ”اس بات کو ذہن سے نکال دو نولس۔۔۔ سب سے اچھی بات یہ ہے کہ تم میرے ہمنوا بن گئے ہو۔“

”ہاں اور شاید یہ میری خوش نصیبی ہے ورنہ تم تو میرے سرنگ پہنچ گئے تھے، اگر میں تمہارا دشمن ہی ہوتا تو کیا تمہارے ہاتھ با آسانی میری گردن تک نہ پہنچ جاتے، اور اس کے بعد تم مجھے نہایت اطمینان سے قتل کر سکتے تھے۔“

”اور اس کے لئے میں وقت کا شکر گزار ہوں نولس کہ اس نے یہ موقع نہ آنے دیا، یہ حقیقت ہے نولس کہ اگر تم تبدیل نہ ہوتے اپنے ارادوں میں تو میں تمہیں زیادہ دیر زندہ نہ رہنے دیتا، لیکن بہر حال تمہارے روپ میں نہ صرف مجھے اپنا ایک ہمنوا بلکہ اتنا عظیم دوست بھی ملا جس کی دوستی پر میں بجا طور پر فخر کر سکتا ہوں۔“ میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

”میرا خیال ہے نولس اب ہمیں واپس چلنا چاہئے۔“

”بالکل، میں خود بھی اس کام میں اب جلدی کرنا چاہتا ہوں۔“ نولس نے سنجیدگی سے جواب دیا اور پھر ہم سرنگوں کے سفر سے واپس چل دیئے۔ لیمر دس اسلحے کے یہ ذخیرے دیکھ کر ششدر رہ گیا تھا اس کے پاس رہنے کے لئے مجھے بہت کم وقت ملا تھا، لیکن اسے

سے گھسے۔“

”اس صورت میں تو ہم محفوظ ہیں۔“
”سو فیصدی ہمارے لئے کوئی خطرہ نہیں ہے۔“
نولس نے سٹپن لہجے میں کہا اور پھر میں نے اسے مزید
تفصیل بتانے کا فیصلہ کر لیا۔

”اس کے علاوہ میں ایک اور انکشاف کرنا
چاہتا ہوں۔“

”اوہ..... اب اور کوئی انکشاف باقی رہ گیا ہے
کیا، مجھے تو آج تک حیرت ہے کہ باغیوں کا عظیم سربراہ
میرے ساتھ ہے۔“ نولس نے مسکراتے ہوئے کہا۔
”نہیں..... وہ بات میری ذات سے متعلق
نہیں ہے۔“
”پھر؟“

”محل ہی کی ایک بات ہے لیکن میرے خیال
میں تم خود بھی اس سے لاعلم ہو ورنہ اس کا تذکرہ ضرور
کرتے۔“

”کیسی کون سی بات ہے۔“
”تم نے کبھی مجھے ارکاش کے بارے میں نہیں
بتایا؟“

”ارکاشہ..... خوشکی کی ماں.....“
”ہاں۔“
”اس کے بارے میں کوئی قابل ذکر بات ہی
نہیں تھی۔“

”کیا وہ زندہ ہے؟“
”ہاں اور محل کے ایک گوشے میں رہتی ہے۔“
”کیا وہ گوشہ نشین ہے؟“
”ہاں اس نے خود ہی یہ زندگی اختیار کی ہے
لیکن اس کا بیٹا خوشکی اس کا پورا پورا خیال رکھتا ہے اور
اس نے اسے محل ہی کے ایک حصے میں رکھا ہوا ہے۔“
”کیا خوشکی اس سے ملنے بھی جاتا ہے؟“

”یہی سنا ہے کہ وہ اپنی ماں کی خدمت میں
حاضری دیتا رہتا ہے۔“
”تمہارے کسی سپاہی نے تمہیں اس حاضری کی

”اچھا کیا تم نے؟“

”لیکن ان سے ان کے بارے میں جو
معلومات حاصل ہوئیں اس نے ہم سب کے حوصلے اور
بڑھادیئے ہیں۔“

”خوب..... وہ کیا معلومات تھیں؟“
”ان لوگوں پر عرصہ حیات تنگ تھا ایسی اذیتیں
برداشت کرنا پڑی تھیں کہ سن کر خوف آ رہا ہے اس لحاظ
سے ہمارے ساتھیوں نے تو بہترین وقت گزارا ہے۔“
”کہاں ہیں وہ لوگ؟“

”ہم نے انہیں خود میں شامل کر لیا ہے اور وہ
لوگ بھی اب ہمارے مشن سے بہت قریب ہیں۔“
”ٹھیک ہے، کوئی حرج نہیں ہے، لیکن ہر شخص کو
مصروف رکھو، کسی کو کامیابی کا شکار نہیں ہونا چاہئے۔“
”وہ سب کاشت کر رہے ہیں۔“
”ٹھیک ہے ایمر دس کوئی اور سوال؟“
”نہیں۔“

”میری ہدایات پر تم نے غور کر لیا ہے۔“
”ہاں، بخوبی اور تم یہاں کے معاملات سے بے
فکر رہو، مجھے یقین ہے کہ تم کوئی ناقابل یقین کارنامہ
انجام دینے میں مصروف ہو گے بہر حال میں بذریعہ
سرنگ کارگس پہنچ رہا ہوں۔“

ایمر دس کی یقین دہانی کے بعد میں وہاں سے
چل پڑا، پانچ ساتھی ہمارے ساتھ تھے اور ہم نے ان
کی حالت خستہ بنا دی تھی اور اب ہم کارگس واپسی کا
سفر کر رہے تھے، میرے ذہن میں ایک اور خیال بھی تھا
جس کا تذکرہ میں نے نولس سے کیا۔

”نولس کیا اسلیم کی گمشدگی کا راز کھل گیا ہوگا؟“
”اوہ ممکن ہے.....“
”کیا ان کا شبہ ہمارے اوپر بھی جاسکتا ہے؟“
”ناممکن۔“

”پھر وہ کیا سوچیں گے؟“
”دوسری بات ہے کہ وہ اسے باغیوں کی حرکت
سمجھیں اور تحقیقات کریں گے کہ کارگس میں باغی کہاں

تفصیل نہیں بتائی۔“

ایسی خوفناک بات کہ اگر کارمس کے لوگوں کو معلوم ہو جائے تو ایک طوفان کھڑا ہو جائے۔

”اس طوفان کا مقبوض کیا ہوگا۔“ میں نے نیولس کو گھورتے ہوئے کہا۔

”قتل و غارت گری اور بے پناہ خونریزی کیونکہ بہر حال نیولس کے ہموا اس کے لئے سب کچھ کریں گے اور وہ طاقتور ہیں۔“

”خود ایگانوس کا کیا رویہ ہوگا؟“ میں نے دوسرا سوال کیا اور نیولس سوچ میں ڈوب گیا پھر گردن ہلا کر بولا۔

”اس کے بارے میں نہیں کہہ سکتا ممکن ہے ایگانوس کا نظریہ بدل جائے اور وہ نیولس کا دشمن بن جائے۔“

”اس کے امکانات موجود ہیں۔“

”کافی حد تک، کیونکہ اگر خود ایگانوس اس پہلو کو نظر انداز کرنا چاہے تو اس کے بس کی بات نہیں ہے اس کے خلاف اس قدر نفرت پھیل جائے گی کہ وہ اس نفرت کا سامنا نہیں کر سکے گا۔“

”گویا دونوں پہلو ہمارے حق میں ہیں؟“

”کیا مطلب؟“

”میں ایگانوس کو اس ایسے سے روشناس کرانا چاہتا ہوں نیولس اور اب واپس جانے کے بعد تمہارا کام یہ ہوگا کہ میری مستقل ڈیوٹی نیولس کی پرہی لگا دو۔“

”آہ... تم اس سے کیا حاصل کرنا چاہتے ہو؟“

”ان دونوں میں اختلاف، لیکن اس کا اظہار میں اس وقت کروں گا جب میرا کام مکمل ہو جائے گا۔“

”اوہ تم کس قدر خطرناک ہو یو لیسس، بلاشبہ تمہیں اس کا حق پہنچتا ہے کہ تم باغیوں کی سربراہی کرو اور اس کے بعد ملک کا نظم و نسق سنبھالو۔“ نیولس نے کہا اور میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی، احمق نوجوان غلط فہمیوں کا شکار تھا اسے کیا معلوم کہ میں کیا تھا اگر وہ میرے بارے میں جانتا ہوتا تو حیرت کا مجسمہ ہو جاتا۔ (جاری ہے)

”نہیں..... کوئی خاص بات ہے۔“ نیولس کی آنکھوں سے تجسس جھانک رہا تھا۔ لیکن میں نے اس بات کا کوئی جواب نہیں دیا اور ایک اور سوال داغ دیا۔

”کیا ایگانوس اپنی بیٹی سے ملنے کبھی نہیں جاتا؟“

”ایگانوس.....“ نیولس چونک پڑا، پھر جلدی سے بولا۔

”نہیں میرا خیال ہے وہ اس سے نہیں ملتا۔“

”کیوں؟“

”وہ بیٹی سے زیادہ خوش نہیں ہے، شاید اس کے ذہن میں یہ بات ہے کہ ارکاشہ کی وجہ سے اس کی حکومت چھین گئی تھی۔“

”کیا اسے اس سے محبت بھی نہ ہوگی؟“

”ایسی بات بھی نہیں ہے لیکن وہ اپنے ہی جوڑ توڑ میں مصروف رہتا ہے، اسے باغیوں کا بھی خوف ہے اس لئے وہ ہر وقت جاگتا رہتا چاہتا ہے۔“

”ہوں تو پھر وہ ضرور لاعلم ہوگا۔“

”کون سی بات ہے؟“

”وحشی ورنہ سو فیصدی جانور ہے، میری سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ انسان کی اولاد کس طرح ہو سکتا ہے۔“

”یعنی۔“

”گور بلا اپنی ماں کو صرف عورت سمجھتا ہے اور ارکاشہ کا بدن اس کے ناخنوں کی خراشوں سے بھرا ہوا ہے وہ مجبور ہے اور بیٹے سے نفرت کرتی ہے۔“

”کیا؟“ نیولس کا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا۔

”ہاں نیولس، ظاہر ہے کہ ایک جانور ہے اس سے زیادہ کیا توقع رکھتے ہو اور یہ تمہاری اس دنیا کا سب سے المناک پہلو ہے تم تابع ہو اس کے جس کی چیرہ دستیوں نے تحت المعرکی کا مستقبل تاریک کر رکھا ہے وہ صرف ایک جانور ہے، انسانوں کی صفات رکھنے والا جانور۔“

”ہاں بڑی بھیا تک بات کہی تم نے یو لیسس“



فطرت

عامر ملک - راویلپنڈی

انسان کے لئے یہ لازم ہے کہ اپنی زندگی کی حقیقت کو فراموش نہ کرے بلکہ غور کرے کہ حکم الہی کیا ہے اور قانون قدرت سے انحراف اس کے لئے باعث ہلاکت ہے۔

عادت تو آسانی سے بدل جاتی ہے مگر فطرت کا بدلنا ناممکن ہوتا ہے کہانی پڑھ کر غور کریں

گزار رہا تھا۔

جب وہ ذرا بڑا ہوا تو ایک دن حسب معمول اس نے نرم و نازک جھاڑیوں پر منہ دے مارا۔ وہ حیران ہو گیا "کمال ہے۔" وہ چیخا۔ "یہ کیا ہو گیا؟" جو کچھ ہوا تھا۔ اسے اتفاق سمجھ کر اس نے قریبی جھاڑیوں پر پھر منہ مارا۔ اس کی پھنکار سے وہ جھاڑیاں راگھ کا ڈھیر بن گئیں۔ "یہ تو میری وجہ سے ہو رہا ہے۔" نرم خوشامپ

وہ ایک نرم خو۔ پھوٹا سا سانپ تھا، جو افریقہ کے صحراؤں میں اکیلا ہی پروان چڑھ رہا تھا۔ آگے پیچھے کوئی نہ تھا۔ اس لئے وہ یہ بھی نہ جانتا تھا کہ وہ کتنی زہریلی نسل سے تعلق رکھتا ہے اور اسکے سانس میں کتنا زہر بھرا ہوا ہے کہ اس کی پھنکار سے پتھر بھی راگھ بن سکتے ہیں۔ وہ اپنے آپ کو ایک معمولی سانپ سمجھتا۔ نرم نرم اور معمولی غذاؤں سے اپنا پیٹ بھرنا اور مزے کی زندگی

نے اپنے آپ سے کہا اور پھر صدے کی وجہ سے آنسو بہانے لگا۔

تین دن تک وہ اکیلا ہی غار میں پڑا سوچتا رہا۔ وہ جن چیزوں کو اب تک پسند کرتا چلا آیا تھا وہ چیزیں اس کے سانس کی حدت اور زہر سے راکھ میں تبدیل ہونے لگی تھیں۔

چوتھے دن وہ رینگتا ہوا غار سے باہر نکلا۔ صحرا کی وسعتوں کو دیکھ کر وہ عزم سے بولا۔ ”میں نیلی غار میں رہنے والے بزرگ سے منوں گا وہ ایک عقل مند انسان ہے اس کے پاس میری مشکل کا کوئی نہ کوئی حل ضرور ہوگا۔ وہ ایک نیک انسان ہے وہ میری مدد ضرور کرے گا۔“

بوڑھے بزرگ نے بڑے تحمل سے سانپ کی گفتگو سنی۔ پھر مایوسی کی حالت میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”انسوس میں تمہارے لئے کچھ نہیں کر سکتا تم ویسے ہی رہو گے۔ جیسے خدا نے تمہیں بنایا ہے۔ تمہاری سرشت اور خصلت تبدیل نہیں ہو سکتی۔ نو جوانی نے تمہیں جذباتی بنادیا ہے اگر تم انسان ہوتے تو میں شاید تمہیں سیدھی راہ پر لے آتا۔ مگر تم سانپ ہو۔ تم اپنے مقدر کو قبول کر لو۔ یہی تمہاری قسمت ہے جس سے تم بھاگ نہیں سکتے۔ اگرچہ تم چاہتے ہو کہ تمہاری پھنکار سے درخت، جھاڑیاں اور پتھر جل کر راکھ نہ ہوں مگر برسہا برس کی ریاضت اور علم نے مجھے جو کچھ دیا ہے اس کی روشنی میں، میں تمہیں کوئی امید نہیں دلا سکتا۔ تم اس نسل سے تعلق رکھتے ہو جس میں کوئی تغیر رونما نہیں ہو سکتا۔“

”قابل احترام بزرگ!“ سانپ نے کہا۔ ”میں آپ کی دانش اور بصیرت پر اعتماد کرتا ہوں۔ مگر میں نے سن رکھا ہے کہ اگر کوئی چاہے تو وہ اپنا آج بدل سکتا ہے۔“

”ننھے سانپ! تمہارے لئے یہ ممکن نہیں ہے کہ تم اپنا آپ بدل سکو۔“ ننھے سانپ کو اس گفتگو سے بڑا دکھ ہوا۔ اس نے کراہتا شروع کر دیا۔ پھر اس کے منہ سے زہریلی پھنکار نکلی اور لمحوں میں وہ بزرگ راکھ بن

گئے۔ راکھ کے اس ڈھیر کو دیکھ کر سانپ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ پھر اس نے اپنے آپ سے کہا۔ ”یہ درست ہے کہ وہ میری وجہ سے جل کر راکھ ہو گیا ہے۔ مجھے اس کی موت کا غم ہے۔ مگر اس میں میرا کیا قصور۔۔۔۔۔ اس نے جو فلسفہ مجھے سمجھانے کی کوشش کی۔ وہ میرے لئے بیکار تھا۔ شاید یہ فلسفہ اس پر پورا اترتا تھا۔ یقیناً اس کی موت اسی طرح لگھی ہوگی اور وہ اپنے اس انجام سے نہ بچ سکتا تھا۔“ پھر سانپ نے چند لمحوں کے توقف کے بعد اپنے آپ سے کہا۔ ”دیکھا تم نے ایک ہی پھنکار میں وہ جل کر راکھ ہو گیا۔“

سانپ رینگتا ہوا اب زرد غار کے پاس پہنچا۔ جہاں ایک کیمیا دان رہتا تھا۔ غار میں داخل ہونے سے پہلے سانپ نے اپنے آپ سے کہا۔

”مجھے اس ”رضا برضا“ کے فلسفے پر ایمان رکھنے والے بزرگ کے بجائے اس کیمیا دان سے ملنا چاہئے تھا۔“ کیمیا دان نے بڑی دلچسپی سے سانپ کی باتیں سنیں۔ جب اس نے بزرگ کے انجام کا واقعہ سنا تو وہ زور زور سے ہنسنے لگا۔ ”یہ فلسفی اور اصول پرست ایسے ہی مرا کرتے ہیں۔ مگر تم کوئی فکر نہ کرو جلد ہی میں تمہاری مشکل حل کر دوں گا۔ ہر زہر کا ایک تریاق ہوتا ہے۔ لیکن ذرا یہ احتیاط کرنا کہ تمہارا سرا دھرا دھر نہ ہلے۔“

کیمیا دان غار کے اندر ادھر ادھر گھومنے لگا۔ جیسے کسی چیز کی تلاش میں ہو۔ وہ کہہ رہا تھا۔

”میں ابھی تمہاری مشکل کا حل تلاش کر لوں گا۔ فطرت بے لچک نہیں ہوتی۔ ہر چیز کا نعم البدل ہوتا ہے۔ ہر راز کی ایک کلید ہوتی ہے بس آدمی کا کام اتنا ہے کہ وہ اس کلید تک رسائی حاصل کرے۔“

وہ پھر فخر سے بولا۔ ”میری طرف دیکھو میں سکے کے ٹکڑوں پر ایسا عمل کرتا ہوں کہ وہ خالص سونا بن جاتا ہے۔ تمہارے چھوٹے اور معمولی سے مسئلے کا حل تلاش کرنا بڑی بات نہیں۔“

”آپ درست فرماتے ہیں۔“ سانپ نے کہا۔ ”مگر جب تک۔“

سوچیں اور.....

☆..... ہمیشہ خوشیوں کو ڈھونڈو کیونکہ غم بغیر ڈھونڈے مل جاتے ہیں۔

☆..... عادتیں بے شک آپ کی ہوتی ہیں مگر آپ دوسروں کے لئے ہوتے ہیں۔

☆..... بے موقع گفتگو انسان کو لے ڈوبتی ہے۔

☆..... انسان عقل سے پہچانے جاتے ہیں، عقل سے نہیں۔

☆..... زندگی کا مفہوم سمجھ میں آتے آتے ساری زندگی بیت جاتی ہے

☆..... محبت پانا ہر کسی کے لئے ممکن نہیں مگر محبت پھیلانا سب کے لئے ممکن ہے۔

☆..... انسان وہی ہے جو دوسروں کی فکر کرے، صرف اپنی پرواہ کرنے والا آدمی کہلاتا ہے۔

☆..... دوسروں کی عیب جوئی کرنے سے پہلے خود کو ایک بار ضرور دیکھو کیونکہ تم میں بھی کوئی عیب ضرور ہوگا۔

☆..... احساس کمتری اور احساس برتری دونوں ہی میں مبتلا انسان کبھی کامیاب نہیں ہوتا۔

☆..... کوئی شک نہیں کہ میرے کپڑے پھٹے پرانے ہیں لیکن یہ میرے اپنے ہیں۔

(ایس اتمیاز احمد - کراچی)

”جب تک کیا.....؟“ کیمیا دان نے کہا۔
یہی تا کہ جب تک تمہارا سانس زہر میں رچا ہوا ہے اس وقت تک کوئی حل نہیں مل سکتا یہ معمولی بات ہے۔“
کیمیا دان نے ایک بوتل سے ایک گرم محلول نکال کر چمچے میں ڈالا۔ محلول سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ ”یہ ایک زہر ہے جس میں تمہارے زہر کا توڑ موجود ہے۔ اس کو پی جاؤ۔“

”یہ تو بہت گرم دکھائی دیتا ہے۔ مجھے جلادے گا۔“ سانپ نے شک کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔
”یہ کیا.....؟ گھبرا گئے۔ تجربے سے ڈرتے ہو، کمال ہے۔ پی جاؤ اسے۔ تمہیں اس سے کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ شاید تمہیں علم نہیں کہ تمہاری نسل کے سانپ لازوال اور ناقابلِ تسخیر ہوتے ہیں۔“

”آپ کیسے کہتے ہیں کہ میں لازوال ہوں، ناقابلِ تسخیر ہوں۔“ سانپ نے پوچھا۔
”میرا خیال ہے کہ تم شرمیلے ہو۔ مگر نہیں۔ اصل میں تم ان پڑھ ہو۔ تمہیں کسی بات کا علم ہی نہیں ہے۔ سانپ پر کسی زہر کا اثر نہیں ہوا کرتا۔ کوئی جانناز ہی تمہاری موت کا سبب بن سکتا ہے۔ وہ بھی اس صورت میں کہ وہ تمہاری زہر ملی پھنکار سے محفوظ رہ سکے تو۔“

”واہ آپ نے خوب بات بتائی۔“ سانپ نے خوش ہو گیا تھا۔
”اب وقت ضائع نہ کرو۔“ کیمیا دان نے چمچے اس کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔ سانپ رہنمائی ہوا چمچے کے اور قریب ہو گیا اور اس نے محلول کی چسکی لی۔ گرم زہر سے اس کے ہونٹ جل اٹھے۔ آنکھوں میں آنسو آگئے درد اور کرب سے اس نے اپنا سر پھیر کر کہا۔
”اس نے مجھے جلادیا۔ آپ کہتے تھے یہ مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچائے گا۔“ سانپ کے لہجے میں احتجاج تھا۔ ”جواب کیوں نہیں دیتے؟“ سانپ کی آنکھوں کے سامنے آنسوؤں کی نمی دور ہوئی تو اس نے اپنے سامنے راگھ کی ایک ڈھیری دیکھی۔ پھر آنکھیں جھپک کر کہا۔

”مجھے افسوس ہے کہ یہ سب کچھ میری وجہ سے ہوا۔ مگر یہ آدمی بھی باعمل نہ تھا۔“ پھر غر سے اپنے آپ سے کہا۔ ”عامل تو میں ہوں اس کی راکھ کی ڈھیری بزرگ کی راکھ کی ڈھیری سے بھی چھوٹی ہے۔“

سانپ غار سے نکل کر باہر آ گیا۔ ٹھوڑی دوری پہنچا تھا کہ اس نے گھوڑے پر سوار زرہ بکتر لگائے ایک جانباز کو دیکھا جس کے ہاتھ میں ایک چمک دار لوہے کا نیزہ تھا۔ جانباز نے گھوڑے کو آگے بڑھا کر نیزہ اوپر اٹھایا تو سانپ گڑ گڑانے لگا۔

”جناب جانباز صاحب! ایک منٹ کے لئے رک جائیے۔ آپ نے میرے بارے میں بڑا اندازہ لگایا ہے۔ میں ایک بے ضرر سانپ ہوں جو نرم و نازک جھاڑیوں اور پھولوں سے محبت کرتا ہے۔“

”اپنی موت کے لئے تیار رہو۔ میں ایک سیدھا سادھا آدمی ہوں۔ میرے ساتھ دیل باز نہ کرو۔“

جانباز نے سختی سے کہا۔

”جناب! مجھ پر اعتماد کیجیے۔ اگرچہ میرا سانس زہریلا ہے مگر میں قسم کھاتا ہوں کہ کسی درخت اور کسی انسان کو نقصان نہیں پہنچاؤں گا میں۔“

”میں اعتماد نہیں کر سکتا۔ میں ایک بہادر انسان ہوں، تم ایک زہریلے سانپ ہو۔ تمہارے سانس میں زہر ہے۔ تمہارا زندہ رہنا سب کے لئے خطرناک ہے۔“

”مگر میں کسی انسان کو نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔“

”یہ تو تم اب کہتے ہو۔“ جانباز نے کہا۔ ”تمہارے پاس وہ قوت ہے کہ تم جھاڑیوں اور پتھروں کو ایک پھنکار سے راکھ میں تبدیل کر سکتے ہو۔ میں نے ایک بزرگ انسان سے سن رکھا ہے کہ طاقت نشہ انسان کو پاگل کر دیتا ہے۔ بس اب بہت باتیں ہو چکی ہیں۔“ یہ کہہ کر جانباز نے نعرہ لگایا۔

گھوڑے کو سانپ کی طرف بڑھایا۔ پھر وہ سانپ پر نیزے سے وار کرنے کے لئے جھکا۔ سانپ خوف زدہ ہو کر بھی کھڑا رہا۔ اس کی کھوپڑی پر پسینے کے قطرے

چمکنے لگے تھے دل تیزی سے دھڑکنے لگا تھا۔ وہ اب بھی یہ کہنا چاہتا تھا کہ مجھ جیسے مرم خوسانپ کو مارنا ظلم ہے مگر وہاں منتا ہی کون تھا۔۔۔۔۔ سانپ نے سروا پر اٹھایا۔

اچانک نیزہ نیلی پنڈ کاریوں کی زد میں آ گیا۔ نیزے کو آگ لگ گئی۔ جانباز کی زرہ بکتر پہلے سرخ ہوئی پھر نیلی، پھر سفید اور پھر فیالی۔ گھوڑا چند منٹوں میں راکھ میں بدل گیا۔

”وہ مارا۔“ سانپ نے نعرہ لگایا۔ ”وہ میرا سانس پہلے سے زیادہ زہریلا ہوتا جا رہا ہے۔“

سانپ نے راکھ کی ڈھیریاں دیکھی اور آگے کی طرف ریگتے ہوئے کہنے لگا۔ ”اس سے یہ ظاہر ہوا کہ میں اپنی سرشت اور فطرت سے خواہش کے باوجود نجات حاصل نہیں کر سکتا ہوں۔ تو پھر۔۔۔۔۔ تو پھر۔۔۔۔۔ وہ“

غر سے سر اٹھا کر شاہ بلوط کے تناور درخت کو دیکھنے لگا۔ اس نے اپنے رخساروں کو ہوا سے بھر کر پھلایا اور پھر پھونک ماری۔ ایک منٹ میں شاہ بلوط کا درخت جل کر راکھ کا ڈھیر بن گیا اس نے اپنے آپ سے کہا۔

”دیکھا میں نے شاہ بلوط کے تناور درخت کو ایک لمحے میں راکھ کر دیا۔ میں تمام سانپوں سے قوی اور زہریلا ہوں اس جانباز نے طاقت کے نشے کے بارے میں کیا کہا تھا۔ کچھ بھی ہو۔ وہ تو راکھ ہوا۔ میں زندہ ہوں اب میں اس پہاڑ کو بھی راکھ بنا دوں گا۔“

پہاڑ پر پہنچ کر سانپ نے نیچے نگاہ دوڑائی تو اسے کئی جانباز چلتے پھرتے نظر آئے۔ سانپ نے اپنے آپ سے کہا۔

”میں ان کے ساتھ بھی منٹ لوں گا۔“

اپنی ٹھوڑی ایک پتھر پر رکھ کر وہ پر عزم نگاہوں سے ان جانبازوں کو دیکھنے لگا۔ جواب اس کی پھنکار سے راکھ کا ڈھیر بننے والے تھے۔

لیکن سانپ کو قانون قدرت کا پتہ نہ تھا کہ ”موت کو بھی ایک دن فنا ہونا ہے۔“





آہنی گرفت

مریم قیصر - چکوال

رات کے اندھیرے میں ایک بکری کا بچہ منمنارہا تھا کہ نوجوان نے اسے اپنی گود میں اٹھالیا اور اسے لے کر آگے بڑھا مگر یہ کیا آہستہ آہستہ اس بچے کا وزن بڑھنے لگا کہ پھر اچانک دل دھلاتا واقعہ رونما ہوا

ایک ظالم چیل کی کہانی جو کہ اپنے پڑھنے والوں کو حیرت کے سمندر میں ڈال دے گی

اس سے پہلے کئی بار کھیت میں اکیلا سوچا تھا، میں گھر سے بستر اٹھا لایا۔ سارا دن سخت محنت سے پالا پڑا تھا، اسلئے بستر پر سر رکھتے ہی نیند کی دیوی بہت جلد مجھ پر مہربان ہو گئی اور میں سو گیا۔

رات کا پچھلا پہر تھا، ایک عجیب سے احساس کے زیر اثر میری آنکھ کھل گئی تو میں نے چونک کر ادھر ادھر دیکھا کچھ بھی نہ تھا۔ میں نے دوبارہ سونے کی کوشش کی لیکن سونہ سکا اس کی وجہ وہ عجیب سی آواز تھی جو اس دیوانے میں میری سماعت سے نکرائی تھی۔ میں نے حواس کو بحال کیا اور چار پائی سے اٹھ بیٹھا۔ رات خاصی روشن تھی یعنی چودھویں کی رات

میرا نام سلامت ہے اور پنجاب کے ایک چھوٹے سے شہر کے ایک گاؤں سے میرا تعلق ہے۔ پورے گاؤں میں میری بہادری کے چرچے تھے اور ہر نوجوان میرے جیسا بننا چاہتا تھا۔ کبڈی کے کھیل میں کوئی میرا ٹائی نہیں تھا۔ گاؤں میں فصلوں کی کٹائی کا موسم تھا، میں نے ہر بار کی طرح اس بار بھی سب سے پہلے گندم کاٹ کر ساری ایک جگہ پر جمع کر لی تھی۔ میرے چند دوستوں نے میری مدد کی اور ہم نے تقریریں لگوائی۔

رات کا وقت تھا اور گندم کو گھر لے جانا ممکن نہ تھا۔ گاؤں میں کھیتوں میں سونا کوئی غیر معمولی بات نہ تھی اور میں

تھی ہر منظر صاف دکھائی دے رہا تھا۔ وہ آواز پائوں کی آواز تھی چھن چھن چھن۔ ”اس ویرانے میں پائوں کی آواز؟“ میں حیرت زدہ ہو گیا۔

میں نے آواز کا موجب معلوم کرنا چاہا اور اس سست چل پڑا جھڑپ سے آواز آرہی تھی اور میں اس سست چلتا گیا۔ وہ آواز تھوڑی دور ایک درخت کے پاس سے آرہی تھی میں درخت کے پاس پہنچا تو ایک دہشت انگیز منظر میرے سامنے تھا۔ درخت کے پاس ایک عورت کھڑی تھی جس کے بال بہت لمبے تھے اور اس کا چہرہ ان بالوں کی وجہ سے ڈھکا ہوا تھا۔ اس کا لباس عجیب و غریب وضع کا تھا۔ میرے ایک ہاتھ میں کلہاڑی تھی اور میں محتاط انداز میں اس کی طرف بڑھا جب میں اس کے قریب پہنچا تو میری نظر اس کے پیروں پر پڑی۔ اس کے پیرا لٹے تھے۔ میں نے بڑے بوڑھوں سے کئی بار سن چکا تھا کہ چڑیلوں کے پیرا لٹے ہوتے ہیں لہذا میں نوراً پیچھے ہٹا تو اچانک اس کی آواز آئی۔ ”سلامت میں تمہارا ہی انتظار کر رہی تھی۔“

خوف کے مارے میرا حلق خشک ہو گیا۔ میں نے بڑے بڑے مقابلے جیتے تھے لیکن اس بار میرا مقابلہ انسان سے نہیں بلکہ ایک مارواکی مخلوق سے تھا۔ وہ میری طرف بڑھی اور میرے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی مجھے محسوس ہونے لگا کہ جیسے میرے قدم زمین میں ڈھنس گئے ہوں۔ مجھ سے ہلاتک نہیں جا رہا تھا اور میں ایک قدم بھی پیچھے نہیں ہٹ پایا۔ اب اس مخلوق کا چہرہ میرے سامنے تھا وہ بہت حسین و خوبصورت تھی، اتنی خوبصورت کہ بیان سے باہر، اور اس کی دونوں آنکھیں سرخ روشن اور دھکتے ہوئے انگارے کی مانند تھیں اور یوں معلوم ہوتا تھا۔ جیسے ان سے روشنی منعکس ہو رہی ہو۔ اس نے جب اپنا سیدھا ہاتھ اوپر کو اٹھایا تو خدا کی پناہ اس کے ناخن بہت بڑے اور نوکیلے تھے۔

اچانک اس نے اپنا ہاتھ میری جانب بڑھایا اور اس کے ناخن میرے سینے میں دل کی جگہ پر پیوست ہونے لگے۔ درد کی ایک شدید لہر میرے جسم میں پھیل گئی اس کا انداز بتا رہا تھا کہ جیسے وہ میرا دل نکالنا چاہتی ہو، میں نے اپنا کلہاڑی والا ہاتھ بلند کیا اور اس کے بازو پر دے مارا

تو چشم زدن میں اس کا بازو کٹ کر نیچے گر گیا اور وہ یک دم پیچھے ہٹ گئی۔ اس نے بازو کی طرف غور سے دیکھا اور پھر میرے دیکھتے ہی دیکھتے وہ بازو دوبارہ اس کے جسم سے جڑ گیا۔

اس نے غصے سے میری طرف دیکھا اور اس کے دونوں بازو لمبے ہو گئے، اس نے میری گردن دیوچ لی اور پھر پوری قوت سے مجھے ایک جانب اچھال دیا۔ میں دھب سے نیچے گرا، کہ اتنے میں وہ دوڑتی ہوئی میرے قریب آئی اور میرے سینے پر سوار ہو کر اپنے تیز ناخنوں سے میرے سینے کے اوپری حصے کو جیسے کھرچنے لگی۔

میں اس چڑیل کے سامنے بے یار و مددگار پڑا تھا۔ مجھے احساس ہو گیا تھا کہ وہ طاقت میں مجھ سے کئی گنا زیادہ ہے اور میں جسمانی طاقت میں اس سے مقابلہ نہیں کر سکتا۔

اس لمحے میں نے سچے دل سے اپنے اللہ کو یاد کیا جس کے قبضہ قدرت میں تمام انسان تمام جنات اور دیگر مخلوقات ہیں اس وقت اللہ کے علاوہ کوئی بھی میری مدد نہیں کر سکتا تھا۔ میرے منہ سے بلند نکلا۔ ”اللہ اکبر۔ اللہ اکبر۔“ اور پھر ساتھ ہی بلند آواز سے میں نے آیت الکرسی کا ورد کرنا شروع کر دیا۔

اس چڑیل نے مجھے روکنے کی کوشش کی اور مجھے زخمی کرتی رہی لیکن کلام الہی کے سوتے ہی اس کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ وہ دور جا گری اور دھومیں میں تحلیل ہونے لگی لیکن جاتے جاتے اس کی آواز سنائی دی۔ ”سلامت آج تو میرے ہاتھوں بچ گیا بلند آواز کی وجہ سے جو تو پڑھ رہا تھا اگر وہ نہ پڑھتا تو مجھ سے ہرگز بچ نہیں سکتا تھا۔“ اور پھر اس کی آواز آنا بند ہو گئی۔

مجھ پر لرزہ طاری تھا، خیر کچھ دیر بعد میرے حواس بحال ہوئے تو میں فوراً گھر جانے والے راستے پر چلنے لگا۔ میرے زخموں سے خون رس رہا تھا بڑی مشکل سے ڈھتے پڑتے گھر پہنچا۔ میری غیر ہولی حالت دیکھ کر گھر والے ششدر رہ گئے انہوں نے بہت کچھ پوچھا لیکن میں نے ابھرا ہر کی باتوں سے ٹال دیا اور اصل بات چھپا گیا۔

میں تین دن بخار کی حالت میں رہا اور اس دوران وہ

خوف ناک عفریت روز میرے خواب میں مجھے دہشت زدہ کرتی رہی۔ میرا ہر بل اس کے خوف میں کٹتا تھا کبھی کبھی ان رنٹوں میں شدید درد کی کیفیت پیدا ہوتی اور میں چیختے چلانے لگتا، ایسے لحظات میں مجھے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ بلا میں کہیں میرے قریب ہے۔

ایک دن رات کے وقت میری آنکھ کھلی اور میں نے کدو بدلی تو اس کی بھیا تک صورت میرے سامنے آگئی، میں نے فوراً آنکھیں بند کر لیں پس پھر چند لمحوں بعد جب میں اپنی آنکھیں کھولیں تو وہاں صرف اندیرے کا راج تھا میں نے اس واقعہ کو اپنا دہم سمجھ کر نظر انداز کر دیا۔

اس واقعہ کو ایک سال کا عرصہ بیت گیا۔ میرے زخم مندمل ہو چکے تھے اور وہ واقعہ میرے ذہن سے تقریباً محو ہو چکا تھا۔ اسی دوران میری پھوپھی زاد سے میری شادی ہو گئی اور میرے ہاں ایک ننھا سا بیٹا سلیمان پیدا ہو چکا تھا۔

ایک دن مجھے میرے دوست رضا مراد کی شادی کا بلاوا آیا۔ تین دن بعد شادی تھی میں خوشی خوشی شادی کی تیاریوں میں مصروف ہو گیا اور ایک دن پہلے اس کے گاؤں پہنچ گیا۔ دلیمہ والے دن اس گاؤں سے نکلنے میں مجھے شام ہو گئی اور آہستہ آہستہ اندھیرا پھیلنے لگا۔ میں نے اپنے قدم تیز کر دیے۔ گاؤں سے تھوڑا دور اچانک مجھے احساس ہوا کہ کوئی اور بھی ہے جو میرے پیچھے پیچھے چل رہا ہے، میں نے فوراً پیچھے مڑ کر دیکھا تو کوئی بھی نہیں تھا میں نے دوبارہ اپنے قدم آگے بڑھانا شروع کر دیے۔

تھوڑی دور آگے جانے کے بعد وہ احساس دوبارہ ہوا، میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو ایک بکری کا چھوٹا سا بچہ میرے پیچھے پیچھے چلتا آ رہا تھا اب اس بچے نے بولنا شروع کر دیا تھا اسے دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی۔ چاندنی رات، چھوٹا سا سفید اور بہت ہی خوب صورت بچہ وہ بولتا ہوا دوڑ کر میرے قریب آ گیا تو اچانک مجھے اس پر پیارا آ گیا اور میں نے اسے گود میں اٹھا کر سوچنے لگا جانے کس نے اس کورات میں چھوڑ دیا، اور کوئی نظر بھی نہیں آ رہا۔“ خیر میں نے اسے گود میں لے کر آگے کو بڑھنے لگا۔

لیکن ابھی میں تھوڑا ہی دور چلا تھا کہ مجھے اس کا

وزن کچھ زیادہ ہوتا محسوس ہوا تو میں نے اسے اپنا دہم سمجھ کر جھٹک دیا لیکن اس کا وزن متواتر بڑھتا رہا اور پھر ایک وقت آیا کہ اس کا وزن ...

اور میری چھٹی حس اچانک بیدار ہو گئی تو جھٹ میں نے اسے زمین پر پٹخ دیا اسے زمین پر پٹخا تھا کہ اچانک اس میں سے دھواں اٹھنے لگا۔

اور جب دھواں چھٹا تو اس جگہ ایک مکروہ صورت جڑیل اپنی قہر آلود نظروں سے مجھے گھور رہی تھی، وہ وہی تھی جس سے میرا ایک سال قبل سامنا ہوا تھا۔ میں آج نہتا تھا میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھا تو انتقام کا جذبہ صاف نظر آیا۔ وہ بولی۔ ”سلامت پچھلی بار تو تو مجھ سے بچ لکلا تھا مگر آج ایسا نہیں ہوگا۔“

”میں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے جو تم میری جان لینا چاہتی ہو؟“ میں نے کہا۔ ”یاد ہے تجھے، تیرے کھیتوں کے کنارے پھیل کا ایک درخت تھا، اس درخت پر میرے ساتھیوں کا بسیرا تھا، ہم وہاں ہنسی خوشی وقت گزار رہے تھے کہ تو نے وہ درخت کٹوا دیا اور ہم سے ہمارا ٹھکانہ چھین لیا، میں اسی جرم کی پاداش میں تیرا خاتمہ کرنا چاہتی ہوں۔“

وہ میری طرف بڑھی اور مجھے گردن سے پکڑ لیا۔ اس کی آہنی گرفت اتنی سخت تھی کہ میری سانس رکنے لگی۔ میں نے ہاتھ پاؤں مارنے شروع کر دیے اور اسی کوشش میں اس کی چوٹی میرے ہاتھوں میں آ گئی، میں نے اس کو زور سے کھینچا تو وہ بلبلاتا آہی اور چیختے لگی پھر میں نے پوری کوشش کی اور زور آزمائی جاری رکھی اور پھر ساتھ ہی ساتھ آیت الکرسی کا ورد کرنے لگا اور اس پر پھونک ماری تو دیکھتے ہی دیکھتے اس جڑیل کو آگ لگ گئی اور پلک جھپکتے ہی وہ جل کر بھسم ہو گئی۔ اس کی کرناک آوازیں قریب و جوار کو دہلا گئیں۔

آج اس واقعہ کو گزرے پچیس سال ہو گئے ہیں۔ لیکن وہ واقعہ آج تک میرے ذہن سے محو نہیں ہو سکا۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس کے بعد ایسا کوئی واقعہ میرے ساتھ پیش نہیں آیا۔



روح کی بے چینی

ایس امیاز احمد - کراچی

ایک روح کی دل شکستہ روداد جو کہ پچیس سال تک سسکتی اور بلکتی رہی، اشارے اشارے سے لوگوں کو حقیقت سے روشناس کراتی رہی مگر کسی نے بھی اس کی ایک نہ سنی اور پھر آخر کار اس نے اپنا انتقام پورا کر لیا۔

دل و دماغ اور ذہن پر اپنا سکتہ میٹھاتی اور روٹنے کھڑے کرتی عجیب و غریب پر تحیر خیز ناک کہانی

دوسرے سیارے کی طرف چلی گئی ہوگی۔ یقین کیجئے انسان سے بڑھ کر اس دنیا میں اور کوئی نہیں۔
”آج سے کچھ عرصہ قبل میں بھی ان باتوں کو تسلیم نہیں کرتا تھا۔“ ریاض حسین نے کہا۔ ”لیکن جناب خاں بی میں ہمارے ساتھ جو واقعات پیش آئے ہیں ان کے سبب سے میں اپنے نظریات پر نظر ثانی کرنے پر مجبور ہو گیا، میری بیوی ان واقعات کی چشم دید گواہ ہے۔ نظریاتی بحث سے قطع نظر امر واقع یہ ہے کہ صورتحال ہماری برداشت سے باہر ہو گئی ہے۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں اختصار سے ان واقعات کو آپ کے سامنے بیان کر دوں۔“

”ضرور، ضرور۔“ شامی نے کہا۔ ”آپ بلا جھجک اپنا مسئلہ پیش کر سکتے ہیں۔“

”ہم وادی کاغان کے ایک چھوٹے سے گاؤں خٹکوت میں رہتے ہیں۔“ ریاض حسین نے قدرے تامل کے بعد کہنا شروع کیا۔

”یہ علاقہ ایبٹ آباد سے تقریباً ساٹھ میل شمال میں واقع ہے۔ خاصا پرفضا اور صحت افزا مقام ہے۔ چاروں طرف سے سرسبز و شاداب پہاڑیوں میں گھرا ہوا ہے۔ آبادی بمشکل ایک ہزار افراد پر مشتمل ہے۔ دو

”جہاں تک ارواح کے وجود کا تعلق ہے میں اس پر پورا یقین رکھتا ہوں۔“ کامران شامی نے نووارد ملاقاتی کا بیان سننے کے بعد کہا۔ ”لیکن ضعیف الاعتقاد لوگوں کی طرح ارواح کی ماورائی قوتوں اور ناقابل فہم شعبہ بازیوں کو تسلیم نہیں کرتا۔“ اس کے ملاقاتی کا نام ریاض حسین تھا، وہ اپنی خوب صورت بیوی ثروت کے ہمراہ اس کے پاس ایک ایسا مسئلہ لے کر آیا تھا جو بہت حد تک ارواح کی روایتی کہانیوں سے ملتا جلتا تھا۔

کامران شامی ایک تجربہ کار وکیل ماہر سرائی رساں اور نفسیاتی و سغلی علوم کا مستند عالم تھا۔ لوگ اس کے پاس قانونی، ازدواجی، نفسیاتی اور پراسرار جرائم کے مسائل حل کرانے کے لئے آتے تھے۔

”ریاض صاحب اس دنیا میں کوئی بات انہونی نہیں۔“ شامی نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”تو بھی میرا خیال ہے کہ آج کے سائنسی دور میں شاید ہی کوئی ایسی شے ہو جو انسان کے قبضہ تصرف سے باہر رہ گئی ہو۔ اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ اگر جن بھوت وغیرہ قسم کی کوئی مخلوق اس کرۂ ارض پر موجود بھی ہو تو بلاشبہ وہ انسان کی بڑھتی ہوئی قوت تسخیر سے خائف ہو کر کسی



سال قبل ہم نے ایک پرانی وضع کا پختہ مکان خریدا ہے جو زریں منزل کے نام سے مشہور ہے۔ یہ مکان گاؤں سے تقریباً سو گز باہر سرسبز درختوں میں گھرا ہوا ہے۔ اس میں تین کمرے، ایک باورچی خانہ اور دو طرفہ برآمدہ ہے۔ مکان چونکہ سستا مل رہا تھا اس لئے ہم نے فوراً خریدا لیا۔ مکان سے ملحقہ دو کنال کا ایک قطعہ بھی ہے جس میں چھوٹا سا باغچہ بنا ہوا ہے۔ مجموعی اعتبار سے مکان اور اس کا ماحول نہایت حسین اور دل فریب ہے۔

پہلے سال گرمیوں کا موسم بہت اچھا گزر گیا۔ لیکن موسم سرما کا آغاز ہوتے ہی ہم نے عجیب قسم کی بے چینی اور گھبراہٹ محسوس کرنی شروع کر دی، ابتدا میں ہم نے اس کی طرف کوئی توجہ نہیں دی۔ لیکن بتدریج اس بے چینی میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ بے خوابی کی شکایت ہونے لگی۔ اکثر رات کو ڈراؤنے خواب دکھائی دینے لگے۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ کوئی نادیدہ ہستی ہم سے نفرت کا اظہار کر رہی ہے، دھمکیاں دے رہی ہے، غصہ اور دشمنی کا اظہار کر رہی ہے اور ”انتقام انتقام“ پکا رہی ہے۔

سردی میں اضافے کے ساتھ ساتھ اس پر اسرار ہستی کے بغض و عناد میں بھی اضافہ ہوتا شروع ہو گیا۔ جب موسم کی پہلی برف باری ہوئی تو یقین کیجئے اس کیفیت میں ناقابل بیان شدت پیدا ہو گئی۔ گھبراہٹ، خوف اور ذہنی کھنچاؤ نقطہ عروج پر پہنچ گیا۔

ہم کئی راتوں تک اچھی طرح نہیں ہو سکے، بالآخر ہم نے مکان چھوڑ دینے کا ارادہ کر لیا لیکن کچھ دنوں کے بعد موسم قدرے گرم ہو گیا اور اس کے ساتھ ہی ہماری گھبراہٹ بھی جاتی رہی اور ہم نے آرام کی خیند سونا شروع کر دیا۔ ہم نے اندازہ لگایا کہ ہماری ساری پریشانی کا سبب سردی اور بے خوابی تھی۔ یعنی سردی کے باعث بے خوابی کی شکایت ہوئی اور بے خوابی کی وجہ سے ہم گھبراہٹ اور توہم پرستی کا شکار ہو گئے، موسم گرما کے آغاز کے ساتھ ہی گھبراہٹ اور خوف کی کیفیت بالکل ختم ہو گئی بلکہ بھولی بسری بات ہو گئی۔

اب موسم سرما میں ایک بار پھر ہمارے دلوں پر وہی بے چینی، بے خوابی، اور گھبراہٹ پیدا ہونی شروع ہو گئی۔ سردی میں اضافے کے ساتھ ساتھ یہ کیفیت بھی بتدریج بڑھتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ ہم یہ یقین کرنے پر مجبور ہو گئے کہ اس کیفیت کے پس پشت ضرور کوئی پر اسرار ہستی کار فرما ہے جسے عام طور پر جن یا روح وغیرہ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے پھر آج سے چند روز پیشتر ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے ہمارے یقین کو حق یقین میں تبدیل کر دیا۔

یہ گزشتہ جمعرات کی بات ہے اس روز بڑے زوروں کی برف باری ہو رہی تھی۔ میں اور ثروت سرشام کھانے سے فارغ ہو کر بستر پر لیٹ گئے۔ تاہم خیند کا نام و نشان نہ تھا۔ کچھ دیر کے بعد برف باری کے ساتھ ساتھ تیز جھکڑ بھی چلنا شروع ہو گیا۔

دفعتاً ہمارے کانوں میں ایک عجیب سی آواز آئی۔ وہ آواز گونج رہی تھی نہ تھی تاہم غایت درجہ اثر انگیز اور پرسوز تھی۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ کوئی بچہ سسک سسک کر رو رہا ہے۔

شروع میں ہم نے اس آواز کو تیز ہوا کی آواز قیاس کر کے نظر انداز کر دیا۔ مگر دھیرے دھیرے وہ نمایاں ہوتی چلی گئی۔ پھر دفعتاً کمرے کا درجہ حرارت گرنا شروع ہو گیا۔ حالانکہ انگیٹھی میں آگ برابر سلگ رہی تھی۔ تمام کھڑکیاں دروازے بدستور بند تھے۔ پر سردی لگھ بے لگھ بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ وہ رات گزشتہ تمام راتوں سے زیادہ اذیت ناک تھی۔ انگیٹھی میں جلنے والی آگ کی دھم روشنی کمرے کی فضا میں لرز رہی تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ کوئی نادیدہ شے چاروں طرف سے ہم پر دباؤ ڈال رہی ہے۔ ہمارے خوف اور ذہنی کھنچاؤ میں مسلسل اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔

سستکیوں کی آواز نمایاں طور پر سنائی دے رہی تھی۔ وہ درد ناک آواز پوری فضا پر محیط معلوم ہوتی تھی۔

برف باری اور جھکڑ کی آواز کسی ماتمی سازی کی

مانند اس آواز کے ساتھ گھل مل گئی تھی۔ ناگہاں میں نے خواب گاہ سے ملحقہ کمرے کے وسط میں ایک دھندلا سا روشن غبار نمودار ہوتے دیکھا۔ وہ ہولے ہولے جنبش کرتا ہوا فرش زمین سے بلند ہو رہا تھا۔ ہم ساکت و جامد آنکھیں پھاڑے اس ناقابل یقین منظر کو دیکھنے لگے۔ وہ روشن غبار ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے ایک شکل اختیار کرنے لگا۔ ایک انسانی شکل!

چند ساعتوں کے بعد وہ غبار ایک مکمل انسانی جسم کا خاکہ اختیار کر چکا تھا۔ جس انداز میں وہ گردش کرتا اور بل کھاتا دکھائی دیتا تھا اس سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ وہ انتہائی فصیح اور طیش کے عالم میں ہے۔ اب یہ بات واضح ہو چکی تھی کہ تمام بغض و عناد اور نفرت و حقارت کا منبع یہی پراسرار ہستی تھی۔

دفعتاً اس کا سر ٹھوس شکل اختیار کرنے لگا چہرے پر کر بناک تاثرات نظر آنے لگے جن میں شدید غم و غصہ احتجاج اور نفرت پائی جاتی تھی۔ ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے اس نے منہ کھولا اور ایک دردناک چیخ بلند کی جس کی آواز زمین سے آسمان تک گونجتی چلی گئی۔ اس کے فوراً بعد وہ دھندلا غبار تاریکی میں تحلیل ہو گیا۔

یہاں تک بیان کرنے کے بعد وہ خاموش ہو گیا۔ چند لمحوں تک کمرے میں مکمل خاموشی چھائی رہی۔

”واقعی حیرت انگیز تجربات ہے۔“ شامی نے سکوت توڑتے ہوئے کہا۔ ”ہیگم ثروت کیا آپ اس معاملے میں کچھ کی بیشی کرنا چاہیں گی؟“

”ریاض صاحب نے مکمل واقعہ بیان کر دیا ہے۔“ ثروت نے قدرے تامل کے بعد کہا۔ ”وہ دھندلا غبار تخم میں خاصا بڑا تھا۔ کم از کم آٹھ فٹ اونچا ہو گا اور جیسا کہ ریاض صاحب نے بیان کیا چہرے پر نظر آنے والے تاثرات انتہائی خوفناک تھے۔ تاہم ذاتی طور پر میرا احساس یہ ہے کہ وہ کسی دس سالہ بچے کا چہرہ تھا۔ اور وہ چیخ.....! اوہ میں تازہ نگاری اس پر سوز چیخ کو نہیں بھلا سکوں گی.....“

”کیا یہ شے اس سے پہلے بھی کبھی دیکھنے میں

آئی تھی۔ آپ نے برف باری اور جھکڑ کا ذکر کیا تھا۔“ شامی نے کہا۔

”غالباً یہ جھکڑ پہلی مرتبہ چلا تھا۔“

”گویا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اس پراسرار منظر کا جھکڑ سے کوئی تعلق ہے۔“ شامی نے کہا۔

”محض ایک قیاس ہے۔ حتمی طور پر کچھ نہیں کہا جاسکتا۔“ ریاض نے کہا۔ ”یہ ملاقات یہاں سے کتنی دور ہے؟“

”تقریباً ایک سو تیس میل..... جس میں ساٹھ میل کا پہاڑی راستہ بھی شامل ہے۔“

”بظاہر یہ معاملہ میرے دائرہ کار سے باہر ہے۔“ شامی نے کہا۔

”شامی صاحب اگر آپ نے انکار کیا تو ہمیں بہت مایوسی ہوگی۔“ ثروت نے کہا۔

”میں آپ کو مایوس نہیں کروں گا۔ اس کیس میں کچھ باتیں ایسی ہیں جو براہ راست میرے نظریات سے ٹکراتی ہیں۔ اگر معاملہ ویسا ہی ثابت ہوا جیسا آپ نے بیان کیا ہے تو مجھے یقیناً اپنے نظریات میں کچھ تبدیلی کرنی پڑے گی۔“

”گویا آپ نے یہ کیس منظور کر لیا ہے۔“ ثروت نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”آپ کی نفیس؟“

شامی نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ”نفیس کے بارے میں کوئی تردد نہ کیجئے۔ اس میں حسب ضرورت کی بیشی کی جاسکتی ہے۔“ پھر اس نے ایک کاغذ اور قلم ریاض حسین کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”اس پر زریں منزل کے سابقہ مالک کا نام اور پتہ تحریر کر دیں۔“

”سابقہ مالک کا نام عباس گل ہے۔“ ریاض نے کاغذ پر پتہ لکھتے ہوئے کہا۔ ”آج کل وہ ایبٹ آباد میں رہتا ہے۔“

”ممکن ہے دو تین روز تک میں خاسکوٹ میں آکر آپ سے ملاقات کروں۔“

”میں آپ کو ساتھ ہی لے کر جانا چاہتا تھا۔“
ریاض نے کہا۔

”میں پہلے عباس گل سے ملوں گا۔ پھر خاص کوٹ آؤں گا۔“

ایسٹ آباد کی گلیاں اور بازار نسبتاً سناں پڑے تھے۔ قرب و جوار کی پہاڑیاں برف سے ڈھکی ہوئی تھیں۔ شمال کی طرف سے ٹھنڈا سینے والی ہوائیں چل رہی تھیں۔ عباس گل کا مکان شہر کے گنجان علاقے میں واقع تھا۔ کامران شامی نے اپنی گاڑی گلی کے کونے پر کھڑی کر دی اور ایک ایک مکان دیکھتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ وہ تھوڑی دیر پہلے دارالحکومت سے فوکس ویگن کے ذریعے وہاں پہنچا تھا۔ چند لمحوں کے بعد وہ مطلوبہ مکان کے سامنے کھڑا تھا۔ پھر دروازے پر دستک دینے کے بعد وہ انتظار کرنے لگا۔

دروازہ کھولنے والا عباس ہی تھا۔ اس کا قد چھوٹا، جسم مضبوط اور آنکھیں سیاہ تھیں، جن میں خاص قسم کی چمک پائی جاتی تھی۔ داہنے ہاتھ کی بڑی انگلی خود کار طریقے پر گھنٹی موچکوں کا زاویہ درست کرنے میں مصروف تھی۔ معمولی طور پر وہ خاصا تند خو نظر آتا تھا۔ ابتدائی تعارف کے بعد وہ شامی کو بیٹھک میں لے آیا۔ پھر گرم گرم قہوہ پیش کرنے کے بعد کہا۔

”آپ زریں منزل کے بارے میں معلوم کرنا چاہتے ہیں۔“

”دراصل ہمارے ملک میں تو ہم پرستی بہت پائی جاتی ہے۔“ شامی نے قہوے کا گھونٹ بھرتے ہوئے کہا۔ ”زریں منزل کا موجودہ مالک میرے پاس ایک ایسا مسئلہ لے کر آیا ہے جس میں بظاہر بھوتوں کا حمل دخل معلوم ہوتا ہے۔ تاہم میں ایک دوسرے انداز سے اس مسئلہ پر غور کر رہا ہوں۔“

”حیرت انگیز بات ہے۔“ عباس گل نے کہا۔ ”یہ مکان میرے پاس تقریباً تین سال تک رہا ہے مگر میری کسی بھوت سے ملاقات نہیں ہوئی۔“

”آپ نے یہ مکان کس سے خریدا تھا؟“

”دراصل یہ مکان ٹاؤن کمیٹی کی ملکیت تھا اور عرصہ دراز سے خالی پڑا تھا۔“ عباس گل نے کہا۔ ”میں نے تفریح اور شکار وغیرہ کے لئے اسے خریدا تھا اور اپنے دوستوں کے ہمراہ اکثر وہاں ٹھہرا کرتا تھا۔ تاہم میں نے کبھی اسے رہائش کے لئے استعمال نہیں کیا۔“

”کیا آپ سردیوں میں بھی وہاں ٹھہرا کرتے تھے؟“

”صرف ایک مرتبہ سردیوں میں وہاں ٹھہرنے کا اتفاق ہوا تھا۔“

”اس دوران آپ کو بے خوابی یا جی کھنچاؤ تو محسوس نہیں ہوا؟“

”میرے ساتھ تین اور دوست بھی تھے۔ ہم نے صرف دو راتیں وہاں گزاری تھیں۔ جہاں تک بے خوابی کا تعلق ہے اس کی شکایت ضرور ہوتی تھی کیونکہ ہم چاروں ایک ہی کمرے میں سوتے تھے اس لئے جگہ کی تنگی کے باعث اچھی طرح نہیں سو سکے تھے۔“

”مکان کے اندر کوئی تہہ خانہ بھی ہے؟“

”نہیں۔۔۔۔۔ کیوں؟“

”یونہی پوچھ لیا۔“ شامی نے اٹھتے ہوئے کہا۔

”آپ کے قہوے کا بہت بہت شکریہ۔“

زریں منزل پر خاموشی چھائی تھی۔ کامران شامی نے اپنی فوکس ویگن صدر دروازے کے سامنے کھڑی کر دی اور کھڑکی سے اس پاس کا جائزہ لینے لگا۔ ہر طرف سفید سفید برف کی تہہ جمی ہوئی تھی۔ اس وقت اس کے ساتھ اس کا دیرینہ دوست جوزف برٹن بھی تھا۔ قدرے توقف کے بعد دونوں گاڑی سے باہر آ گئے۔ جوزف نے بھاری اور پرانی وضع کے دروازے پر دستک دی۔ ایک منٹ کے بعد دروازہ کھلا اور ریاض حسین نے باہر جھانک کر دیکھا۔

اس کے پیچھے ثروت بھی کھڑی تھی۔ شامی کو دیکھ کر ان کے چہروں پر اطمینان کی لہر دوڑ گئی۔

آتش دان کے سامنے بیٹھ کر تھوڑی دیر تک رکی گفتگو ہوتی رہی۔ ثروت نے کافی بنا کر انہیں پیش کی پھر

”یہ اس امر کی دلیل ہوگی کہ پراسرار روح کا تعلق مکان سے نہیں آپ کی ذات سے ہے۔“
ریاض اور ثروت چونکہ کرشمی کی طرف دیکھنے لگے۔ ان کے چہروں پر خوف کی ہلکی سی لہر دوڑ گئی۔ تاہم انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس وقت وہ خواب گاہ سے محنت کمرے میں کھڑے تھے۔

”یہ وہ کمرہ ہے جس میں دھندلا غبار نظر آیا تھا۔“ ریاض نے کہا۔

”کیا آپ ٹھیک ٹھیک اس جگہ کا تعین کر سکتے ہیں جہاں سے وہ غبار اٹھنا شروع ہوا تھا۔“
”تقریباً اس جگہ سے۔۔۔۔۔“ ریاض نے ایک جگہ پر پاؤں رکھتے ہوئے کہا۔

شامی نے فرش پر بچھا ہوا قالین اس جگہ سے ہٹا دیا اور اکڑوں جیٹھ کر فرش کا جائزہ لینے لگا۔ اچانک اس نے چونک کر کہا۔

”جوزف اس فرش کو ذرا غور سے دیکھو۔ کیا اس میں تمہیں کوئی عجیب بات نظر آتی ہے؟“
جوزف آنکھیں جھپکتے ہوئے فرش کو گھورنے لگا۔
”میرا خیال ہے کہ میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا۔“ اس نے کہا۔ ”یہ ایک عام مافرش ہے۔“

”واپسی پر تمہاری آنکھیں ٹیسٹ کروانی پڑیں گی۔“ شامی نے کہا۔ ”کیا تمہیں نظر نہیں آتا کہ فرش کا یہ حصہ باقی فرش سے مختلف ہے۔ واضح طور پر اسے دوبارہ توڑ کر بنایا گیا ہے۔“ ریاض اور ثروت بھی اس حصے کو آنکھیں پھاڑ کر گھورنے لگے۔

”آپ کے پاس ہتھوڑی یا اس قسم کی کوئی چیز ہوگی؟“ شامی نے ریاض کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
”کیا آپ فرش توڑنے کا ارادہ رکھتے ہیں؟“
ثروت نے کہا۔

”فی الحال نہیں۔“ شامی نے جواب دیا۔ ”تاہم ہو سکتا ہے کہ اس کی ضرورت بھی پڑ جائے۔“
ہتھوڑی دیر بعد ریاض نے ایب ہتھوڑی لا کر شامی کے ہاتھ میں تھما دی۔

اصل موضوع کی طرف آتے ہوئے شامی نے پوچھا۔
”سنائیے رات کیسی گزری؟“
”سب معمول بے خوابی کی شکایت رہی۔“
ریاض نے جواب دیا۔ ”لیکن نسبتاً آرام رہا۔ کیونکہ گزشتہ رات برف باری نہیں ہوئی۔“
”عمارت کے اندر کوئی تہہ خانہ بھی ہے؟“
شامی نے پوچھا۔

”تہہ خانہ تو کوئی نہیں۔“ ثروت نے کہا۔ ”میرا خیال ہے کہ آپ نے ابھی تک ہمارے بیان کو دلوں سے تسلیم نہیں کیا۔“

”ایسی بات نہیں۔ بلکہ میں اس معاملے کی کوئی قابل قبول وجہ تلاش کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔“
”یہ زیادہ مناسب ہوگا کہ آپ بذات خود مکان کا جائزہ لے لیں۔“ ریاض نے کہا۔

”میں یہ بات کہنے ہی والا تھا۔“ شامی نے کہا۔
پھر وہ دونوں ریاض کی رہنمائی میں مکان کے مختلف حصوں کو دیکھنے لگے۔ ”مکان تو بالکل سیدھا سادا ہے۔“ جوزف نے تبصرہ کرتے ہوئے کہا۔ ”کوئی خفیہ گوشہ یا کمرہ نہیں۔ اگر کسی بھوت یا روح سے ملاقات نہ ہوئی تو سخت مایوسی ہوگی۔“

”ریاض صاحب کیا یہ ممکن ہے؟“ شامی نے کہا۔
”کہ آج کی رات آپ کسی دوست یا عزیز کے ہاں قیام کرنے کا انتظام کر لیں۔ ہم تنہا یہاں رہنا چاہتے ہیں۔ میں اور جوزف۔“

”جیسے آپ مناسب سمجھیں۔“ ریاض نے جواب دیا۔

”میرے خیال میں یہ بات بالکل نامناسب ہے۔“ جوزف نے کہا۔ ”ہو سکتا ہے کہ وہ بھوت بھی ان کے ساتھ ہی چلا جائے۔“

تب۔۔۔۔۔ شامی نے پوری سنجیدگی سے کہا۔ ”اس گتھی کو سلجھانا مزید آسان ہو جائے گا۔“
”میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔“ ریاض نے حیرت سے کہا۔

شامی نے ہتھوڑی سے فرش کے مختلف حصوں کو بجا کر دیکھنا شروع کر دیا پھر وہ سیدھا کھڑا ہو کر ریاض کو گھورنے لگا۔

”آپ نے کہا تھا کہ اس عمارت میں کوئی تہہ خانہ نہیں ہے۔“ اس نے کہا۔ ”کیا آپ نے نقشہ دیکھا تھا یا محض قیاس سے یہ بات کہی تھی؟“

”نقشہ تو نہیں دیکھا تھا۔“ ریاض نے جواب دیا۔ ”اور میں سمجھتا ہوں کہ نقشہ محفوظ بھی نہیں رہا ہوگا۔“

تھوڑی دیر کے بعد چاروں ڈرائنگ روم میں آکر آتش دان کے سامنے بیٹھ گئے، کئی لمحوں تک کمرے میں خاموشی چھائی رہی۔ ہر شخص کا ذہن مختلف خیالات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔

”موسم تیزی سے بدل رہا ہے۔“ شامی نے کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے کہا۔ ”طوفان کی آمد کے آثار نظر آ رہے ہیں۔“

ثروت اور ریاض کے چہرے پر خوف کی لہر دوڑ گئی۔ دونوں شامی کی نظروں کا تعاقب کرتے ہوئے باہر دیکھنے لگے۔ شامی نے مزید کہا۔

”میرا خیال ہے کہ اب آپ کو اپنے کسی دوست سے ہاں جانے کی تیاری شروع کر دینی چاہئے۔ اگر طوفان شروع ہو گیا تو جانا مشکل ہو جائے گا۔“

نصف گھنٹے کے بعد ریاض اور ثروت اپنے ایک عزیز کے گھر چلے گئے۔

رات کے کھانے سے فارغ ہو کر شامی اور جوزف آتش دان کے سامنے بیٹھ کر کافی پینے لگے۔ باہر ہلکی ہلکی برف باری شروع ہو گئی تھی اور ہوا بتدریج طوفان کی شکل اختیار کرتی جا رہی تھی۔ ایک طویل خاموشی کے بعد جوزف نے کہا۔

”دوست سلسلہ شروع ہو چکا ہے۔ مجھے اہنادل بیٹھتا محسوس ہو رہا ہے۔“

”کچھ گھنٹن سی محسوس ہو رہی ہے۔ شاید کمرے میں آکسیجن کی کمی واقع ہو رہی ہے۔“ شامی نے اٹھتے ہوئے کہا۔ اس کی آواز میں خفیف سی گھبراہٹ شامل تھی۔

”ممکن ہے کھڑکی کھولنے سے کچھ فرق پڑ جائے۔“ پھر وہ کھڑکی کے قریب جا کر چند لمحوں تک باہر گرتی ہوئی برف کو دیکھتا رہا۔ قدرے توقف کے بعد اس نے کھڑکی کھول دی۔ اس کے ساتھ ہی تیز ہوا اور تیز ہوا سیٹیاں بجاتی ہوئی اندر داخل ہونا شروع ہو گئی۔ ایک لمحے کے بعد اس نے دوبارہ کھڑکی بند کر دی۔

”شاید میرا خیال غلط ہے۔“ اس نے اعتراف کرتے ہوئے کہا۔ ”اس گھنٹن کا سبب کچھ اور ہے۔“

معا ایک مدھم آواز، جو کسی پرسوز آہ سے ملتی جلتی تھی، ہوا کے دوش پر آتی محسوس ہوئی۔

”شامی!“ جوزف نے تیزی سے کہا۔ ”یہ آواز کیسی تھی؟“

”گھبرو گھبرو۔“ شامی نے آواز کی طرف کان لگاتے ہوئے کہا۔

ایک لمحوں کے بعد دوبارہ آواز سنائی دی۔ جوزف کے ماتھے پر پسینے کے قطرے چمکنے لگے۔ اس نے اپنا آئوٹریک پستول نکال لیا اور اچھل کر کھڑا ہو گیا۔

”میرے دوست یہ کوئی سازش ہے، سازش۔“ اس نے چیخ کر کہا۔

”پستول واپس رکھ لو۔“ شامی نے قدرے سختی کے ساتھ کہا۔ ”سازش کرنے والے آہیں نہیں بھرا کرتے۔“

جوزف نے پستول واپس رکھ دیا اور ٹڈال ہو کر کرسی پر گر گیا۔ باہر شدید برف باری ہو رہی تھی اور تیز ہواؤں نے جھکڑ کی صورت اختیار کر لی تھی۔

”شامی۔ اس خاموشی سے مجھے وحشت ہو رہی ہے۔“ جوزف نے کہا۔ ”خدا کے لئے کچھ بات کرو۔ ورنہ میں پاگل ہو جاؤں گا۔“

”جوزف، ذرا سوچو کہ اگر اس وقت ہم نے اس دہنی کھنچاؤ کا تجربہ نہ کیا تو کبھی حقیقت نہیں جان سکیں گے۔

اس لئے اپنے حواس کو کنٹرول میں رکھو اور اس کیفیت کی کوئی قابل فہم توجیہ معلوم کرنے کی کوشش کرو۔“

سسکی کی آواز پھر سنائی دی۔ اب وہ آواز زیادہ

ہے۔ ہمارے ریکارڈ کے مطابق تقریباً تیس سال قبل اس کے اندر ایک پرائمری اسکول ہوا کرتا تھا، بعد میں اسکول بند کر دیا گیا اور مکان طویل مدت تک غیر مستعمل پڑا رہا۔ پھر کچھ سال پہلے اسے فروخت کر دیا گیا۔“

”اسے فروخت کیوں کیا گیا تھا؟“ شامی نے پوچھا۔

”ریکارڈ تھا۔ فروخت کر دیا۔“

”کیا مکان کے اندر کوئی تہہ خانہ بھی ہے؟“

”میرے خیال میں نہیں ہے۔“ ٹاؤن کلرک نے

جواب دیا۔ ”لیکن آپ یہ سب کچھ کیوں پوچھ رہے ہیں؟“

”ہم دارالحکومت سے ایک معاملے کی تحقیقات

کے لئے یہاں آئے ہیں۔“ جوزف نے کہا۔

دارالحکومت کا نام سن کر ٹاؤن کلرک کچھ سنبھل

گیا۔ بلکہ اس کے چہرے پر گھبراہٹ نظر آنے لگی۔

دارالحکومت اور تحقیقات دو ایسے الفاظ ہیں جو کسی بھی

ملازم کو زور دینے کے لئے کافی ہوتے ہیں۔

”آپ حضرات تشریف رکھیں۔“ اس نے اپنی

کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا۔

”میں آپ کو اس مکان کی فائل دکھاتا ہوں۔“

اس میں آپ کو ہر سوال کا جواب مل جائے گا۔“ تھوڑی

دیر کے بعد وہ ایک سال خوردہ اور گرد آلود فائل جھاڑتا

ہوا لے آیا، شامی اور جوزف اطمینان سے بیٹھ کر فائل

دیکھنے لگے۔

مکان کی تعمیر تقریباً ساٹھ سال قبل ہوئی تھی۔

نقشے کے اندر تہہ خانہ بھی دکھایا گیا تھا۔ جسے بعد میں بند

کر دینے کا ذکر تھا۔

”اس نقشے کے مطابق مکان میں تہہ خانہ بھی

بنایا گیا تھا۔“ شامی نے ٹاؤن کلرک کی طرف دیکھتے

ہوئے کہا۔ ”لیکن آگے چل کر لکھا ہے کہ اس تہہ خانے کو

بعض تعمیری خامیوں کے باعث بند کر دیا گیا تھا۔ کیا

آپ بتا سکتے ہیں کہ تہہ خانہ بند کرنے سے کیا مراد ہے؟

تہہ خانہ کو مٹی سے پر کر دیا تھا یا صرف داخلی راستہ بند کر دیا

تھا؟“

واضح تھی۔ کچھ وقفے کے بعد وہ آواز مسلسل سنائی دینی شروع ہو گئی۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ پوری کائنات سسکیاں لے رہی ہے۔ اچانک شامی نے جوزف کا بازو پکڑ لیا۔

”جوزف ادھر دیکھو۔“ اس نے لمحہ کمرے کی

طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ وہاں پر زرد رنگ کا

دھندلا سا غبار کمرے کی تاریکی میں چمکتا نظر آ رہا تھا۔

وہ فرش سے موسم جی کے مدھم شعلے کی مانند لرزتا ہوا ہولے

ہولے بلند ہو رہا تھا۔ اوپر اٹھنے کے ساتھ ساتھ اس کے

جسم میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ وہ مخصوص انداز میں جنبش

کرتا اور بل کھاتا نظر آ رہا تھا۔ کم و بیش آٹھ فٹ تک بلند

ہونے کے بعد اس کا بڑھنا اور پھیلنا رک گیا۔ اب وہ

ایک انسانی جسم کا خاکہ اختیار کر چکا تھا۔

شامی اور جوزف زمان و مکان کی حدود و قیود

سے بے خبر کسی سحر زدہ انسان کی مانند اسے گھور رہے

تھے۔ اس مافوق الفطرت وجود کے بل کھاتے ہوئے جسم

سے نفرت و حقارت اور انتقام و عناد کی چنگاریاں نکل کر

دونوں کے دل و جود پر حاوی ہوتی جا رہی تھیں۔ معاً اس

کے چہرے پر کسی جیتے جاگتے انسان کے نعوش نمایاں

ہو گئے۔ اس کے چہرے پر انتہائی کرب و اذیت کے

تاثرات پائے جاتے تھے۔ پھر اس نے اپنا منہ آسمان کی

جانب بلند کر کے ایک دردناک جیج بلند کی۔ اس کی آواز

ساری فضا میں گونجتی سنائی دی۔ پھر وہ غبار تیزی کے

ساتھ تاریکی میں تحلیل ہو کر نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

شامی اور جوزف نے خوفزدہ نظروں سے ایک

دوسرے کی طرف دیکھا اور کچھ غڈ حال سے ہو کر اپنی

اپنی کرسی پر بیٹھ گئے۔ دونوں ہی اس پراسرار غبار کے

بارے میں سوچ رہے تھے۔۔۔۔۔

☆.....☆.....☆

معمر ٹاؤن کلرک نے چشمہ درست کرتے

ہوئے شامی اور جوزف کی طرف دیکھا۔ پھر اس نے

شامی کے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا۔

”جناب اس مکان کی تفصیل بتانا بہت مشکل

”یہ بتانا بہت مشکل ہے۔ خاصی چھان بین کرنی پڑے گی۔“

”کیا آپ کسی ایسے شخص کے بارے میں بتا سکتے ہیں جو اس زمانے میں اس عمارت یا اسکول سے وابستہ رہا ہو؟“

”ایک صاحب ہیں۔“ ٹاؤن کلرک نے ذہن پر زور ڈالتے ہوئے کہا۔ ”شاید وہ کچھ مدد کر سکیں۔ ان کا نام سلیمان ہے اور وہ کسی زمانہ میں اس اسکول میں استاد تھے۔“

”ان کا پتہ کیا ہے؟“

”اتفاق سے وہ قریب ہی رہتے ہیں۔“ ٹاؤن کلرک نے کہا۔ ”یہاں سے داہنے ہاتھ کی تیسری گلی میں چوتھا مکان ان کا ہے، گلی کے کونے پر پرچون کی دکان ہے۔ وہاں سے معلوم کر لیجئے۔“

سلیمان کی عمر ستر کے لگ بھگ تھی۔ جسم درمیانہ اور صحت خاصی کمزور تھی۔ شامی اور جوزف کو دیکھ کر اس نے رکی آداب کا تکلیف کئے بغیر بولا۔

”آپ کو مجھ سے کیا کام ہے؟“

”آپ کسی زمانے میں ٹاؤن کمیٹی کے پرائمری اسکول میں پڑھاتے رہے ہیں۔“ شامی نے براہ راست مطلب کی بات کرتے ہوئے کہا۔ ”آپ کو یاد ہوگا کہ پرائمری اسکول اس زمانے میں زرین منزل میں ہوا کرتا تھا۔ میں اس عمارت کے بارے میں کچھ باتیں آپ سے معلوم کرنا چاہتا ہوں۔“

سلیمان کے چہرے کا رنگ قدرے متغیر ہو گیا۔ ”میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔“ اس نے ناگواری سے کہا۔ ”آپ کہاں سے آئے ہیں اور کس ضمن میں یہ معلومات حاصل کرنا چاہتے ہیں؟“

”ہم دارالحکومت سے آئے ہیں۔“ جوزف نے گلا صاف کرتے ہوئے کہا۔ ”ہم ایک پرائیویٹ.....“

سلیمان نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ”کیا آپ پولیس سے تعلق رکھتے ہیں۔“

”نہیں۔“ جوزف نے کہا۔

”محترم آپ نے یہ سوال کیوں کیا۔“

”میرا خیال ہے کہ میں آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکتا۔“ سلیمان نے جواب دیا۔ ”آپ کے یہاں آنے کا اصل مقصد کیا ہے؟“

”میں نے عرض کیا تھا کہ ہم زرین منزل کے بارے میں کچھ باتیں معلوم کرنا چاہتے ہیں۔“ شامی نے دوبارہ وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ”اس عمارت میں کچھ عرصہ پہلے پرائمری اسکول تھا اور آپ وہاں مدرس رہ چکے ہیں۔“

سلیمان کے چہرے پر الجھن اور گھبراہٹ کے آثار نظر آنے لگے۔

”شاید آپ یہ عمارت خریدنا چاہتے ہیں۔“ اس نے پہلو بدلتے ہوئے کہا۔ ”جناب میں معذرت چاہتا ہوں، اس سلسلے میں آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکتا۔“

”آپ کا اندازہ درست نہیں ہے۔“ شامی نے زور دیتے ہوئے کہا۔ ”ہمیں عمارت خریدنے سے کوئی دلچسپی نہیں۔ دراصل ہم عمارت کے اندر رونما ہونے والے بعض عجیب و غریب واقعات کی تحقیقات کے لئے آئے ہیں اور یہ تحقیقات عمارت کے موجودہ مالک کی درخواست پر کر رہے ہیں۔ ہم آپ کا زیادہ وقت نہیں لینا چاہتے، چند ایک سوالات ہیں۔“ شامی نے قدرے توقف کے بعد کہا۔ ”مثلاً یہ جانا چاہتے ہیں کہ کیا زرین منزل کے نیچے کوئی تہہ خانہ بھی تھا۔“

”اگر تھا تو.....“

”میں کہہ چکا ہوں کہ میں آپ کی مدد نہیں کر سکتا۔“ سلیمان نے غصے سے کہا۔ ”آپ فوراً یہاں سے چلے جائیں۔“

”کمال ہے صاحب آپ تو.....“

”آپ فوراً میرا مکان خالی کر دیں۔“ اس نے چیخ کر کہا۔ ”میرے پاس فضول باتوں کے لئے وقت نہیں ہے۔“

”کیا مطلب.....؟“

ہوئے اسے ہر وقت شرارتوں پر اکساتے رہتے تھے۔“
 ”معاف کیجئے۔“ شامی نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔ ”کیا اس لڑکے کا عمارت سے کوئی تعلق ہے؟“
 ”آپ سنتے جائیں۔ ابھی معلوم ہو جائے گا۔“
 سلیمان نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”میں نے سیفی کو شرارتوں سے باز رکھنے کے لئے نرمی اور محبت کے تمام طریقے آزما ڈالے لیکن اس پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ میری قوت برداشت کے لئے ایک آزمائش بن گیا تو تنگ آ کر میں نے اسے جسمانی سزا دی شروع کر دی۔ بچوں کے سامنے شرمندہ کیا۔ بعض اوقات تھپڑی سے اسے بری طرح چپا کہ اس کے بدن پر نشان پڑ جاتے۔ اس کے والدین غریب آدمی تھے۔ انہوں نے بھی بر طرح کے طریقے آزما ڈالے۔ لیکن سیفی پر ان تمام سزاؤں کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ سزا سے وہ اور بھی ڈھیٹ اور خود سر ہو گیا۔ پھر میں نے جھٹم پوشی اور درگزر کے ذریعے اس کی اصلاح کی، پر یہ بھی بے اثر ثابت ہوئی۔“
 قدرے توقف کے بعد اس نے کہا۔ ”سردیوں کی ایک صبح اس کا رویہ قطعی ناقابل برداشت ہو گیا۔ اس روز وہ دن بھر شرارتیں کرتا رہا۔ اس کی وجہ سے سارا دن کلاس میں ہنگامہ، شور، قہقہے اور طوفان برپا رہا۔ کوئی بچہ پڑھنے کے سوڈ میں نظر نہیں آتا تھا۔ اس روز موسم بہت خراب تھا اور طوفان کی آمد کے آثار نظر آ رہے تھے۔ میں حتی الامکان اس کی شرارتوں کو نظر انداز کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ لیکن آخر کار میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔“
 جھٹمی ہونے میں تھوڑی دیر رہ گئی تھی اور سیفی کی وجہ سے ایک منٹ کے لئے بھی پڑھائی نہیں ہو سکی تھی تب میں نے ایک مضبوط چھڑی کے ساتھ اسے بری طرح چپا۔ یہ دیکھ کر کلاس روم میں سناٹا چھا گیا۔ تمام لڑکے خوفزدہ نظر آنے لگے۔ تاہم سیفی پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ اتنی مار کھانے کے بعد نہ تو اس کی آنکھ سے آنسو ٹپکا اور نہ ہی منہ سے کوئی آواز نکلی۔ وہ خاموشی سے پٹا رہا اور عجیب نظروں سے مجھے گھورتا رہا۔ مار کھانے

”مطلب و مطلب کچھ نہیں۔ میں کہتا ہوں یہاں سے نکل جاؤ۔“ فرط جوش سے سلیمان کی آواز کانپ رہی تھی۔
 ”اچھی بات ہے۔“ شامی نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ”اگر آپ کو ہمارا آنا اتنا ہی برا لگا ہے تو ہم چلے جاتے ہیں۔ ناراض نہ ہوں۔“
 یہ کہہ کر دونوں دروازے کی طرف جانے لگے۔ سلیمان ایسے شخص کی طرح سر جھٹک رہا تھا جو کسی اندرونی کرب میں مبتلا ہو۔
 ”ٹھہریے۔“ اس نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ دونوں رک کر اس کی طرف دیکھنے لگے۔ ”بیٹھ جائیں۔“ اس نے دھیمی آواز میں کہا۔ ”مجھے اپنے رویے پر افسوس ہے امید ہے آپ مجھے معاف کر دیں گے۔“
 چند لمحوں تک وہ خلا میں گھورتا رہا۔ اس کا چہرہ دفعتاً کسی قریب المرگ شخص کی مانند ہو گیا تھا۔ اس نے مدھم آواز میں کہنا شروع کیا۔
 ”میں بوڑھا ہو چکا ہوں۔ نہ معلوم کون سا دن میری زندگی کا آخری دن ثابت ہو۔ اس لئے میں اب یہ بوجھ یہ اذیت اور ضمیر کی ملامت مزید برداشت نہیں کر سکتا۔“
 کسی اچانک خیال کے تحت اس کا جسم بری طرح لرز گیا۔ شامی اور جوزف خاموشی سے بیٹھ کر اس کی طرف دیکھنے لگے۔
 ”تقریباً پچیس سال پہلے کی بات ہے۔“ اس نے اپنا بیان جاری رکھتے ہوئے کہا۔
 ”جیسا کہ آپ نے کہا، میں ذریں منزل میں واقع پرائمری اسکول میں پڑھایا کرتا تھا۔ میرے شاگردوں میں ایک لڑکا انتہائی شریر اور ضدی تھا اس کا نام سیفی تھا۔ گو وہ ذہین اور ہوشیار تھا پر اس کی ساری ذہانت نت نئی شرارتوں میں صرف ہوتی تھی۔ اس کے دماغ میں نبھانے کیا چیز داخل ہو گئی تھی، وہ کبھی شرارتوں سے نہیں تھکتا تھا۔ چھوٹے سے اسکول میں اس کی وجہ سے ہنگامہ مچا رہتا تھا۔ بچے اسے تفریح کا ذریعہ سمجھتے

کے بعد گو وہ خاموش ہو گیا مگر پڑھنے پر بھی آمادہ نہ ہوا۔ بس اپنی سیٹ پر بیٹھ کر انتہائی نفرت اور حقارت بھری نظروں سے مجھے گھورنے لگا۔ اس کا یوں نفرت سے گھورنا میرے لئے اور بھی تکلیف کا باعث تھا۔ میں اندر ہی اندر ذہنی کرب اور کھنچاؤ سا محسوس کرنے لگا۔ یہ بات اس کی شرارتوں سے بھی زیادہ تکلیف دہ تھی، چھٹی کے بعد میں نے اسے روک لیا۔

اس وقت برف باری شروع ہو چکی تھی اور ہوا کا زور بتدریج بڑھتا جا رہا تھا۔ نامعلوم اس وقت میرے اندر کون سی شیطانی روح سما گئی تھی کہ مجھے کچھ ہوش نہ آیا کہ میں کیا کر رہا ہوں۔

اب یہ بات نہایت احمقانہ نظر آتی ہے۔

لیکن اس وقت میرا احساس یہ تھا کہ میرے اور سیفی کے مابین قوت ارادی کا مقابلہ ٹھن گیا ہے اور مجھے بہر صورت یہ مقابلہ جیتنا ہے۔ بصورت دیگر میری معلمانہ حیثیت ختم ہو جائے گی اور بچوں پر سے رعب جاتا رہے گا۔

دوسری طرف سیفی یہ سمجھ رہا تھا کہ اسے ایک اور شدید قسم کی مار پڑنے والی ہے، وہ پوری طرح مار کھانے کے لئے تیار کھڑا تھا اور انتہائی سرد اور ٹھہری ہوئی نظروں سے مجھے گھور رہا تھا۔ اس کی آنکھوں سے خوف یا گھبراہٹ کے بجائے نفرت ظاہر ہو رہی تھی۔ لیکن میں اسے ایک اور اذیت ناک سزا دینے کا ارادہ کر چکا تھا۔

اسکول کے عملے میں کسی کو اس بات کا علم نہیں تھا کہ عمارت کے نیچے ایک تہہ خانہ بھی ہے۔ تہہ خانے میں داخل ہونے کا صرف ایک ہی فرشی دروازہ تھا جو میری میز کے نیچے بچھے ہوئے قالین کے نیچے پوشیدہ تھا۔ اس فرشی دروازے پر اتفاقاً میری نظر پڑ گئی تھی۔

ایک روز چھٹی کے بعد صفائی کے خیال سے میں نے قالین ہٹایا تو وہاں پر تقریباً ڈیڑھ مربع فٹ سائز کا ایک فرشی دروازہ نظر آیا۔ بوجہ تجسس اسے کھول کر دیکھا

تو اندر کی جانب ایک انتہائی سانس خوردہ چوہی زینہ نظر آیا، نیچے تاریکی اور سردی تھی۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ ابتدا میں عمارت کے نیچے تہہ خانہ تعمیر کیا گیا تھا جس کے داخلی دروازے کو بعض وجوہات کی بنا پر اینٹیں چن کر بند کر دیا گیا تھا اور غالباً اس فرشی دروازے پر کسی کی نظر نہیں پڑی تھی۔ میں نے بھی اس دروازے کے بارے میں کسی کو بتانا مناسب نہیں سمجھا۔۔۔۔۔ کاش مجھ پر اس دروازے کا انکشاف نہ ہوتا۔ بعد میں اس دروازے کو بھی سینٹ سے بند کر دیا گیا تھا۔

اس روز میں نے تہہ خانہ کو استعمال کرنے کا ارادہ کر لیا۔ جب اسکول خالی ہو گیا اور تمام بچے اسکول کی حدود سے نکل گئے تو میں نے قالین ہٹا کر فرشی دروازہ کھولا اور سیفی کو تہہ خانہ دکھاتے ہوئے کہا کہ ”یا تو، تو اپنی شرارتوں سے توبہ کر لے یا پھر تہہ خانے کے اندر داخل ہو جا۔“ چند لمحوں تک وہ مردنگا ہوں سے مجھے گھورتا رہا۔۔۔۔۔ ”دیکھو توبہ کرو۔“ میں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔ ”اس میں تمہارا ہی بھلا ہے لیکن اگر تم توبہ نہیں کرنا چاہتے تو تہہ خانے میں اتر جاؤ اور یاد رکھو جب تک تم پچھلی حرکتوں کی معافی نہیں مانگو گے اور آئندہ کے لئے شرارتوں سے باز رہنے کا وعدہ نہیں کرو گے میں تمہیں باہر نہیں نکالوں گا۔“

وہ احتجاج کئے بغیر خاموشی سے تہہ خانے میں اتر گیا۔

میں نے شدید غصے کے ساتھ ڈھکنا بند کر کے اوپر قالین پھیلا دیا اور کرسی پر بیٹھ کر انتظار کرنے لگا۔ مجھے پورا یقین تھا کہ چند منٹوں کے بعد وہ اپنی شکست تسلیم کر لے گا اور چیخ چیخ کر معافی مانگتے ہوئے باہر نکلنے کی درخواست کرے گا۔

تہہ خانہ تاریک اور کولڈ اسٹوریج کی مانند سرد تھا۔ جہاں چند منٹ گزارنے انتہائی مشکل تھے۔۔۔۔۔

مجھے وہاں بیٹھے ہوئے نصف گھنٹہ گزر گیا پر اندر سے کوئی آواز نہ آئی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ میرا غصہ بڑھتا جا رہا تھا۔ گویا میری قوت ارادی شکست

کہ وہ طوفان کی وجہ سے راستہ بھٹک گیا ہوگا۔
دوسرے بچوں کے ذریعے یہ بات عام ہو چکی تھی کہ
میں نے سیفی کو چھٹی کے بعد روک لیا تھا، صورت حال
بہت تازک تھی، پس میں نے جھوٹ بولنے میں ہی
عافیت سمجھی اور کہا کہ ”چند منٹوں کے بعد میں نے سیفی
کو رخصت کر دیا تھا، بلکہ وہ کچھ دور تک میرے ساتھ
ہی گیا تھا۔“

میرا یہ جھوٹ گاؤں والوں نے آسانی کے
ساتھ تسلیم کر لیا۔ اکثر لوگوں کا خیال تھا، سیفی نے دانستہ
جنگل کا راستہ اختیار کیا ہوگا اور یا تو برف باری کے
طوفان میں ہلاک ہو گیا ہوگا یا کہیں چھپا ہوا ہوگا۔

تاہم چند لوگ ایسے بھی تھے جنہیں میرے بیان
پر شک تھا۔ پران کی تعداد بہت کم تھی۔

ذاتی طور پر میرا خیال یہ تھا کہ ”دیر تک تمہ
نمانے میں انتظار کرنے کے بعد وہ باہر نکل کر گھر کے
لئے روانہ ہوا ہوگا اور راستے میں برف کے نیچے دب
کر ہلاک ہو گیا ہوگا۔“ یہ خیال آتے ہی مجھے اندیشہ
ہوا کہ وہ فرشی دروازہ کھلا چھوڑ گیا ہوگا۔ اور اگر کسی
نے تمہ خانہ کا کھلا ہوا دروازہ دیکھ لیا تو میرے لئے
مشکلات پیدا ہو جائیں گی۔

شام سے کچھ دیر پہلے میں چپکے سے اسکول پہنچ
گیا۔ وہاں یہ دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی کہ ہر شے اپنی جگہ
پر موجود تھی، فرشی دروازہ حسب معمول قالین سے ڈھکا
ہوا تھا، میری کرسی بھی اسی حالت میں پڑی تھی۔

یہ دیکھ کر میرے جسم میں خوف کی لہر دوڑ گئی میں
نے جلدی سے قالین ہٹا کر فرشی دروازہ کھولا اور تمہ خانے
میں جھانکنے لگا۔ دروازے کی راہ سے داخل ہونے والی
روشنی میں، میں نے اندر ایک ہولناک منظر دیکھا۔
سائنورہ چوبی زینہ ٹوٹا ہوا تمہ خانے کے فرش پر پڑا تھا۔
قریب ہی سیفی اونڈھے منہ فرش پر پڑا تھا۔

اس امید پر کہ شاید اس کے جسم میں زندگی کی
کوئی رت باقی ہو، میں نے جلدی سے اپنی ہڈی کا ایک
سراڈیک کے ساتھ باندھا اور اس کے سہارے تمہ

کھاتی جا رہی تھی۔
پھر ایک گھنٹہ گزر گیا لیکن سیفی نے باہر نکلنے کے
لئے کوئی درخواست نہیں کی۔

اس اثنا میں برف باری اور جھکڑ خاصی شدت
اختیار کر گیا تھا، تیز ہوائیں کسی ماتی ساز کی مانند چھتی
ہوئی گزر رہی تھیں۔

اس وقت شاید میں براہ راست شیطان کے
تصرف میں تھا۔ میں نے سیفی کو اس کے حال پر چھوڑ دیا
اور خاموشی کے ساتھ وہاں سے نکل گیا۔

شامی اور جوزف کے چہرے پر خوف اور بے
یقینی کے تاثرات ابھرتے دیکھ کر اس نے کہا۔

”بظاہر یہ ایک ظالمانہ فیصلہ نظر آتا ہے۔ لیکن
مجھے یقین تھا کہ جب سردی ناقابل برداشت ہو جائے
گی تو سیفی فرشی دروازہ کھول کر باہر نکل آئے گا اور کمرہ
خالی پا کر سیدھا اپنے گھر بھاگ جائے گا۔“ یہ نتیجہ
ہوئے بوڑھے سلیمان کی آواز بھرا گئی۔ اور آنکھوں سے
آنسو بہنے لگے۔

”خدا میرے گناہ معاف کرے، جو سانحہ اس
بچے پر گزرا، میں نے ہرگز دیا ارادہ نہیں کیا تھا۔ میں
گھر جاتے ہوئے راستے میں اس قدر غصے کی حالت
میں تھا کہ برف باری اور طوفان کی شدت پر مطلق غور نہ
کر سکا۔ مجھے رہ رہ کر سیفی کی ضد اور ہٹ دھرمی پر غصہ
آ رہا تھا۔ اس رات کئی سال کے بعد شدید برف باری
ہوئی تھی جس کی وجہ سے کچھ دیر کے بعد تمام راستے
مسدود ہو گئے۔

اگلی صبح مجھے اپنی حرکت پر سخت ندامت ہوئی۔
تمام شرارتوں اور حماقتوں کے باوجود سیفی، بہر حال ایک
کمزور بچہ تھا۔ اور بزرگانہ شفقت کا مستحق تھا۔ مجھے امید
تھی کہ وہ تمہ خانے سے نکل کر ضرور گھر پہنچ گیا ہوگا۔
اگلے روز اسکول کی چھٹی تھی۔

دوپہر کے وقت مجھے معلوم ہوا کہ سیفی اپنے
گھر نہیں پہنچا۔ ان کا ایک پڑوسی مجھ سے سیفی کے
بارے میں معلوم کرنے آیا تھا، گھر والوں کا خیال تھا

خانے میں اتر گیا۔ اندر رخ کر دینے والی سردی تھی۔

سینی سردی سے ٹھنکر کر مر چکا تھا۔

آس پاس کا جائزہ لینے کے بعد اس کے ساتھ پیش آنے والے حالات کا اندازہ لگانا مشکل نہ تھا۔ اندر کی ناقابل برداشت سردی کی وجہ سے اس نے تھوڑی ہی دیر بعد باہر نکلنے اور معافی مانگنے کا ارادہ کر لیا ہوگا۔ یہ سوچ کر اس نے سیڑھیوں پر چڑھنا شروع کیا ہوگا۔ چند سیڑھیاں طے کرنے کے بعد سالخوردہ چوبی زینہ ٹوٹ گیا ہوگا اور اس کے ساتھ ہی وہ بھی فرش پر گر گیا اور اس کی ایک ٹانگ زخمی ہو گئی۔ اس کے باوجود وہ باہر نکلنے کے لئے جدوجہد کرتا رہا تھا۔ اس کے ہاتھوں کی انگلیاں زخمی تھیں اور ناخن مٹی سے بھرے ہوئے تھے۔

زینہ ٹوٹنے کے بعد اس نے زور زور سے مجھے آوازیں دی ہوں گی لیکن شاید برف باری اور پرشور ہواؤں کے باعث میں اس کی آواز نہیں سن سکا تھا۔ پر وہ انتہائی مایوسانہ انداز میں دیواروں کو کھرچتا ہوا باہر نکلنے کا راستہ تلاش کرتا رہا تھا۔ اس کا انداز دیواروں پر پائے جانے والے ناخنوں کے نشانات اور اس کی زخمی انگلیوں سے ہوتا تھا۔ بالآخر نہایت اذیت کے ساتھ سردی میں ٹھنکر کر مر گیا ہوگا۔

کمرے سے آتی ہوئی مدھم روشنی میں اس کے چہرے پر ناقابل بیان اذیت اور غصے کے تاثرات نظر آتے تھے۔

اُوہ آج بھی اس دہشت ناک منظر کو یاد کر کے میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ میں نے تہہ خانے کے ایک کونے میں چھوٹا سا گڑھا کھود کر اس کی لاش کو وہاں دفن کر دیا۔ پھر باہر نکل کر قالین کو فرش پر دروازے پر پھیلا دیا اور خاموشی سے گھر واپس آ گیا۔ پھر بعد میں تہہ خانے کا منہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بند کر دیا۔

کچھ عرصے بعد سینی کی گمشدگی ایک بھولی بسری داستان ہو گئی۔ چونکہ وہ غریب والدین کا بیٹا تھا اس لئے

کسی نے اس معاملے کی طرف زیادہ توجہ نہیں دی۔ بعد میں جب میں کرسی پر بیٹھ کر بچوں کو پڑھاتا تو بعض اوقات یوں محسوس ہوتا کہ نیچے سے سینی کی آواز آرہی ہے۔ وہ چیخ چیخ کر مجھ پر لعنت کر رہا ہے۔ نفرت اور حقارت کا اظہار کر رہا ہے اور انتقام انتقام پکا رہا ہے، بسا اوقات وہ آواز اتنی نمایاں سنائی دیتی کہ میں کلاس میں بیٹھے ہوئے بچوں کی طرف دیکھنے لگتا اور خیال کرتا کہ شاید وہ بھی یہ آواز سن رہے ہیں۔

دھیرے دھیرے وہ آواز کسی بھگی ہوئی روح کی مانند میرے دل و دماغ پر مسلط ہونی شروع ہو گئی۔ مجھے یقین کی حد تک محسوس ہونے لگا کہ سینی کی روح بدستور تہہ خانے کے اندر موجود ہے اور انتقام کا منصوبہ بنا رہی ہے۔ میرا خوف اس حد تک بڑھا کہ میں تنہا اسکول میں جاتے ہوئے گھبرانے لگا۔

اگلے موسم سرما میں، میں نے زبردست خوف، دہشت اور ذہنی کھنچاؤ، محسوس کرنا شروع کر دیا۔ کبھی کبھی یوں محسوس ہوتا کہ میں پاگل ہو جاؤں گا۔ برف باری اور طوفان کے وقت میری حالت پاگلوں کی سی ہو جاتی۔ یوں معلوم ہوتا کہ سینی میرے سامنے کھڑا ہے اور ٹھہری ہوئی نظروں سے مجھے گھور رہا ہے۔ اس کی آنکھوں سے نفرت اور انتقام کی چمکاریاں نکل رہی ہیں۔ ایسے مواقع پر میری قوت برداشت جواب دے جاتی اور جی چاہتا کہ تمام واقعہ بے کم و کاست بچوں کو سنا دوں تاکہ کچھ تو ذہنی بوجھ ہلکا ہو۔ پھر کسی نادیدہ خوف کے تحت ایسا کرنے سے باز رہتا۔

پچیس سال سے میری زندگی اس دائمی عذاب میں مبتلا ہے۔ شاید تمام حیات یہ سزا موقوف نہیں ہوگی۔ میں فی الوقت اس سزا کا مستحق ہوں، اس اذیت کے مقابلے میں اب موت بھی بے حقیقت چیز معلوم ہوتی ہے۔“

قدرے توقف کے بعد اس نے مزید کہا۔ ”اب مجھے اس بات کی کوئی پروا نہیں کہ بستی کے لوگ حقیقت کے انکشاف پر کیا رد عمل ظاہر کرتے ہیں لیکن اعتراف

آواز سنائی دی، چند لمحوں تک ہر شخص اپنی اپنی جگہ پر ساکت ہو کر رہ گیا۔ پھر سب سے پہلے شامی کا جسم حرکت میں آیا۔

”جوزف.....“ اس نے چیخ کر کہا۔ ”جلدی سے کسی رسی کا انتظام کرو۔“ جوزف رسی ڈھونڈنے کے لئے دوسرے کمرے کی طرف بھاگا اور شامی جھک کر اندر دیکھنے لگا۔ دفعتاً وہ تیزی سے پیچھے ہٹ گیا۔

اندر سے زرد رنگ کا دھندلا سا غبار باہر نکل رہا تھا۔ نصف منٹ کے بعد وہ غبار کمرے کی فضا میں تحلیل ہو گیا۔ تہہ خانے میں مکمل سناٹا تھا۔

شامی نے سوراخ کے قریب منہ کر کے بلند آواز سے ”سلیمان۔ سلیمان“ پکارا لیکن اندر سے کوئی جواب نہ آیا۔

اس اثنا میں ریاض ایک بڑی سی ٹارچ لے کر آگیا اور نیچے روشنی ڈال کر دیکھنے لگا۔ وہاں ایک ناقابل یقین منظر سب کا منتظر تھا۔

سلیمان اوٹدھے منہ فرش پر پڑا تھا۔ اس کے اوپر ایک انسانی ڈھانچہ جس کی لمبائی بمشکل چار فٹ ہوگی پھیلا پڑا تھا۔ اس ڈھانچے کے دونوں ہاتھ سلیمان کی گردن میں پیوست تھے اور سلیمان مر چکا تھا۔

”شامی صاحب، یہ قہقہے کی آواز کیسی تھی؟“ ریاض نے پوچھا۔

شامی نے کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا ہی تھا کہ اسی بجکانہ قہقہے کی آواز خواب گاہ سے آتی سنائی دی۔ تمام لوگ چونک کر اس طرف دیکھنے لگے، ایک ٹاپے کے بعد وہ آواز صحن سے سنائی دی۔ پھر وہ آواز فضا میں قہقہے بکھیرتی ہوئی دور ہوتی چلی گئی۔

شامی نے ایک طویل سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”ریاض صاحب اب آپ کو بے خوابی اور بے چینی کی شکایت نہیں ہوگی۔ بے چمن کرنے والی روح اپنی اصل منزل کی طرف چلی گئی ہے۔“



جرم کے بعد میرے سینے سے بہت بڑا بوجھ ہلکا ہو گیا ہے اور میری آخری خواہش یہ ہے کہ سیفی کی لاش کو۔ یا جو بھی ہڈیاں اس کی ہنپی ہوئی ہوں انہیں پورے احترام کے ساتھ دفن کروں شاید اس سے اس کی بھنگی ہوئی روح کو کچھ قرار آ جائے۔“

زریں منزل کے قریب وجوار میں تیز ہواؤں کے ساتھ برف باری ہو رہی تھی۔ شامی اور جوزف بوڑھے سلیمان کے ہمراہ اس کمرے میں کھڑے تھے جس کے نیچے مبینہ طور پر تہہ خانہ واقع تھا۔ ایک طرف ریاض اور اس کی خوب رو بیوی ثروت کے علاوہ بستی کے دو معزز اور ذمہ دار افراد بھی وہاں موجود تھے۔

سلیمان نے ایک مقام کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا کہ ”کسی زمانے میں اس جگہ فرش دروازہ تھا۔“ یہ وہی جگہ تھی جہاں سے دھندلا غبار اٹھتا ہوا دیکھا گیا تھا۔

باہمی مشورے کے بعد وہاں سے فرش توڑنے کا فیصلہ کیا گیا۔ پھر ایک مزدور کا انتظام کیا گیا جس نے تقریباً ایک گھنٹے کے بعد تہہ خانے میں داخل ہونے کا راستہ بنا دیا۔ پھر ایک سیڑھی نیچے اتاری گئی۔

سلیمان کا اصرار تھا کہ سب سے پہلے وہ تہہ خانے میں داخل ہوگا۔

بہر حال کسی نے اسے روکنے کی کوشش نہیں کی اور ویسے بھی وہشت کی وجہ سے کوئی بھی اندر داخل ہونے پر تیار نہیں تھا۔ پس وہ سیڑھی کے ذریعے نیچے اترنا شروع ہو گیا۔ خوف کی وجہ سے اس کے ہاتھ ہر کانپ رہے تھے۔ ابھی اس نے تیسرے یا چوتھے ڈنڈے پر تن قدم رکھا تھا کہ سیڑھی پھسل گئی اور سلیمان کو لئے ہوئے ایک دھماکے سے فرش پر گر گئی۔

عین اس وقت ایک مافوق الفطری واقعہ پیش آیا جس نے جملہ حاضرین کو ورطہ حیرت میں ڈال دیا۔

سیڑھی گرنے کے ساتھ ہی سلیمان نے ایک درد ناک چیخ بلند کی جس کے فوراً بعد اندر سے بجکانہ قہقہے کی

مجازی محبت

شکیل نیازی - میانوالی

نوجوان اور ایک خوب رو حسینہ آپس میں باتیں کر رہے تھے اور جس کے متعلق باتیں ہو رہی تھیں وہ آیا اور اپنا نام سنتے ہی دروازے کے باہر ٹھٹک کر رک گیا وہ بات اس کے کان میں پڑتے ہی وہ دھل گیا۔

انسانی زندگی پر سب سے زیادہ محبت کا اثر ہوتا ہے۔ اس کے مصداق یہ حقیقی رواداد ہے

کی نماز بھی پڑھنی ہے، زین نے گھڑی کی طرف دیکھ کر اٹھتے ہوئے کہا۔

”مسٹر زین جیسے کہ آپ کو پتہ ہے کہ کل آپ کے اکلوتے دوست کی سالگرہ ہے اور اگر حضور اس بار بھی اپنے سابقہ ریکارڈ کی طرح غیر حاضر پائے گئے تو اس بار آپ کو اپنے اکلوتے دوست سے ہمیشہ کے لئے ہاتھ دھونے پڑیں گے۔“ ندیم نے بڑے سنجیدہ انداز میں کہا۔

”ندیم تمہیں تو پتہ ہے کہ ابو شام کے بعد باہر جانے کو کتنا برا سمجھتے ہیں۔“ زین نے فکر مند ہو کر کہا۔

”کوئی بات نہیں اگر انکل نے آنے کی اجازت نہ دی تو پھر اپنے بیٹے کو ساری عمر ہی اپنے گلے سے لگا کے رکھیں۔“

”نہیں اس بار اجازت دے دیں گے۔“ زین نے کچھ سوچ کر کہا تو ندیم نے سر ہلا دیا۔

زین العابدین کے والد امین اللہ جامع مسجد کے امام تھے۔ انتہائی نیک اور شریف انسان تھے۔ محلے کے لوگ ان سے بڑی عقیدت رکھتے تھے، ان کا دھیمہ مدھم لہجہ سننے والے کو اپنے سحر میں جکڑ لیتا تھا۔ امین اللہ کی ایک بیٹی پاکیزہ اور ایک بیٹا زین العابدین تھا۔ ان کی بیوی کا انتقال زین کی پیدائش کے وقت ہو گیا تھا۔

سرخ و سفید رنگت چہرے پر معصومیت اور شفاف لباس میں ملبوس وہ کوئی فرشتہ نظر آ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں موجود قلم تیزی کے ساتھ کاپی کی چکنی سطح پر پھسلتا جا رہا تھا۔ ”زین شام تک ہو جائے گا۔“ دوسرے لڑکے نے کہا جو اس کا ہم عمر ہی تھا وہ صوفے پر تشریا لیٹا ہوا تھا۔ دونوں ٹانگیں سامنے پھیلا رکھی تھیں اور ساتھ ساتھ وہ سگریٹ کے گہرے گہرے کش بھی لگا رہا تھا۔ اس کے مخاطب کرنے پر اس لڑکے کا قلم رک گیا اور اس نے اپنی سبز رنگت رکھنے والی آنکھوں کو ایک ادا کے ساتھ اٹھا کر اسے گھورا۔ ”ارے تمہاری ایسی ہی اداؤں نے میڈم تازیہ کو تمہارا دیوانہ بنا رکھا ہے بے چاری سارا پیریڈ زین العابدین کی تعریف میں گزار دیتی ہے۔“

”ایسا نہیں بولتے دس سال ہو گئے ہیں ان کی شادی کو ان کی ادلا نہیں ہے، شاید یہی وجہ ہے کہ وہ زیادہ توجہ دیتی ہیں۔“ زین العابدین نے کاپی اور قلم ایک طرف رکھ کر کہا۔

”ہاں ہاں پوری کلاس میں تم ہی تو ہو جس میں اسے اپنا ہونے والا بیٹا نظر آتا ہے۔“ ندیم نے منہ بنا کر کہا اور زین اسے صرف گھور کے رہ گیا۔

”اوکے میں چلتا ہوں، پانچ ہو گئے ہیں اور عمر



ندیم ریسلنگ، کرکٹ اور فلمیں دیکھنے کا جنون کی حد تک شوق رکھتا تھا۔ ندیم کے والد عباس صاحب شہر کے مشہور بزنس مین تھے، دولت گھر کی لونڈی تھی۔ اس لئے ندیم کو ہر طرح کی عیاشی میسر تھی۔

☆.....☆.....☆

زین پچھلے ایک گھنٹے سے پاکیزہ کو ابا جان سے اجازت لے کر دینے کے بارے میں کہہ رہا تھا۔ ”زین تمہیں پتہ ہے تاکہ ابا جان کو ایسی محفلوں سے کتنی نفرت ہے۔“ پاکیزہ نے کہا۔

”بابی پلیز! ایک بار اجازت لے لوں اگر اس بار میں نہ گیا تو ندیم بہت خفا ہوگا اور پھر ایک ہی تو دوست ہے میرا، پلیز! میرے لئے ابو سے بات کریں ناں۔“ زین نے منت کرنے والے انداز سے کہا۔

”نہیں میں ابو سے ایسی ویسی کوئی بات نہیں کرنے والی، تمہیں دوستوں کے بجائے اپنی پڑھائی پر توجہ دینی چاہئے۔“ پاکیزہ نے دو ٹوک لہجے میں کہا۔

”ٹھیک ہے نہیں جانتا لیکن آج کے بعد میں بھی آپ سے بات نہیں کروں گا۔“ زین نے ناراضگی سے کہا۔ ”زین اب ناراض نہ ہو۔“ پاکیزہ نے پریشان ہو کر کہا۔

پاکیزہ اس وقت صرف بارہ سال کی تھی۔ لیکن اس نے ایک ماں کی طرح زین کی ساری ذمہ داری اپنے سر لے لی۔ اس کی اس انداز سے تربیت کی کہ وہ ہی اپنے ابا جان کا اصل جانشین بنے۔ اس نے کبھی زین کو ماں کی محسوس نہیں ہونے دی۔ امین اللہ پاکیزہ کی جلد از جلد شادی کرنا چاہتے تھے لیکن پاکیزہ نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ ”جب تک زین میٹرک نہیں کر لیتا اس وقت تک وہ شادی نہیں کرنا چاہتی۔“ امین اللہ بھی زین کی وجہ سے زیادہ نہیں بولتے تھے۔

زین بالکل اپنی ماں پر گیا تھا وہی ہلکی سبز رنگت رکھنے والی آنکھیں، وہی ناک، وہی حسن و جمال، امین اللہ اپنی بیوی رابعہ سے بہت محبت کرتے تھے، اس لئے دوسری شادی نہ کر پائے۔ ویسے بھی پاکیزہ نے ان کا بہت ساتھ دیا تھا۔ ان کو کبھی زین کی طرف سے شکایت نہ ہونے دی۔ زین حسین ہی نہیں بہت ذہین بھی تھا۔ ہر کلاس میں پوزیشن ہولڈر تھا۔ وہ نیم میں پڑھ رہا تھا۔ وہ بہت کم کسی کے ساتھ بولتا تھا۔ اسی حساب سے اس کے دوست بھی کم تھے۔ ندیم سے اس کی بہت اچھی دوستی تھی۔ لیکن دونوں کے شوق جدا تھے۔ زین شاعری، فلسفہ، سفر نامہ و تاریخ کے موضوع پر کتابیں پڑھنے کا شوقین تھا، جبکہ

داخل ہوا عباس صاحب کو سامنے پایا۔ ”زین بیٹا کیا حال ہیں۔“ عباس صاحب نے خوشگوار انداز سے پوچھا۔
 ”ٹھیک ہوں انکل۔“ زین نے بھی جواباً مسکرا کر کہا، اتنے میں ندیم بھی وہاں آ گیا۔ ”زین یہ تم ہو مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں ہو رہا، تمہارے ابو نے کیسے اجازت دی۔“

”بس کسی نہ کسی طرح اجازت مل گئی۔“ زین نے مسکراتے ہوئے کہا۔

عباس صاحب نے آنے والے مہمانوں کو دیکھ کر کہا۔ ”آؤ میں تمہیں اپنے کزنز سے ملاتا ہوں۔“ ندیم زین کا ہاتھ پکڑ کر اسے ایک طرف لے گیا اور مختلف لوگوں سے اس کا تعارف کرانے لگا، ایک تو زین کی خوبصورتی اور دوسری اس کی سادگی سے بھی کو اس کا دیوانہ بنا ڈالا۔ خصوصاً وہاں موجود اونچے اور آزاد گھرانوں کی لڑکیوں نے ایسی سادگی اور حسن کو پہلے نہیں دیکھا تھا جو بھی اسے دیکھتی فوراً ہاتھ آگے بڑھا دیتی۔ ”ہائے آئی ایم تانیہ“ ایک خوب صورت لڑکی نے ہاتھ آگے بڑھا دیا۔

”ندیم کے بچے کس مشکل میں ڈال دیا تمہیں ہاں ہے نا مجھے لڑکیوں سے گنتی المرحی ہے۔“ زین نے ندیم کے کان میں کہا۔

”نوکے کزنز بعد میں بات کرتے ہیں ذرا ہم دوسرے لوگوں سے بھی مل آئیں۔“ ندیم نے زین کی مجبوری کو سمجھتے ہوئے اسے لے کے آگے بڑھ گیا۔ ”بے شرمی کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔“ زین نے غصے سے ندیم کو کہا۔

”او بھائی اس میں لڑکیوں کا کوئی قصور نہیں ہے تم لگتے ہی اتنے قائل ہو کہ بندے کا دل خود بخود قفل ہونے کے لئے تیار ہو جاتا ہے۔“ ندیم نے اسے مسکرا کے دیکھتے ہوئے کہا تو وہ خود شرمائے اندر ادھر دیکھنے لگا۔

لان میں بہت سی میزیں لگی ہوئی تھیں اور ایک طرف اسٹج بھی لگا ہوا تھا جہاں آلات موسیقی رکھے ہوئے تھے۔ ”حضرات آپ سب کا بہت بہت مشکور ہوں کہ آپ ہماری دعوت پر آئے۔ آپ سب کی تفریح کے لئے ایک محفل موسیقی کا انتظام کیا ہے اور میں میز ماہ نور کو آپ کی

”آپ کو کیا فرق پڑتا ہے میں راضی ہوں یا ناراض۔“ زین نے منہ بنا کر کہا۔
 ”ٹھیک ہے میں ابو سے بات کروں گی، لیکن یہ پہلی اور آخری بار ہوگی۔“ پاکیزہ نے کہا۔
 ”ٹھیک ہے باجی اس کے بعد کبھی نہیں کہوں گا۔“ زین نے خوش ہو کر کہا او پاکیزہ نے سر ہلادیا۔

خیر شام کے کھانے کے بعد پاکیزہ نے ابو سے بات کی تو وہ سوچ میں پڑ گئے۔ ”پاکیزہ بیٹا تمہیں تو پتہ ہے نا کہ آج کل کے ماحول کا، مانا کہ ندیم زین کا دوست ہے لیکن عباس صاحب کی فیملی بہت ایڈوانس ہے، میں نہیں چاہتا کہ زین کے دامن پر کوئی دھبہ لگے اور پھر سانگرہ جو کہ ہے ہی گناہوں کا پلندہ، عباس صاحب کی فیملی میں تو پردے کا تصور بھی محال ہے، ایسی مخلوط محفل کا زین پر برا اثر پڑے گا۔“

”نہیں اباجی میں نے زین کو مال بن کے پاا ہے۔ مجھے پتا ہے کہ وہ کسی سوچ رکھتا ہے، وہ کبھی بھی آپ کے دیئے ہوئے سبق کو نہیں بھول سکتا اور رہا سوال یہ کہ وہ محفل مخلوط محفل ہے تو ابازین ابھی بچہ ہے اسے ایسی سوچ کیسے آ سکتی ہے۔ آپ کو اس پر بھروسہ کرنا چاہئے وہ آپ کا بھروسہ کبھی نہیں توڑے گا۔“ پاکیزہ نے زین کی بھرپور وکالت کی۔

”ٹھیک ہے لیکن اس سے کہنا کہ گھر جلدی واپس آئے۔“ ابو نے کہا اور عشا کی نماز پڑھنے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے۔

☆.....☆.....☆

عباس صاحب کا بنگلہ ایسے لگ رہا تھا جیسے ندیم کی سالگرہ نہیں شادی ہو رہی ہو۔ پارکنگ ایریا میں رنگ برنگی کاروں کی لائن لگی ہوئی تھی۔ ندیم کا گھر زین کے گھر سے دو گلیوں کے فاصلے پر تھا۔ اسلئے زین پیدل ہی ندیم کے گھر تک آیا تھا۔ اندھیرا اچھا خاصا پھیل چکا تھا۔ اندر سے بہت سے لوگوں کے بولنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ زین کے لئے کسی محفل میں جانے کا یہ پہلا موقع تھا۔ اس لئے وہ دھڑکتے دل کے ساتھ اندر داخل ہوا۔ وہ جیسے ہی اندر

بھر پور تالیوں میں اسٹیج پر آنے کی دعوت دیتا ہوں۔“ عباس صاحب نے کہا اور لان تالیوں کی آواز سے گونج اٹھا۔

”زین یہ شہر کی مشہور و معروف گلوکارہ ہیں جس محفل میں جاتی ہیں چار چاند لگ جاتے ہیں اس محفل کو۔“ ندیم نے زین کی معلومات میں اضافہ کیا، بلکہ گلابی رنگ کے فرائڈ میں وہ قیامت ڈھا رہی تھی۔ اس کی عمر لگ بھگ بیس سال کی رہی ہوگی لیکن ایسا حسن بہت کم ہی نظر آتا ہے، گہری سیاہ موٹی آنکھیں، نرم وار پٹلیں، گلاب کی پتیوں کی مانند ہونٹ، اونچی ٹاک، انگاروں کے مانند دیکھتے گال اور اونچا قد جو اس کی شخصیت کو اور زیادہ پرکشش بناتا تھا۔ جن لوگوں نے اسے پہلے نہیں دیکھا تھا، انہوں نے پر جوش انداز سے تالیاں بجا لیں اور جن لوگوں نے اسے پہلے دیکھا تھا وہ تالیاں بجاتا ہی بھول گئے، جو تالیاں بجاتا بھول گئے ان میں زین بھی شامل تھا۔ وہ نہ چاہتے تھے کہ باوجود اسے دیکھنے پر مجبور تھا۔

ماہ نور نے اسٹیج پر آتے ہی اپنا ہاتھ پیشانی تک لے جا کے جھکے ہوئے انداز میں آداب کیا اور اس کے ساتھ ہی ساز بجا اٹھے۔ ماہ نور نے بڑی نزاکت کے ساتھ مائیک ہاتھ میں لیا اور ایک غزل چھیڑی۔

”اے دوست میرے ہمدم مجھے تم چھوڑ مت جاؤ
کبھی غصہ میں آئے تم چہرہ یہ موز مت جانا“
زین کو ایسا محسوس ہوا جیسے وہ غزل نہیں گا رہی بلکہ اس پر جادو کر رہی ہے اور لفظوں سے اسے اندھے چال میں جکڑ رہی ہے۔ وہ جوں جوں غزل گاتی چلی گئی، زین کو لگا وہ جیسے کسی دریا کی موجوں کے ساتھ ساتھ بہتا جا رہا ہے۔ وہ تب اپنی سوچوں سے باہر نکلا جب وہ غزل ختم کر چکی تھی اور سامعین تالیاں بجا رہے تھے۔ اس کے ساتھ ہی عباس صاحب نے کیک کاٹنے کا اعلان کیا۔

ندیم نے زین کے ہاتھ کو تھاما اور لان کے درمیان موجود بڑی میز کے پاس لے آیا۔ بس پر ایک بڑے سائز کا کیک پڑا تھا۔ سب لوگ میز کے گرد جمع ہو گئے اور عباس صاحب کے کہنے پر ماہ نور آگے بڑھی اور ندیم کے ہاتھ کو تھاما جس میں ندیم چھری پکڑ چکا تھا۔ ”ہی ہی برتھ ڈے ٹو

یو۔“ کی آوازوں کے ساتھ ہی کیک کا ایک ٹکڑا الگ ہو گیا۔ ماہ نور نے وہ ٹکڑا اٹھا کر ندیم کی طرف بڑھایا اور جیسے ہی ندیم نے منہ کھولا تو ماہ نور نے وہ ٹکڑا تیزی کے ساتھ زین کے منہ میں ٹھونس دیا۔

زین جو اس کے چہرے کو دیکھنے میں گم تھا جلدی میں پوری طرح منہ بھی نہ کھول سکا اور کیک پر نگہ کریم نے اس کے چہرے پر موجیں بنا ڈالیں۔ ندیم شرمندہ سی ہنسی ہنس پڑا اور لان قہقہوں سے گونج اٹھا۔ زین بھی شرمندہ انداز میں روہنی سے منہ صاف کرنے لگا۔ ”ایسے ہی رہنے دو مرد لگ رہے ہو۔“ تو زین نے اور شرمندگی محسوس کی۔ زین کو لگا وہ اسے دیکھ رہا تھا تو اس بات کو محسوس کر کے ماہ نور نے اس کی کم عمری پر طنز کیا ہے۔

”دیکھو کیسے چو نچلے کر رہی ہے کیوں کہ عباس صاحب کے ساتھ اچھا بھلا اسکیٹڈ چل رہا ہے اس کا آج کل۔“ ایک خاتون نے طنزیہ انداز میں کہا تو زین نے بھی سن لیا۔

”عباس صاحب کی اولاد بھی جواں ہے اور ان کو اپنی عمر کا بھی احساس نہیں۔“ ایک اور عورت بولی۔

”دو سال ہو گئے بیوی کو فوت ہوئے، شادی تو ویسے ہی کرنی ہے کیوں نہ ماہ نور سے کر لیں۔ ایک اور خاتون نے خاموشی توڑ دی۔ اسی طرح کے بہت سے فقرے زین کے کانوں میں پڑے لیکن وہ کچھ نہ سمجھ پایا۔

تھوڑی دیر بعد ماہ نور چلی گئی تو زین کو بھی ہوش آیا کہ ابانے گھر جلدی آنے کا بولا تھا۔ زین نے جلدی سے ندیم سے اجازت لی اور باہر نکلا، ابھی چند قدم ہی چلا تھا کہ ایک کار نے پاس آ کر بارن بجایا۔ وہ ایک طرف ہوا تو کار اس کے ساتھ آ کر رک گئی۔ ”ارے آپ! وہ بھی پیدل۔“ ماہ نور نے کار کا دروازہ کھول کے کہا۔

زین کو لگا کہ وہ کہیں خواب تو نہیں دیکھ رہا۔ ”جی وہ میرا گھر پاس ہی ہے۔“ زین نے نہ جانے کس طرح فقرہ مکمل کیا اور نہ تو اس کے ہوش ہی اڑ گئے تھے۔

”آئیے آپ کو راستے میں چھوڑ دیں گے۔“ ماہ نور نے ایک ادا سے کہا۔ ”نہیں کچھ قدم کا فاصلہ ہے۔“

زین نے قدرے شرمائے کہا۔

پیا تو آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا گھر کی طرف چل پڑا۔

”اوہو آپ تو تکلف میں پڑ گئے۔ اگر آپ کی رفاقت میں ہم دو قدم طے کر لیں گے تو یہ ہماری خوش قسمتی ہوگی۔“ ماہ نور نے ادا سے کہا تو زین ہنسنے لگا اس کے ساتھ بیٹھ گیا اسے لگا جیسے وہ کسی گلستان میں ہو۔

گھڑی میں مدہوش کرویے والی ہلکی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ زین اس کے ساتھ بیٹھ تو گیا تھا لیکن وہ خود ہی شرم سے پانی پانی ہو رہا تھا کہ اگر اب اس بات کی ذرا بھی ہنک لگ گئی تو ان کے دل پر کیا گزرے گی۔ ”گناہ ہے آپ ہمارے ساتھ بیٹھ کر پریشان ہیں۔“ ماہ نور نے اس کی چوری پکڑ لی۔

”نہیں تو۔“ زین نے فوراً کہا۔

”تو پریشان کیوں لگ رہے ہیں۔“

”وہ تھوڑا لیٹ ہو گیا ہوں تو باجی تھوڑا پریشان ہو رہی ہوگی۔ اسی لئے تھوڑا پریشان ہوں۔“ زین نے کہا۔

”ہر وقت پریشان رہنا خوبصورتی کو متاثر کر رہا ہے۔“ ماہ نور نے کہا۔ تو وہ کسی لڑکی کی طرح شرمائے۔

”بس یہیں اتار دیں۔“ زین نے جلی کے ٹوکڑ کی طرف اشارہ کر کے کہا اور فوراً اتر گیا۔

”کیا بات نہیں کریں گے۔“ ماہ نور نے اسے کہا تو وہ شرمندگی سے واپس مڑا۔ ”اللہ حافظ۔“

”کیا ہم اتنے اجنبی ہیں کہ ایک دوسرے سے ہاتھ بھی نہیں ملا سکتے۔“ ماہ نور نے کار سے اتر کر کہا اور اپنا نرم و نازک ہاتھ آگے بڑھادیا۔ زین کو لگا جیسے اس کا خود پر اختیار نہ رہا ہو اس نے بھی بے اختیار اس سے ہاتھ آگے بڑھایا تو ماہ نور نے دونوں ہاتھوں سے اس کے ہاتھ کو تھام لیا اس گرم جوش مصافحہ سے زین کا پورا جسم کانپ اٹھا۔ ماہ نور نے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ ”بہت جلد ملاقات ہوگی۔“

”انشاء اللہ“ زین کے منہ سے بے اختیار نکلا اور اس نے زین کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ اور تیزی سے مڑ کر گاڑی میں بیٹھی اور آگے بڑھ گئی۔ زین کھوئے کھوئے انداز سے اسے جاتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ جب گاڑی اس کی نظروں سے اوجھل ہو گئی تو اس نے گھبرا کے ارد گرد دیکھا اور جب کسی کونہ

وہ گھر آیا تو اس کے ابو تھوڑی طبیعت نامساں ہونے کی وجہ سے سوچکے تھے لیکن پاکیزہ اس کے انتظار میں ابھی جاگ رہی تھی۔ ”زین خیریت تو تھی بہت دیر کر دی۔ ابا جان تمہارا انتظار کرتے کرتے سو گئے ہیں۔ طبیعت تو ٹھیک ہے ناں۔“ پاکیزہ نے اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ”زین مجھے تم کچھ پریشان لگ رہے ہو۔“ پاکیزہ نے فکر مندی سے کہا۔

”نہیں باجی آپ خواہ مخواہ پریشان ہو رہی ہیں، ایسا کچھ بھی نہیں ہے۔“ زین نے کہا اور تیزی سے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ ”اسے جانا دیکھ کر پاکیزہ سوچ میں پڑ گئی۔“

دوسرے دن زین جلدی جلدی اسکول پہنچا لیکن ندیم نہیں آیا۔ زین اس کا انتظار کرتا رہا۔ حتیٰ کہ اسمبلی ہو گئی۔ آج پہلی بار زین نے ندیم کا اتنی شدت سے انتظار کیا تھا۔ اسے ندیم پر غصہ بھی آ رہا تھا کہ وہ آیا کیوں نہیں۔ آخر خدا خدا کر کے دو بجے نیمٹی ہو گئی۔ زین نے جلدی سے گھر کا رخ کیا۔ گھر آ کے فریش ہونے کے بعد ندیم کے گھر کا رخ کیا۔ چونکہ اس سے معلوم ہوا ندیم گھر پر ہی ہے۔ لیکن سویا ہوا ہے۔ گھر کے ملازم زین کو ندیم کے دوست کے طور پر اچھی طرح جانتے تھے۔ اس لئے زین کو ڈرائنگ روم بیٹھایا اور تھوڑی دیر بعد ندیم بھی آنکھیں ملتا ہوا ڈرائنگ روم میں داخل ہوا۔ ”آج اسکول کیوں نہیں آئے جانتے ہو کتنا پریشان ہوا میں۔“ زین نے اس کے داخل ہوتے ہی کہنا شروع کر دیا۔

”کیوں خیریت تو تھی ناں۔“ ندیم نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”خاک خیریت تھی آج اسکول میں اتنا بورا ہوا کہ تمہیں اندازہ نہیں ہے۔“

”اچھا اب لڑنا چھوڑ دو بولو کیا پیو گے ٹھنڈا یا گرم۔“

”نہیں مجھے کچھ نہیں پینا۔“ زین نے مصنوعی غصے سے کہا۔

قربان جاؤں غصے پر اور بھی قائل لگتے ہو۔ اگر

میں لڑکی ہوتا تو اب تک سو بار تم سے عشق کر چکا ہوتا۔ ”ندیم نے کچھ ایسے انداز سے کہا کہ زین کی ہنسی نکل گئی۔ اصل میں رات گئے تک جاگتا رہا، اس لئے طبیعت ذرا ٹھیک نہیں تھی، اسی لئے نہیں آیا۔ زین خیریت تو ہے نا مجھے تم تھوڑے پریشان نظر آ رہے ہو۔ ”ندیم نے فکرمند ہو کر کہا۔

”نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔“

”نہیں مجھے پتا ہے کچھ نہ پتہ ضرور ہے میں تمہاری طبیعت سے بچپن سے واقف ہوں، اپنے دوست کو نہیں بتاؤ گے۔“ ندیم نے دوستی کا حق جتا دیا تو ”زین نے ڈرتے ڈرتے ساری بات بتا دی۔“

”واہ زین صاحب ویسے تو ہم نے فلموں میں دیکھا ہے یا کتابوں میں پڑھا ہے لیکن تم تو چھپے رستم ٹکے۔“ ندیم نے مسکرا کے کہا تو زین کا سر شرم سے مزید ہلک گیا۔ ”تصور تمہارا نہیں ہے ماہ نور کو بکلی دفعہ دیکھنے والوں کا اکثر یہی حال ہوتا ہے۔“

”ویسے یہ ماہ نور کہاں رہتی ہے۔“ زین نے تجلجک کے پوچھا۔

یہ ان ٹاپوں کی باسی ہے جہاں شرفاؤں کو جانے کو برا سمجھتے ہیں اور رات کو اپنے تمام لبادے اتار کر پھینچ جاتے ہیں۔ کسی زمانے میں یہ چوبارے بڑے بدنام ہوا کرتے تھے لیکن آج ان گلیوں کے لوگ کسی آرٹسٹ کے طور پر جانے جاتے ہیں۔ ”ندیم نے چہمت کو گھورتے ہوئے کہا تو زین کے خیال میں فوراً اس محلے کا نام گونج اٹھا۔

”جس کا نام لینا بھی کوئی شریف آدمی گناہ سمجھتا تھا۔“

”کیا تم مجھے ان کا پتہ دے سکتے ہو ایک بار میں ان سے ملوں گا۔“ زین نے بے اختیار ہو کے کہا تو ندیم نے ایک طویل سانس لی اور اسے پتہ بتانے لگا۔

☆.....☆.....☆

بلیک کلر کی پینٹ اور وائٹ کلر کی شرٹ میں ملبوس زین اس محلے کی اس گلی کے سامنے اترا جہاں ماہ نور کا چھونا مگر عالی شان گھر تھا۔ گلی تقریباً سنسان تھی اور زین کے ظلم کے مطابق یہاں پر راتیں جاگتی اور دن سوتے ہیں۔ زین

آج اسکول کے بجائے یہاں چلا آیا تھا اور ہر بات ندیم کے علم میں بھی تھی، گھر والوں کے سامنے وہ اسکول کی تیاری کر کے نکلا تھا اس لئے وہ اسکول یونیفارم میں ہونے کے ساتھ ساتھ اس کے کندھے پر شولڈر بیگ بھی تھا۔ اس کا دل تیزی کے ساتھ دھڑک رہا تھا۔ اس نے کانپتے ہاتھوں سے ٹبل پہنائی تو تھوڑی دیر بعد دروازہ کھلنے کے ساتھ ہی ایک موٹی ماری عورت دکھائی دی۔ ”کس سے ملنا ہے؟“ اس نے تقریباً غراستے ہوئے پوچھا۔

”جی وہ ماہ نور سے ملنا ہے۔“

”زین نے اپنی لڑائی پر قابو پاتے ہوئے بڑی مشکل سے کہا۔ عورت نے بنا کچھ بولے اس کے لئے راستہ چھوڑ دیا۔ زین تقریباً ڈگمگاتے قدموں کے ساتھ آگے بڑھا اور سامنے ڈرائنگ روم میں بیٹھا کر عورت نے کہا۔ ”آپ بیٹھیں میں بی بی جی کو جگاتی ہوں۔“

ڈرائنگ روم پورے کا پورا ہال تھا۔ جس میں صوفے بڑے سلیٹے سے رکھے ہوئے تھے اور ایک کونے میں بوتلوں کا چھوٹا سار یکہ رکھا تھا۔ جس میں رنگ برنگی بوتلیں تھیں، کوئی تھیں۔ دیواروں پر خوب صورت پینٹنگ بھی تھیں۔ جو دہاں کے گھروں کے ذوق کی آئینہ دار تھیں۔ تقریباً بیس منٹ بعد اندر کا دروازہ کھلا تو زین کو یوں محسوس ہوا جیسے کمرے میں بہار آ گئی ہو۔ گیلے چہرے پر سیاہ کھلے بال چپکے ہوئے تھے جو اس بات کا ثبوت تھا کہ کچھ دیر پہلے ہی چہرہ دھویا گیا ہے۔ لیکن چہرہ دھونے کے باوجود آنکھوں میں فیند کا خمار ابھی بھی تھا۔ سفید کپڑوں میں ملبوس بغیر میک اپ کے وہ اور بھی خوب صورت نظر آ رہی تھی۔ زین غیر ارادی طور پر کھڑا ہو چکا تھا۔ ”آپ آئے ہمارے غریب خانے پر یا خدا ہم کوئی خواب تو نہیں دیکھ رہے۔“ ماہ نور نے مخصوص مسکراہٹ سے کہا۔

”وہ میں نے سوچا کہ رات کو آپ نے مجھے گھر ڈراپ کیا تو اس کے لئے آپ کا شکریہ ادا کروں۔“ زین کو سمجھ نہ آئی کہ یہاں آنے کی کیا وجہ بتائے۔

”تو آپ دو منٹ کی لفٹ دینے پر 40 منٹ کا سفر طے کر کے اس لفٹ کا صرف شکریہ ادا کرنے آئے

ہیں۔“ ماہ نور نے کہا تو زین کو لگا جیسے اس کی چوری پکڑی گئی ہو۔“ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہم نے ہی رات کو آپ کو رات بھر یاد نہیں کیا بلکہ آپ نے بھی ہمیں یاد کیا۔“ ماہ نور نے مسکرا کے کہا تو زین کو اس بات سے تھوڑا حوصلہ ملا۔

”وہ میں آپ سے یہ کہنا چاہتا تھا کہ اس سے آگے زین کچھ نہ بول پایا تو ماہ نور نے کہا۔“ جو بھی کہنا ہے بغیر ڈرے کہہ دیجئے کہ آپ مجھے اچھی لگتی ہیں۔ اور یہ کہ مجھے آپ سے محبت ہوگئی ہے۔“

”مجھے پتہ ہے یہ بات بہت بری ہے کہنے میں لیکن اس کے علاوہ اور کوئی چارہ بھی نہیں ہے۔“ زین نے بے بسی سے کہا تو ماہ نور اپنی جگہ سے اٹھ کر صوفہ پر اس کے پاس آ بیٹھی، اتنی پاس کہ زین کو اس کے جسم کی حرارت محسوس ہونے لگی۔ زین کا چہرہ مارے شرم کے لالہ کی طرح سرخ ہو گیا۔ اس کے یوں قریب بیٹھ جانے سے زین نے دوسری طرف سرکھنے کی کوشش کی تو ماہ نور نے اس کا ہاتھ تھام لیا اور اپنا منہ اس کے کان کے قریب کر کے سرگوشی کے انداز میں کہا۔“ زین محبت گناہ نہیں ہوتی۔ محبت اختیار میں نہیں ہوتی کیونکہ محبت کی نہیں جاتی ہو جاتی ہے۔“ یہ کہہ کر ماہ نور نے زین کے دیکھتے گالوں کو اپنے گلانی ہونٹوں سے چوم لیا۔

زین کو یوں لگا جیسے اس کے گال پر کسی نے انگارے رکھ دیئے ہوں۔ اس نے گھبرا کے ماہ نور کو دیکھا تو اس کے چہرے پر شرمندگی کے بجائے مسکراہٹ تیر رہی تھی۔ زین کو یوں لگا جیسے وہ کسی نشے میں ہو۔ ”میرے خیال میں مجھے چلنا چاہئے۔“ زین نے کہا۔

”پھر کب ملیں گے۔“ ماہ نور نے بے قراری سے پوچھا۔ تو زین خاموش ہو گیا۔ وہ اسے دروازے تک چھوڑنے آئی۔ ”خدا حافظ“ ماہ نور نے کہا تو زین نے کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا لیکن کہہ نہ پایا۔ وہ سر کو جھٹک کے تیز قدموں سے آگے بڑھ گیا اور ماہ نور کسی سوچ میں ڈوب گئی۔

اس واقعہ کو دو روز ہو چکے تھے لیکن زین کا دماغ اس ملاقات میں اٹکا ہوا تھا۔ وہ ابھی تک اس کے بارے

میں فیصلہ نہ کر پایا تھا کہ اس کا یہ قدم صحیح تھا یا غلط۔ اس کے معمولات بری طرح متاثر ہو چکے تھے۔ پڑھائی میں دل نہ لگا پڑھتا تھا اور نہ ہی کوئی اور کام ڈھنگ سے کر رہا تھا۔ ندیم کو اس نے سرسری طور پر ہی ملاقات کے بارے میں بتایا تھا۔ پاکیزہ نے اسے انجھایا ہوا پایا تو اس نے پوچھا لیکن زین نے پڑھائی کی ٹینشن کہہ کے جان چھڑائی۔ تیسرے دن اسکول سے چھٹی ہونے پر وہ اسکول سے باہر نکل آیا۔ وہ روز پبلک ٹرانسپورٹ کے ذریعے آتا جاتا تھا اس لئے اس کے قدم خود بخود بس اسٹاپ کی طرف اٹھ رہے تھے کہ اچانک پیچھے سے کسی کار نے ہارن بجایا وہ ایک سائیڈ پر ہو گیا کار اس کے قریب آ کر رکی۔ کار ماہ نور ڈرائیو کر رہی تھی۔

ماہ نور کے اشارے پر وہ غیر ارادی طور پر دروازہ کھول کے فرنٹ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ ”بڑے روٹھے روٹھے میرے محبوب نظر آتے ہیں۔“ ماہ نور نے سامنے دیکھتے ہوئے کہا۔

”نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں۔“ زین نے دھیرے سے کہا۔

”تو پھر اتنے خفا کیوں نظر آ رہے ہو؟“

”آپ کو ایسا لگ رہا ہے۔“ زین نے جلدی سے جواب دیا۔

”تم ملنے کیوں نہیں آئے۔“ ماہ نور آپ سے تم پر آگئی۔

”ٹائم ہی نہیں ہوتا۔“ زین بدستور دھیمے لہجے میں بول رہا تھا۔

”اچھا یہ بتاؤ کہاں چلنے کا ارادہ ہے۔“

”نہیں باجی ویٹ کر رہی ہوگی گھر پر۔“ زین نے اس بار تھوڑی اونچی آواز میں کہا۔

”اوہو ایک تو ہر وقت جلدی میں رہتے ہو، آج کوئی بہانہ نہیں چلے گا۔ آج تم لنگ میرے ساتھ کرو گے۔“

ماہ نور نے تحکمانہ لہجے میں کہا تو زین خاموش ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد ماہ نور نے ایک بڑے ہوٹل کے سامنے کار پارک کی، ہوٹل کا عملہ شاید ماہ نور کی حیثیت سے اچھی طرح

”آج کے لئے سوری، آئندہ نہیں کھاؤں گا“
میری پیاری آپ!۔“ زین نے پاکیزہ کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

”اچھا ایک طرف ہو تمہارا یونیفارم دھو لوں۔“
پاکیزہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ تو زین ایک طرف ہٹ گئی۔“ زین تمہارے یونیفارم سے پرفیوم کی خوشبو آرہی ہے اور اگر میں غلطی پر نہیں تو یہ لیڈ پر پرفیوم کی خوشبو ہے۔“
یہ سنتے ہی زین کو یوں لگا جیسے اس پر چھت آن گری ہو لیکن وہ فوراً سنبھل گیا۔ دراصل واپسی پر ندیم کے ساتھ جنرل اسٹور پر گیا تھا ندیم پرفیوم پسند کر رہا تھا تو میں نے بھی تھوڑا سا لگا لیا اب مجھے کیا پتہ تھا کہ وہ لیڈ پر پرفیوم ہے۔“ زین نے تیز تیز کہا۔

”اچھا اچھا اتنا اونچا کیوں بول رہے ہو، میں نے تو یوں ہی مذاق کیا تھا۔“ پاکیزہ نے کہا اور کپڑے دھونے کے لئے آگے بڑھی۔

☆.....☆.....☆

وقت کا پتہ نہ چلا اور آٹھ ماہ بیت گئے۔ اس دوران زین مسلسل ملا بھی رہا، کبھی کبھار پارک میں کبھی دریا کنارے، کبھی ہوٹل میں اور کبھی ماہ نور کے گھر پر، لیکن زیادہ تر ملاقاتیں ماہ نور کے گھر پر ہی ہوتی تھیں۔ لیکن اس کے باوجود بھی ان کے درمیان ایک دیوار حائل رہی۔ اگرچہ ماہ نور نے اپنی طرف سے پوری کوشش کی کہ اس دیوار کو گرا دے لیکن زین کی تربیت اس انداز سے کی گئی تھی کہ باوجود ماہ نور کی کوششوں کے زین کی وہ حد عبور نہ کر سکی۔ امتحان سر پر آگئے تھے۔ لیکن زین کا پڑھائی کی طرف بالکل دھیان نہیں تھا وہ پڑھ ضرور رہا تھا۔ لیکن صرف گھر والوں کو دکھانے کی حد تک، تیاری صفر تھی، اس بار پوزیشن لینا اس کے بس کی بات نہیں تھی اور اس بات کا زین کو بھی اچھی طرح علم تھا۔ لیکن وہ ماہ نور کی محبت میں اتنا آگے جا چکا تھا کہ اس کے پاس اب واپسی کا کوئی راستہ نہیں تھا۔

آخر کار امتحان میں صرف دو دن رہ گئے اور زین تیاری نہ ہونے کی وجہ سے پریشان تھا۔ اسکول کی چھٹیاں

واقف تھا اس لئے اسے بڑی عزت سے دیکھ کر رہے تھے۔ ماہ نور نے زین سے اس کی پسند پوچھی اور آؤرد سے دیا۔ زین نے بڑی مشکل سے کھانا کھایا۔ ”تم کچھ زیادہ ہی پریشان نظر آ رہے ہو، جو بھی مسئلہ ہے مجھے بتا دو ہو سکتا ہے کہ اس کا کوئی حل ہو میرے پاس۔“ ماہ نور نے سنجیدگی سے کہا۔

تو زین تھوڑی دیر بعد بولا۔ ”میں سوچ رہا تھا کہ اگر ابا جان باجی کو پتہ چل گیا تو کیا ہوگا۔“
”دیکھو زین پہلی محبت تو ہو کر رہتی ہے، میرے یا تمہارے پریشان ہونے سے تقدیر کے فیصلے نہیں بدل جائیں گے۔ اور یہی بات یہ کہ تمہارے ابا جان اور باجی کو نہ پتہ چلے تو یہ تمہاری روشنی ہے۔ اگر تم ان کے ساتھ پہلے جیسا نارمل ماحول یا روپیہ رکھو گے تو ان کو تم پر کبھی شک نہیں ہوگا، اور ہم دونوں بھی ملاقات کے مسئلے میں احتیاط سے کام لیں گے تو کسی کو پتہ نہیں چلے گا۔ سچے میری تھی سی جان۔“ ماہ نور نے آخر میں لاڈ پیار سے کہا تو زین کو اس کے انداز پر ہلکی آگئی۔ ”ہستے رہا کرو، ہستے وقت تمہارے حسن کو چار چاند لگ جاتے ہیں۔“ ماہ نور نے نیلے لہجے میں کہا تو زین کا چہرہ مارے شرم کے سرخ ہو گیا۔ ماہ نور نے زین کے کہنے پر ہی اسے گھر کے قریب ہی ڈراپ کیا تھا۔

وہ معمول سے پورا ایک گھنٹہ لیٹ ہو گیا تھا۔ پاکیزہ نے گھر آتے ہی اس سے پوچھا۔ ”زین خیریت ہے نا آج بہت دیر سے گھر آئے ہو۔“

”ہاں واپسی پر ندیم کے گھر چلا گیا تھا۔“ زین نے اپنے چہرے کو چھپاتے ہوئے کہا اور جلدی سے اندر کپڑے چھینج کرنے چلا گیا۔

”کھانا لگاؤں۔“ پاکیزہ نے پوچھا۔
”نہیں آج ندیم کے ساتھ راستے میں چاٹ کھالی تھی۔“

”زین تمہیں کتنی بار کہا ہے کہ چاٹ سے دور رہا کرو۔ پچھلی بار بھی چاٹ کھانے کی وجہ سے تم بیمار ہو گئے تھے۔“ پاکیزہ نے ڈانٹنے والے انداز میں کہا۔

ہو چکی تھیں اس لئے وہ بارہ بجے کے قریب پریشانی کے عالم میں ندیم کے گھر کی طرف چل پڑا۔

جب ندیم کے گھر پہنچا تو گیٹ تھوڑا سا کھلا ہوا تھا۔ وہ اس گھر میں آتا رہتا تھا اور، یہ بھی اس گھر میں کوئی عورت تو رہتی نہیں تھی کہ وہ شرماتا۔ وہ کھلے دروازے سے اندر آ گیا۔ سامنے ڈرائنگ روم کا دروازہ تھا جو نیم وا تھا اور اس سے باتیں کرنے کی آواز آرہی تھی۔ زین نور ا پیچان گیا کہ اندر ماہ نور اور ندیم ہیں۔ پھر اس نے جو پٹوٹا وہ سب سن کے اس کا زندہ رہنا معجزے سے کم نہیں تھا۔

”ندیم بہت ہو گیا اب مجھ سے اور نہیں ہوتا یہ ڈرامہ۔“ ماہ نور نے بے زاری سے کہا۔

”ابھی ہماری معاہدے کی مدت پوری نہیں ہوئی۔“ ندیم نے سگریٹ کا گہرا کش لگاتے ہوئے کہا۔

”تم نے کہا تھا کہ امتحان تک چپے گا، یہ سب کچھ اور اب امتحان میں دن ہی کتنے رہ گئے ہیں۔“ ماہ نور نے بدستور بے زاری سے کہا۔

”دیکھو میڈم اگر تم چاہتی ہو کہ میرے باپ سے شادی کر کے اس کی دولت پر ہمیشہ کر سکو اور میں سب کچھ ہوتا دیکھ کر شور نہ مچاؤں تو تمہیں وہ سب کرنا پڑے گا جو میں نے کہا اور جہاں تک مجھے پتہ ہے ابھی تک وہ کچھ نہیں ہوا جس کا میں طلب کار تھا۔ زین کا دامن اب بھی صاف ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اسے تم سے محبت ہوگئی ہے۔“ ندیم نے سگریٹ کی راکھ جھاڑتے ہوئے کہا۔

”تو تم کیا چاہتے ہو میں اس کے ساتھ زبردستی کروں۔ ندیم یقین مانو وہ لڑکا بہت ہی معصوم اور نیک انسان ہے، ورنہ ماہ نور کو دیکھ کر کوئی شریف نہیں رہتا۔“

”بند کرو یہ بکواس زین معصوم ہے شریف نیک ہے لائق ہے یہ میں بچپن سے سنتا آرہا ہوں، کان پک چکے ہیں یہ بکواس سن سن کے، کیوں مجھ میں وہ کون سی خوبی نہیں جو زین میں ہے، وہ کون سی چیز ہے جو اس کے پاس تو ہے مگر میرے پاس نہیں۔ اگر وہ حد سے زیادہ خوب صورت ہے تو یہ قدرت کا کمال ہے۔ اگر وہ لائق ہے تو قسمت کی بات ہے۔ کیوں کہ میرے باپ نے میرے

اور قریبی لوگوں نے اسے میرے لئے رول ماڈل بنا دیا ہے کیوں مجھے احساس کمتری کی گہرائیوں میں دھکیل دیا گیا ہے۔ اس کے ساتھ چلتا ہوں تو کیوں مجھے اپنا آپ چھوٹا لگتا ہے کیوں۔“ ندیم نے غصے کی شدت میں جلتی سگریٹ کو اپنی منہمی میں مسل دیا۔

”یہ صرف حسد ہے اور کچھ نہیں۔“ ماہ نور نے منہ بنا کے کہا۔

”ہاں ہاں یہ حسد ہے تو حسد ہی کسی لیکن اس میں تصور زمانے کا ہے میرا نہیں، کاش زمانے نے اس میں اور مجھ میں کوئی فرق نہ رکھا ہوتا تو آج یہ سب کچھ نہ ہوتا۔ بس ماہ نور کچھ دن اور صبر کر لو، خیر میں خود ہوسے کہوں گا کہ وہ تم سے شادی کر لیں۔ بس اس کو ایک بار میں برابر دیکھنا چاہتا ہوں۔ میں جس شرمندگی کا سامنا بچپن سے کرتا آرہا ہوں وہ بھی اس شرمندگی کا سامنا کرے وہ بھی کم نمبروں میں پاس ہوتا کہ اسے احساس ہو کہ کتنا دکھ ہوتا ہے خود کو کسی سے کم تر دیکھنا۔“ ندیم کا چہرہ شدت جذبات سے سرخ ہو چکا تھا۔

”ٹھیک ہے کچھ دن اور سہی لیکن اس کے بعد تم نے کوئی چکر چلایا تو یہ مت بھولنا کہ میں کوٹھے والی ہوں۔ ماہ نور نے زہر خند لہجے میں کہا۔

”ہاں پتہ ہے تمہاری حیثیت کا اسی لئے تو یہ کام تمہارے ذمے لگایا ہے۔“ ندیم نے شاطر انداز میں منسکرا کر کہا۔

اس گفتگو کو سننے کے بعد زین کو ایسا لگا جیسے وہ کسی تپتے صحرا میں کھڑا ہے، جہاں دور دور تک کسی انسان کا نام و نشان نہیں ہے۔ زندگی کی اس ناکامی کے بعد اسے لگا کہ وہ زندگی میں کبھی کامیاب ہی نہیں ہوا تھا۔ جیسے وہ سب کچھ کھوپکا ہوا اس کا دامن شروع سے خالی تھا۔ اسے یہ بھی علم نہ ہو سکا کہ وہ کس طرح چپکے سے گمراہ ہو گیا۔ بنا ان دونوں سے کچھ کہے بنا کچھ بولے، بنا کوئی شکوہ مانگی شکایت، اگر تھی تو بس ایک لامتناہی خاموشی اور وہ شعور کی دنیا میں تب واپس آیا جب گھر میں داخل ہوا تو ابا جان کو چار پائی پر لیٹے ہوئے دیکھا۔

ابا جان کی سوالیہ نگاہوں کو دیکھ کر اس کے ذہن

نور اور ندیم کا گھر میں اکثر جھگڑا چلتا رہتا تھا جس سے تنگ آ کر عباس صاحب نے ندیم کو نہ صرف گھر سے نکال دیا بلکہ اپنی جائیداد سے بھی عاق کر دیا۔ بعد میں ندیم کا اپنے ہی ایک دوست سے جھگڑا ہو گیا اور ندیم نے اسے قتل کر دیا۔ اب وہ جیل میں عمر قید کی سزا کاٹ رہا ہے۔ شادی کے بعد اب تک ماہ نور بھی طرح طرح کی بیماریوں کا شکار رہی ہے۔ اس نے بہت بار مجھ سے مل کے معافی مانگنے کی کوشش کی لیکن ابا جان کی وفات کے بعد میں نے وہ گھر چھوڑ دیا۔ ساتھ ساتھ باقی پاکیزہ کی شادی ہو چکی تھی اس لئے میں نے بھی مدرسے میں پڑھانے کے ساتھ ساتھ مستقل سکونت اختیار کر لی۔

استاد محترم بہت بار شادی کرنے پر زور دے چکے ہیں لیکن میں ہر بار یہ کہہ کے جان چھڑا لیتا ہوں کہ ”میں کسی سے شادی کرنے کے قابل نہیں۔ پتا نہیں شاید مجھ میں وہ اعتبار کرنے کی صلاحیت ختم ہو چکی ہے۔“ یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گئے اور میں ان کو دیکھتا رہا۔ ”آخری عرض تم سے یہ ہے جو ان دنیا کی لذتیں عارضی ہیں ان کی خاطر آخرت کے ناقص ہونے والے انعامات کو کھو مت دینا، مجھے بہت دکھ ہوتا ہے۔ جب تم جیسے نوجوانوں کو سگریٹ پیتے دیکھتا ہوں جو تمہاری صحت کے ساتھ ساتھ تمہاری سیرت کو بھی داغ دار کر رہا ہے۔“

مولانا صاحب نے کچھ اس طرح سے کہا کہ میں تڑپ اٹھا، میں نے فوراً جیب سے سگریٹ کی ڈبی نکالی اور اسے دونوں ہاتھوں سے مروڑ کر کھڑکی سے باہر پھینک دیا۔ ”وعدہ رہا مولانا صاحب آئندہ کبھی اس گندی چیز کو ہاتھ نہیں لگاؤں گا، چاہے کچھ بھی ہو جائے۔“ میں نے پر عزم لہجے میں کہا تو وہ مسکرا دیے۔ تھوڑی دیر بعد ان کا مطلوبہ اسٹیشن آ گیا تو وہ اترتے وقت مجھ سے گرم جوشی سے گلے ملنا نہ بھولے۔ ”اگر کبھی یاد آؤں تو میرے حق میں دعا کرنا۔“ یہ کہہ کر وہ گاڑی سے اتر گئے۔ اور میں خیالوں میں گم ہو گیا۔

میں ایک خیال بجلی کی سی تیزی سے آیا وہ جلدی سے ابا جان کے نزدیک ان کے گھٹنوں سے لگ کے بیٹھ گیا۔ ”کیوں بیٹا خیریت تو ہے کچھ پریشان نظر آ رہے ہوں؟“ انہوں نے زین کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔ تو اس نے سرخ اور نم دار آنکھوں سے اپنے شفیق ابو کو دیکھا اور کہا۔ ”ابا میرا دل اب دنیاوی تعلیم سے بے زار ہو چکا ہے۔ میں آپ کی طرح ایک عالم بننا چاہتا ہوں۔ اور پھر اماں کی بھی تو یہی خواہش رہی تھی کہ ان کا بیٹا ایک عالم دین ہو۔“ زین کی بات سن کے ابا اسے ہلچل دیکھتے رہے اور پھر یک دم اسے کندھوں سے اٹھا کر اپنے سینے سے لگا لیا۔

”مجھے فخر ہے بیٹا تم پر، بہت سے موقعوں پر میں یہ بات تم سے کہنا چاہتا تھا لیکن کہہ نہیں پایا، میں نے سوچا اگر اللہ نے تمہیں اپنا بندہ بنانا ہوگا تو خود بتائے گا اور اگر اس ذات کا فیصلہ تمہارے حق میں کچھ اور ہوا تو پھر میرا کہنا بھی بے کار ہے۔ آج تم نے فرزندگی کا حق ادا کر دیا ہے۔ بے شک وہ اللہ ہی ہے جو انسان کے دلوں کے مال جانتا ہے۔ بیٹا میں آج ہی اپنے ایک دوست سے بات کرتا ہوں۔ بہت بڑا مدرسہ ہے ان کے شہر میں۔ تم وہیں رہ کر پڑھو گے۔“ انشا اللہ اللہ بہت جلد تمہیں تمہارے نیک مقصد میں کامیاب کرے گا۔“

”انشا اللہ زین کے منہ سے بھی بے اختیار نکلا۔“

☆.....☆.....☆

میں نے سگریٹ کا آخری گہرا کش لگایا اور اسے چلتی ٹرین کی کھلی کھڑکی سے باہر اچھال دیا۔ ساتھ ہی سامنے کی سیٹ پر براجمان اس روشن اور نورانی چہرے والی ہستی کو دیکھنے لگا جو مجھے آپ جی سنا چکی تھی۔

معاف کیجئے گا مولانا صاحب ”یعنی مولانا زین العابدین“ کیا اس آخری دن کے بعد آپ کا اپنے دوست یا ماہ نور سے سامنا ہوا۔

میرے سوال پر وہ کھڑکی سے باہر اندھیرے میں ڈوبی لمفائی روشنیوں کو دیکھنے لگے۔ ”نہیں بس اتنا پتہ چلا

کہ انور کے شادی کے بعد اس نے



چاہت خلوص اور محبت سے سرشار دلوں کی انٹ ڈاستان جو کہ پڑھنے والوں کو ورطۂ حیرت میں ڈال دے گی کہ دل کے ہاتھوں مجبور اپنی خواہش کی تکمیل کے لئے بے شمار جان لیوا اور ناقابل فراموش مراحل سے گزرتے ہوئے بھی خوشی محسوس کرتے ہیں اور اپنے وجود کے مٹ جانے کی بھی پروا نہیں کرتے۔ یہ حقیقت کہانی میں پوشیدہ ہے۔

یہ دنیا رہے نہ رہے لیکن کہانی محبت کی زندہ رہے گی۔ انہی الفاظ کو احاطہ کرتی ہلکداز کہانی

”تیار ہو جا مور کھ.....!“ جل کماری نے اس سے انتہائی تحقیر آمیز لہجے میں کہا۔ ”اب جو سے تجھ پر ٹوٹنے والا ہے وہ تیرے شریر پر بڑا بھاری گزرنے والا ہے جسے تو سہم نہ سکے گا۔“

اس لمحے آکاش کی حالت ایسی ہو رہی تھی اسے بیان کرنے سے اس کی زبان قاصر تھی۔ وہ لمحہ بہ لمحہ دگرگوں ہونے لگی تھی۔ اعصابی انتشار کا آغاز ہو چکا تھا اس کی قوت ارادی پانی کے کسی تیرے بلبلے کی طرح بیٹھ چکی تھی لیکن وہ اس سنگین صورتحال کا مقابلہ کرنے پر مجبور تھا۔ اس کے سامنے ایسا کوئی راستہ نہیں تھا جس پر چل کر وہ جل کماری سے سمجھوتہ کر سکتا تھا یا اس کے اس مذموم عزائم پر عمل پیرا ہونے سے باز رکھ سکتا۔

جل کماری نے اس کے قریب کھڑے ہوئے مکر وہ صورت جلا دوں کو کسی نامانوس سی آواز میں کوئی حکم دیا۔ ان کے قدم بیک وقت مشینی انداز میں حرکت میں آئے اور وہ فضا میں تیرتے اس پر ٹوٹ پڑے۔

اس نے دفاع میں انہیں روکنا چاہا لیکن اچانک ہی اس کا بدن لرزہ سا گیا۔ نہ جانے وہ موت کا خوف تھا یا جل کماری کے کسی پراسرار حربے کا اثر کہ ان دونوں سے کوئی مزاحمت نہیں کر سکا اور انہوں نے اسے بڑی آسانی

وہاں تین بہت اونچے اونچے چوٹی ستون ملا کر اس طرح کھڑے کئے تھے کہ ان سے پھانسی کا کام لیا جاسکتا تھا۔ ان کے طے ہوئے اوپری سروں کے قریب ایک بہت ہی وزنی چھنی موجود تھی جس کے ایک سرے پر پھندا نظر آیا تھا اور اس کا دوسرا سرا وہاں کھڑے دو بند بہت اور خون خوار جلا دوں کے قدموں میں پڑا ہوا تھا۔ اسی جگہ کئی بڑی بڑی چٹانیں بہت ہی سوتلی اور منہبوط رسیوں سے بندھی ہوئی تھیں۔

پھانسی کا مشہوم تو وہ سمجھ گیا۔ لیکن چٹانوں کا مقصد اس کی سمجھ سے بالا تر تھا۔ اس نے اپنے چہرے سے یہ تاثر دیا کہ وہ اس منظر سے خوف زدہ اور ہراساں نہیں ہے اور اس کے دل میں موت کی دہشت بالکل نہیں ہے۔ لیکن اس کے دل میں ایک انجانا سا خوف اسے لرزاسا دے رہا تھا۔ اس نے جل کماری کی طرف بے خوفی سے دیکھا۔

جل کماری اس کی طرف دیکھ رہی تھی اور اس کے ہونٹوں پر ایسی استہزاء کی مسکراہٹ چمکی ہوئی جو اس لمبی کی طرح جو جو ہے کو شکار بنانے سے قبل نامیدی اور مایوسی کی سی حالت میں ادھر ادھر دوڑتی ہے۔ اس کی آنکھوں میں ایک ایسی وحشیانہ چمک کہہ رہی تھی کہ اس سے بچنا ناممکن ہے۔



سے اسے یوں بے بس کر لیا جیسے وہ ٹھنڈی سووم کا پتلا ہو۔

اسے زمین پر گر ادیا گیا تھا۔ پھر ان دونوں نے اس کی ایک ٹانگ پکڑ لی اور سنگارخ زمین پر گھسیٹتے ہوئے اسے ادھر لے چلے جہاں پھانسی کا پھندا جھول رہا تھا۔

آکاش کو ایسا لگا جیسے پتھروں کی نوکیں اس کے بدن کو چھانی کر گئیں۔ وہ بے اختیار چیخنے لگا۔ لیکن وہ بہروں کی طرح چیخ و پکار پر کان دھرے بغیر اسے بے دردی سے گھسیٹتے رہے۔

پھانسی کے پھندے کے نیچے پہنچ کر ان میں سے ایک پھرنی سے اس کے سینے پر جڑھ گیا۔ اور رسی کا پھندا اس کی گردن میں ڈال کر اس کی گرد اس طرح باندھنے لگا کہ جھٹکے کے ساتھ اسے اوپر اٹکانے کی صورت میں وہ پھندا مزید تنگ نہ ہو سکے۔ جوں ہی ڈھیلا پھندا تیار ہوا وہ اس کے سینے سے اتر گیا۔ اس نے تڑپ کے زمین سے اٹھنا چاہا لیکن اسی وقت دوسرے جلاوٹ نے رسی کا دوسرا سرا تھاما۔ اور پھر اسے دور تک کھینچتا لے گیا تو آکاش کا تڑپتا بدن تیزی کے ساتھ فضا میں اونچا معلق ہوتا چلا گیا۔

اس کی چیخیں بڑی درد ناک تھیں۔ اس کا بدن زخموں سے لہو لہان ہو چکا تھا۔ گردن ڈھیلے پھندے میں پھنسی ہوئی تھی اور اسے دوران خون کے دباؤ کے باعث اپنی پیشانی کی رگیں پھنکتی ہوئی محسوس ہی ہو رہی تھیں۔ اس کا شعور جواب دے چکا تھا۔ اس کی عقل کام نہیں کر رہی تھی۔ لیکن موت کا خوف بہت ہی ہیبت ناک ہوتا گیا۔ اس کے ہاتھ پھندے والی رسی پر پڑ گئے۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے وہ رسی تھامی اور پورا پورا بوجھ ہاتھوں پر ڈال کر چرخی کے ذریعے اوپر اٹھتی ہوئی رسی میں لٹک گیا تاکہ گردن کا کھنچاؤ کم ہو سکے اور وہ اپنی قوت کو مجتمع کر سکے۔

زمین سے کئی گز کی بلندی تک اٹھانے کے بعد اسے آہستہ آہستہ نیچے لایا گیا لیکن اس کے پیر زمین سے نکلنے نہیں دیئے۔ ایک شخص رسی کا دوسرا سرا تھامے اسے معلق کر رہا اور دوسرے مکر وہ صورت جلاوٹ نے اس کے قریب آ کر اطمینان کے ساتھ وزنی چٹانوں سے بندھی ہوئی رسیوں کے سرے سے اس کی ٹانگوں اور ہاتھوں سے

باندھنے شروع کر دیئے۔

ان کے عزائم کی بو پاتے ہی وہ اچھل پڑا۔ پوری قوت سے تڑپ کے خود کو بچانا چاہا لیکن زمین سے پتھروں کا اتنا فاصلہ تھا کہ وہ پیر نکانہ سکا۔ اس جلاوٹ نے بڑی بے دردی کے ساتھ چار وزنی چٹانیں اس کے ہاتھ اور پیروں سے باندھ دیں جس سے وہ اور بے بس اور معذور سا ہو گیا تھا۔

جب دوسرا جلاوٹ بھی اسے اوپر اٹھانے کے کام میں اپنے ساتھی کا ہاتھ بٹانے کے لئے آگے بڑھا تو وہ خود پر قابو نہ پاسکا۔ اور پھر اس نے خوشامدانہ لہجے میں اسے پکارنا شروع کیا۔ اس میں محبت کی مٹھاس بھر دی۔

”میرے من کی رانی.....! میری جان تمنا.....! میری پیاری جلی کماری.....! میری محبت..... میرے سپنوں کی رانی.....! تم بھول رہی ہو کہ ہم دونوں ایک دوسرے کو کتنا چاہتے ہیں..... دن رات ہم نے کس محبت سے گزارے ہیں..... ہم ایک دوسرے کی جان رہے ہیں..... ایک جان دو قالب..... مجھے اس عذاب سے نجات دو..... ان شیطانوں سے چھٹکارا دلاؤ..... اپنی خواب گاہ میں لے چلو..... میں..... میں ایک غلام کی طرح تیری سیوا کروں گا..... میں..... تیرے چہنوں میں رہوں گا..... تو دنیا کی سب سے حسین اور سندر عورت ہے.....“

”تو میری شان میں کویتا کہہ رہا ہے.....“ وہ ہڈیانی لہجے میں بولی اور پھر استہزائیہ سی ہنسی ہنس کے بولی۔ ”کیا تو مجھے بے وقوف سمجھ رہا ہے کہ میں تیری چال بازی کے قریب میں آ جاؤں گی کہ اپنے حسن کی تعریف سن کے اپنے انتقام کی آگ بجھا دوں گی اور تجھ پر مہربان ہو کے نیاضی سے نوازوں گی..... عورت بار بار دھوکا نہیں کھاتی ہے..... تو اپنی مدد کے لئے پکار اپنی سنگیت کو جو پنجاور ہوئی رسی تھی..... اپنی امرتارانی کو سہائتا کے لئے بلا جو تجھے اپنی آغوش میں لے لے.....“

پھر اس نے توقف کر کے زور زور سے قہقہے لگائے اور پھر اس نے دونوں جاووں کو اشارہ کیا کہ وہ اپنا کام شروع کریں۔ ان جلاوٹوں نے حرکت کی تو آکاش کا بدن آہستہ آہستہ اوپر اٹھنا شروع ہوا۔ اذیت ناک موت کے

ہڈیوں کی کڑکڑاہٹیں اس کی موت کا پیغام نہ بن سکیں۔
تکلیف اتنی شدید تھی کہ وہ بے ہوشی کی شفیق آغوش میں
زیادہ دیر تک کھویا نہ رہ سکا۔

جب وہ بیدار ہوا تو اس نے خود کو زمین پر پڑا ہوا
پایا۔ اس کے گلے میں ابھی تک رسی کا پھندا پڑا ہوا تھا۔
ہاتھ پر چٹانوں سے بندھے ہوئے تھے۔ اس نے بدن کو
ترکت دینے کی کوشش کی تو اس کی بے اختیار چیخیں نکل
گئیں۔ اس کے بدن کے سارے جوڑا ترچکے تھے اور وہ
کھل طور پر معذور اور اپاہج ہو چکا تھا۔

”جل کماری...!“ اس نے اذیت میں ڈوہلی
چینوں کے دوران میں گناہوں اور عذاب کی اس سرزمین
کی مکہ کو پکارا جو بد چلن... بدکار... آزارہ... ہوس
پرست اور ظالم شتم کی تھی۔ جو اس وقت وہ اس کی دسترس
میں تھا۔

اس کی کرب ناک آواز کی بازگشت بل منڈل
کے غار کی سنگین چٹانوں سے ٹکرا کے دیر تک گونجتی رہی۔
لیکن اسے اس کا کوئی جواب نہیں ملا۔ وہ وہاں شاید کیلا پڑا
رہ گیا تھا۔ کوئی دوتا تو اس کی یہ چیخیں سن کے ضرور آتا۔

اس کی حالت مردوں سے بھی بدتر تھی۔ وہ بے
حس و حرکت پڑا تھا لیکن بری طرح چیتا ہی جا رہا تھا۔ اور
شدت سے بے ہوشی کی آرزو بھی کرنے لگا۔ لیکن درد کی
نا قابل برداشت ٹیسیں بھی اسے بے ہوش نہ کر سکیں۔

جو چند لمحوں تھے اس پر اس حالت میں صدیاں
بن کے گزرنے لگے۔ ایک ایک پل اس پر قیامت بنا رہا۔
پھر اسے جل کماری ایسی حالت میں نظر آئی کہ جو تو بہ شکن
تھی... وہ حیوان نظر آتی تھی۔ یہ حالت اس نے آکاش
کو جانے کی غرض سے کی تھی۔ اس کا چہرہ فتح مندانہ
مسکراہٹ سے گلزار ہو رہا تھا۔ اس کے عقب میں وہی دو
جلاد کسی کھولتے ہوئے سیال کا بھاپ اڑاتے برتن
سنہالے چلے آ رہے تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ اس سیال
سے اسے جھلسا کے مار دیں گے۔

”سنگیت کیسی سندر اور شعلہ جسم ناری تھی۔“ جل
کماری نے اس کے قریب آ کر زہر میں بھیجی ہوئی آواز

بعد اسے اس کے منہ سے بے معنی چیخیں اور آوازیں نکلنے
لگیں۔ پھر اس نے اپنی ٹانگوں میں برقی جھٹکے سے محسوس
کئے۔ ایسا ہی اس نے اپنے ہاتھوں پر بھی محسوس کیا۔ اس
کے ساتھ ان چاروں میں سے ایک ایک چٹان کا بوجھ اس
کے ہاتھ اور پیچ سے بندھا اٹھنے لگا۔ بڑے کرب ناک
لحاث تھے... وہ اذیت سے بے حال ہو جا رہا تھا۔ اسے
اپنے ٹخنوں، گھٹنوں، گولہبوں، گلائیوں، کہلیوں اور بازوؤں
کے جوڑ نکلنے محسوس ہو رہے تھے۔ اس کا جسم ٹڑپنے تک
کے احساس سے محروم ہو چکا تھا۔

گردن تک بندھے ہوئے ڈھیلے پھندے کی
رسی اس کی کھال میں کسی چاقو کی دھار کی طرح اترتی
جا رہی تھی۔ لیکن اس ظالم اور اجنبی سرزمین پر کوئی ایسا نہ تھا
جو اس پر رحم کھاتا اور اسے اس اذیت سے نجات دلاتا۔

چند گز اوپر لے جا کر ان دونوں نے رسی چھوڑ دی
اور اس کی آنکھوں کے سامنے سیاہ دائروں کا ایک سمجھورا
گھوم گیا۔ وہ ان چٹانوں میں بندھا پوری شدت سے
زمین پر گرنا۔ ان دونوں نے اسے سنبھالنے اور سانس لینے کی
بھی مہلت نہیں دی اور پھر اسے اوپر اٹھانا شروع کر دیا، ان
کی یہ حرکت بڑی ظالمانہ تھی۔

اس کے بدن کی ساری رگیں اور پٹھے جواب
دینے لگے۔ جس عذاب میں اسے مبتلا کیا گیا وہ اس کا
تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ بے زہمی اور شقاوت کی یہ صورت
حال بالکل ہی بے مثال تھی۔

اس بار انہوں نے اسے کچھ اوپر لے جا کر رسی
چھوڑی اور پوری سنگ و دانہ مہارت کے ساتھ چٹانوں
کے زمین پر لگنے سے قبل ہی ہاتھ روک لئے... اس کے
پورے وجود پر قیامت گزر گئی۔ بدن میں درد کی ناقابل
برداشت ٹیسیں دوڑ گئیں۔ ہڈیوں کے چیخنے کی سی آوازیں
فضا میں کڑکڑائیں اور وہ اندوہنا کی چیخیں مارتا بے ہوش
ہو گیا۔

واقعی جل کماری نے سچ کہا تھا کہ اس کے عقاب
سے وحشت زدہ ہو کر اسے موت کی خواہش ہونے لگے گی
اور زندگی اس کا روگ بن جائے گی۔ وہ مسببہ جھٹکا اور

چینے لگا۔

میں کہا۔

اس کی مصیبت پہلے ہی کچھ کم نہ تھی اب سزاؤں کا نیا دور شروع ہونے والا تھا۔ کانوں اور آنکھوں میں کوئی تیل ڈالنا واقعی ایک امپوٹا شیطانی خیال تھا۔ اس وقت تک اس کی آتما نوب و دہشت سے لرز رہی تھی۔ اس سے انجانے میں جو ایک حماقت ہو گئی تھی وہ اس کے باعث یہ سزا بھگتے پر مجبور تھا۔

وہ دونوں جلاد کھولتے ہوئے تیل کا برتن لئے اس کے قریب آ بیٹھے۔ اس نے انہیں دھکیلنے کی کوشش میں ہاتھوں کو حرکت دینی چاہی اور تکلیف کی شدت سے تڑپ اٹھا۔ اس کی مجبوری اور سپرسی اپنی انتہا کو پہنچی ہوئی تھی اور اس ہولناک مصیبت سے نجات کی کوئی صورت اور تدبیر دور دراز نظر نہیں آ رہی تھی۔

ان میں سے ایک جلاد نے پتلی کی ٹکلی میں بھر کے کھولتا ہوا تیل برتن میں سے نکالا اور اس کی طرف بڑھا۔ آکاش ملنے جلنے سے معذور تھا بس چیختا ہی رہا۔

چیخ کیوں رہے ہو.....؟“ جل کماری کی ہلکی بڑی زہریلی تھی۔ ”تم آخری بار مجھے اور میرا حسین اور گداز بدن دیکھ لو۔ اس لئے اندھے ہونے کے بعد اسے تصور میں دیکھتے رہو..... دیکھو..... میں کتنی حسین اور قیامت لگ رہی ہوں..... میرے انگ انگ سے کیسی مستی املی پڑتی جا رہی ہے.....“

”تو..... تو کتنا لگ رہی ہے.....“ آکاش نے نفرت، غصے اور حقارت سے کہا۔ ”کسنی..... رذیل..... بدچلن..... کاش.....! میں مرتے مرتے تیرا گلا دبا سکتا..... تیرے منہ پر تھوک سکتا..... تجھے ایک لاسٹ رسید کر سکتا.....“

”تم دونوں کیا تماشا دیکھ رہے ہو.....؟ میں نے تمہیں تماشا دیکھنے کے واسطے بلایا.....؟“ وہ چراغ پا ہو گئی۔ ”دیکھ نہیں رہے ہو مجھے کسی بے ہودہ گالیاں بکتا جا رہا ہے..... تم سنتے جا رہے ہو۔“

”سب سے پہلے اس کی کون سی آنکھ ضائع کریں۔“ ایک جلاد نے پوچھا۔

”وہ جو بھی جیسی بھی تھی لیکن تمہارے سامنے کچھ بھی نہ تھی.....“ وہ پوری قوت سے بولا۔ ”تم مجھے ختم کرو..... مجھے صرف موت چاہئے۔ میں ایک پلی بھی زندہ رہنا نہیں چاہتا.....“

”نہیں میری جان آکاش جی.....!“ وہ حقارت بھرے لہجے میں بولی۔ ”ہم پاپ نہیں کرتے۔ بلکہ مہمانوں کی بڑی عزت اور سیوا کرتے ہیں۔ اس لئے کہ تم جیسے لوگ یوں بھی بڑی لمبی عمریں پاتے ہیں..... ہم ابھی تمہیں ایک عرصہ مہمان رکھیں گے..... جل منزل کی دھرتی کتنی سندر ہے۔ اس کا اندازہ تمہیں ہو گیا ہوگا۔ میں نہیں چاہتی کہ اسے تمہارے خون سے پیدا کروں۔“

”جل کماری.....“ اس نے پھنسی پھنسی آواز میں پھر نفسیاتی حربہ آزمایا۔ ”تم بلا وجہ اور ذرا ذرا سی بات پر مشتعل ہو رہی ہو۔ تم ذرا ٹھنڈے دل سے بچار کرو..... زندگی بڑی حسین، رنگین اور ہمیش سے گزارنے کے لئے ہوتی ہے نہ کہ اسے انتقام کی نذر کرنے کے لئے..... تم شاکر دو گی اور محبت کی بھیک دو گی تو میں ایک ایسا جیون ساتھی ثابت ہوں گا جو تمہارے جنموں میں جیون کا ایک ایک لمحہ گزاروں گا..... دیکھو..... سوچو..... اس سنسار میں تم..... چود ہوؤں کے چاند سے کہیں حسین ہو.....“

”تم کتنی پیاری پیاری باتیں کرتے ہو اور اس میں کتنی مہارت رکھتے ہو.....؟“ وہ طنز پر لہجے میں بولی۔ ”زندگی کا پھندا دکھا رہے ہو..... میں تمہیں کسی حالت میں مرنے نہیں دوں گی..... تمہیں ایک ایسی زندگی دوں گی جس کا تم وہم و گمان بھی نہیں کر سکتے ہو..... میرے آکاش جی.....! ابھی میرے یہ سیوک کھولتا ہوا تیل تمہاری آنکھوں اور تمہارے کانوں میں ڈالیں گے پر تم زندہ رہو گے..... میں دجن دیتی ہوں کہ تمہیں اس سے تک مرنے نہیں دوں گی جب تک میرے بس میں ہوا.....“

آکاش کا بدن لرز نے لگا۔ کیکپا ہٹ کے ساتھ ہی اترے جوڑوں میں درد کی ناقابل برداشت لہریں ابھریں اور وہ کسی ذبح ہوتے ہوئے بھیڑیے کی طرح



پیا سحر - مدینہ سیدال گجرات

درِ دل

بزرگ نے جیسے ہی کلامِ الہی پڑھنا شروع کیا تو کمرے میں زبردست ہوا کے جھکڑ چلنے لگے اور پھر اچانک کمرے میں جیسے زلزلہ آگیا ہر چیز الٹ پلٹ ہونے لگی پھر ایک مہیب ڈرائونی آواز گونجی۔

یہ حقیقت ہے کہ انسان ہی نہیں بلکہ مادیدہ مخلوق بھی دل کے باتوں مجبور ہوتی ہیں

ذہن سکون کے گہوارے میں ہلکورے لیٹنے لگا۔ اس نے آنکھیں بند کر کے سر آرام دہ کرسی کی پشت سے نکال دیا۔ سب سے مہراں کے ساتھ اس کی شادی ہوئی تھی حالات تب سے ہی ٹھیک نہ تھے اس کی بیماری کچھ پراسراری ہوئی جاتی تھی، مہراں کو لگتا تھا کہ ماہین کسی نفسیاتی الجھن کا شکار ہے ماہین الگ اپنی کیفیت سے پریشان تھی۔ سو آج ڈاکٹر عزیز سے ٹائم لیا تھا۔

”ڈاکٹر مجھے لگتا ہے یہ میرا وہم ہے، اور مہراں کا بھی، وہ کہتے ہیں کہ میں سونے میں کسی ساحر سے باتیں

”یہ ساحر کون ہے؟“ ڈاکٹر نے مہراں سے ساری بات جان کر اسے کمرے سے باہر بھیج دیا۔ اور ماہین سے نرمی سے پوچھا۔

”پتہ نہیں ڈاکٹر میں نہیں جانتی۔“ اس کے چہرے پر زلزلے کے آثار تھے۔

”وہ میرا.....“ بات ماہین کے منہ میں ہی رہ گئی کیونکہ اطراف میں ایک مانوس سی خوشبو پھیل گئی تھی اور ماہین کے دل و دماغ پر چھائی گئی۔ کمرے میں سوائے ڈاکٹر عزیز اور ماہین کے کوئی نہ تھا۔ کمرے کا ماحول ایسا تھا کہ ماہین کا

اسے تنہا بھیج دیا اس وعدے کے ساتھ کہ وہ بہت جلد آنے کی کوشش کرے گا۔

.....

آج پرانی راہوں سے کوئی مجھے آواز نہ دے
درد میں ڈوبے گیئت نہ دے ہم کا سسکتا ساز نہ دے
وہ صبح سے ہی یہ گانا گنگلائے جا رہی تھی۔ مہراں
بھی آج بہت یاد آ رہا تھا، اس کی طبیعت بھی کافی فریش
تھی اس نے سوچا کیوں نہ پتہ کیا جائے، لیکن کیا؟ وہ سوچ
میں پڑ گئی، ساتھ ہی گنگناہٹ جاری تھی۔

اس کی گنگناہٹ کو یکدم بریپ لگ گئے، کیونکہ وہ
روح میں اترتی ہوئی خوشبو ہر سو پھیل گئی تھی۔ ماہین نے اس کو
اپنا وہم سمجھا اور کمرے کی صفائی کرنے کا ارادہ کر لیا۔ اس کا
کمرہ کافی دنوں سے بکھر پڑا تھا اور ملازمین کو اس کے کمرے
میں آنے کی اجازت نہ تھی سو اس نے صفائی کرنے کی ٹھان
کر دوپٹے کمرے کے گرد گھوم کر باندھ لیا، اور کمرے کے ایک
کونے پر تھکے ہوئے ایک ٹکاہ دوڑائی۔

”بکھر رہا ہوں کمرہ، دکھری ہوئی چیزیں، ادھوری باتیں،
میری شخصیت کا خاتمہ ہیں۔“

ادڈلکش آواز سامعین سے ٹکرائی۔ تو اس نے چونک
کر دھڑک دھڑک دیکھا۔

کسی کو نہ پا کر سر جھٹکا اور کتابوں کی الماری کی
طرف بڑھی، سب سے پہلی چیز جو اس کے ہاتھ آئی وہ سرخ
جلد والی ایک خوب صورت سی ڈائری تھی۔ اس ڈائری کو دیکھ
کر ماہین کی رنگت متغیر ہوئی۔ پھر بے اختیار اس نے وہ
ڈائری اٹھالی۔ پہلے صفحے پر لکھا تھا۔ مائی کے نام۔

تمہارے غم نے کیا مجھے خوار مائی
مجھے مل جاؤ اک بار مائی
جنون کی حد تک میں نے تم سے
”عشق کیا اور پیار مائی
تمہارا ساحر

وہ جیسے کہیں کھوی گئی۔ ذہن ماضی کے دوش پر سفر
کرتے لگا۔

اسے لگا جیسے ابھی کل ہی کی بات ہو..... وہ اپنی

تروعات ہوئی لوگ اپنے کام دھندے پر جانے لگے، بچوں
نے بھی اسکول کا ارادہ باندھا۔ ماہین بالکونی سے یہ تمام
مناظر دیکھ رہی تھی۔ اور سوچ رہی تھی کہ ”زندگی کتنی خوب
صورت ہے، لیکن میری زندگی اتنی بے رنگ کیوں، اور پھٹکی
سی کیوں ہے یہ دلکش اور حسین مناظر میری آنکھوں کو بھلے
کیوں نہیں لگتے۔ کیا کمی ہے کس چیز کی کمی ہے میری زندگی
میں؟“ وہ خود سے پوچھ پوچھ کر تھک گئی مگر جواب نہ ارد۔

مہراں نے آئیں جاتے ہوئے کہہ دیا تھا کہ
”آج وہ ڈرائیور کے ساتھ اپنے ٹیکے حاصل پور روانہ
ہو جائے کہ شاید آب و ہوا کی تبدیلی اس کی صحت پر اچھا
اثر ڈالے، سو ماہین نے بیگز تیار کئے اور ڈرائیور کے ساتھ
حاصل پور کے لئے نکلے۔

حاصل پور کی موٹیلی میں اس کی آمد پر خوب خوشیاں
منائی گئیں۔ حیدر ملک اپنی اکلوتی بیٹی سے مل کر استے خوش
ہوئے کہ بہت سی دولت اس کے سر پر سے دار کر خیرات
کر دی۔ حاصل پور کے لوگ حیدر ملک کی فیاضی سے استے
خوش رہتے کہ دعاؤں کے ڈنڈے برساتے نہ تھتے۔ آج
بھی جب منزہ ملک نے گاؤں کی چند عورتوں کو تاج سے
بھرے تھیلے دیئے تو ماہین بھی ماں کے ساتھ ہی تھی جب وہ
عورتیں ڈھیر دن دعائیں دیتی ہوئیں اپنے گھروں کو واپس تو
ماہین ان کی زبان سے اپنے لئے اتنی دعائیں سن کر الجھتی گئی
وہ سوچنے پر مجبور ہو گئی کہ اتنی دعاؤں کے ساتھ میں رات ہی ہوں
پھر بھی وحشی و دلی سکون کو ترستی ہوں یہ سب میرے ساتھ ہی
کیوں ہو رہا ہے، کیا میں بہت گناہ گار ہوں جو مجھ پر دعائیں
بھی اثر نہیں کرتیں، مہراں بھی کیا سوچتے ہوں گے، جب
سے شادی ہوئی ہے ایک دن بھی سکون سے نہیں گزرا اور یہ
ساحر، یہ کیوں میرے حواس پر چھا گیا ہے، آخر کیوں؟“ اس
کیوں کا جواب وہ ایک بار پھر نہ تلاش کر پائی تھی۔

حویلی میں آ کر ماہین کی طبیعت کچھ بہتر تھی نہ تو
سوتے میں ساحر سے باتیں کرتی نہ ہی وہ خوشبو مسام جاں
سے ٹکراتی تھی یعنی مہراں کا خیال درست تھا کہ آب و ہوا کی
تبدیلی نے ماہین پر اچھا اور خوشگوار اثر مرتب کیا تھا۔ وہ خود تو
کاروبار کے سلسلے میں مصروف رہا، ماہین کے ساتھ نہ آ سکا،

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

ماہی پر آشکار نہیں ہونے دینا چاہتا تھا۔ ”اب کیسی طبیعت ہے تمہاری؟“

ساحر دنگ رہ گیا اسے لگا جیسے وقت رک سا گیا ہے اور وہ اسی ایک جیلے میں قید ہو گیا ہے۔ اس دشمن جاں نے کیا پوچھ لیا تھا۔ پہلے زخم زخم کرنے کے بعد اب مرہم کا سامان، بیک وقت اذیت و راحت کا احساس ہوا تھا اسے۔

”پہلے سے بہت بہتر ہے۔“ وہ ایک گہری آہ بھر کر بولا۔ خاموشی ایک بار پھر سے طاری ہو گئی، اس خاموشی کی دیوار کو توڑنے کی ہمت وہ خود میں نہیں پارہا تھا۔ لیکن وہ یہ موقع کھوتا نہیں چاہتا تھا سو بولا۔ ”مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے ماہی۔“

”بولو۔“ ماہی نے مختصر ا کہا۔ وہ کچھ دیر سوچتا رہا پھر بولا۔ ”مجھ سے کوئی غلطی ہو گئی ہے؟“

”نہیں۔“ پھر مختصر جواب ملا۔ ”تو پھر آپ مجھے نظر انداز کیوں کرتی ہیں؟“ ساحر کا لہجہ شاکی سا تھا۔ وہ یہ دیکھے بغیر کہ ماہی کا موڈ آف ہو گیا ہے بولتا رہا۔ ”ہم دوست ہیں تو پھر کیوں آپ نے دور دور رہنا شروع کر دیا ہے؟“

”ایکسکوز می ہم دوست نہیں ہیں۔“ اس بات پر تو ماہی جیسے تپ ہی گئی۔

”آپ مجھے دوست نہیں سمجھتیں لیکن میں تو سمجھتا ہوں ناں، بلکہ میں تو اس حویلی میں آیا ہی آپ کے لئے ہوں، آپ کو بتا چکا ہوں کہ میری سوچوں، میرے خیالوں، میری امید اور ناامیدی میں آپ ہو، ہر بل ہر آن میرے دل میں دھڑکن بن کر دھڑکتی ہو میری رگوں میں خون بن کر بہتی ہو۔۔۔۔۔ میری ہر آتی جاتی سانس میں آپ بستی ہو ماہی، آپ میری روح میں اتر گئی ہو، میرے روز و شب بہت مضطرب ہیں ماہی۔“

”تو میں کیا کروں۔“ ساحر کی بات ادھوری رہ گئی تھی کیونکہ ماہی یکدم ہی جتنی تھی۔ ”کیا چاہتے ہو تم مجھ سے، مجھے چھوڑ کیوں نہیں دیتے تم، مجھے اکیلا چھوڑ دو، مجھے تمہاری ضرورت نہیں ہے تم چاہتے کیا ہو؟“

”میں کچھ نہیں چاہتا ماہی، میں صرف آپ کی

خوشیاں چاہتا ہوں۔“ وہ کمزوری آواز میں بولا۔

”تمہیں میری اتنی فکر کیوں ہے؟“ وہ بولی۔

”میں آپ سے محبت کرتا ہوں حد سے زیادہ۔“

”مجھے تمہاری محبت کی ضرورت نہیں ہے، ہر چیز کی ایک حد ہوتی ہے اور تم اپنی حد میں رہو۔“ وہ بہت ہی غصے میں آ گئی تھی۔

”آپ کیوں مجھ سے اتنا جڑتی ہیں؟“ وہ بھی اپنی بات پر ڈٹا رہا اس نے ٹھان لی تھی کہ وہ آج وجہ جان کر ہی رہے گا۔۔۔۔۔“ مجھے وجہ بتائیں بس میں سوچ سوچ کر پگھل ہو گیا ہوں کہ آخر مجھ سے ایسی کیا غلطی ہو گئی ہے جو آپ نے مجھے یوں ٹھکرا دیا۔“

”سننا ہی چاہتے ہو تو سنو، مجھے نفرت ہے تم سے اور تمہاری محبت سے، مجھے تمہاری باتوں سے نفرت ہے۔ میری جان چھوڑ دو، میری زندگی سے دور چلے جاؤ خدا کے لئے۔“ یہ الفاظ بجلی بن کر گرے تھے۔ ساحر کچھ لمحے تو کچھ بول نہ سکا، گہرے صدمے سے اس کی آواز دنگ ہو گئی، کچھ دیر بعد بولا تو یوں۔ ”آپ تو میری سانسوں کی ضامن ہیں پھر آپ۔۔۔۔۔ ماہی آپ کیسے اس طرح کہہ سکتی ہیں۔“ اس کی آواز رندھ گئی۔ ”میں آپ سے بے انتہا محبت کرتا ہوں۔“

”میں نے نہیں کہا تھا مجھ سے اتنی محبت کرو۔“ ماہین کے انداز میں حد درجہ سفاکی تھی۔

”میں کسی صلے کے لئے تھوڑی سی۔۔۔۔۔ میں تو بس۔۔۔۔۔ میں تو آپ کے۔۔۔۔۔“ اس کے الفاظ بے ربط ہو گئے لہجہ بکھر سا گیا وہ سمجھ نہیں پارہا تھا کہ ماہین کے غصے کی تیزی و تندگی کا مقابلہ کیسے کرے۔

”میں تم سے تنگ آ چکی ہوں، خدا کے لئے میری جان چھوڑ دو، تمہیں میری فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے، تم میری زندگی سے چلے جاؤ۔“ ماہی بولتی رہی بسا کر کی آنکھیں بھیگنے لگیں وہ یہ دعا کرتا تھا کہ ماہی بولتی رہے اور آج جب وہ بولی تو ساحر کی دل کی دنیا ہی تاخت و تاراج کر کے رکھ دی۔

”مجھے معاف کر دیں ماہی میں جانتا نہیں تھا کہ

آپ مجھ سے اتنی تنگ ہیں۔۔۔۔۔

دل نے چپکے سے کہا۔
”کنول مجھے پتہ ہے تم مجھے پسند کرتی ہو، مگر میرا
دل مسکان کو چاہتا ہے۔“ مسکان نے دل ہی دل میں
اپنے آپ سے کہا۔

☆.....☆.....☆

جب دل شدت سے کسی کو چاہے اور وہ کسی اور کا
ہونے جا رہا ہو تو دل ہرگز یہ گوارا نہیں کر سکتا، محبت، شہدک
کا احساس ہوتی ہے اور نفرت آگ کا، آگ سے کھیلنے
والے بہت کم ہوتے ہیں۔ مگر کنول آگ میں جل کر راکھ
کے بجائے کندن بن جانا چاہتی تھی، وہ اس وقت آگ
سے کھیل رہی تھی، آگ سے ہر ایک کھیل بھی نہیں سکتا،
اس نے اشارے میں مسکان کو اپنی پسندیدگی بتا دی تھی۔
مگر مسکان اسے نہیں مسکان کو چاہتا تھا، سو اس کے لئے یہ
پسندیدگی غیر معمولی تھی۔

کنول نے اپنے بیک سے سیل فون نکالا اور
مسکان کے نمبر پر کال کر دی۔ نکل جا رہی تھی۔ مگر مسکان
نے اٹھائی نہیں۔

ایک کے بعد دوسری اور دوسری کے بعد تیسری
مرتبہ بھی مسکان نے فون ریسو نہیں کیا تو غصے سے کنول
نے فون ہی چنچا دیا، وہ غصے سے صوفے پر بیٹھ گئی، کچھ بل
بیت گئے۔

کنول کا موبائل بجنے لگا، کنول نے مسکراتے
ہوئے سیل فون کی طرف دیکھا۔ دوسری طرف مسکان
تھی۔

”ہیلو!“ کنول نے فون پس کر کے کان سے
لگا لیا۔

”آپ کی کالز آئی تھی، میں واش روم میں تھی،
ابھی باہر آئی تو کالز دیکھ کر آپ کو فون کر دیا۔“
”دراصل مجھے آپ سے بات کرنی تھی، مگر میں
کوئی دوسرا نہیں ہے کیا، وہ بھی فون اٹینڈ کر سکتا تھا۔“

”ہاں ہوتے تو ہیں، بھائی اور ماما شادی پر گئے
ہیں، آج میں اکیلی ہوں۔ ویسے کیا بات کرنی تھی آپ
کو؟“

ایک دوسرے کی طرف اٹھتے تھے۔ کنول کو یقین تھا کہ جلد
یا بدیر یہ فاصلہ سٹ جائے گا۔ لیکن فاصلہ ختم ہونے سے
پہلے ہی مسکان نے سیدھی لائن ٹرانسکل (سکون) میں
بدل دیا۔ اب تینوں سرے پر وہ تینوں مضبوطی سے کھڑے
تھے اور تینوں کی پوزیشن مضبوط اور مستحکم تھی۔

”تمہیں مسکان کیسی لگی؟“ مسکان نے کنول کی
طرف مسکرا کر دیکھا۔

”بہت اچھی، بہت خوب صورت، کاش اگر میرا
کوئی بھائی ہوتا، تو میں اسے بھانجی بنا لیتی۔“ کنول نے
دل کے بجائے دماغ سے کام لینا شروع کر دیا تھا۔

”تو میں تمہارا بھائی نہیں ہوں کیا، مجھ سے شادی
کر کے وہ تمہاری بھائی بن جائے گی۔“ مسکان نے کہا۔ تو
اندراہی اندر کنول زخمی ناگن کی طرح پھنکارتی رہ گئی۔

”نہیں مسکان تم میرے کزن ہو، بھائی نہیں،
میری شادی تم سے ہو سکتی ہے۔ آئندہ میرا بھائی غلطی سے
بھی نہ بننا۔“ کنول نے اسے ہلکا سا اشارہ دیا۔

”اچھا تو یہ بات ہے۔“ مسکان مسکرایا۔ سمجھدار تھا
سمجھ گیا۔

کنول نے مسکراتے ہوئے سر ہلایا۔
”ہم بچپن سے ساتھ ہیں، تم نے مجھے پہلے ایسا
کرنے کے لئے کیوں نہیں بتایا۔“

”ان باتوں کو اب جانے دو، تمہاری زندگی میں
مسکان ہے، میرے لئے گنجائش پیدا نہیں ہو سکتی۔“ کنول
نے مخالف سمت میں دیکھا۔

”ویسے ایک بات پوچھوں، مسکان تمہیں کیوں
پسند ہے؟“

”وہ دل کو اچھی لگتی ہے، مجھے اس کی مسکراہٹ
پسند ہے، وہ بہت زیادہ حسین ہے اور بہت ذہین بھی،
تمہیں پتہ ہے کنول اسے بہت سارے لوگ پسند کرتے
ہیں، مگر وہ مجھے پسند کرتی ہے۔“

کنول کی آنکھوں میں نمی تیرنے لگی، وہ کھڑکی
سے باہر دیکھنے لگی۔
”اور میں جو تمہیں پسند کرتی ہوں۔“ کنول کے

سفید بیڈوں میں لیٹا ہوا تھا، مسکان کے ہونٹ گہرائی میں جا کر کالے گئے تھے، اس لئے فی الحال وہ بول نہیں سکتی تھی۔

ہوش میں آنے کے بعد وہ ناگہی سے خود کو دیکھنے لگی، سہان، ایاز اور اس کی والدہ ایک ساتھ کھڑے تھے۔ جہاں یہ واقعہ ہوا تھا پولیس وہاں تفتیش کر رہی تھی۔ ان کو خون سے لکھا ہوا ایک سفید کاغذ ملا، جس پر خون سے ”مسکراہٹ“ لکھا تھا۔

تین دن بعد مسکان بیڈوں کی قید سے آزاد ہوئی۔ یہ دن مسکان نے نہایت ہی اذیت میں گزارا ہو کر گزارے تھے، ایک منظر اسے رات بھر سونے نہیں دیتا تھا، دستانے میں ہنوس ہاتھ، بد بیئت ماسک کے پیچھے چھپا چہرہ بار بار اس کی نظروں میں آ جاتا، جب بھی مسکان آنکھیں بند کرتی، وہ یہی سوچتی رہتی شاید اس کی خوب صورتی، اس نامعلوم شخص نے جھین لی ہے۔ یقیناً میرا چہرہ اس لئے چھپایا گیا ہے کہ مجھ پر تیزاب پھینک دیا گیا ہے۔

پولیس نے بیان لے لیا۔ مسکان کو اس دن آئینہ دکھایا گیا، یہ ایک تلخ حقیقت تھی، اسے چھپایا نہیں جاسکتا تھا۔ آئینے میں خود کو دیکھ کر مسکان پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی۔

”میں نے کسی کا کیا بگاڑا تھا۔ جو اس ظالم انسان نے میرے ساتھ یہ عمل کیا۔“ سہان نے مسکان کے ہاتھ سے آئینہ لے کر توڑ دیا۔

”مسکان اب تم تب تک آئینہ نہیں دیکھو گی، جب تک میں سب کچھ ٹھیک نہیں کروں گا۔“

”اب کچھ بھی ٹھیک نہیں ہو سکے گا، میری خوب صورتی کا راز، میری مسکراہٹ جھین لی گئی ہے۔ میں ایک مضحکہ خیز بن گئی ہوں۔“

”میرا یقین کرو، میں سب ٹھیک کر دوں گا۔ بس کچھ دن اور تمہیں اس اذیت کو سہنا ہوگا۔“

مسکان کی والدہ جائے نماز بچھائے اس شخص کو بد دعائیں دے رہی تھیں۔ جس نے ان کی بیٹی کا یہ حال کیا تھا۔

لکھا اور وہ بھی مسکان کے خون سے، اب یہ مسکرا نہیں سکے گی!

پھر اس نے دستانہ پہنا اور نوش نوشی مسکان کے کمر سے نکل آئی۔ وہ مین ٹیٹ سے نکل، تب تک وہ بوسیدہ ماسک بیگ میں سما چکا تھا، دستانے بھی بیگ میں چلے گئے تھے۔

گلی میں کوئی بھی نہیں تھا۔ کنول اپنی گاڑی میں بیٹھی اور چلی گئی۔ 15 منٹ میں اس نے مسکان کی سب سے خوب صورت چیز اس سے جھین لی تھی۔ اور مسکان اس ظالم چور کو پہچان بھی نہ سکی۔

.....

سہان کا دل بری طرح گھبرانے لگا، پورے وجود میں عجیب بے چین کر دینے والی لہریں سی دوڑنے لگیں، کچھ برا ہونے کا احساس اس کے دل میں جاگا، وہ جو آدھے گھنٹے بعد جانے والا تھا، فوراً اٹھا، اور گاڑی کی طرف دوڑا، عجیب انہونی ہونے کا احساس اسے بے کل کر رہا تھا۔ گاڑی تیز رفتاری سے سڑک پر جیسے اڑ رہی تھی۔ وہ بلیک جھپکتے ہی مسکان کے پاس پہنچ جاتا چاہتا تھا۔ آدھے گھنٹے کا راستہ سہان نے پندرہ منٹ میں طے کیا، گاڑی سے اتر، دوڑتا ہوا مسکان کے گھر کے اندر داخل ہوا۔

خونی منظر اس کا دل دہلانے کے لئے کافی تھا۔ مسکان کو اس حالت گزار میں دیکھ کر اس کا دل رو رہا تھا۔ اس کا چہرہ خون میں تر ہو چکا تھا۔ منہ خون سے بھرا تھا، سہان نے اسے بانہوں میں اٹھایا اور گاڑی میں ڈالا، گاڑی کا رخ قریبی بڑے اسپتال کی طرف تھا۔

مسکان کی والدہ اور بھائی کو اطلاع دی جا چکی تھی، پولیس بھی تفتیش کے لئے آ چکی تھی، سہان نے اپنا بیان دے دیا تھا۔ مسکان بے ہوش تھی۔ حتمی بیان مسکان ہی دے سکتی تھی۔ ڈاکٹر اس کی صحت یابی کی پوری کوشش کر رہے تھے، پولیس اس معاملے میں ملوث ہو چکی تھی۔

مسکان کا بھائی بہت غصے میں تھا۔ اس شخص کو ہر قیمت پر جیل کی سلاخوں کے پیچھے دیکھنا چاہتا تھا۔ مسکان کو چھ گھنٹے کے بعد ہوش آیا۔ اس کا پورا چہرہ

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✧ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریچ
- ✧ ایڈ فری لنکس، لنکس کو پیسے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا
- ✧ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو مائیل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پریویو
- ✧ ہر پوسٹ کے ساتھ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریچ
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

مسکرائے گی۔“ اور کنول نے کال کاٹ دی۔

کنول ہاری بھی ایسے تھی کہ اس کا دل اندر سے ٹوٹ گیا تھا۔ اسی رات اس نے پاکستان چھوڑ دیا، حالانکہ وہ دنیا چھوڑ دینے کا ارادہ کئے ہوئے تھی۔

پولیس کا کام رہی، نامعلوم ملزم کو ڈھونڈا نہیں جاسکا، مسکان کے ہونٹ اگرچے گہرائی میں کاسے جاپکے تھے مگر ڈاکٹر اورپس نے پوری کوشش سے پلاسٹک سرجری کر کے اسے نئے ہونٹ دے دیئے تھے۔

مسکان اور سمان کی شادی دھوم دھام سے ہو گئی۔ سمان کو کنول کے یوں چلے جانے سے کوئی پرواہ نہیں تھی، وہ اپنی مسکان کے قریب بیٹھا ہوا سوچ رہا تھا۔

”کبھی کبھی ہمارے بہت قریبی دوست اور اپنے ہمیں لائمی میں بہت بڑے نقصان سے دوچار کر دیتے ہیں۔ جیسے کنول نے مسکان کے ہونٹ کاٹ کر مجھے دکھ پہنچایا۔ خیر میں نے اسے معاف کر دیا۔ وہ جہاں بھی رہے خوش رہے۔“

سمان نے جب سفید کاغذ پر خون سے لکھا ہوا مسکراہٹ دیکھا تو اسے فوراً پتہ چل چکا تھا کہ یہ لکھائی کنول کی ہے۔ وہ اور کنول جب کبھی ساحل سمندر پر جاتے، کنول ہمیشہ ساحل کی ریت پر اپنا اور اس کا نام انگلی سے لکھ دیتی، اور سمندری لہریں چوم چوم کر اسے متا دیتیں، وہ کنول کی لکھائی کیسے پہلی نظر میں پہچان نہ لیتا۔ اسے پتہ تھا کہ کنول اسے چاہتی ہے، کنول نے کوئی قتل نہیں کیا تھا مگر اس کا جرم بہت بڑا تھا، پھر بھی سمان نے اسے شرمندہ ہونے سے بچالیا۔ یہ اس کا کنول پر ایک بہت بڑا احسان تھا۔

”کیا سوچ رہے ہو۔“ مسکان مسکرا کر بولی۔

”یہی کہ تمہاری مسکراہٹ پہلے سے زیادہ خوب صورت ہو گئی ہے۔“ سمان بولا اور مسکان کو بانہوں میں بھر لیا۔

کنول کو تیسرے دن سمان نے فون کر کے سب کچھ بتا دیا تھا۔ کنول نے سمان سے بے صبری سے پوچھا۔ ”اب تم کیا کرو گے؟ مسکان کی مسکراہٹ تمہیں پسند تھی، اب وہی نہیں رہی۔“

”کنول میں مسکان کا علاج کراؤں گا، اسے بچ منجہ دار میں چھوڑ تو نہیں سکتا۔“

”سمان تم بنا ہونٹوں کے اسے کیسے قبول کرو گے، مجھے تو سن کر وحشت ہو رہی ہے، اگر کوئی تم دونوں کو ساتھ دیکھے گا تو.....!“

”یہ تم کیا کہہ رہی ہو، میں چاہتا ہوں، میں پریشان ہوں تم میرا ساتھ دو۔“

”میں ہمیشہ تمہارے ساتھ ہوں، تم مسکان کو چھوڑ دو! یہ اس کے گھر والوں کی ذمہ داری ہے، کہ وہ اس کا علاج کرائیں۔“

”میں اسے نہیں چھوڑ سکتا۔ وہ مجھے بنا ہونٹوں کے بھی قبول ہے۔“

”سمان! اس وقت تم ہوش میں نہیں ہو، بعد میں بات کرتے ہیں۔“ کنول بولی۔

”اب تو ہوش میں آیا ہوں، سوچو، اگر تمہارے ساتھ کوئی ایسا کرے، اور تمہارا ہونے والا منگیتر، تمہیں چھوڑ دیتا، تو تم ہونٹوں کے کٹ جانے پر اتنا غم زدہ نہیں ہوتی، جتنا اپنے منگیتر کی بے وفائی کا غم کرتیں، تمہیں پتہ ہے! مسکان کو تے ہونٹ مل جائیں گے!“

”کک..... کک..... کیسے!“ کنول ہلکائی۔

اس کا دل سوس کر رہ گیا۔ سمان نے اسے لا جواب کر دیا تھا۔ کنول محبت کی یہ بازی بھی ہار چکی تھی۔

”سائنس نے بہت ترقی کر لی ہے۔ پلاسٹک سرجن ڈاکٹر اورپس نے مکمل یقین دہانی کروائی ہے کہ مسکان کو پلاسٹک سرجری کے بعد نئے ہونٹ لگ سکتے ہیں اور وہ بھی بہت حسین اور شاداب۔“

کنول آگے کچھ نہ بول سکی!

”مسکان پہلے سے زیادہ خوب صورت انداز میں



نے یہ بھی نہ سوچا کہ کوئی اور ہو سکتا ہے۔ سہانہ نے تو ایک گھنٹے میں آنے کا کہا تھا۔ اور ابھی 15 منٹ بھی بمشکل گزر رہے تھے۔

جیسے ہی دروازہ کھلا، سیاہ دستانے میں چھپا ہاتھ برآمد ہوا۔ مکان سنہیلی بھی نہیں تھی، بدبیت شکل کے بوسیدہ ماسک پہنے ہوئے کوئی تیزی سے اندر داخل ہوا۔

دوسرے لمحے میں ماسک مین کا ہاتھ مکان کے منہ پر ہاتھ، کلوروفارم کی خوشبو نے مکان کو سوچنے کا موقع تک نہیں دیا۔ وہ یہ تک نہ جان سکی کہ ماسک مرد نے پہن رکھا ہے یا کوئی عورت تھی۔

مکان لہرا کر فرش پر گرتی چلی گئی۔ کنول نے وقت ضائع کئے بغیر اپنے بیک سے تیز دھار قینچی نکالی اور دوسرے لمحے قینچی مکان کے ہونٹوں پر وہ رکھ چکی تھی۔

شدت سے کنول نے بائیں ہاتھ سے مکان کے ہونٹ پوری قوت سے کھینچے اور دائیں ہاتھ سے قینچی چلا دی۔

اور پھر تیز دھار قینچی بیک وقت دونوں ہونٹوں کو کاٹ نہ سکی، البتہ اسے زخمی ضرور کر گئی، کنول نے قینچی نکالی اور خون آلود قینچی سے پہلے اس کا اوپری ہونٹ کاٹ دیا، بے ہوش مکان جنبش تک نہیں کر سکی۔

پھر نچلا ہونٹ کاٹ دیا۔ بھل بھل خون کا فوارہ نکلا، خون آلود ہونٹ، جو مکان کے خوبصورتی کا حصہ تھے، اب اس سے جدا پڑے تھے، بنا ہونٹوں کے اس کے دانت صاف نظر آ رہے تھے۔

”اب میں دیکھتی ہوں، بنا ہونٹوں کے اس چڑیل کو سہانہ کیسے اپناتا ہے۔“

کنول نے سر جھٹکا اور مکان کے کٹے پھٹے ہونٹ اٹھا کر ڈسٹ بن میں پھینک دیئے۔

وہاں پر ایک سفید رنگ کا کاغذ پڑا تھا۔ جو عموماً پرتر میں استعمال ہوتا ہے۔ جسے ڈٹل اے کاغذ کہتے ہیں۔

کنول نے وہ کاغذ اٹھایا اور دستانہ ہاتھ سے اتار کر مکان کے جتے خون میں اپنی انگلی ڈبودی۔

اس نے سفید کاغذ پر اپنی انگلی سے ”مسکراہٹ“

”کچھ خاص نہیں، آپ کا حال احوال پوچھنا تھا۔“ کنول نے سنبھل کر کہا۔

”جی میں بالکل ٹھیک ٹھیک ہوں، آپ کا بہت بہت شکریہ! کہ آپ نے یاد کیا۔“

”اس میں شکریہ کی کیا بات ہے۔“ کنول مسکرائی۔ ”میں ہمیشہ تمہیں یاد رکھوں گی۔“ رابطہ منقطع ہو چکا تھا، خاموشی چھا چکی تھی۔

کنول گہری سوچ میں گم تھی۔ ”مکان گھر پر اکیلی ہے۔ اچھا موقع ہے۔“ وہ اٹھی۔ اسٹور روم میں گھس گئی۔ پرانے کپ بورڈ سے اس نے ایک بدبیت سا ماسک نکالا۔ جو گرد سے اٹا پڑا تھا۔ پھر اس نے وہ بد شکل ماسک اچھی طرح جھاڑا۔ پھر کاڑی میں بیٹھ کر مکان کے گھر کی طرف روانہ ہو گئی۔ اس کو مکان کا گھر معلوم تھا۔

راستے میں وہ ایک میڈیکل اسٹور پر رکی، اس نے سیلز مین کو اچھی خاصی رقم دی، بدلے میں سیلز مین نے اسے ایک دوائی دی، بے ہوشی کی دوا، کلوروفارم!

رومال پر کلوروفارم ڈال کر اس نے رومال پر اس میں رکھ دیا۔ مکان کے گھر سے تھوڑے فاصلے پر اس نے گاڑی روک دی۔ بیک اٹھایا اور چیل پڑی۔ وہ گیٹ کے قریب پہنچ گئی، اس نے گلی میں ادھر ادھر دیکھا، کوئی نہیں تھا، اس نے اپنے بیک سے ماسک نکالا اور پہن لیا، وہ اس ماسک میں اچھی خاصی مضحکہ خیز لگ رہی تھی۔

مکان کے گھر کا مین دروازہ اس نے دھکیلا، خوش قسمتی سے وہ کھل گیا، وہ اندر چلی گئی، گھر میں داخل ہوتے ہی وہ الارٹ ہو گئی، جیسے مشن ایمپاسیبل کو پاسیبل کرنے کی کوشش کر رہی ہو، مین گیٹ سے ہو کر اس نے لان عبور کیا، پھر گھر کے داخلی دروازے پر پہنچ گئی، اس نے پرس سے دستانہ نکالے، اور پہن لئے، داخلی دروازے پر اس نے دباؤ ڈالا، مگر دروازہ بند تھا، اس نے جینڈل پورے زور سے گھمایا مگر بات نہیں بنی۔

داخلی دروازے پر دستک ہونے لگی۔

”لگتا ہے سہانہ آ گئے۔“ مکان مسکرائی، وہ جلدی سے انھی اور ہنستی مسکراتی دروازے پر پہنچ گئی اس

”میں تم سے مخاطب ہوں۔“ سمان قدرے اونچی آواز میں بولا۔

”من رہی ہوں، دیکھ کر بتاؤں گی، کبھی کبھی ہم پہاڑ کھودتے ہیں اور چوہا نکلتا ہے۔“

سمان نا کبھی سے کنول کو دیکھنے لگا۔ ”سامنے دیکھو ڈفر، ایکسیڈنٹ کروانا ہے کیا۔“ اور سمان مسکرا کر سامنے دیکھنے لگا۔ کنول کی چیخ اچھی خاصی بلند تھی۔

ادھری سائیڈ کے قریب بے شاندار سے ہوٹل میں مسکان ٹیبل پر بیٹھی ان کی منتظر تھی۔ وہ دونوں چلتے ہوئے مسکان کی ٹیبل تک آ پہنچے، مسکان ان کے استقبال کے لئے اٹھ کھڑی ہوئی، کنول نے اس سے ہاتھ ملایا۔ جبکہ مسکان گلے لگانے کا سوچ رہی تھی۔ سمان نے دونوں کا تعارف کا مرحلہ طے کیا۔ مسکان نے اسے خوش دلی سے دیکھ کر اور تینوں ٹیبل کے ارد گرد بیٹھ گئے۔

سمکان اسے پہچان نہ سکی۔ کالج میں وہ مسکان کی مخالف تھی۔ مگر وہ مقابلہ یک طرفہ طور پر طے کرتی، مسکان سے وہ کبھی نہیں پوچھتی تھی، وہ مسکان سے کبھی مخاطب نہیں ہوئی تھی اور نہ اس سے بات کرنا پسند کرتی تھی۔

کنول کے خیال کے مطابق وہ اسے پہچان نہ سکی، ہر بات کنول کے لئے بولس تھی، ورنہ اگر وہ اسے پہچان جاتی تو یقیناً اس کی دکھتی رگ کالج کی پرانی باتیں شروع کر دیتی۔

”تمہیں پتہ ہے کنول آج مسکان کی برتھ ڈے ہے، اور ہم اس کی برتھ ڈے سلی بریٹ کرنے آئے ہیں۔“ سمان کی بات پر مسکان مسکرانے لگی، اور کنول غور سے اس کے مسکرانے کے انداز کو دیکھنے لگی، واقعی ایسی دلکش مسکراہٹ کسی کی بھی نہیں ہوگی، سفید موتیوں کی طرح دانت چمک رہے تھے اور ہونٹ بتالپ اسٹیک کے گلابی تھے۔

”ڈفر، پہلے کیوں نہیں بتایا۔ میں مسکان کے لئے کوئی گفٹ تو لے آتی۔ دیکھئے مسکان! یہ اس تالائق کی غلطی ہے۔ بے وقت بنا دیتا تو۔“ کنول نے ناراضگی سے سمان کو کھورا۔

”اُس اوکے، تم آئیں، تو ایسا لگا، جیسے تم ہی میرا گفٹ ہو۔ سمان اکثر تمہارا ذکر کرتا رہا ہے۔“ مسکان نے سمان کی طرف دیکھ کر کہا۔

”اچھا، ریلی لیکن جب میرے ساتھ ہوتا ہے، صرف تمہاری مسکراہٹ کی تعریفیں کرتا ہے اور تم سے مل کر مجھے لگا کہ سمان جھوٹی تعریفیں نہیں کرتا۔“

کچھ دیر کے بعد ٹیبل پر ایک بج چکا تھا اور ایک کے اوپر شمع روشن ہو گئی تھی۔ ”پپی برتھ ڈے، مسکان“ ایک کے اوپر لکھا تھا۔ کنول ان کے درمیان خود کو مس فٹ سمجھ رہی تھی۔

سمکان نے روشن شمع کو پھونک مار کر بجھا دیا، اور سمان، کنول تالیوں کے شور میں پپی برتھ ڈے مسکان، وٹس کرنے لگے۔

سمکان نے ایک چھری سے کاٹا اور پیس بنا کر سمان کے منہ میں ڈال دیا تو کنول کے دل پر جیسے مسکان چھری پھیر رہی تھی، اور اس کے دل کے ٹکڑے جیسے سمان کو کھلا رہی تھی۔

اگلا ٹکڑا کر کے اس نے کنول کی طرف بڑھا دیا تو کنول نے اس کے ہاتھ سے ٹکڑا لیا۔ اور ذرا سا چکھا۔ اور پھر وہیں رکھ دیا۔ مسکان نے کنول سے دوستی کر لی۔ اور اپنا ٹیلی فون نمبر بھی دے دیا۔

سمان دونوں کو شاپنگ پر لے گیا، اور پھر پہلے مسکان کو گھر ڈراپ کر دیا۔ کنول نے اس کا گھر نوٹ کر لیا۔

پھر دونوں اپنے گھر چلے آئے۔

☆.....☆.....☆

کنول کو سب کچھ بہت برا لگ رہا تھا۔ مگر کمال حیرت سے اس نے سمان کے سامنے مسکان کی کسی بات کا الٹا جواب نہیں دیا اور نہ ایسا ظاہر کیا کہ اسے مسکان کی موجودگی سے تکلیف ہو رہی ہے۔ جب تک مسکان نا معلوم تھی وہ اور سمان سیدھی لائن کی طرح تھے۔ لائن کے ایک سرے پر کنول کھڑی تھی اور دوسرے پر سمان، دونوں میں بظاہر فاصلہ بہت تھا۔ مگر ان کا ایک ایک قدم

”یہ قینچی اب میرے کام آئے گی۔“

☆.....☆.....☆

”اٹھو آج میں تمہیں مسکان سے ملواتا ہوں، تم بہت کبہ رہی تھی کہ میں مل کر بتاؤں گی کہ کیسی ہوگی۔“ کنول بیڈ پر لیٹی تھی، اور مسکان اس کے سر پر کھڑا کبل کھینچ رہا تھا۔

مسکان ”لیوٹی“ مجھے مسکان سے نہیں ملنا، وہ بہت خوب صورت ہوگی اور جس کا نام مسکان ہو، اس کی مسکراہٹ، کیوں خوب صورت نہیں ہوگی۔“ کنول نے خود پر دوبارہ کبل تان لیا۔

”کنول میں مسکان سے بات کر چکا ہوں کہ آج تمہیں اس سے ضرور ملنا ہوگا، اگر تم نہیں گئی تو میں ناراض ہو جاؤں گا۔ کیا سوچے گی مسکان کہ میری کیسی کزن ہے جو ملنے نہیں آئی۔“

”یار، میں نہیں ملنا چاہتی، تو کیوں زبردستی ملوا رہے ہو۔“ کنول نے تنک کر کہا۔

”اوسے، میں آئندہ تم سے کوئی بات نہیں کروں گا۔“ مسکان نے کبل چھوڑ کر کہا۔

”رکو، میں چل رہی ہوں، اتنی سی بات پر ناراض ہو کر جا رہے ہو۔“ کنول مسکان کو ناراض نہیں دیکھ سکتی تھی، اس نے کبل پھینکا، اور اٹھ گئی۔ ”تم بیٹھو، میں تیار ہو کر آتی ہوں۔“

کنول نے بیک میں قینچی ڈالی اور واش روم میں کھس گئی۔ آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اس نے اپنا تنقیدی جائزہ لیا اور پھر منہ ہاتھ دھو کر باہر نکلی اور پھر تیار ہو کر مسکان کے سامنے آ گئی۔ ”ارے واہ بہت پیاری لگ رہی ہو۔“ مسکان تعریف کے ساتھ کہنے لگا۔

یہ سن کر کنول نے کندھے اچکائے، پھر دونوں کیراج کی طرف چلے گئے۔ کنول فرنٹ سیٹ پر بیٹھ گئی، مسکان نے اپنی گاڑی نکالی، دونوں کا رخ اسی سائینڈ پر تھا۔

”تمہیں پتہ ہے کنول، مسکان کی مسکراہٹ، سونا لیز اسے بھی پیاری ہے۔ جس کی دنیا دیوانی ہے۔“

”ہا..... ہا.....“ شیطانی منصوبہ اس کے ذہن نے بھرپور اپنایا۔

شیطان نے اسے کیسی عجیب راہ دکھائی۔ شیطاں بھٹکانے پر آئے تو وہ بھٹکا دیتا ہے۔ کبھی بدلے کے نام سے، اور کبھی پیار کے نام سے۔

محبت اور جنگ میں سب کچھ جائز ہوتا ہے نور جنگ سے محبت زیادہ اہم ہوتی ہے۔

☆.....☆.....☆

بہت روکا خود کو تمہیں یاد کرنے سے لیکن دل میرا میری طرح فرمان نکلا کنول سے کئی بار مسکان ملنے آیا۔ مگر کنول اس سے نہیں ملی، یہ سوچ کر اس کی روح کانپ جاتی کہ ”مسکان مسکان کے ساتھ ہوگی اور اس کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے سمندر کنارے پر چہل قدمی کرتی ہوگی، مسکان اس سے باتیں کرتا ہوگا اور مسکان مسکرا رہی ہوگی۔“

”مجھے ان دونوں میں جدائی ڈالنی ہوگی، شادی سے پہلے۔ اگر اس کی شادی ہوئی تو میں جیتے جی ہار جاؤں گی، مر جاؤں گی، ختم ہو جاؤں گی۔“ وہ کیسے مسکان کی جدائی برداشت کرتی۔

مجھے کوئی قتل تو اسے کرنا نہیں۔۔۔ صرف اس کی مسکراہٹ چھیننی ہے۔ پھر سب کچھ خود بخود ٹھیک ہو جائے گا، پھر مسکان میرا ہو جائے گا۔ وہ مسکرائی۔

مسکان کو میں پسند تھی، میں اسے اچھی لگتی تھی، یہی سچ تھا۔

جو چیز کسی دوسرے کی ہو، اس کے لئے پریشاں نہیں ہوا کرتے، ضد بھی نہیں کرتے، وہ اس کا پہلا پہلا پیار تھا۔

میں، سب کچھ ٹھیک کر دوں گی، سب کچھ پہلے جیسا کر دوں گی، مسکان میرا ہو جائے گا، وہ دل ہی دل میں خود کو تسلی دیتی۔ اس کی سوچ مسکان سے شروع ہو کر مسکان پر ختم ہو جاتی۔ آج اس کا دماغ ماؤف ہو رہا تھا یا ہو چکا تھا، ہر راستہ بند نظر آ رہا تھا مگر بند نہ تھا۔

کنول نے قینچی کی طرف دیکھا اور مسکرائی۔

ایک خوف اس کے دل میں بیٹھ رہا تھا کہ سہان کسی کی مسکراہٹ پر دل ہار چکا ہے مگر سہان ایسا کیسے کر سکتا ہے۔ وہ کنول کا دل کیسے کسی کی مسکراہٹ پر ہار سکتا ہے۔

میں اس کے ہونٹوں کو دیکھا کرتا تھا۔ پھر ایک دن، اس کی مسکراہٹ کی تعریف کر دی۔ تمہیں پتہ ہے کنول اس نے کیا کہا؟

”کیا کہا؟“ کنول نے آہستہ آواز میں پوچھا۔

اب اس کا لہجہ پست تھا اور آواز دھیمی تھی۔

اس نے کہا۔ ”میری مسکراہٹ کی تعریف ہر کوئی کرتا ہے جب کوئی میرے مسکرانے کی تعریف کرتا ہے، تو میں ایک نقطہ، اپنی ڈائری میں ڈال دیتی ہوں۔ اور آج ان نقطوں کی تعداد دو سو ہو جائیگی۔“

اور تمہیں پتہ ہے کنول میں اس بات پر کھلکھلا کر ہنسا تھا اور اس نے میرا ساتھ دیا تھا۔ ”سہان اسے اپنائیت بھرے لہجے میں بتا رہا تھا۔ اور کنول کو لگ رہا تھا کہ جیسے اس کے دل پر چھری چل رہی ہے۔

”کیا نام ہے اس کا؟“

”مسکان! سہان نے مسکرا کر بتایا۔ اس کے دل میں جل تھل بجنے لگا تھا، اور کنول طوفان کی زد میں کھڑی تھی، اور جیسے طوفان ہائی رفتار سے اس کے اوپر سے گزر رہا ہو۔

”مجھ سے نہیں جیت سکتی! ہر مقام پر مجھ سے جیتنے والی مسکان مجھ سے محبت میں نہیں جیت سکتی۔“ کنول کا دل چیخ چیخ کر اسے باور کر رہا تھا، کنول نے سختی سے ہونٹ بھینچ لئے۔

”میری محبت میں کی ہوگی، تبھی سہان مسکان پر دل ہار بیٹھا، خیر ابھی کچھ نہیں ہوا، مسکان کا میں کچھ نہ کچھ بندوبست کر دوں گی۔“

”کیا سوچنے لگی کنول؟“ سہان نے ہاتھ سے کنول کی آنکھوں کے سامنے چٹکی بجا لی۔ ”کچھ نہیں! اور بہت کچھ۔“ کنول مسکرائی۔

سہان نے ناکبھی سے کنول کو دیکھا اور پھر وہ اٹھ کر جانے لگی۔

”میں سمجھا نہیں!“ وہ کنول کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

”جلد سمجھ جاؤ گے۔“ کنول مسکرائی۔ اور افسردہ چال چلتی ہوئی چلی گئی۔

مگر ایسا ہو چکا تھا۔ فیصلہ ہو چکا تھا وہ سہان کے دل میں جگہ بنا چکی تھی، اور کنول کتنی بے خبر تھی، اسے پتہ بھی چلا تو سہان سے! جسے وہ اپنا آپ دل کہتی تھی۔

کنول غیر یقینی نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

”کنول تمہیں پتہ ہے، اس جیسی حسین مسکراہٹ کسی کی بھی نہیں ہے۔“ اور کنول کا دل چاہا کہ وہ اس انجان مسکراہٹ والی لڑکی کو زندہ قبر میں دفن کر دے، وہ کمال فن سے خود پر جبر رکھ کر بیٹھی ہوئی تھی اور اپنی رقیب کی مسکراہٹ کی تعریف سن رہی تھی۔

”سہان میں جب اس سے ملوں گی، تب یقین کروں گی کہ تم جس کی مسکراہٹ کی تعریفیں کر رہے ہو وہ اس قابل ہے بھی یا نہیں۔“ کنول نے سہان کی آنکھوں میں دیکھ کر کہا۔

”اور یہ بات بھی صحیح ہے کہ میں تمہیں اس سے ضرور ملواؤں گا، تمہیں بھی بہت پسند آئے گی۔“

”ہاں دیکھ کر بتاؤں گی۔“ کنول مسکرائی مگر اس کا دل جل رہا تھا، شغف بڑھ رہی تھی۔ ابھی اسے مسکراہٹ والی لڑکی کا نام تک معلوم نہیں تھا۔ مگر دل میں جیسے اس کے آگ لگ گئی تھی۔ وہ اپنے دل میں لگی آگ سے اس انجان لڑکی کو جھلسا کر رکھ کر دینا چاہتی تھی۔

”اس کے ہونٹ بہت حسین ہیں۔ میں نے اپنی زندگی میں کسی کے اتنے گلاب کی پتھریوں کی طرح نرم و نازک یا قوتی ہونٹ کبھی نہیں دیکھے۔“

”سہان، وہ تمہیں کہاں ملی تھی؟ اور کیا تم نے اس سے حال دل بیان کر دیا۔“

کنول کے لہجے میں بظاہر سٹھاس بھرا تھا، وہ اشتیاق کے عالم میں پوچھ رہی تھی، مگر سہان نہیں جانتا تھا کہ کنول اندھ بھی آگ میں تھلس رہی ہے۔

”وہ میرے آفس میں کام کرتی ہے۔ پہلے پہلے تو

لوگ کون ہیں اور مجھے یہاں کیوں لائے ہیں؟“

ماہین کے سوال پر نمداد نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ وہ گھٹی جھاڑیوں کی طرف بڑھ رہے تھے۔

ایک جگہ پر وہ رک گئے، وہ بہت بڑا درخت تھا جس کو دیکھ کر حیرت ہوئی تھی اس کے نیچے بہت گھنی جھاڑیاں تھیں، درخت کی شاخیں چاروں طرف سے ایسے جھکی ہوئی زمین تک آ رہی تھیں کہ ایک چار دیواری کا سا گماں ہوتا تھا۔ جھاڑیوں کے تنکوں کے نیچے ایک چبوترہ سا بتا تھا۔ ماہین کو کچھ سمجھ نہ آ رہا تھا کہ یہ لوگ کون ہیں اور اسے یہاں کیوں لے کر آئے ہیں؟

نمداد نے اس کی یہ حیرت بھی دور کر دی۔ چبوترے کی طرف اشارہ کر کے بولی۔ ”اس پر اپنے مذہب کے مطابق فاتحہ پڑھو۔“

ماہین کچھ نہ سمجھتے ہوئے آگے بڑھی وہ کوئی جیسے مزار تھا، جب اس کی نظر کتبے پر پڑی تو اس کے پیروں کے نیچے سے زمین کھسک گئی اور زبان سے بے اختیار نکلا۔ ”میں نے ایسا کب چاہا تھا۔“

کتبے پر لکھا تھا۔ ”ماہی تمہارا ساحر۔“ پھر بے اختیار ماہین کی آنکھوں سے آنسو اُٹ آئے اور وہ دھواڑیں مار مار کر رونے لگی۔ بہت سا وقت ایسے ہی گزر گیا وہ سسکیاں بھرتی رہی۔

آخر نمداد نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ”بس کرو یوں تو تم ساری زندگی بھی آنسو بہاتی رہو تو اس کی محبت اور اپنی لا پرواہی یا نظر اندازی کا بوجھ ہکا نہیں کر سکتی، ہمارے پاس وقت کم ہے۔“

”وہ تمہیں چھوڑ کر یہاں آ بسا تھا۔ روتا رہتا تھا بہت بے چین رہتا، ہر وقت ”ماہی، ماہی“ ہم لوگ اسی درخت پر رہتے ہیں، اس نے درخت کی طرف اشارہ کیا، ہم حیران تھے کہ لوگ دنیا چھوڑ کر جنگل میں آ بستے ہیں اور ہر وقت دنیا بنانے والے کو یاد کرتے ہیں اور یہ عجیب جن ہے، طاقتور ہوتے ہوئے بھی روتا ہے، پاگلوں کی طرح ہلکتا ہے اور ماہی ماہی کرتا ہے۔“

ہمیں اس پر بہت ترس آتا، جنات ہو کر بھی، مگر تمہیں انسان ہو کر بھی اس پر ترس نہ آیا، خیر ہم نے اس کا ورد بانٹنے کے لئے انسانی روپ میں اس کے پاس آنے کا فیصلہ کر لیا۔

جس دن ہم انسانی روپ میں اس کے پاس آنے والے تھے اسی دن تم نے اسے مار دیا، تم نے اس کے دل میں گولی اتار دی جس میں صرف تم اور تمہاری محبت بسی تھی۔“ ہم فوراً اسے پہچاننے کے لئے بڑھے تو جانتی ہو اس نے کیا کہا؟“

ماہی نے بھیگی آنکھوں کے ساتھ سرنگی میں ہلادیا۔ نمداد نے پھر گویا ہوئی۔ اس نے کہا۔ ”مجھے مر جانے دو مجھے ماہی نے مارا ہے، یہ خوشبو بتا رہی ہے کہ ماہی نے مجھے مارا ہے وہ آس پاس ہے۔ میری خواہش اور دلی خوشی ہے کہ میرے قبیلے اور سل والے ماہی یا اس کے گھر والوں سے دور رہیں۔“ اور وہ مر گیا، مرتے مرتے بھی یہ کہہ رہا تھا کہ ”میں ماہی کی خوشی میں خوش ہوں۔“

ہم چاہتے تو تمہارے لوگوں کو تمہاری داستان سناتے لیکن مرنے والا تمہاری عزت کرتا تھا، اس لئے ہم نے بھی تمہیں بے عزت نہ ہونے دیا۔ تمہارے گھر جانے کا دقت ہو گیا ہے، ہم چاہتے تو تمہیں کڑی سزا دیتے مگر تمہیں بچا لیا گیا، آنکھیں بند کر دو اور جاؤ اس سے پہلے کہ ہم اپنا ضبط کھو بیٹھیں۔“ جن مذاہ بہت غصے میں تھا۔

ماہین نے آنکھیں بند کر لیں اور جب اس نے آنکھیں کھولیں تو وہ اپنے کمرے میں تھی۔ شدت کرب سے دل پھٹنے کے قریب تھا، آنکھیں بند کر سرخ ہو چکی تھیں مگر تکلیف و لذت کم نہ ہو رہی تھی۔ ”میں مجبور تھی، تمہاری ماہی مجبور تھی میرے ساحر، مجھے معاف کر دو۔۔۔۔۔ معاف کر دو۔“

وہ اپنا چہرہ ہاتھوں میں چھپا کر سسکنے لگی۔ یہ بھی ٹھیک ہے وہ چلا گیا مجھے بند رستے پر چھوڑ کر یہ بھی ٹھیک ہے نہ آئے گا وہ کبھی بتانا کا توڑ کر



میں آپ کو چھوڑ دیتا ہوں یہ خواہش آپ کی میں ضرور پوری کروں گا، مجھے آپ سے کچھ نہیں چاہے تھا آپ کے سوا، میں تو بس آپ کو دیکھ کر زندہ ہوں، اب اگر آپ ہی نہیں تو کچھ کچھ بھی نہیں.....“ آنسو اس کے رخساروں پر بہنے لگے، آپ نہیں تو کچھ بھی نہیں..... کچھ بھی نہیں۔“ ہچکچوں سے اس کا سانس ڈولنے لگا۔

ماہی کے لمبوں پر مسکان تھی، وہ ہنس رہی تھی، ٹونا بکھرا سا حشر اید اس کی اتنا اس کے جذبہ غرور کو تسکین دے رہا تھا۔ وہ مسکراتی رہی۔ وہ ماہی کو کسی قیمت پر چھوڑ نہیں سکتا تھا لیکن ماہی کی نفرت نے اسے سب کچھ چھوڑنے پر مجبور کر دیا تھا پھر تو وہ ملک صاحب کے لاکھ روکنے پر بھی نہ رکا اور حویلی چھوڑ کر چلا گیا۔

نہ دشمنی کسی دن سے اب نہ دوستی کسی رات سے بچا ہی کیا جو وہ لے گیا چھین کر میری ذات سے یہ مقام ہی تھا عجیب سا میں خود کو بھی نہ بچا سکا نہ میں پاس اس کو بلا سکا نہ میں دل کی بات بتا سکا

☆.....☆.....☆

ماہین کی دھوپ چھاؤں سی طبیعت اسے کہیں ٹھہرنے نہ دیتی تھی۔ ساحر کا خلوص اس کی وفا کو مایہ برداشت ہی نہ کر پائی۔ سچ ہے محبت کی زیادتی بھی انسان کو دکھ دیتی ہے اسے ساحر کا بلک بلک کر رونا یاد آتا رہا۔ اس کے سوا وہ ساحر سے کوئی ہمدردی نہ جتا سکتی تھی۔

انہی دنوں حیدر ملک نے اپنے بھانجے مہراں ملک سے ماہین کی شادی طے کر دی۔ ماہین کوئی احتجاج نہ کر سکتی تھی سو بلا چوں چہاں باپ کا فیصلہ مان لیا کیونکہ یہ تو طے تھا ایک نہ ایک دن تو یہ دن آتا ہی تھا۔ وہ ساحر کو بھول جانا چاہتی تھی لیکن اگر ہر چیز انسان کے بس میں ہوتی تو قدرت کے فیصلوں کی کیا اہمیت رہ جاتی۔ مہراں شہر سے آیا تو اسے شکار کا شوق چلایا اس نے ماہین کو بھی دعوت دے ڈالی جسے اس نے بخوشی قبول کر لیا، کیونکہ وہ خود شکار بورنشانے بازی کی شوقین تھی۔ یوں اس کا شوق بھی پورا ہو جاتا اور مہراں کی دعوت کا مان بھی رہ جاتا۔ سوز و درد شہر سے شکار کی تیاری کی اور جنگل کی طرف چل دیئے۔ وہ حامل پور کے باہر جنگل میں موجود

تھے۔ مہراں نے بہت سارے چھوٹے موٹے شکار جن میں زیادہ تر پرندے شامل تھے۔ ماہین نے ابھی تک رائفل کندھے سے اتاری نہ تھی۔ چلتے چلتے وہ اچانک رک گئی کھنی جھاڑیوں میں اس کو خرگوش دکھائی دیا۔ مہراں آگے بڑھ گیا وہ ماہین کے رکنے سے انجان تھا۔ ماہین نے رائفل لوڈ کی اور فوراً خرگوش کو نشانے پر لیا، ایک لمحے کے لئے اس نے ہاتھ کانپ گیا۔ ساحر کا خیال آ گیا، اس نے تو رائفل چلائے نکھایا تھا اسے، اس نے نخوت سے سر جھٹکا اور ہاتھوں کی لرزش کی پروا نہ کرتے ہوئے ٹریگر دبا دیا۔ اسے سنے میں مہراں بھی آ گیا۔ ایک کراہا بھری۔ ”یہ آواز کیسی ہے؟“ مہراں نے چاروں طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”کیسی آواز، میں نے تو کوئی آواز نہیں سنی۔“ ماہین نے کہا۔ اس کی نگاہیں زخمی خرگوش کو تلاش کر رہی تھیں مگر وہ ایسے غائب ہوا جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔ کراہ ایک بار پھر ابھری، اب کہ آواز قدرے اونچی تھی۔

☆.....☆.....☆

ماہین چونک گئی اور ماضی کے سفر سے لوٹ آئی، ہر طرف ہوشربا خوشبو پھیلی ہوئی تھی، ساحر کی آخری یاد اس کی ڈائری جیسے ساحر نے اپنے خون جگر سے سجایا تھا واپس رکھ دی، گراؤنڈ فلور سے تیز تیز بولنے کی آواز آرہی تھی۔ ماہین نے غور کیا۔ تو تیزی سے باہر کی طرف بھاگی۔ ساحر کی آواز۔ ”کیا وہ واپس آ گیا؟“ دل میں سوچا تھا اس نے سورج اپنی آخری منزل کی طرف دوانہ ہوا ہاتھ۔ سائے لمبے ہو رہے تھے۔

جب وہ لان میں پہنچی تو ساحر سچ سچ وہاں موجود تھا ماہین اس کی طرف بڑھی، اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی ساحر پلٹا جب دونوں کی نظر ملی تو وہ جیسے پتھر لٹی کچھ بھی کہنے سننے کی حالت میں ہی نہ رہی۔ ساحر کی آنکھوں میں آگ سی جلتی ہوئی نظر آئی، اتنی گرمی، اتنی تپش کہ ماہین کو وہ تپش اپنی آنکھوں میں منتقل ہوتی محسوس ہوئی، مایہ کو یوں لگا جیسے اس کا دماغ جل اٹھا ہے وہ تیوراً کر گری اور بے ہوش ہو گئی، مہراں حویلی کے گیٹ سے داخل ہوا تو اس نے ماہین کو اکیلے

مستانی ہو جاتی ہیں، ساحر کو موسم کی خوب صورتی و بدصورتی سے کوئی غرض نہ تھی اس کے سبب موسم تو اس کے دل موسم کے حساب سے حسین ہوتے۔

وہ میرے ساتھ ہی رہتا ہے جہاں تک جاؤ میں ہوں دریا تو ہے وہ شخص کنارہ پر وہ بس ماہین کی سوچوں میں مگن جا رہا تھا کہ اس سوچ کے سلسلے کو ایک کتے کے بھونکنے کی آواز نے توڑ ساحر نے چونک کر ارد گرد غور کیا تو وہ حیدر ملک کی حویلی کے بالکل سامنے کھڑا تھا۔ کتے کے بھونکنے کی آواز حویلی سے آ رہی تھی۔ وہ مسلسل بھونکنے جا رہا تھا ابھی ساحر اس بارے میں کچھ سوچ بھی نہ پایا تھا کہ اچانک حویلی کا گیٹ کھلا اور اس میں سے ایک شخص برآمد ہوا اس نے سارے جسم کو چادر سے ڈھانپ رکھا تھا حتیٰ کہ چہرہ تک مکمل چھپا رکھا تھا، وہ شخص تیزی سے چلتا ہوا ساحر سے ٹکرا گیا اور اس ٹکراؤ میں اس کے ہاتھ سے کچھ چھوٹ کر نیچے گرنا تو وہ جلدی سے تھمکا اور گرے ہوئے نوٹ میٹ لگا۔

ایک بل میں ساحر کو ساری صورتحال سمجھ گئی اس نے فوراً اس آدمی کو گریبان سے پکڑ کر اٹھایا اتنے میں حویلی سے کچھ لوگ بھاگتے ہوئے آئے اور اس آدمی کو پکڑ کر اندر لے گئے۔ ساحر بھی اسی افراتفری میں ان کے ساتھ حویلی میں داخل ہو گیا کہ دیکھتے تو سہی کہ کیا معاملہ ہے، شاید وہ دشمن جاں بھی دھماکی دے جائے۔

وہ سب ایک لمبی سی راہداری سے گزر کر ایک ہال کمرے میں داخل ہوئے، کمرے میں داخل ہو کر سب ادب سے کھڑے ہو گئے، ساحر بھی چپ چاپ ایک سائڈ پر کھڑا ہو گیا، چور اور رقم حیدر ملک کے سامنے پیش کئے گئے تو انہوں نے چور کو خود کچھ نہ کہا، تھانے فون کیا پولیس کو بلایا اور چور اس کے حوالے کر دیا۔ اس ساری کارروائی سے فارغ ہو کر ان کو جب پتہ چلا کہ چور کو ساحر نے پکڑا ہے تو وہ بہت شکر گزار ہوئے اور ممنون نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولے۔

”نوجوان بہت شکریہ کرتے کیا ہو کسی کے بیٹے ہو؟“

ساحر ان کے آدھے سوال کا جواب گول کر گیا اور

سہیلی کے ساتھ یونہی ٹپٹنے کو نکل تھی تو کسی بات پر فغا ہو کر سہیلی کے پیچھے بھاگی۔ سہیلی تو تیز بھاگنے کی وجہ سے نکل گئی مگر ماہین دوپٹہ جھاڑیوں میں الجھنے کی وجہ سے وہیں رک گئی۔ دوپٹہ ایسا الجھا تھا کانٹوں میں کہ نکلنے کا نام ہی نہ لے رہا تھا۔ ایسے میں ساحر سامنے آیا۔ دوپٹہ چھڑوانے میں اس کی مدد کی۔ ”آپ کا نام پوچھ سکتی ہوں؟“ ماہین نے دوپٹہ درست کر کے اوزر جھتے ہوئے کہا۔

”نام سے کیا فرق پڑتا ہے محترمہ، ویسے بندے کو ساحر کہتے ہیں اور آپ؟“ ساحر نے اپنا نام بتا کر اس کا نام پوچھا۔

”ماہین ملک۔“ مختصر سا جواب ملا۔ ساحر جیسے کھوسا گیا اس کی رعنائی میں۔ پھر ماہین نے کھنکار کر اس کو متوجہ کیا تو وہ جیسے ہوش کی دنیا میں لوٹ آیا۔ ”بہت اچھا نام ہے، آپ حیدر ملک کی بیٹی ہیں، پھر تو ہماری مالکین ہوئیں۔“

ماہین کی گردن احساسِ تقدیر سے آڑی گئی۔ حسن اگر مغرور نہ ہو تو عشق کبھی پائٹل نہیں ہوتا، پھر یہ تو صدیوں کی ریت ہے، نجانے کب سے چلی آ رہی ہے۔

ساحر اگر مردانہ وجاہت کا نمونہ تھا تو وہ بھی تو ہزاروں میں ایک تھی، طرہ یہ کہ وہ ایک معمولی کسان کا بیٹا اور ماہین مالکین، مالک بھی ملازمتوں کو شکر یہ نہیں کہتے، سودا بھی ساحر کو شکریہ کہے بغیر ہی چل دی۔

وقت گزرتا گیا اور ماہین ساحر کو بھول گئی، لیکن ساحر کے تو جیسے دل میں گھر کر گئی وہ اکثر اس ایک ملاقات کو سوچتا اور سوچتا ہی رہ جاتا۔ ”کتنی عجیب تھی وہ، کاش پھر متی، مگر کیوں ملتی، مل بھی سکتی ہے، لیکن کیسے؟“ وہ اپنی ہی سوچوں میں الجھ سا جاتا۔ وہ بہت بے چین رہنے لگا۔ ماہین کا چہرہ نگاہوں میں ایسا بس گیا کہ اسے کچھ اور نظر ہی نہ آتا، دن بہت بے چین اور راتیں جیسے جسم و جاں کو سلگانے لگی تھیں۔ وہ سوچتا رہتا کہ کیا کرے اس کو دیکھنے کی خواہش اتنی شدت پکڑ گئی کہ ایک دن قدم خود بخود اس کی حویلی کی طرف بڑھنے لگے۔ ان دنوں بارشوں کی وجہ سے سورج ٹھنڈا پڑ گیا تھا۔ اس لئے موسم خوشگوار تھا۔ سادون کا مہینہ، ایسے میں تو ہوائیں بھی

پیار جو حد سے بڑھ جاتا ہے
ہر اک شے میں نظر آتا ہے
”ہر اک شے میں نظر آتا ہے ہر اک شے میں نظر
آتا ہے۔۔۔۔۔ آواز اب بے شمع شور میں بدلی گئی۔ ”پیار جو حد
سے بڑھ جاتا ہے۔۔۔۔۔ پیار جو حد سے بڑھ جاتا ہے“ اوہ یہ
آواز، یہ شور، مایہن نے کانوں پر ہاتھ رکھ لئے، کرب سے
اس کی آنکھیں جیسے ابل پڑی تھیں، کانوں پر ہاتھ رکھنے کے
باوجود شور بدستور قائم رہا، وہ آواز مایہن کو ایک درد سے آشنا
کرتی تھی، ایسے درد سے جو اس کی روح کو چھلنی کر کے رکھ
دیتا، آواز میں ایسی شدت تھی جو مایہن کی برواشت سے باہر
تھی۔ اس نے شور کی شدت کو کم کرنے کے لئے کانوں پر
تکیہ رکھ لیا، پر شور تھا کہ کم ہونے کے بجائے بڑھتا ہی گیا، وہ

اسکے دن سورج طلوع ہوا اور معمولات زندگی کی



حد بندی

ساجدہ راجا - ہندواں سرگودھا

دو دوست ایک میدان سے گزر رہے تھے کہ اچانک دونوں میں سے ایک غائب ہو گیا۔ اس کی فلک شکاف چیخ سنائی دینے لگی۔ مگر اچنبھے کسی بات یہ تھی کہ وہ خود موجود نہیں تھا، وہ گیا تو کہاں گیا۔

انہونی اور حقیقت کو جھلانا اکثر زندگی کو غراب سے دوچار کر دیتی ہے۔ اس کا ثبوت کہانی میں ہے

ان دونوں کی عمر بالترتیب نو اور دس سال تھی اور اس چچی دوپہر میں وہ دونوں کپے آہٹوڑنے جا رہی تھیں۔ آٹم کے درخت ان کے گھر سے کچھ فاصلے پر تھے اور درمیان میں بالکل خالی میدان تھا جس کے بارے میں عجیب عجیب باتیں مشہور تھیں، اور ان درختوں تک جانے کے لئے اس میدان سے لازمی گزرنا پڑتا تھا، اس لئے آٹم کے درختوں تک کوئی نہیں جاتا تھا، لیکن وہ دونوں ہر بات سے بے نیاز چلی جا رہی تھیں، ان کا بھین ابھی ان باتوں سے بہرا تھا، انہیں بس وہ کپے آٹم ہی چاہئے تھے جنہیں وہ ہر روز لپٹائی نظروں سے دیکھتی تھیں، لیکن گھر والوں کی پابندی کی وجہ سے وہاں جاتے پائیں۔

”بد قسمتی یا خوش قسمتی سے آج دونوں کے گھر والے دوپہر کی نیند لے رہے تھے اور ان دونوں کو گھر سے نکلنے کا موقع مل گیا۔

Dar Digest [211] January 2015

کی روتی ہوئی آواز مسلسل آرہی تھی۔
 ”تم مجھے نظر کیوں نہیں آرہی۔“
 وحشت زدہ ہو کر اس پاس دیکھنے لگی۔
 ”رائی مسلسل روتی کو بلا رہی تھی اس کی روتی
 ہوئی آواز روتی کے اہ صاحب ہلا رہی تھی لیکن رائی اسے
 نہیں بھی نظر نہ آرہی تھی۔

”مجھے سہا لور دینی .. روحی .. روحی .. اور روحی
سراسیمہ سی اور زلی ہوئی وہاں سے بھاگ آئی اور گھر
والے اس کی حالت دیکھ کر دھک سے رہ گئے۔ سرخ
وشت زارہ چہرہ اور پھولا ہوا سانس اور سب سے خوفناک
وہ چیز جس نے گھر والوں کو حیران کر دیا وہ روحی نے سفید
بال تھے۔ اس کا سارا سر مکمل طور پر سفید ہو چکا تھا۔ جبکہ
وہ محض دس سال کی تھی اور پندرہ منٹ پہلے تک اس کے
بال سیاہ تھے، گھر آتے ہی وہ بے ہوش ہو گئی۔

اور سب اسے خوش آیا تو سب گھر والے سراپہ۔
 ستاس کے گرد وجود رہے اور کھر والوں نے پوچھنے پر اس
 نے روتے ہوئے سارا واقعہ اس کے گوش گزار کر دیا۔
 وہ سب رانی کے گھر دوڑے تاکہ ان کو مطلع
 کر سکیں۔ رانی کی ماں اور باقی گھر والے نئے پاؤں
 میدان کی طرف دوڑے لیکن وہاں خالی میدان ان کا
 منہ چڑھا رہا تھا۔

”اماں.. اماں.. مجھے اٹالو یہاں سے
مجھے چالو۔“ ران کی اعصاب شکن ہنسی بھڑکی آواز سے
سب کو ہلادیا۔

”تو کہاں ہے میری رانی۔۔۔ مجھے بتا۔۔۔“
 رانی کی ماں نے چلاتے ہوئے دکھ بھرے لہجہ میں کہا
 لیکن وہاں سے کوئی جواب نہ آیا بس۔۔۔“ اماں مجھے
 بتالو۔“ کی آوازیں ان کا دل لرزاتی رہیں۔

پورا دن اور رات گزر گئی لیکن کوئی سراغ نہ ملا،
کئی عامل آئے لیکن وہ بھی کچھ معلوم نہ کر سکے، چونکہ
آواز زیر زمین سے آرہی تھی، اس لئے وہ زمین بھی
کھودیں لگتی بہت گہرائی تک لیکن نثار..... رانی کی آواز
اگرچہ دھیمی ہو گئی تھی لیکن وقفہ وقفہ سے آرہی تھی۔

بڑے بڑے کچے آم، لٹکے دیکھ کر ان کی آنکھوں میں چمک آگئی اور انہیں میں پانی، نمک، سرخ لٹکا کر کچے آم کھانے کا اجناس مزہ تھا اور اسی مزے کو پانے کے لئے وہ گھروالوں کی پابندی سے باوجود گھر سے نکل آئیں۔

”جلدی پھلورانی۔ جلدی توڑ کے پھر واپس بھی آتا ہے۔“ مرانی بوہنے نام کی طرح باطنش رانیوں سے سی تھی تیز تیز قدم اٹھانے لگی۔

”تیرے پاس تک تو موجود ہے ناں؟“ رانی نے تصدیق کے لئے رومی سے پوچھا تو اس نے اثبات اور ہوش سے گردن ہلادی۔

”ہاں اگلے اور نمک میں زیادہ سرخ مرچیں بھی ڈال دی ہیں۔“

”واہ۔۔۔ آج تو مزہ آجائے گا۔ میرے ذمہ
میں تو ابھی سے پانی آگیا۔“ رانی نے خوشی سے چپکتے
ہوئے کہا اور وہ دونوں تیز قدموں سے میدان میں پھٹے
لیکس۔ گرم اور تیز دھوپ ان کا چہرہ جلائے دے رسی
تھی اور پینے بہ بہہ کر ان کے کپڑے سجود رہا تھا لیکن
جیس جیلا اس کی پرواہ کب تھی وہ تو اس جلدی سے پہنچے
آم تو زخرو میں بیٹھ کر کھانا چاہتی تھیں تاکہ کمر والوں کو
ان کی ذمہ داری کا علم نہ ہو سکے۔

دورِ نیت کے پاس پہنچ کر رانی جلدی سے اوپر
 چڑھ گئی اور کہے آہ تو ذکرِ نیچے پھینکتے تھی، ردِ جی نے جلدی
 سے انہیں اکٹھا کرنے لگی۔

”بس کر رانی کافی ہیں۔“ رانی بیٹے آگئی اور بھر پور دونوں مڑے سے آم کھانے لگیں اور جب پیٹ بھر گیا تو واپسی کے لئے قدم بڑھا دیے۔

”روحی..... روحی۔“ رانی کی تیز آواز پر روحی نے مڑ کر دیکھا اور دھک سے رہ گئی۔ رانی کہیں بھی موجود نہیں تھی۔

رائی..... تم کہاں ہو.....؟“ روجی نے خوف
زدہ آواز میں پوچھا۔ کیونکہ دور تک سوائے خالی میدان
کے کچھ نہ تھا۔

”روحی، خدا کے لئے مجھے بچالو، روحی۔“ رانی

پیالہ

ایک دفعہ کسی دعوت میں کسی امیر خاتون کا ہیروں کا ہار چوری ہو گیا۔ اس نے میزبان سے شکایت کی، میزبان نے اعلان کروادیا کہ ان محترمہ کا ہیروں والا ہار چوری ہو گیا ہے اور ہم ایک پیالہ بڑی میز پر رکھ دیتے ہیں اور جس صاحب کو ملا ہو اس پیالے میں رکھ دے، اور لائٹ آف کر دی تاکہ کوئی دیکھے نہ اور لائٹ آف کر دی گئی۔ تھوڑی دیر بعد جب روٹنی کی گئی تو میز پر سے پیالہ بھی غائب تھا۔ (انتخاب: محمد اسحاق انجم۔ ننگن پور)

بکری بائل سفید ہو چکی تھی جبکہ ”ابا ابا“ کی آوازیں مسلسل آرہی تھیں۔

”اکرم... اکرم بیٹے تم کدھر ہو...؟“ لیکن اس کی طرف سے کوئی جواب نہ آیا۔ ”ابا مجھے پہنلو۔“ کی تکرار اس کے دل کو لرزادی تھیں۔

کچھ دن پہلے ہونے والا رانی کا واقعہ اس کی نگاہوں میں گھوم گیا اور اس کا دل خشک پتے کی مانند کانپ گیا۔

”نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔ میرا اکرم غائب نہیں ہو سکتا۔“

لیکن جو ہوتا تھا وہ ہو چکا تھا اس کا اکلوتا ذلیل اس نے سامنے غائب ہو گیا اور وہ کچھ بھی نہ کر پایا۔ سب کو اس دل دوز دانے کی خبر ہو گئی اور اکرم کی تلاش زور و شور سے جاری ہو گئی۔ لیکن اکرم کو نہ ملنا تھا نہ ملا، تھک ہار کر سب چنکے ہوئے، وہ اور کبھی کیا سکتے تھے۔ لیکن بکری کے بال بھی روٹی کی طرح سفید ہونا ان کو جبران کر گیا۔ اکرم کے باپ کو پتہ بھی نہ چلا تھا کہ اکرم کب اس

دن پر دن گزرتے گئے، یہ واقعہ بہت پھیلا، بہت سے لوگوں نے رانی کا سراغ لگانے کی کوشش کی لیکن سب ناکام رہے۔ نہ جانے رانی کو زمین کھا گئی کہ آسمان نکل گیا اور پھر سب کی توجہ اس سے ہٹ گئی۔ رانی کی آواز اب آنا ختم ہو چکی تھی اور لوگ بھی کب تک وہاں رہتے، تلاش کا ہر حربہ ناکام ہو گیا تھا اس لئے سب نے چپ سا دھ لی، بس رانی کی ماں ہی تھی جسے خبر نہیں آ رہا تھا وہ ہر وقت اسی جگہ موجود رہتی اور رانی رانی بکارتی رہتی...! یقیناً وہ پاگل ہو چکی تھی...! یا ہونے والی تھی۔

اکرم کی عمر نو سال تھی اس نے بہانہ بنا کر اسکول سے چھٹی کی اور اب اپنے باپ کے ساتھ کھیتوں کی طرف جا رہا تھا، ساتھ میں بائیں کر کے باپ کا دل بھی بھارا ہوا تھا۔

اکلوتا تھا سو خوب اڈا اڈا تھا اور کبھی کبھی اس اڈا کا بہت اچھی طرح فائدہ اٹھاتا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں اس کی پیاری بکری لی رہی تھی وہ اپنی اس بھورے رنگ کی بکری سے بہت پیار کرتا تھا اور اسکول کے علاوہ ہر وقت اسے اپنے ساتھ چپکانے رکھتا بلکہ بکری بھی اس سے بہت مانوس تھی جب تک وہ اسکول سے نہ آتا، میں میں کرتی رہتی اور جب اسے اکرم نظر آتا وہ میں میں کر کے گھر سر پر اٹھاتی اور اکرم کی طرف لپکتی۔ سب کو اکرم کے ساتھ اس کی دانستی کا پتہ تھا۔

اب بھی اپنے باپ کے ساتھ بائیں بھارنے کے علاوہ وہ گاہے بگاہے بکری کے سر پر ہاتھ پھیر رہا تھا وہ ہلکا سا منہ کر اپنی خوبی کا اظہار کرتی اس کے ساتھ چلتی آرہی تھی۔

وہ میدان کے پاس پہنچ چکے تھے۔ اکرم کا باپ اس سے تھوڑا آگے چل رہا تھا۔

”ابا... ابا“ کی پکار اور بکری کی زور کی منشاہٹ پر اکرم کے باپ نے ہانک کر پیچھے دیکھا اور اس کی آنکھیں حیرت سے پھٹنے کے قریب ہو گئیں۔

اکرم غائب تھا اور اس کی بھورے رنگ کی

خوف محسوس ہونے لگتا۔

اک عامل نے اس دوران دعویٰ کیا کہ وہ ایسا
کل کرے گا کہ اس جگہ کی پر اسراریت کھل جائے گی
اور جو کچھ بھی ہو گا وہ سامنے آ جائے گا۔

لوگوں کے خوفزدہ دلوں کو کسی حد تک چھین آ گیا۔
لیکن پھر بھی وہ خوفزدہ سے تھے خوف اتنی آسانی سے
کہاں چھپا چھوڑتا ہے...؟؟ بالکل اسی طرح جیسے
انسان کے کئے گئے گناہ اس کا پیچھا نہیں چھوڑتے۔ لاکھ
معافیاں مانگی جائیں ان گناہوں کا عکس زمین کے
پردے پر موجود رہتا ہے ہم لاکھ بھوانا چاہیں لیکن گناہ
اپنے مالک کو نہیں بھولتے وہ کسی نہ کسی صورت اپنے مالک
تک پہنچ جاتے ہیں بالکل اسی طرح جب خوف دل میں
پہنچے گا زہر کریمہ جاتا ہے تو آسانی سے پیچھا نہیں چھوڑتا۔
ایسا ہی حال اس علاقے کے لوگوں کا تھا اس
عامل کے دعوے کے بعد وہ کسی حد تک ناول ہو پائے
تھے دن کسی انہونی کا خطرہ ہر وقت دل دھڑکا تا
رہتا۔ !!! اور پھر اس عامل کا دعویٰ کسی حد تک سچا نکلا۔

پورے تین دن اس نے کوئی کل پڑھا تھا اور جب
کسی حد تک اسے اس جگہ کے اسرار کا پتہ چلا تو اس کی رنگت
بادی کی طرح پیلی ہو گئی جیسے کسی نے یکدم اس کا سارا خون
نچوڑ لیا ہو۔ اس کا جسم کانپ رہا تھا بالکل کسی خشک پتے کی
مانند اور اس کی یہ حالت دیکھ کر لوگ غش کھانے کے قریب
ہو گئے۔ اور بہت دیر بعد جا کر عامل کی حالت کچھ بہتر ہوئی
تو اس نے ذرتے ذرتے صرف اتنا بتایا۔

”وہ دونوں بچے واپس آ جائیں گے اگر وہ واقعی
بچے ہوئے تو...؟“ کسی کو عامل کی بات کی سمجھ نہ
آئی۔۔۔ وہ بولتا رہا۔

”ہاں میرے بعد اتنا کرنا کہ اس جگہ کے گرد
ایک مضبوط حد بندی قائم کر دینا ورنہ اس جگہ کا دائرہ
پھیلنے پھیلے پورے علاقے پر محیط ہو جائے گا اور پھر کوئی
بھی نہیں بچے گا اور اب میں بھی نہیں بچوں گا کیونکہ اس
جگہ کا اسرار مجھ پر کھل چکا ہے اور جس پر اس جگہ کا مجید کھل
جائے پھر وہ اس جگہ کا کلین بن جاتا ہے یا بننے پر مجبور

میدان کی حدود میں داخل ہو اور وہ است ضرور دکتا۔
رائی کی طرح اس کی آواز میں بھی سنائی دیتی
رہیں اور مدھم ہوتے ہوئے غائب ہو گئیں۔ پورے
علاقے میں خوف اپنے پہنچے گا زکر بیٹھ گیا جیسے وہ علاقہ
اس کی ملکیت ہو۔ ایشیت اس علاقے میں یوں راج
کرنے لگی جیسے وہاں انسانوں کا بسیرا ہی نہ ہو۔ خاموشی
نے آوازوں کو شکست دے دی گویا وہ لوگ کبھی بولے
ہی نہ ہوں اور ہنسے تو جیسے صدیاں بیت گئی تھیں، عجیب
خوف و ہراس نے اس علاقے کو اپنی لپیٹ میں لیا ہوا تھا
لوگ ڈرے ڈرے سہرے رہنے لگے، گھروں سے باہر جانا
کم ہوتا اور اس میدان کے پاس تو بالکل ختم۔

بچوں کو خوفناک کہانیاں سنا کر یوں ڈرائیا کہ وہ
اس میدان کا نام سننے ہی کا پٹنے لگتے اور یہ ان کے لئے
ٹھیک بھی تھا۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ دونوں غائب
ہونے والے بچوں کی عمریں نو سال تھیں اور ان کے
ساتھ موجود جاندار کے بال سفید ہو گئے، چاہے وہ
جاندار انسان ہوں یا جانور۔

بہت سے عامل آئے لیکن کوئی فائدہ نہ ہوا ان
کا کل ایک حد سے آگے نہیں بڑھتا تھا صرف اندھیرا
ہی اندھیرا نظر آتا تھا۔ کالے لم دا لے بھی آئے بہت
سے توڑ کئے۔ بہت سے چلے گئے۔ بہت سی بھینٹیں
دیں، لیکن سوائے اندھیرے کے کچھ نظر نہ آیا۔ وہ
ماپوس لوٹ گئے، سب کو صبر آ گیا سوائے ان بچوں
کے والدین کے۔ وہ تو جیسے میدان کے پاس ڈیرا
ڈال کے بیٹھ گئے اور اس جگہ کو سکتے رہتے جہاں ان
کے بچے غائب ہوئے تھے۔

اور اس دوران انہوں نے ایک بات نوٹ کی
کہ ہر رات درجنوں کے حساب سے کھیاں اس جگہ
بھینٹنا رہتیں لیکن وہ کھیاں جسامت میں عام کھیوں
سے بہت بڑی تھیں اور ان کی آواز کانوں کے پردے
چھاڑتی معلوم ہوتی تھی۔ دن کو ان کا نام و نشان بھی نہ
ہوتا لیکن آدھی رات کو وہ نہ جانے کہاں سے آن موجود
ہوتیں اور ان کی تعداد اتنی زیادہ ہوتی کہ ان کو دیکھ کر

اقوال

کوشش کرو کہ آپ دنیا میں رہو دنیا آپ میں نہ رہے کیونکہ جب تک کشتی پانی میں ہوتی ہے تو خوب تیرتی ہے لیکن جب پانی کشتی میں آ جاتا ہے تو کشتی ڈوب جاتی ہے۔ (حضرت علی)

(انتخاب: ایس حبیب خان۔ کراچی)

عجیب بد ہیئت سا بننا رہی تھیں۔ حتیٰ کہ ان کے والدین بھی ٹھک گئے لیکن پھر ان کے والدین لپک کر بے قراری سے ان تک گئے اور زور زور سے روتے ہوئے ان کو اپنے ساتھ لپٹا لیا لیکن وہ دونوں بے حس و حرکت کھڑے رہے اور منہ سے کچھ نہ بولے، ان کو گھر لے جایا گیا کھانا پیش کیا، وہ سارے کام کسی رو بوٹ کی مانند کرتے رہے۔

لیکن ان کی ناہوشی نہ ٹوٹی ان کے بوز سے چہرے سب کے دل میں خوف بھرتے رہے لیکن ان دونوں کو کسی بات سے غرض نہ تھی۔

پھر اسی دن لوگوں نے عامل کی بتائی ہوئی جگہ پر دیوار تعمیر کر کے ایک حد بندی قائم کر دی اور خاصی حد تک مطمئن ہو گئے لیکن جب جب وہ رانی اور اکرم کو دیکھتے ان کا خوف پھر سے عود کر آ جاتا۔ !!

وقت گرتا رہا اور پھر اکتالیسویں شب گزر گئی۔ صبح کے وقت لوگوں نے دیکھا تو رانی اور اکرم دونوں اپنی اپنی جگہ راکھ کے ڈھیر کی صورت میں پڑے تھے۔ ایسا کیوں ہوا یہ ایک راز ہی رہا جس نے لوگوں کو حیران کر کے رکھ دیا تھا۔ پھر اس حد بندی کی وجہ سے کوئی بھی غائب نہ ہوا۔



کر دیا جاتا ہے اور میں بھی مجبور کر دیا گیا ہوں اور اگر میں نے آپ کو اس جگہ کا بھید بتا دیا تو پھر تم سب کو اس جگہ کا کین ہونا پڑے گا اور اس جگہ کا کین ہونے سے بہتر ہے انسان خودکشی کر لے اور موت کو گلے لگا لے۔۔۔۔۔

پھر وہ عامل اٹھا اور اس جگہ کے گرد نشانی لگائی۔ ”اس جگہ حد بندی کرنا بالکل نہ بھولنا ایک مضبوط دیوار اس کا عمدہ حل ہے۔ دیکھو آج ہی سے حد بندی کر دو جو تمہیں کل کے نقصان سے بچائے گی۔ میری بات کو بھولنا مت کیونکہ یہ بات نظر انداز کرنے کے بالکل قابل نہیں کیونکہ جو کچھ میں جان چکا ہوں اگر تمہیں معلوم ہو جائے تو ایک لمحہ بھی اس جگہ نہ رکو۔ فوراً نکل کر دو اور دیوار بنانے کا کام ابھی سے شروع کر دو۔“

کچھ لوگوں نے فوراً نکل کیا اور وہاں سے چلے گئے تاکہ ضرورت کا سامان دیوار بنانے کے لئے آلیں۔ ان کو گئے کچھ ہی دیر ہوئی تھی کہ ایک دل لرزا دینے والی بات ہوئی۔

جس جگہ وہ عامل کھڑا تھا وہاں سے ملکا سا دھواں اٹھا اور عامل کو اپنی پیٹ میں لے لیا اور پھر لوگوں نے جو منظر دیکھا وہ نہایت دہشت زدہ کر دینے والا تھا۔ عامل کا قد چھوٹا ہوتا ہوتا ہوتا ایک بالکل نو سال کے بچے کے برابر ہو گیا۔ اور پھر اس کے منہ سے دلہ وز ٹکٹی جیچوں نے سب کو ساکت و ہلا کر دیا۔

پھر پھر عامل بھی اکرم اور رانی کی طرح غائب ہو گیا۔ لیکن اس کی چھین سسل سنائی دیتی رہی اور پہلے والے واقعے کی طرح دم مہم ہوتے ہوئے غائب ہو گئیں۔ !! اور پھر ایک اور دلہ وز واقعہ پیش آیا جس نے سب کے ساکت وجود میں حرکت بھردی۔

کچھ عرصہ پہلے غائب ہونے والے اکرم اور رانی ان کے سامنے کھڑے تھے۔ لیکن کس حالت میں۔۔۔۔۔؟

ان کے جسم تو نو سالہ بچے جیسے تھے لیکن ان کا چہرہ۔۔۔۔۔؟ اوہ خدایا۔۔۔۔۔ ان کا چہرہ کسی نوے سالہ بوڑھوں جیسا تھا سفید بال، سفید بھنویں جو کہ ان کو

قلبی اذیت

نور محمد کاوش - سرگودھا

اکثر احکام خداوندی سے جہنم پوشی، برہمنی، سفاکی اور سنگدلی انسان کا عدوت کا نشان بنا کر حقارت کا مجسمہ بنادیتی ہے اور کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا کہ اس کے ساتھ ایسا بھی ہو سکتا ہے کہاسی ہڑھ کر تو دیکھیں۔

مقلد شعور کو حیرت میں ڈالتی اور حقیقت سے روشناس کراتی دل کو چھوٹی روداد

میں رکھا ہوا تھا۔ وہ بھی اس نے رکھا اور براجمان ہوئی مگر جب شکر براجمان نہ ہوا اور اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ تو میں سے پوچھا کہ

”اے ایسا بھی کوئی نہیں ہے یہ لڑا کہ میری بات کا جواب تک دینے کی توفیق نہیں ہو رہی۔“

اب کی بار شکر نے اس کی سست گردن مٹھائی اور اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

”دیکھتی نہیں کوئی راہ گیر ہے۔ مگر جو بھی ہے میری طرف ہی آ رہا ہے یہاں کوئی آبادی و ہادی تو ہے نہیں اور اپنے گاؤں سے گزر کر سیدھا اسی طرف آ رہا ہے مطلب یہ ہوا کہ اسے مجھ سے ہی کوئی کام ہے۔“

ان کی اتنی باتوں کے درمیان وہ نو جوان ان کے قریب پہنچ چکا تھا۔ تھکے تھکے نقش کا مالک وہ نو جوان چنداں سانولے رنگ کا تھا۔ شاید کلین شیوہ و اتنا تھا مگر اب تھوڑی تھوڑی داڑھی مونچھوں کے بال باہر جھانک رہے تھے۔ کشادہ پیشانی تھی اور ہلکے نیلے رنگ کی آنکھیں۔ جن میں گہرا تجسس پایا جاتا تھا۔ وہ سیدھا شکر کے پاس آیا اور آتے ساتھ دونوں کو ہاتھ جوڑ کر پر نام کیا۔ شکر نے تو نہایت ہی خوش اخلاقی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس کے پر نام کا جواب دیا جبکہ

شکر اس وقت اپنی زمینوں میں کام کر رہا تھا۔ جب اسے اسے ہی ایک ٹک سی پگھلے پڑی۔ ایک نو جوان اپنی طرف آتا دکھائی دیا۔ اتنی تیزی دھوپ میں وہ پیچھے تیز تیز قدم اٹھاتا اسی کی سست پک رہا تھا۔ شکر کو تجسس ہوا تو اس نے کام پھوڑا اور قریب ہی ایک گھنے درخت کی چھاؤں میں جا کر کھڑا ہو گیا۔ مگر اس کی نگاہیں بدستور اسی نو جوان پر مرکوز رہیں۔ دوسری طرف اس نو جوان کی نگاہیں بھی اسی پر لگی ہوئی تھیں۔

ادھر دوسری طرف اس کی تپتی دہچکا کھانا لے آئے اور وہ رہی۔

”اتنی کی بات ہے بہت پریشان دکھائی دے رہے ہو، کوئی پریشانی ٹوٹ پڑی ہے کیا۔۔۔؟“ اس نے آتے ساتھ ہی اس سے پوچھا اور پھر اس کی نظروں کے تقاب میں دیکھتے ہوئے بولی۔ ”اتنی کون ہے یہ کیا کوئی دور دور کا برادری کا چھوٹا ہے جسے اسنے لگاؤ کے ساتھ دیکھے چلے جا رہے ہو؟“

ساتھ لائی درخت اس نے زمین پر بچا دی اور چنگیر میں رکھی ایک میلے میلے کپڑے میں لپٹی روئیاں نکال کر سامنے رکھیں۔ سالن ایک چھوٹے سے برتن



لے لے گا۔ جانتے نہیں کتنا ظالم قسم کا انسان ہے وہ۔۔۔۔۔۔ اس نے ایک نظر لیے لیے ڈنگ بھرتے اس نوجوان کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”تم چھوڑو ان باتوں کو ایسی باتیں تمہاری عقل میں آنے والی نہیں ہیں۔ میں نے کوئی جھوٹ کا مظاہرہ نہیں کیا۔ ایثار جانتا ہے کہ میں نے جو کچھ بھی کہا ہے وہ سچ ہے اور ایثار کبھی بھی مجھے اس کی نظروں میں گرنے نہ دے گا۔۔۔۔۔۔“ شکر نے نوالہ توڑ کر منہ میں ڈالتے ہوئے کہا۔

”مگر تمہیں کیسے معلوم یہ سب۔۔۔۔۔۔؟“ اس کی جتنی کی حیرت میں ابھی تک کوئی کمی واقع نہ ہوئی تھی۔ وہ ابھی تک اپنے سوال پر ڈٹی ہوئی تھی۔

”تم اس بات کو چھوڑو یہ بتاؤ تم نے اس نوجوان سے ایسا رویہ کیوں اپنایا کیا تمہیں نہیں معلوم کہ مہمان ایثار کا بھیجا ہوا ہوتا ہے۔“ شکر ایک بار پھر نفرت بھرتے انداز میں جتنی کو دیکھتے ہوئے بولا۔

”اجی میری بات سن لو۔ مجھ سے نہیں ہوتی یہ مہمان نوازیاں۔ اتنی گری میں اپنے لیے کچھ پکانا جان جو کھوں میں ڈالنا ہوتا ہے دوسروں کے لیے کیسے پکاؤں ایک بار خود پکاؤں اپنے ان مہمانوں کے لیے تو ہوش نہ کھانے آ جا میں گے۔ ساری مہمان نوازی اکل جائے گی۔ تم لوگ کرتے ہی کیا ہو سارا سارا دن تو ہمیں چل خوار ہونا پڑتا ہے۔ خود تو حرے سے پکی پکائی کھانے گھوڑے گدھے سب کچھ بچ کے سوتے ہو۔ سارا دن کام کر کر کے میرے پورے جسم میں درد کی بیسیں اٹھتی ہیں بھی پوچھا تک نہیں۔۔۔۔۔۔ اس کی بات سنتے ہی اس کی جتنی نے ایک بار پھر اپنا پرانا طرز عمل اپنایا تو اب کی بار اسے بھی نصرا گیا۔

خوف کھاؤ۔ ایک کھانا ہی پکاتی ہو تم اور کرتی ہی کیا ہو۔ کون سے پہاڑ ہیں جو توڑتی ہو سارا۔ یہاں ایک دن ان کھیتوں میں کام کرو عقل نہ کھانے لگ جائے گی تمہاری۔ لے جاؤ اپنا یہ کھانا مجھے نہیں کھانا۔۔۔۔۔۔ اس نے ہاتھ میں پکڑا نوالہ چنگیر میں رکھی

کو غصہ دراز بیت چکا ہے مگر اولاد جیسی نعمت سے محروم ہے۔ ڈاکٹر، حکیم، پنڈت ہر جگہ سے چپک اپ کر دیا چکا ہے۔ مگر بے سو۔ وہ اب اس نعمت سے محروم ہے اور یہی سمجھتا ہے کہ اس کی تقدیر میں اولاد جیسی نعمت نہیں ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ اس کی قسمت میں نہایت فرمانبردار اولاد لکھی ہے۔ اس کو اولاد کیوں نہیں ہو رہی اس کی ایک خاص وجہ ہے۔

اس کی نسل نیا حویلی کے من گیت کے بالکل سامنے ایک جادو کی کھوپڑی دفن ہے۔ جب تک اس کھوپڑی کو وہاں سے نکال کر گنگا میں ڈالا نہیں جائے گا۔ اور جب تک چالیس دن تک اس حویلی میں غرباء کو کھانا نہ کھلایا جائے تب تک اس شخص کو اولاد نہ ہوگی۔ تم جاؤ اور اسے اس حقیقت سے آشنا کرو۔

جب وہ ان باتوں پر یقین رکھے گا تو ایثار اسے فرمانبردار پتر سے نوازے گا۔ جیسے ہی وہ بچہ پیدا ہو۔ تم نے اس بچے سے ملاقات کرنی ہے۔ اس بچے کے پاس ڈھیر ساری صلاحیتیں موجود ہوں گی۔ تم نے اسے مخاطب کر کے اس سے یہی سوال کرنا ہے کہ میں نیکی اور بدی میں فرق جاننے کا متنی ہوں تمہارے اس سوال کا جواب وہی دے گا۔ اب تم ایثار کا نام لے کر یہاں سے چلے جاؤ، بہت جلد تمہیں تمہارے سوال کا جواب مل جائے گا۔“

شکر کی بات سن کر اس کی جتنی کی حیرت سے آنکھیں پھیل گئیں یہی نہیں اس نوجوان کی کیفیت بھی کچھ ایسی ہی تھی۔ دونوں چینی چینی آنکھوں سے اس کی باتیں سن رہے تھے۔ نوجوان نے مزید کچھ کہے سے بنا ایک بار پھر کھڑا ہو کر نہایت ہی ادب و احترام سے پر نام کیا اور چلتا ہٹا۔ اس کے وہاں سے چلتے ساتھ ہی حیرت کے سمندر میں غوطہ زن اس کی جتنی نے اسے مخاطب کیا۔

”اجی ایک بات تو بتاؤ ان سب باتوں کا تم کو کیسے پتہ۔ تم جانتے ہو کہ اگر تمہاری باتوں میں جھوٹ کا عنصر ہو تو اس بے چارے کی تو ٹھاکر بلرام جان ہی

”کیا تم میرا پیغام ٹھاکر صاحب تک پہنچا سکتے ہو۔ مجھے ایک نہایت ہی ضروری کام کے سلسلے میں ان سے ملاقات کرنی ہے۔۔۔۔۔“ جواب میں دیہاتی نے کچھ کہنے کی بجائے اسے وہیں انتظار کرنے کا کہہ کر خود اندر چلا گیا۔ جلد ہی اس کی واپسی ہوئی۔

”آئیے تشریف لائیے۔۔۔۔۔“ اس نے اندر سے ہی اس کے سامنے ہوتے ہوئے کہا۔

جو اب انہی جوان اندر داخل ہو گیا۔ وہ بہت احتیاط سے قدم رکھ رہا تھا۔ دیہاتی نے اس بات کو بہت قریب سے نوٹ کیا۔ نو جوان یوں پھونک پھونک کر قدم رکھ رہا تھا۔ گویا اپنے ہم پایا گیا ہو جس پر پاؤں اترتے ہی اس کے پرچے اڑ جائیں گے۔ دیہاتی نے ایک بار اس کی طرف ہوا۔ نظروں سے دیکھا اندر درگرمی سے بولا کچھ نہیں۔

شاید وہ اس نو جوان نے چنداں سمجھ لیا تھا۔ موند لیٹنے میں آیا ہے کہ دیہاتی لوگ شہری لوگوں سے بات کرتے ہوئے بہت تنگنا کرتے ہیں۔ اکثر تو شہری لوگوں کے سامنے بات کر ہی نہیں سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ دیہاتی لوگ شہری زندگی میں خود کو ٹھیک سے ایڈجسٹ نہیں کر پاتے۔ ان کی اسی تنگی پرست کی وجہ سے ان کی پود پر بھی خربوزے کو کچھ کر خربوزے والا رنگ چڑھتا ہے۔

”جی اس سامنے والے کمرے میں ٹھاکر صاحب آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔۔۔۔۔“ اس نو جوان نے اب کی بار نہایت ہی شائستہ اور مدہم لہجے میں کہا۔ اس کے اس انداز پر وہ نو جوان زیر لب مسکرایا اور اندر داخل ہو گیا۔ اندر کا منظر دیکھ کر اسے حیرت ہوئی۔ یہ سینگ روم تھا۔ جسے نہایت ہی قیمتی سامان سے مزین کیا گیا تھا۔ شاید ٹھاکر بلرام کو شہری طور طریقوں سے آگاہی تھی۔ اس نو جوان نے حیرت سے چار سمت ایک نگاہ دوڑائی تھی اس کی نگاہیں سامنے صوفے پر نہایت ہی شان و شوکت سے براہمان ٹھاکر سے ٹکرائیں جس کی نگاہیں اسی پر مرکوز تھیں۔

ایک روٹی کے اوپر پھینکا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

”ہاں ہاں کچی بات تو ہمیشہ کڑوی ہی لگتی ہے نہ کھانا یہ نہ کھانا بھار میں جاؤ۔۔۔۔۔“ اور نیا اور نیا اول ذیل کچی چتی کی باتیں سن اس کی آنکھیں نم آلود ہو گئیں اور وہ بے دلی سے چلتا ہوا اس کی کھیت کی طرف چل پڑا۔ جس میں وہ نو جوان کے آنے سے قبل کام کر رہا تھا۔

نو جوان نے راستے میں کہیں رانا مناسب نہ سمجھا۔ اس کی سپڈ اتنی تیز تھی کہ سمجھنے کی بجائے وہ چالیں بینتالیں منٹوں میں اس دیہات میں پہنچ گیا تھا۔ ایک دیہاتی سے پوچھنے پر اسے ٹھاکر بلرام کی حویلی کا پتہ مل گیا۔ پورے گاؤں کے اندر اس کی حویلی واقعی قابل دید تھی۔ جیسے ہی وہ حویلی کے صدر دروازے پہ پہنچا ایک دیہاتی اندر سے دڑتا ہوا اس کی طرف آیا۔ صدر دروازے کے ساتھ والا پتھر دار دروازہ ملا ہوا تھا۔ جس میں سے دیہاتی نے اسے آتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔

لیو، ہیز اور ہاف واٹ سٹرٹ والا شہری بابو تھا۔ اس لیے فوراً دڑتا ہوا اس کے پاس آیا۔

”شہری بابو کتے تو تم۔۔۔۔۔“ اس نے آتے ساتھ ساتھ پوچھا۔ ”کس سے ملنا ہے؟“

”مجھے ٹھاکر بلرام صاحب سے ملنا ہے۔۔۔۔۔“ اس نے اس کی طرف دیکھنے کی بجائے اندر جھانکتے ہوئے کہا۔

”مگر کس سلسلے میں۔۔۔۔۔؟“ دیہاتی نے ایک اور سوال دینا۔

”یہ میں انہیں ہی اپنی آمد کی وجہ بتا سکتا ہوں۔۔۔۔۔“ اس نے اب پہلی بار اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا تو وہ دیہاتی تھوڑا ہچکچایا۔

”بھڑ بھی کچھ پتہ تو چلے۔۔۔۔۔؟“ دیہاتی متواتر اپنی بات پر قائم قائم تھا۔

ملیں گی۔۔۔۔۔ اس سے قبل کہ نوجوان مزید کچھ بولتا
ٹھا کر کا چہرہ غصے سے لال پیلا ہو گیا اور اس نے
کہا جانے والی آنکھوں سے نوجوان کو دیکھا۔
”اگر مزید کچھ کہا تو تکہ بولی ایک کردوں اب
مزید کچھ کہے سنے بغیر یہاں سے چلتے ہو۔۔۔۔۔“
ٹھا کر بلرام نے تقریباً گرجتے ہوئے کہا۔ ایک بار تو اس
کی بات سن کر اس نوجوان کے پیروں تلے زمین ٹل گئی
مگر بیلہ ہی اس نے اپنے حواس پر قابو پالیا۔
”اگر میری کسی بھی بات کے اندر جھوٹ
ہو تو فوراً سے بھی چشتر میرا سر کاٹ کر دیا جائے۔ مگر ایک
بار آپ میری بات سن لیں گے تو کیا ترجیح
ہوگا۔۔۔۔۔؟“ نوجوان نے سوالیہ آنکھوں سے اس کی
طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
”تم جانتے ہو تم کیا کہہ رہے ہو۔۔۔۔۔؟“
ٹھا کر بلرام نے اس کی طرف غصے سے دیکھتے ہوئے
کہا۔ ”اگر تمہاری کسی بات میں جھوٹ کا عنصر ہو تو میں
حقیقت میں فوراً تمہارا سر کنواؤں گا۔ معافی کی کوئی
مغنیائش نہ ہو گی تمہارے لیے۔“
”مجھے سب قبول ہے۔۔۔۔۔“ نوجوان نے مانی
بھرتے ہوئے کہا۔
”ٹھیک ہے بولو۔۔۔۔۔“ اب کی بار ٹھا کر
کاٹا تھاٹھکا سے تردد ہو تو اس نے اب کی بار چنداں
نرم لہجے میں کہا۔
”آپ کے من دروازے کے سامنے ایک
کھوپڑی دفن ہے۔ جو عرصہ دراز قبل کسی طرح زمین
کے نیچے کسی دشمن نے دفن کیا تھا۔ اسے پہلے آپ
باہر نکالے باقی بات میں آپ کو بعد میں بتاؤں
گا۔۔۔۔۔“ نوجوان کی بات سن کر ٹھا کر نے ہنسی
اچکائیں اور جانے کیوں اسے اب کی بار نوجوان کی
باتوں میں سچائی دکھانی دی۔ تو وہ فوراً اپنی جگہ سے
کھڑا ہو گیا اور کمرے سے باہر نکلا تو نوجوان بھی اس
کے ساتھ باہر نکلا۔
باہر نکلنے کی دیر تھی کہ کچھ دیہاتی جو اس کے

نوجوان نے آگے بڑھ کر اس سے مصافحہ کیا
۔ ٹھا کر نے زیر لب مسکرا کر اس کے پر نام کا جواب
دیا۔ لیکن اس نوجوان نے دیکھا کہ یہ مسکراہٹ ایسی
تھی جیسے ہونٹوں نے کرب کے انداز میں کر دت
بدلی ہو۔ گنت دشمنوں سے قبل ہی ایک فوریہ و شیرہ
ایک جگہ میں دودھ میں کوئی ٹھنڈا شربت ڈالے
آں وارد ہوئی۔ گری کی شدت نے نوجوان
کو تھکائے رکھ دیا تھا۔ بھوک، پیاس سے اس
کا برا حال تھا۔ وہ ایک ساتھ تین گلاس شربت کے
حلق میں انڈیل گیا۔
ٹھا کر بلرام بدستور است دیکھ رہے تھے۔ ٹھٹھے
اور ٹھنڈے شربت کا پیٹ میں جانا تھا کہ کچھ جان میں
جان آئی۔ اس نے تعریفی نظروں سے ٹھا کر کی طرف
دیکھا۔ وہ دو شیرہ برتن اٹھا کر وہاں سے چلتی بنی۔ تو
ٹھا کر نے اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا مگر نہ
سے بوا اچھ نہیں۔
نوجوان نے ایک گہری نگاہ ٹھا کر پر ڈالی۔ کشادہ
چہاتی اور نہایت ہی خوب روئین نقش کا وہ مالک تھا۔ اس
کی بڑی بڑی مونچھیں اس کے چہرے کے رعب
و دب۔ اور جلال میں مزید اضافہ کر رہی تھیں۔ اس نے
نیپوٹی نیپوٹی واڑھی رکھی ہوئی
تھی۔ واڑھی ہو چھوٹی ہنڈوؤں اور سر کے بالوں میں
سفیدی کی جھلک واضح دکھائی دے رہی تھی۔
”میں یہاں ایک نہایت ہی اہم کام سے
آیا ہوں ٹھا کر صاحب۔۔۔۔۔ اس نے ٹھوک بھگتے
ہوئے اب کی بار ٹھا کر کو مخاطب کرتے ہوئے
کہا۔ ”شاید آپ کو میری بات سن کر غصہ ہو مگر یہ
حقیقت ہے جو میں آپ پر عیاں کرنے آیا ہوں۔“
”تم کھل کے بات کرو جو بھی کہنا چاہتے
ہو۔۔۔۔۔“ ٹھا کر نے باتیں ٹانگ اٹھا کر دائیں
ٹانگ پر دھر کر اس جہنم دیتے ہوئے کہا۔
”میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ آپ کے ہاں
جلد ایک ایک لڑکا پیدا ہوگا جسے دھیر ساری ملا جلی

شاید ملازم تھے دوڑ کر اس کے سامنے آن کھڑے ہوئے۔

”فوراً کدالیں اٹھاؤ۔۔۔۔۔“ ٹھاکر نے ان کی طرف دیکھے بناروازے کی طرف چلتے ہوئے کہا۔ انہوں نے جواباً کچھ کہا تو نہیں لیکن ان کی پیشانیوں پر بہت سے سوال ابھرتے تھے۔

ٹھاکر کے حکم کے مطابق اس کے ملازم کدالیں لے کر آگئے اور کھدائی شروع ہو گئی۔ اب کی بار نوجوان کو دمچکاگا کہ اگر یہاں سے کوئی کھوپڑی نہ نکلی تو ٹھاکر فوراً اس کا سر کٹا دے گا۔ ایسے پرہیز انسان سے مسانی کی توقع رکھنا ہی بے وقوفیت تھا۔ نوجوان کا دل زور زور سے دھک دھک کر رہا تھا۔ ٹھاکر کی آنکھیں مٹی اتر اسی پر جمی ہوئی تھیں۔ کبھی کبھی وہ تیزی سے کدالیں چلاتے اپنے ملازمین کو طائرانہ نظروں سے دیکھ لیتا تھا۔ جبکہ نوجوان کی ہڈیوں میں متواتر کھوہی جانے والی جگہ پر لگی ہوئی تھیں اس نے ایک بار بھی ٹھاکر کی طرف نہ دیکھا۔ اس کی حالت تو ”کانو تو بدن میں ہونے ہو“ والی ہو چلی تھی۔ بھی ٹھاکر کا ایک ملازم تقریباً چلاتے ہوئے ہوا۔

”ٹھاکر صاحب یہ دیکھیے یہاں پر ایک کھوپڑی ہے۔۔۔۔۔“ اپنا کٹ ٹھاکر نے بے یقینی کی کیفیت سے دوچار ہو کر اس ملازم کے ہاتھ میں کھوپڑی کو دیکھا۔

نوجوان کی سانس میں سانس آئی تو اس نے نہایت ہی تکبرانہ انداز میں ٹھاکر کی طرف دیکھا۔ ٹھاکر دل کی اتھاہ گہرائیوں سے اس کا گرویدہ ہو گیا اسے اس کی بات سچی معلوم ہونے لگی کہ وہ بہت جلد ایک حسین و جمیل چاند سے بیٹے کا باپ بنے گا۔ جو خواب برسوں سے وہ دیکھتا چلا آرہا تھا جس کو حقیقت میں بدلنے کے لیے اس نے بہت پر تو لے تھے مگر ناکامی نے اس کا منہ چڑھایا تھا۔ اسے آج وہ خواب حقیقت کا روپ دھارنا ہوا نظر آیا۔

”ٹھاکر خوف سے کھوپڑی کو دیکھنے لگا پھر ہوا۔

”اسے لے جا کر گنگا میں ڈال دو۔“

ٹھاکر صاحب اور کتنا کھو رہا ہے۔۔۔۔۔“ اپنا کٹ ایک ملازم کی بازگشت اس کی قوتِ سماعت سے ٹکرائی تو وہ یوں چوٹا کیجے سو یا ہوا انسان اپنا کٹ پونک کر اٹھ بیٹھتا ہے۔

”نہیں بس کرو بلکہ ایسا کرو اس مٹی کو اب اس گڑھے میں بھر کے اچھی طرح سے گڑھے کو بند کر دو۔۔۔۔۔ اتنا کہہ کر وہ وہاں سے چلا آیا تو نوجوان بھی بدستور اس کے پیچھے چلا آیا۔ جبکہ ملازموں نے کھا جانے والی آنکھوں سے اسے جاتے ہوئے دیکھا۔ پہلے اتنی مشکل سے انہوں نے ایک گڑھا کھودا تھا اب اس گڑھے کو بند کرنے کا حکم دے کر یہ جا رہا تھا۔

ہم نے تو امیدیں ہی ختم کر رکھی تھیں مگر آج تم ہمارے لیے ایک امید کی کرن بن کر آئے ہو۔ تمہارے ایک بات تو سچ نکلی اور اگر دوسری بات بھی سچ نکلی تو میں تمہیں سونے چاندی کے ساتھ لیس کر کے یہاں سے روانہ کروانے کروں گا۔۔۔۔۔“ ٹھاکر بلرام خوشی سے پھولے نہ ساتے ہوئے ہوا۔

اس وقت وہ ٹھاکر کے ساتھ اس کے گھر کے اندر اس کی چٹی کے پاس براجمان تھا۔ جسے یہ خبر سننے ہی اپنی قوتِ سماعت پر یقین نہیں آرہا تھا۔

”ہاں نوجوان! اگر ایٹور نے ہمیں اسید لگا دی تو تمہاری سوچ سے بڑھ کے ہمارے پاس ایٹور کا دیا ہے۔۔۔۔۔“ ٹھاکر کی چٹی نے اپنے چٹی کی بات کی تصدیق کرتے ہوئے کہا۔

”آپ لوگ مجھے غلط سمجھ رہے ہیں۔ میرے پاس ایٹور کا دیا اتنا کچھ ہے کہ اس کے سامنے آپ کا یہ سب کچھ رتی برابر بھی نہیں میں یہاں اپنے مقصد کی خاطر آیا ہوں۔۔۔۔۔“ لڑکے نے نہایت ہی اطمینان سے دونوں کی بات سن کر جواب دیا تو دونوں نے محو حیرت سے اسے گھورا۔

کیسے کیسے لوگ

ایک آدمی طوائی کے پاس گیا اور کہا کہ ایک سیر برنی دے دو۔ اس نے دے دی تو وہ واپس کر کے کہنے لگا کہ چلو ایک سیر لڈو دے دو، طوائی نے لڈو دے دیئے تو وہ چل پڑا۔ طوائی نے کہا پیسے تو دیتے جاؤ اس نے کہا۔ ”یہ تو میں نے برنی کے بدلے میں لئے ہیں۔ تو طوائی نے کہا اچھا تو برنی کے پیسے دے دو۔ تو وہ آدمی بولا۔ برنی تو میں نے واپس کر دی ہے۔

(انتخاب: ذیشان - کراچی)

کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے تھے۔ آج اچانک لیڈی ڈاکٹر نے جب یہ انکشاف کیا تو دونوں بچی، چنی حیران و ششدر رہ گئے۔

ٹھا کر نے لیڈی ڈاکٹر اور ہسپتال کے عملہ میں نہ صرف فوراً مٹھائی تقسیم کروائی بلکہ انہیں خوشی سے پھولے نہ ساتے ہوئے نقدی سے بھی نوازا۔ یہ بات دیہات میں جنگل میں آگ کی طرح پھیل گئی۔ ٹھا کر کے حریفوں کے من پھول گئے۔ کیونکہ ان دونوں بچی چنی کی موت کے بعد وہ اس ساری جائیداد کے وارث بنے تھے۔ وہ کوئی اور نہیں اس کے سیکے نتیجے، بھانجے تھے۔ یہی نہیں خود اس کے دونوں بھائی بھی اس کے لیے دل میں کدورت کے جذبات رکھتے تھے۔ جیسے یہ نوید ان کی قوتِ سماعت سے لگرائی ان کے ہروں تلے سے زمین سرک گئی۔

شدتِ غم اور غصے کی وجہ سے انہوں نے بھائی اور بھائی کو مبارکباد تک دینا گوارا نہ کیا۔ ٹھا کر بھرام بھی ان کے تئیر بہت اچھے سے پھیلاتا تھا۔ اس کے

”م کچھ سمجھ نہیں تم کیا چاہتے ہو۔۔۔۔۔؟“ ٹھا کر نے پہلے انگشت بدنداں ہو کر اپنی چنی کی طرف دیکھا۔ اس کی کیفیت بھی اس سے کم نہ تھی۔ پھر اسے مخاطب کیا۔

”میں کیا چاہتا ہوں وہ صرف آپ کا ہونے والا بچہ ہی مجھے دے سکتا ہے۔۔۔۔۔“ اس نو جوان نے متواتر اسی لہجے میں کہا۔

”کھل کے بات کرو۔۔۔۔۔“ ٹھا کر نے اب کی بار ٹاک سیکڑ کر کہا۔

”آپ کمر مت کریں کوئی خاص بات نہیں بس میرا ایک سوال ہے جو اس پیدا ہونے والے بچے کے علاوہ کوئی نہیں دے سکتا۔۔۔۔۔“ نو جوان نے اب کی بار ٹھا کر کی چنی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا

”کیا تمہیں معلوم ہے کہ تم کیا بول رہے ہو۔۔۔۔۔؟“ ٹھا کر نے پرتشیش لہجے میں پوچھا۔ ”ایک مضمون بچہ تمہارے سوالوں کا جواب کیا خاک دے گا جسے ٹھیک سے غلوں کرنا نہیں آتا۔“

”شاید آپ اس بات کو بھول رہے ہیں کہ میں نے پہلے ہی آپ کو بتا دیا تھا کہ آپ کا بیٹا بہت صلاحیتوں کا مالک ہوگا۔۔۔۔۔“ اس نے اسے یاد دلاتے ہوئے کہا۔ جواباً ٹھا کر خاموش رہا۔ مگر اس کی حالت قابلِ دید تھی۔ اسے یہ نو جوان کوئی پاگل بچوں معلوم ہو رہا تھا۔ وہ اپنی بات گفتگو کی مالا نہیں پہناتا چاہتا تھا کیونکہ یہ نو جوان اس کے لیے ایک امید کی کرن ثابت ہوا تھا۔

☆.....☆.....☆

غرباہ میں لنگر تقسیم کرتے آج اکتیسواں دن تھا۔ جب ڈاکٹری رپورٹ میں ٹھا کر کی چنی کو حاملہ قرار دے دیا گیا۔ ٹھا کر اور اس کی چنی کو یقین نہیں ہو رہا تھا۔ وہ بار بار ڈاکٹر سے ان لفظوں کے سننے کے منتہی تھے۔ جو برسوں سے سننا چاہتے تھے۔ جنہیں سننے کی خاطر انہوں نے بہت پر تو لے تھے۔ لیکن آخر قسمت

مگر جلد ہی اس نے آنکھیں کھول لیں۔

لیکن آنکھیں کھولنے کے ساتھ ہی وہ انگشت بندہاں رہ گیا۔ سینا بن کے آنے والے اس نوجوان نے کراؤنڈ فلور پر کمرہ اپنے رہنے کے لیے صاف کروایا تھا۔ وہ کمرہ تو فرسٹ فلور سے دکھائی نہ دیتا تھا مگر اب تک اس کے اندر چلنے والی لائٹ جو حن کی طرف کھلنے والی کھڑکی کے پنوں سے باہر چھن چھن کر نکل رہی تھی دلیل کر تھا کر کا تھا ٹھنکا۔ وہ فوراً اپنے آیا کر دیکھے تو سہی اتنی رات گئے وہ نوجوان کیا کر رہا ہے وہ بجائے دروازے پر دستک دینے کے حن کی طرف سے کھڑکی کی طرف گیا۔

جیسے ہی اس نے کھلی کھڑکی کے پنوں میں سے اندر بھاٹکا تو دروازہ حیرت میں جتا ہوا گیا۔ وہ تم سن نوجوان ایٹور کے سامنے ماتھا ٹکائے پرارتھا کر رہا تھا۔ اور ایب وہ تھا قریب المرگ اور آج تک اسے اپنے ایٹور کے سامنے ماتھا ٹیکنے کی توفیق نہ ہوئی تھی۔ شدید ملامت کے احساس نے اسے پانی پانی کر دیا تھا۔ وہ آبدیدہ ہو گیا۔ آنکھیں نم ہو گئیں۔

”میرے ایٹور! میں کتنا سوزکھ ہوں کہ تو نے مجھے ہر وہ نعمت عطا کی جس کی تمنا ہر کس و ناکس کو ہوتی ہے باوجود اس کے میں تیرا کتنا فرمان بندہ ہوں۔ پھر تو نے اپنی عطاؤں کا یہ سلسلہ موقوف کیوں نہ کیا۔ ایٹور! میں تیری عطاؤں کے نہیں سزاؤں کے قابل تھا۔“

اس کا دل بچھ سا گیا تھا۔ اس نے دیکھا کہ نوجوان پرارتھا کر رہا ہے۔ پھر وہ اٹھ کر بستر پر دوڑا توں بیٹھ گیا اور ایٹور کو یاد کرنے لگا۔ وہ مڑ کر دروازے کے پاس آیا اور دروازہ کھٹکھٹایا۔ تھوڑی ہی دیر میں اس نوجوان نے دروازہ کھولا۔ کتنی شادابی تھی اس کے چہرے پر۔ کتنا سکون وطمینان تھا۔ وہ اس سے ہر لحاظ سے بڑھ گیا تھا۔ مال و دولت میں بھی اور ایٹور کے درمیں بھی۔ رات کے اندھیروں میں جب انسان گھوڑے بیچ کے سو رہے تھے تو یہ نوجوان اپنے مالک سے گزگڑا کر پرارتھا کر رہا تھا۔ وہ واقعی سچا تھا۔ اسے

بھائی، بھابھیاں اور تینوں بہنیں جب اس کے گھر آتے تھے تو اس کی چٹی کو باتوں باتوں میں امن ملنے کرنے کے ساتھ ساتھ بٹوکا کرتے تھے۔ حالات کے سامنے دونوں مجبور تھے۔ ایک نہ ایک تو بیوی ہی اس کے گھر میں قیام پذیر رہتا تھا۔ ٹھا کر بھی بخوبی جانتا تھا کہ یہ سب پیار محبت اس کی دولت ہتھیانے تک محدود ہے۔

آج اسے کچھ ہو جائے فل اوان سب نے تیار بدل جائیں گے۔ سب سے پہلے تو وہ اس کی چٹی کو نکال پھینکیں گے۔ اسی غرضے کی وجہ سے اس نے بہت عرصہ قبل اپنی ساری جائیداد اپنی چٹی کے نام لکھ دی تھی۔ وصیت میں یہ بھی لکھ دیا تھا کہ اگر ہم دونوں اس دنیا میں نہیں رہتے تو ہماری جائیداد کسی عناد آشرم کو دے دی جائے۔ اس بات کی خبر اس کے بہن بھائیوں کو بالکل نہ تھی۔ اور اس نے اپنے وکیل کو بھی غصہ و غلہ پر مٹخ کر رکھا تھا۔ کہ ایسی کوئی بھی بات ان کے کانوں تک نہ پہنچنے پائے ورنہ فل از وقت وہ کوئی بھی قدم اٹھا سکتے ہیں۔

آج اس کے سامنے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو چکا تھا۔ وہ اس کے لیے کتنی بات اور اپنائیت رکھتے تھے اس پر مایاں ہو چکا تھا۔ مگر اب اسے اپنی نہیں اپنے ہونے والے بچے کی پتا لگ گئی۔ ممکن ہے کہ وہ اس کے ہونے والے بچے کو کوئی تکلیف پہنچائیں۔

رات کافی ڈھل چکی تھی مگر نیند تھی کہ ٹھا کر کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور کھڑکی کے سامنے آکھڑا ہوا۔ اس نے کھڑکی کے دونوں پٹ ہٹا دیے۔ اس کا یہ کمرہ فرسٹ فلور پر تھا۔ یہ جو پلی تین منزلہ تھی اور حقیقت کے اندر کسی محل سے کم نہ تھی۔ کھڑکی کے پٹ کھولنے کی دیر تھی کہ ٹھنڈی ہوا کے تیز جھونکوں نے اس کے قلب و دہن میں راحت پہنچائی۔ ایک بار تو اس نے آنکھیں موند لیں شاید اس ٹھنڈی ہوا سے بھرپور استفادہ حاصل کرنا چاہتا تھا

ایٹور نے واقعی علم غیب عطا کیا تھا۔ ایسے ہی تو اس نے یہ پیش گوئی نہیں کر دی تھی۔ اور پھر اس نے جھوٹ بھی تو نہیں بولا تھا۔ اس نے جو کہا تھا وہ سب حقیقت پر مبنی تھا۔ اس کی برسوں کی بھاگ دوڑ بے سود ثابت ہوئی تھی۔ مگر نوجوان کے منہ سے نکلے چند لفظوں نے ناممکن کو ممکن کر دکھایا تھا۔

”آئیے ناں اندر کن دنیا لوں میں کھوئے ہوئے ہیں تھا کر صاحب۔۔۔؟“ اچانک اس نوجوان کی دل موہ لینے آواز سن کر وہ چونکا۔ اور بنا بچھ کبے اندر داخل ہوا۔ وہ ایک طرف دروازے کے ساتھ ہی صوفے پر براہمان ہو گیا۔ نوجوان کی نگاہیں بدستور اسی پر مرکوز تھیں۔

”آپ مجھے کچھ پریشان دکھائی دے رہے ہیں؟ سب خیر تو ہے ناں کوئی مسئلہ تو نہیں ہے؟“

نوجوان نے ایک بعد دیکر اسے دو سوال پوچھے۔ ”خاکر نے لگا دیں افغانئیں۔ ٹپلے ہوٹ کو دانوں تلے دبا یا۔ شاید اندرونی کیفیت پر قابو پانے کی سعی کر رہا تھا۔ دوسرے ہی لمحے سامنے تھا کر نوجوان کے قدموں میں پڑا وہ کڑکڑا رہا تھا اور نوجوان خوبیرت سے اسے تلے جا رہا تھا۔ نوجوان کے ہاتھوں نے اسے اڑھنے سے کراچیاں ملے تھا کر کوہ کیا تھا۔ اس کی اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی نیچے اٹک کئی تھی۔ وہ تنگی باندھے تھا کر کوہ دیکھے جا رہا تھا جو اس کی ٹانگوں کو پکڑے اپنا سر اس کے پیروں پر رکھے ہوئے تھا۔

”ایٹور کے لیے میرے ہونے والے بچے کی حفاظت لیجئے۔۔۔۔۔ میرے بہن بھائی کہیں اس کی جان ہی نہ لے لیں۔۔۔۔۔ میں برسوں اس خوشی کی گمزی کا انتظار کیا ہے اور اگر اب یہ امید دم توڑ گئی تو میں۔۔۔۔۔ میں کرجیاں کر چیاں ہو جاؤں گا۔۔۔۔۔ میرا سب کچھ آپ نے لیجئے۔۔۔۔۔ آپ ایٹور کے بہت پیٹے ہوئے ہیں۔۔۔۔۔ مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہی کہ میں کیسے اپنی جتنی اور اپنے ہونے والے بچے کی حفاظت کروں نہ جانے کیوں۔۔۔۔۔ مجھے ہمہ وقت

دھچکا سا لگا رہتا ہے۔۔۔۔۔ میری جتنی اور میرے بیٹے کو اپنی حفاظت میں لے لیجئے۔۔۔۔۔ ایٹور کے بعد اب آپ ہی میرے لیے ایک مسیحا ہیں۔۔۔۔۔ میں دنیا میں سوائے آپ کے کسی پر اعتماد نہیں کر سکتا۔۔۔۔۔ میں آپ کے آگے ہاتھ جوڑتا ہوں۔۔۔۔۔“ تھا کر بلرام نے دوزانوں بیٹے ہونے ہاتھ جوڑ کر زار و قبار روٹے ہوئے کہا۔ آنسو تھے کہہ گئے کا نام نہ لے رہے تھے۔ نوجوان کی آنکھیں بھی بھر آئیں۔ اس نے نیچے بیٹھ کر خاکر کے ہاتھوں کو اپنے دونوں ہاتھوں میں تھاما۔

میں آپ لوگوں کی عزت بہت زیادہ کرتا ہوں۔ میں نے آپ کے گھر کا نمک کھایا ہے۔ اور آپ چھٹا کیوں کرتے ہیں۔ ایٹور پر بھروسہ رکھئے۔ انسانوں پر بھروسہ رکھنے والے ہی تو دھوکہ کھاتے ہیں۔ آپ لوگ پختا مست لریں آپ کے ہونے والے بچے کی دنیا کی کوئی طاقت بال تک بیکانہ کر پائے گی۔ دل سے اس وہم کو نکال دیکھیئے۔ آپ کا بیٹا بہت اونچے مقام کا مالک ہوگا۔ ایٹور نے اسے ایسا مقام دے رکھا ہے کہ وہ خود اپنی اور آپ سب کی حفاظت کر رہا ہے تو آپ اتنی فکر کیوں کرتے ہیں۔۔۔۔۔“ نوجوان نے خاکر کو گلے لگایا۔ اور خاکر بچوں کے جیسے ہلکے ہلکے کرنا نے کتنی دیر روٹا رہا۔ جب اس کے دل کا فبار کھل گیا تو وہ ذور اُٹا ہاں سے چلا گیا۔

خاکر نے یہ سنا دار کو کہہ دیا تھا کہ ”میرا کوئی بھی عزیز مجھ سے ملے آئے تو اسے گھر کے اندر نہ آنے دے۔“ وہ جتنا خوش تھا اس سے کئی گنا زیادہ پریشان بھی تھا۔ سارا دن گھر کے اندر ادھر سے ادھر چکر لگاتے گزر جاتا اور راتیں کروٹوں کی نظر ہو جاتی۔ وہ ہر وقت مستعد رہتا چاہتا تھا۔ وہ اپنی جتنی اور بچے کی حفاظت کرنا چاہتا تھا چاہے اس کے عوض اس کی اپنی جان ہی کیوں نہ ہلی جائے۔

بچے کی پیدائش کے دن بہت قریب آپکے

خوشیوں میں ان لوگوں کی شرکت پسند نہیں کرتا۔۔۔۔۔“ مذاکر نے دانتے پیٹتے ہوئے کہا اور پھر چہرے وار کی طرف توجہ ہوا۔ ”تمہیں جو کیا ہے وہ کرو کھڑے کھڑے میرا منہ کیا دکھا رہے ہو۔“

چہرے دار آٹافاناکوہاں سے چلتا بنا اور اس نے باہر ہی سب کو چلتا کیا۔ ان کے جانے کے بعد مذاکر نے تلکھ کا سامن لیا۔

☆...☆.☆

ٹھاکر بلرام کے ہاں ایک خوبصورت بچے نے آنکھیں کیا کھولیں۔ پورے گاؤں میں نہ صرف مٹھائی تقسیم کی گئی بلکہ صدقے اتارے گئے۔ ٹھاکر اور اس کی پتی خوشی سے پھولے نہ مار رہی تھیں۔ ٹھاکر کے تو زمین پر پاؤں نہ پڑ رہے تھے۔ بار بار دونوں پتی، جتنی اپنے بچے کو بوسہ دیتے۔ ہی تھیں اتنا خوبصورت کہ ایک نگاہ دیکھتے تو بار بار دیکھنے کو مائل رہتے۔ یہی ٹھاکر کو وہ نوجوان یاد آیا جس کے سر پر ان خوشیوں کا صلہ سہہ تھا۔

ٹھا کر نے ایک نوکر کو بھیج کر پتہ کر دیا تو وہ اپنے روم میں ہی تھا۔ ٹھا کر اور اس کی چٹی کے علاوہ دو ملازمہ بھی ان کے ساتھ ہوئیں۔ جو جوان اس وقت بستر پر لیٹا ہوا تھا۔ اس نے آنکھیں موندی ہوئی تھیں۔ سر کے نیچے تکیہ ہونے کے باوجود اوہنا ہاتھ سر کے نیچے دے رکھا تھا۔ کھٹکے کی آواز سن کر اس نے فوراً آنکھیں کھولیں۔ سامنے ٹھا کر، اس کی چٹی اور اس کے ہاتھ ہاتھ میں ایک بلبلاتا پچہ دیکھ کر اس کا ہاتھ ٹھنکا۔ جو جوان نے ٹھا کر کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھا۔ جو اب ٹھا کر نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کا مسکرانا جو جوان سمجھ گیا اور فوراً اٹھ کر آلتی بالٹی مار کر بیٹھ گیا۔

”ہم بہت خوش ہیں چتر۔ ہماری خوشی کی کوئی انتہا نہیں کہ تم ہمارے لیے ایک سیما بن کے آئے اور دیکھو تو۔۔۔۔۔“ ٹھاکر کی چٹنی اپنی گود میں اٹھائے بچے کی پیشانی چومتے ہوئے بولی۔ ”کتنا سندر چتر ہے میرا۔ ایٹھو اس کو کسی کی نظر نہ لگائے۔“

تھے۔ اب بات مہینوں یا مہنتوں کی نہیں رہی تھی بلکہ بات دنوں پر آگئی تھی۔ اور اس نے شہر سے ایک لیڈی ڈاکٹر اور اس کے ساتھ اس کے عملے کو ایک ایک بیٹے کے لیے اپنے گھر بلا لیا تھا۔ وہ لیڈی ڈاکٹر دور رہیں سے اس کی کوئی رشتہ دار بھی نکلتی تھی۔ مگر ٹھاکر کو اس پر اعتماد تھا۔ آج تک ٹھاکر اور اس کی جتنی نے جہاں سے بھی چپک اپ کر دیا تھا وہ ان کے ساتھ ساتھ رہی تھی۔ اور وہ وقتاً فوقتاً ٹھاکر کو اس بات کا احساس دلاتی رہتی تھی کہ حریفوں کی لچائی ہوئی نظریں اس کے مال و زر پر لگی ہوئی ہیں۔ اسے کاش اللہ شورشیں ایک بچہ دے دے تو دیکھنا تو اسے بھی خوشتر یہ لوگ بدل کر خاستر ہو جائیں گے۔ اور واقعی حقیقت میں ایسا ہی ہوا تھا۔ ان جملے بیٹے اپنوں میں سے آج تک کسی کو یہاں آنے کی توفیق نہ ہوئی تھی۔

اس وقت بھی ٹھاکر کی چٹی کی طبیعت چنداں
 ناساز تھی۔ ٹھاکر اور وہ جوان دونوں باہر گھر میں بیٹھے
 گفت و شنید کر رہے تھے جب چہرے دار انہیں اپنی
 طرف آتا دکھائی دیا۔ وہ قریب آکر کھائیت ہی مودبانہ
 لہجے میں گویا ہوا۔

”ٹھاکر صاحب آپ کے بھائی اور بہنیں اسے
بچوں کے ہمراہ تشریف لائے ہیں۔ میرے لیے کیا حکم
ہے؟“

پہرے دار کی بات سن کر رضا کر کے کان کھڑے ہو گئے۔ اس نے گہری نھروں سے کیٹ کی طرف دیکھا۔

”انہیں وہیں سے چلنا کر دو۔۔۔۔۔“ اس نے
گھٹ پر ہی کسی غیر مرئی نقطے پر نگاہیں جماتے ہوئے
کہا۔

”یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں آپ کے اپنے آپ کی خوشیوں میں شرکت کے لیے آئے ہیں۔۔۔۔۔“ اس نوجوان نے ٹھا کر کی بات سن کر انگشت بدنداں ہو کر اس سے پوچھا۔

”مجھے کسی کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں اپنی ان

ایک بچہ لاکھوں میں فروخت ہوتا ہے۔ تم اس کتیا کے پاس چلے جاؤ وہی تمہاری منزل ہے۔ وہی تمہارے ہر سوال کا جواب ہے۔ وہیں پر تمہارے یہ بھاگ دوڑ ختم ہو جائے گی۔ میں پرارتھنا کروں گا کہ ایٹور تمہیں تمہارے مقصد میں کامیاب کرے۔“

”جاؤ اب چلے جاؤ یہاں سے اور کبھی خیال میں بھی میری چھتا مت کرنا میں اپنے اوپر یا اپنے مانتا ہوتا کے اوپر آنچ تک نہ آنے دوں گا۔ کسی کی جرأت نہیں کہ کوئی ہمارا بال تک بریکا کر پائے۔۔۔۔۔“ اتنا کہہ کر اس چند گھنٹوں پہلے دنیا میں آئے بچے نے چپ اختیار کر لی۔

یہ ایک ایسا منظر تھا جس پر اعتبار کرنا ممکن تھا مگر آنکھوں دیکھی اور کانوں سنی بات سے کون کمر سکتا ہے۔ حیرت کے کتنے ہی بم کمرے میں ایستادہ ٹھا کر اور ٹھکرائیں پر گرے۔ بچے کی بات ختم ہوتے ساتھ ہی نو جوان نے رختِ سفر باندھنا شروع کر دیا۔ سب نے روکنے کی سعی کی مگر بے سود۔ وہ بھند رہا کہ جب تک اس کی منزل اسے نہیں جاتی اس کی زندگی میں ٹھہراؤ نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔ سب نے بہت خوشی سے اسے روانہ کیا۔ خاص کر ٹھاکر بلرام اور اس کی بچی تو اس کا شکر ادا کر کر کے اسے شرمسار کر رہے تھے۔ یوں لگ رہا تھا جیسے شرم کی وجہ سے وہ ابھی زمین میں جھنس جائے گا۔

☆.....☆.....☆

نو جوان نے پہلے سوچا کہ جا کر ٹھکر سے ملاقات کرے مگر پھر اس نے اپنا ارادہ ترک کیا اور بچے کے بتائے ہوئے پتے پر پہنچ گیا۔ یہ ایک پختہ مکان تھا۔ اسے کوٹھی یا محل کا نام نہیں دیا جاسکتا تھا۔ مگر یہ بھی عیاں تھا کہ اس کی پختگی میں کسی قسم کا کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں چھوڑا گیا۔ نو جوان نے دروازے پر دستک دی تو ایک سانولے رنگ کے نو جوان نے دروازہ کھولا۔

”جی فرمائیں۔۔۔۔۔“ نو جوان نے نہایت ہی ناگواری سے پوچھا۔

”ایٹور کی دیا ہے۔ اب اس بچے سے مجھے دو چار باتیں کرنے دیں کیونکہ میں جس گھڑی کے انتظار میں تھا وہ یہی گھڑی تھی اب مجھے اپنی منزل پانی ہے۔ یہی معصوم میری منزل ہے۔۔۔۔۔“ نو جوان نے لبوں پر مسکراہٹ سجاتے ہوئے دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

ایک بے یقینی کے عالم میں دونوں نے اپنے بچے کو نو جوان کے سپرد کر دیا۔ اس نے اس معصوم بچے کو اپنے ہاتھوں کے جھولے میں تھام لیا۔ اس کی گہری نیلی آنکھیں بہت ہی حسین تھیں۔ یوں لگ رہا تھا جیسے کسی جھیل میں فلک کی شبیر دکھائی دے رہی ہو۔

”اے معصوم بچہ۔۔۔۔۔ تو بدی سے پاک ہے۔۔۔۔۔ دنیا میں تیری آمد خوش آمد ثابت ہوگی۔۔۔۔۔ ایٹور تیرا اقبال بلند کرے میں عرصہ دراز سے یہاں تیری آمد کا منتظر تھا۔ آج تو نے اس فانی دنیا میں آنکھیں کھولی ہیں۔ میں تجھ سے ایک سوال کرنا چاہتا ہوں بس مجھے اس کا جواب چاہیے۔۔۔۔۔“ نو جوان نے نہایت ہی ادب و احترام سے اس بچے سے بات کی۔

اگلا منظر ناقابل یقین اور ناقابل فراموش تھا۔ سب حیرت کے سمندر میں غوطہ زن ہو گئے۔ جب اس بچے نے نو جوان کی بات سن کر بولنا شروع کر دیا۔ کسی کو بھی اپنی قوتِ سماعت پر دشواں نہیں ہو پارہا تھا۔

اے ایٹور کے پیارے بندے تمہیں سوال بتانے کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں۔ میں تمہارے دل کے اندر کی ہر بات سے آشنا ہوں بس تمہیں تھوڑی سی دقت اور برداشت کرنا پڑے گی۔ واپس اسی گاؤں میں لوٹ جاؤ جہاں ٹھکر کسان نے تمہیں میرے بارے میں بتایا تھا۔ اسی گاؤں میں ایک جگدیش نامی شخص رہتا ہے۔ جو پہلے بہت ہی غریب تھا۔ مگر اب اس پر ایٹور کی بہت بہت کرپا ہے۔ اس کے پاس ایک کتیا ہے۔ وہ کتیا بہت ہی اعلیٰ قسم کی ہے۔ اس کا ایک

آئے ہو۔“

اب کی بار دونوں کی حیرت ہوئی جب انہوں نے کتیا کا منہ ہلکے دیکھا اور اس کے ہلکے منہ سے نکلنے والے الفاظ سنے۔

”جب تم سب جانتی ہی ہو تو پھر بتاؤ مجھے، میں تھک گیا، آخرا ب تم مجھے کہاں بھیجوگی۔۔۔۔؟“ نو جوان نے ناگواری سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ جب کہ وہ شخص جو حیرت سے دونوں کو ٹٹکنی باندھے سکے جا رہا تھا۔ نو جوان پیچھے کے بالکل سامنے جا کھڑا ہوا تھا۔

”اب تم کہیں نہیں جاؤ گے۔ تمہارے سوال کا جواب میں خود ہی ہوں، کیا تم نے ابھی تک میری آواز نہیں پہچانی۔۔۔۔“ اس کتیا نے غصے سے چیخ و تاب کیا کر کہا۔ تو نو جوان سوچوں کے بھنور میں گم ہو گیا۔ تبھی اسے یاد آیا کہ یہ آواز تو اس نے سنی ہے مگر کہاں یہ اس کو یاد نہیں آیا۔

”ہاں میں نے تمہاری آواز پہلے بھی سنی ہے مگر کہاں یہ بات یاد نہیں آرہی۔۔۔۔“ نو جوان نے سر میں کھجلی کرتے ہوئے کہا۔

”شکر کسان کو جانتے ہو۔۔۔۔؟“ اس کتیا نے دھیمے سے لہجے میں کہا۔ دوسرے ہی لمحے جیسے نو جوان پر کوئی بہت بڑا ہم آگرا ہو۔ اسے یاد آ گیا تھا کہ یہ آواز اس نے کہاں سنی تھی۔ یہ آواز تو شکر کی چنی کی تھی۔ نو جوان کی نکاہیں نہ چاہتے ہوئے بھی اس کتیا پر تقریباً جم ہی گئیں۔

”کاش اس دن تم نہ آتے۔۔۔۔“ کتیا نے روہانسی آواز میں کہا مگر حیرت کا مجسمہ بنے نو جوان نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔

”شکر بہت دیا لو شریف اور دوسروں کا احساس کرنے والا انسان ہے مگر صد ہا افسوس کہ میں ہمیشہ اپنی زندگی میں ایک بری عورت ثابت ہوئی۔ شکر نے مجھے سدھارنے کے لیے بہت پاپڑ بیچے مگر میں خود سدھرتا ہی نہیں چاہتی تھی۔ میں نے آج تک کسی مہمان

تو درکنار کسی فقیر کو بھی کچھ نہ دیا تھا۔ شکر مجھے بہت سمجھایا کرتا تھا کہ ایشور کی راہ میں دیا کرو۔ مگر مجال ہے میرے کانوں پر جوں تک رنگ جانی۔

وہ بھی مجھے سمجھا سمجھا کر شاید تنگ آ گیا تھا۔ پڑوسیوں کے ساتھ میں بہت برے طریقے سے پیش آتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ میرے گھر نہ کبھی کوئی برادری میں سے آتا تھا نہ آس پڑوس میں سے۔ لیکن ایک دن ایک پڑوس میں میرے گھر آئی۔ اس کا پتی کسی فیکٹری میں ملازم تھا۔ ان کے ہاں ایک چاند سا بچہ بھی تھا۔ افسوس کہ ہماری شادی کو عرصہ ہو جانے کے باوجود ہم اولاد جیسی نعمت سے محروم تھے۔ اسی لیے اس بات سے بھی میں آشنا نہ تھی کہ اولاد کے لیے ماں کے دل میں کس حد تک محبت پنہاں ہوتی ہے۔

وہ عورت میرے ساتھ بیٹھی باتیں کر رہی تھیں کہ اس کے بچے نے وہیں پڑا میرا شیشے کا ایک گلاس توڑ دیا۔ میں نے ایک زوردار طمانچہ اس کے منہ پر رسید کیا۔ اور منہ میں جو آئی نکالتی چلی گئی جبکہ اس عورت کی آنکھوں سے آنسو کی آبشار کی طرح بہتے رہے۔ میں نے اس عورت کو بھی خوب سنا ڈالیں۔ وہ چپ چاپ بچے کو اٹھا کے چلی گئی۔

اس کے دوسرے دن تم آ گئے۔ تمہارے ساتھ بھی میں نے بدتمیزی کرنے کوئی دقیقہ فرو گزاشت نہ چھوڑا۔ میرا چنی بنا کچھ کھائے اٹھ کر کھیتوں میں کام کرنے لگ گیا اور میں نے اس کو دوبارہ کھانے کو کہنے کی زحمت تک گوارا نہ کی۔ حالانکہ میں نے اٹھتے وقت اس کی آنکھوں میں چپکے آنسو کی چمک واضح طور پر دیکھ لی تھی۔ مگر مجھے اس کی رتی برابر چٹنا نہ تھی۔

میں اس وقت گھر آئی تو یکبارگی مجھ پر غنودگی طاری ہونے لگی۔ میں کتنی دیر سوئی اس بات کا مجھے کوئی پتہ نہ تھا۔ لیکن جب آنکھ کھلی تو میرے حواس باختہ ہو گئے کیونکہ میں چار پانی پر موجود نہ تھی۔ میری تو ہیئت ہی بدل چکی تھی۔ ایشور نے میری آتما کو نکال کے اس کتیا میں ڈال دیا تھا۔ یقین مانو شہری بابو مجھے موت نہیں

نوجوان کے چہرے سے زمین سرک گئی کہ یہ کیا اس کے کسی سوال کا کیا جواب دے گی یہ تو الٹا اسے کچا چھاڑا لے گی۔ کتیا اسے دیکھتے ساتھ ہی اٹھ کر جنگل کے دروازے کے پاس آکھڑی ہوئی۔
”ادھر دیکھو یہ اس کے بچے ہیں۔“

اچانک اس کی قوت سماعت سے اس شخص کی دوبارہ بازگشت نگرانی تو نوجوان نے اس سمت دیکھا۔ چھوٹے بچوں نے بچے کی شیرنی کے بچوں سے کم نہ دکھائی پڑتے تھے۔

”مجھے اس کتیا سے کچھ پوچھنا ہے۔۔۔۔۔؟“
نوجوان نے سوالیہ نظروں سے اس شخص کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ تو وہ شخص اس کی بات سن کر انگشت بندھاں رہ گیا۔

وہ حیرت و تجسس سے اس نوجوان کی طرف دیکھنے لگا۔ جیسے اسے نوجوان کی کہی بات کاوشواں نہ ہو پارہا ہو۔

”شکل سے تو تو چنگا بھلا دکھتا ہے مگر اب پتہ چلا کہ تو پاگل ہے۔ کتیا سے کچھ پوچھنا ہے، یہ تیری سہیلی ہے کیا، پاگل کہیں کے کہ یہ تیری باتوں کے جواب دے گی۔۔۔۔۔“ اس آدمی نے تیغ پاہوتے ہوئے کہا۔ وہ خوش تھا کہ نوجوان کتیا کا کوئی بچہ خریدنے آیا ہے مگر سب اس کے الٹ ہو گیا تھا۔

”آپ خاطر فکر نہ کریں میں بالکل ٹھیک ہوں اور آپ کے سامنے سوال کروں گا تو وہ میرے سوال کا جواب دے گی۔۔۔۔۔“ نوجوان نے اٹل لہجے میں کہا۔ اس کی بات سن کر ایک بار پھر اس شخص کا ماتھا ٹھنکا۔ لیکن قیل اس کے کہ وہ شخص اس نوجوان کو دھکے دے کر گھر سے باہر نکالتا۔ کسی عورت کی آواز نے اس کی قوت سماعت پر دستک دی۔

”اسے آنے دو۔۔۔۔۔“ آواز سننے ساتھ ہی اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ خود نوجوان بھی حیرت کا بت بن کے رہ گیا۔ دونوں کی نگاہیں متواتر اس بونجرے پر ٹک گئیں۔ ”آؤ نوجوان میں جانتی ہوں تم کیا پوچھنے

مجھے جلد پیش صاحب سے ملنا ہے۔۔۔۔۔ اس نے اس کے انداز کو بالائے طاق رکھتے ہوئے کہا۔

”ہاں۔۔۔ ایک تو ان کتے کے شوقینوں نے جینا حرام کر رکھا ہے آرام سے بیٹھ کے دونوں کے نہیں لیتے دیتے۔ انتظار کیجئے آپ کا پیغام پہنچاتا ہوں۔۔۔۔۔“ اس نے نہایت ہی بد میزنی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ مگر نوجوان کو اس کے کسی بھی قسم کے رد عمل سے کوئی لینا دینا نہ تھا۔ اسے مطلب تھا تو اپنی منزل سے جس کے لیے وہ نجانے کب سے ذلیل و خوار ہو رہا تھا۔ اسے تھوڑی سی انتظار کرنا پڑا اسی نوجوان نے جلد ہی دروازے سے منہ نکالا۔

”تشریف لائیے۔۔۔۔۔“

نوجوان اندر داخل ہوا تو اسے سامنے ہی ایک ادھیڑ عمر آدمی دکھائی دیا۔ اس کے لبوں پہ معنی خیز مسکراہٹ تھی۔ اسے اندر آتا دیکھ کر اس کی طرف لپکا۔

”آؤ آؤ نوجوان کیسے تشریف لائے آپ۔ ہم ایک دوسرے سے ملے نہیں ہیں اس لیے امید کرتا ہوں کہ تم اس اعلیٰ نسل کی کتیا کا کوئی بچہ خریدنے کے لیے آئے ہو؟ تمہارا آنا مجھے بالکل حیرت میں نہیں ڈال رہا اس کی وجہ جانتے ہو، کیونکہ میں ڈیلی سنے سے چہرے دیکھنے کا عادی ہو چکا ہوں۔۔۔۔۔“ قریب چہنچتے ساتھ ہی مصافحہ کرتے ہوئے اس شخص نے دریا کو کوزے میں بند کر دیا۔

”آپ نے ٹھیک پہچانا مگر میں ایک بار اس کتیا کو دیکھنا چاہتا ہوں۔۔۔۔۔“ نوجوان جواباً مسکراتے ہوئے کہا۔

”ہاں ہاں کیوں نہیں تم آؤ میرے ساتھ۔۔۔۔۔“ اس آدمی نے ایک طرف چلتے ہوئے کہا تو نوجوان اس کے پیچھے چل پڑا۔

ایک چھوٹا سا رن لے کر مکان کے دوسری طرف وہ اسے لے گیا جہاں ایک مضبوط جنگل کے اندر ایک کتیا مقید تھی۔ کتیا کیا تھی بلکہ دیکھنے پر یوں لگتا تھا جیسے کوئی شیر قید کر دیا گیا ہو۔ ایک بار تو دیکھ کے



آسیب زدہ

مدر بخاری - شہر سلطان

اچانک کمرے میں شدید قسم کا زلزلہ آیا، وال کلاک نیچے گر کر چکنا چور ہو گئی، سنگھار میز کا شیشہ ٹوٹ کر کرچی کرچی ہو گیا، جھازی الماری فرش بوس ہو گئی، مگر یہ کیا چند لمحے بعد ہی ہر چیز اپنی اپنی جگہ اصلی حالت میں...

طویل عرصہ سے خالی مکان اور غیر آباد علاقہ آسیب زدہ ہو جاتا ہے۔ حقیقت کہانی میں ہے

اصفہان قریشی کا پورا جسم لرز رہا تھا۔ ماتھے پر سے پسینہ کچھ زیادہ ہی بہہ رہا تھا، وہ کمرے سے باہر نکل کر کھڑکی کی جانب ٹھنڈی ہوا لینے کے لئے اٹھا مگر جیسے کسی مضبوط زنجیر میں اس کو جکڑ لیا گیا۔ جس اور گرمی بڑھتی چلی جا رہی تھی اس کا سانس بحال رکھنا کافی مشکل ہو گیا تھا پھر پورا جسم پسینہ سے بھگنے لگا۔ اس نے تمام تر ہمت جمع کی اگر وہ اٹھنے میں ناکام ہو جاتا تو یقینی موت واقع تھی۔ اچانک کھڑکی سے ٹھنڈی ہوا کا جھونکا آیا جس نے گرمی کا تسلسل توڑ دیا۔ سخت گرم موسم میں سورج کی تمازت کو ختم کرنے کے لئے بادل آ جاتے ہیں اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے ابر رحمت برسنے لگی ہر طرف موسم برسات جیسا سہانا راج ہو گیا تو اصفہان نے سکون کا سانس لیا، اب

آئی تھی۔ بس میں تو چار پائی پہ سوئی تھی اور جب آنکھ کھلی تو خود کو ایک کتیا کے روپ میں پایا۔ میرے پیروں تلے سے زمین کھسک گئی۔

مگر اب پہچتائے کیا ہوت جب جذباں چب گئیں کھیت۔ میں یہاں بہت تکلیف میں ہوں۔ ایک تو میری زندگی اب ہمیشہ کے لیے اس بنجرے میں مقید ہو کر رہ گئی ہے۔ یہ لوگ تو مجھ سے خوف کھاتے ہیں مگر حقیقت تو یہ ہے کہ میں نے کبھی کسی کو ایذا نہیں پہنچائی۔ میں اس بنجرے سے باہر نکلنا بھی نہیں چاہتی کیونکہ میں یہ گوارہ نہیں کرتی کہ کسی پر میرا راز افشاں ہوں۔

میں انسانی روپ میں تو ہمیشہ اولاد جیسی نعمت سے محروم رہی مگر یہاں ایک وقت میں ان گنت بچوں کی ماں بنتی ہوں۔ مگر انہیں دودھ تک پلانا نصیب نہیں ہوتا۔ میری ماستاڑ پتی ہے۔ میری آنکھوں کے سامنے میرے بچوں کو دوسروں کو بھاری دولت کے عوض میرا مالک فروخت کر دیتا ہے۔ مگر اس میں اس بے چارے کا کیا قصور ہے۔ یہ تو سارا کیا کرتا میرا ہے۔ مجھے تو یہ سزا اس ایثار کی طرف سے مل رہی ہے۔

میں دن رات اٹھ رہا ہوں مگر شاید میری پرارتھنا سے قبولیت کا تاثر ختم کر دیا گیا ہے۔ شہری بابو میں نے کئی بار مرنے کی کوشش کی مگر نہیں مر سکی، میرے لیے یہ زندگی نہایت ہی ذلت آمیز ہے۔ مجھے ایک کتیا کا روپ مل گیا ہے۔ میں سب کچھ دیکھتی رہتی ہوں مگر کچھ نہیں کر پائی۔ میں انسان ہو کر بھی ایک وقت میں کئی کئی اعلیٰ قسم کے کتوں کے سامنے لاچار ہو جاتی ہوں۔ ذہنی اور قلبی اذیتوں کے علاوہ جسمانی اذیتیں برداشت کر رہی ہوں مگر ان تک نہیں کرتی۔ کیونکہ مجھے میرے کیے کی سزا دنیا میں ہی مل رہی ہے۔ اب چلے جاؤ تم شہری بابو ایثار کے لیے چلے جاؤ۔“

اتنا کہہ کر کتیا جنگل کے دروازے سے پیچھے ہٹ کر بیٹھ گئی۔ اس کی آنکھوں سے گرستے اشکوں کو وہ بہت قریب سے دیکھ رہا تھا۔ وہ بیٹھی اپنی قسمت پہ

اشک ریزی کر رہی تھی۔ اس کا مالک حیرت کا مجسمہ بناو ہیں کا وہ ہیں کھڑا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے اسے ابھی ایک ہو جائے گا اور سورگباش ہو جائے گا۔ خود اس نوجوان کی کیفیت اس سے کچھ کم نہ تھی۔ اس کے لیے قدم اٹھانا دشوار ہو گیا تھا۔ منوں وزنی قدم لگ رہے تھے۔ مگر وہ پھر بھی انہیں چار دنا چار اٹھ رہا تھا۔ اس نے اس شخص کو وہیں مہبوت کھڑے چھوڑا اور اس گھر سے باہر نکل آیا۔

باہر نکلا تو نگاہ آسمان کی طرف اٹھی۔ آسمان پر کالے بادل چھا چکے تھے۔ اور نکل اس کے کہ بادل برستے اس کی آنکھیں برس پڑیں۔

اے میرے مالک! مجھے معاف فرما دے۔ مجھے انسانی روپ میں ہی موت دینا۔ میں بہت گناہ گار ہوں تو میری خطاؤں کو پس پشت ڈالتے ہوئے بھی خطاؤں کا سلسلہ جاری رکھے ہوئے ہے۔ اے میرے مالک! تو یہ بھی جانتا ہے کہ میں کتنا گناہ گار ہوں۔۔۔۔۔ وہ دروازے کے پاس ایستادہ رو رہا تھا۔ بلک رہا تھا۔ سک رہا تھا۔ آنکھوں سے اتھرو جاری و ساری تھے۔ جبکہ آسمان پر بادل گرج رہا تھا۔ بجلی چمک رہی تھی اور پھر دوسرے سے موسلا دھار بارش شروع ہو چکی تھی۔

دیکھتے ہی دیکھتے وہ وہیں جگہ سے گر گیا۔ اس گھر کا چوکیدار اسے دیکھ رہا تھا۔ آنے جانے والے بھی اسے دیکھ رہے تھے۔ مگر آج اسے کسی کی کوئی چٹانہ تھی۔ اسے تو بس اپنی چٹنا کھائے جا رہی تھی کہ اگر اس کی کسی بھی خطا پر پکڑ ہو گئی تو کہیں اس کی بھی آتما۔۔۔۔۔

اس کے منہ سے ایک ٹھنڈی سانس نکلی اور پھر وہ دھواں دھار روئے لگا۔ جب کہ اس کے ساتھ آج آسمان بھی دھواں دھار رو رہا تھا۔ شاید اسے بھی اس کی حالت پر رونا آ رہا تھا یا اس مضبوط سلاخوں والے بنجرے میں مقید کتیا پر۔



کیا مگر یوں میں پانی موجود تھا سرخ رنگ کا نہیں وجود نہ تھا۔

اور پھر اس نے ایک عجیب منصوبہ بنایا، اس کا منصوبہ گھر سے باہر کسی ریسٹورنٹ میں رہنے کا تھا۔ اس نے اس آبی گھر سے کچھ دنوں تک چھکارہ پانے کا ایک ہی حل نکالا تھا کہ ریسٹورنٹ میں کچھ دنوں کے لئے رات گزاری جائے۔

کمرہ نمبر 272 میں کرکٹ بیچ LCD پر دکھا جا رہا تھا اصفہان نے یہ کمرہ چند دنوں کے لئے کرائے پر لیا تھا۔ چند ایک سوٹ اپنے پاس رکھ لئے تھے۔ دن کو اس گھر میں جانا خطرناک نہ تھا مگر رات کو وہاں ٹھہرنا موت کو دعوت دیتا تھا۔

گویا رات ریسٹورنٹ میں اور دن بھر آفس! مگر جو نمی آخری اور شروع ہوا لائٹ چلی گئی۔ اندھیرا چھا گیا بیچ خاصا دلچسپ ہو گیا تھا۔ گراف لائٹ! کجنت نے ابھی جانا تھا وہ غصے سے جھلا اٹھا۔ کرکٹ کا دیوانہ اصفہان قریشی دن بھر کی تھکن کے باوجود بیچ دیکھنا چاہتا تھا مگر دلچسپ صورتحال کے دوران لائٹ کا چلے جانا غصہ دلانا تھا!

اس نے ایف ایم آن کیا مگر وہاں سگنل نہ ہونے کے برابر۔

”شٹ! ایف ایم پر بھی کوئی سگنل نہیں!“ وہ جھلا اٹھا۔ اس نے دوسرے ریڈیو اسٹیشن چیک کئے۔ قریب سب ہی بند تھے۔

اس نے دروازے کی وراز سے نیچے دیکھا وہاں روشنی تھی۔ وہ دروازے کی طرف بڑھا۔ اس نے ہینڈل گھمایا باہر لائٹ موجود تھی راہداری کا بلب روشن تھا ساتھ والے روم سے بیچ کی کنٹری سنائی دے رہی تھی۔ اس نے دروازہ کھٹکھٹایا روم 273 سے ایک بوڑھا باہر نکلا۔

”جناب میرے روم کی لائٹ نہیں۔ بیچ کا کیا بنا؟“

”ہم جیت گئے بیٹا! انتظامیہ کو فون کر دے

لائٹ ٹھیک کرے۔“

”اوکے انکل! ویسے لائٹ بند ہوئی تھی؟“

”نہیں! آج لائٹ نہ جانے کا اعلان ہوا تھا!“

اور ویسے بھی یہاں بیوی جنرل ہے، لمحہ بھر میں لائٹ آ جاتی ہے۔

مطلب کہ اس کے روم کا لائٹ کنکشن منقطع ہوا تھا گزشتہ واقعات کو مد نظر رکھتے ہوئے اسے وہم گزرا کہ یہ ساری منحویت صرف اس گھر تک ہی محدود نہیں بلکہ وہ خوفناک بلا جو ہر رات مختلف روپ میں آدھمکتی تھی اس ہوٹل میں بھی آدھمکتی ہے۔

وہ دوبارہ اپنے روم میں آیا۔ اب لائٹ آ چکی تھی۔ وہ پرامید تھا کہ کم از کم اس ہوٹل میں کچھ التماسیدھا نہ ہوگا۔ مگر وہ رات سب سے مہنگی پڑی۔

رات کا ایک کا عمل رہا ہوگا جب اس کا سانس پھولا ہوا تھا دل کی دھڑکن خاصی تیز تھی جیسے سینہ حیر کر باہر آ جائے گا۔ اس کا جسم پسینہ میں ڈوبا ہوا تھا۔ کچھ گڑبڑ ضرور تھی۔ سامنے ٹیڈی بیئر رکھا ہوا تھا ٹیڈی بیئر کی آنکھیں سرخ ہو کر چمک رہی تھیں۔

”ذرو مت! مگر تم جہاں بھی جاؤ گے میں تمہارے ساتھ ہوں!“ اسے آواز سنائی دی اس ٹیڈی بیئر کا منہ کھلا تھا آواز ٹیڈی بیئر سے آئی تھی۔

اسے وہم تھا یا واقعی کچھ ایسا ہوا تھا؟ اور پھر ڈورنٹل بکٹی سنائی دی۔ اس کا دل دھڑک گیا ہوٹل کا قلم ہی اندر آ سکتا تھا مگر کیا وجہ جوتانی رات کو کوئی ادھر آ نکلا۔

ڈورنٹل کچھ دیر بعد دوبارہ سنائی دی۔ وہ ڈرتا ہوا دروازے کے کی ہول کی طرف بڑھا باہر کوئی موجود نہ تھا۔ وہ مکمل چھان بین کے بعد بستر کی طرف بڑھا مگر نٹل دوبارہ بجی تو وہ بھاگ کر ہول سے دیکھنے لگا مگر باہر کوئی موجود نہ تھا۔

”کیا مصیبت ہے! کس چکر میں پڑ گیا ہوں کون ہے جو تنگ کر رہا ہے؟“

پھر وہ بیڈ پر بیٹھ گیا..... لیکن اگلے ہی لمحے وہ

ہر چیز نارمل ہونے لگی تھی ایسے کہ جیسے کچھ ہوا ہی نہ تھا۔
اصفہان کا خوف ابھی باقی تھا پچھلے دو ہفتے سے
ہر رات کچھ عجیب طرز کا واقعہ رونما ہو جاتا تھا لیکن صرف
تھوڑی دیر کے لئے اس کے بعد حالات نارمل
ہو جاتے تھے اور ایسے سارے واقعات صرف آدھی
رات کے بعد ہی رونما ہوتے تھے۔

پچھلی رات اس کے کمرے میں شدید قسم کا
زلزلہ آیا تھا۔ ہر چیز بکھر چکی تھی پٹکھٹنے لگا تھا۔ وال
کلاک زمین پر آ گری۔ سنگھار میز پر رکھے پر فوم نیچے
آن گرا تھا، سائیڈ میں دیوار سے لگی الماری دھڑام سے
فرش نشین ہو گئی تھی اس شدید ترین زلزلے میں وہ خوف
زدہ اور بدحواس ہو کر کمرے سے باہر آ گرا تھا۔ وہ نیند
میں اول فول بک رہا تھا۔ اس کی دماغی کیفیت پر کافی
برا اثر پڑا تھا۔ مگر پھر زلزلہ جیسے ختم گیا لیکن اس نے ساری
رات باہر لان میں گزاری تھی۔

اگلی صبح اسے حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔ کمرے
میں موجود ہر چیز اپنی اپنی جگہ پر قائم تھی۔ مگر اس نے
آنکھوں سے ہر چیز کو نیچے کرتے دیکھا تھا۔

وہ نیند سے بیدار ہوا تو ٹھنڈی گھاس نے اس کا
استقبال کیا۔ وہ رات کو زلزلے کی وجہ سے باہر نکل آیا تھا
اور لان میں ہی سو گیا تھا۔

لیکن پھر پتہ چلا کہ زلزلہ صرف اس کے کمرے
تک محدود تھا۔ اگر زلزلہ آتا تو ہر کوئی محسوس کرتا۔ محلے
میں کسی فرد واحد نے اس زلزلہ کی بات تک نہ کی۔
ماجرہ گھمبیر تھا۔

مگر پھر اسے دو رات پیچھے کا انوکھا واقعہ یاد آ گیا!
وہ رات کا آخری پہر تھا جب اسے شدید قسم کی
سردی محسوس ہونے لگی تھی گو کہ واقعی سردی تھی مگر اتنی شدید
ٹھنڈ کہ کمرہ میں موجود ہر چیز پر برف جمی شروع ہو گئی۔
لیکن اس وقت شدید ترین سردی میں برف جمنے سے وہ
ٹھنڈھرتے ہوئے کانپ رہا تھا۔ سردی محسوس کرنے سے
پہلے اسے جھٹکا لگا تھا جس سے اس کا بند پریش متاثر ہوا تھا
اچانک جھٹکے نے اس کے دل کی دھڑکن کو مزید تیز کر دیا

ایسے جیسے کہ دل سینے سے باہر نکل پڑے گا۔
سردی کا خوف ناک راج پورے کمرے میں چھا
رہا تھا۔ میٹر پر بھی برف جمنا حیران کن بات تھی۔ برف
بڑھتی چلی جا رہی تھی اور اس کا جسم اس برف میں چھپتا چلا
جا رہا تھا۔ مگر پھر منظر بدلا۔ ہر چیز نارمل ہونے لگی۔ برف
سرے سے غائب تھی۔ جیسے برف ہی نہیں.....!

اس کا دماغ گھوم کر رہ گیا تھا۔ کیونکہ اس قسم کے
واقعات خطرناک تھے۔ نجانے کون ایسا کر رہا تھا
اور کیوں ڈرانے کی کوشش کر رہا تھا؟

اسی طرح کی ایک اور خونی رات نے اسے
پاگل کر کے رکھ دیا تھا۔ وہ رات کا آخری پہر رہا ہوگا
جب اچانک اسے شدید پیاس محسوس ہوئی وہ ہڑبڑا کر
اٹھ بیٹھا فریج کچن میں تھا گو کہ اتنی سردی میں پیاس
بہت کم محسوس ہوتی ہے۔ مگر انسانی فطرت کہ پیاس کا
لگنا قدرتی ہے۔ وہ کٹن کی جانب بھاگا۔ شدید ٹھنڈ نہ
تھی البتہ محسوس ہوتا تھا جیسے فضا میں خشکی موجود ہے۔

کچن میں پہنچ کر اس نے فریج کھولا فریج کی
مذہم الٹ میں تمام چیزیں واضح ہو گئیں۔ واٹر سائیڈ
میں پانی کی چار سے پانچ بوتلیں رکھی ہوئی تھیں اس نے
ایک بوتل کو اٹھا کر فریج بند کیا مگر پھر لگا جیسے پانی میں
خون شامل ہو گیا ہے یہ کیسے ممکن تھا کہ پانی سرخ رنگ
کے خون میں بدل گیا تھا۔ وہ گاڑھا سرخ خون تھا
یہ ایک اس کے ہاتھ سے بوتل چھوٹ گئی اور بوتل کا
ڈھکن کھل گیا، اور فرش سرخ خون سے سرخ ہو گیا تھا۔ وہ
خوف زدہ نظروں سے فرش کو دیکھے جا رہا تھا دماغ
سائیں سائیں اور جسم پر پسینہ پھوٹ پڑا تھا۔ پیاس
بڑھتی چلی جا رہی تھی جیسے وہ پیاس سے مر جائے گا۔
مگر پھر پیاس کا اثر ختم ہونے لگا اس کی اتر
حالت خاصی بہتر ہونے لگی۔

وہ خوف زدہ کچن سے باہر نکل آیا۔ آہستہ
آہستہ سب بہتر ہو رہا تھا پیاس باقی نہ تھی جیسے سب کچھ
ٹھیک تھا اگلی صبح فرش پر سرخ رنگ کا سیال نظر نہ آیا۔ اس
نے حیرت سے فریج میں رکھی پانی کی تمام بوتلوں کو چیک

صنف نازک کی فریاد

ہم لڑکیاں اپنے گھر کا آنگن ہوتی ہیں، دنیا کی تلخ
ہواؤں اور طوفانوں سے بے خبر ہم اپنی آنکھوں
میں بہت سے خوبصورت خواب سجالتی ہیں۔ بنا
یہ سوچے کہ خوابوں کے ٹوٹنے کی کرچیاں جب
آنکھوں کو زخم دیں گی ان پر مرہم رکھنے والا بھی
کوئی نہ ہوگا، ہم لڑکیاں اپنی محبت کو دل میں
چھپائے، بغیر کسی سے کچھ کہے اپنے گھر سے
رخصت ہو جاتی ہیں، لیکن اپنے جذبات کو زبان
پر لانے سے صرف اس لئے ڈرتی ہیں کہ کہیں
اس سے ہمارے والدین کی عزت رسوا نہ ہو، ہم
لڑکیاں اپنے گھر اور گھر والوں کے لئے دعائیں
مانگتی ہیں لیکن کبھی اپنی ذات کے لئے کچھ نہیں
مانگتیں، ہم یہ سوچتی ہیں کہ ہماری ذات کی خوشیاں
اور تکمیل ہمارے گھر والوں کے دم سے ہیں۔
ہمارے آنسو، احساسات، جذبات اور تمنائیں
کبھی ظاہر نہیں ہوتیں، ہم بہت کچھ کہنا چاہتے بھی
کہہ نہیں پاتیں، ہمارے جذبات، تمنائیں ہماری
مجبوریوں تلے دب کر دم توڑ دیتی ہیں اور ہم
لڑکیاں ہمیشہ سے اپنی خوشیوں سے زیادہ اپنی اور
اپنے والدین کی عزت کا بھرم رکھتی ہیں، بس ایسی
ہی ہوتی ہیں ہم لڑکیاں۔

(انتخاب: شرف الدین جیلانی - ٹنڈوالہار)

”دروازہ کھولو! دروازہ کھولو!“ باہر کوئی نسوانی
آواز تھی۔ وہ دروازہ کھولنے کے لئے اٹھا دروازہ
کھولتے ہی اس کا وجود لرز کر رہ گیا۔
”عجبت تھی سیاہ لہجے بال سرخ لمبی زبان سیاہ
چہرہ.....!“ وہ کرا اور بے ہوش ہو گیا۔
☆.....☆.....☆

اگلی صبح سورج کی تیز روشنی نے اسے جگایا تو اس
کو بدروح نما نگہت کا خیال آیا۔
وہ جلدی سے اٹھا ہر کمرہ چھان مارا مگر رات والی
جڑیل نظر نہ آئی۔

آج آفس کی چھٹی تھی صبح تقریباً گیارہ بجے اس
سے ملنے کے لئے اس کا ایک دوست آیا اور ساری روداد
سنانے کے بعد اس نے آئینہ دیا کہ ”کسی ماہر عامل
سے رابطہ کر کے اس سارے معاملے کو حل کیا جائے۔“
چند لمحے بعد ہی وہ ایک عامل کا نمبر ڈائل
کر رہا تھا مگر دوسری طرف سے پیغام ملا کہ شاہ صاحب
کے گھر حاضر خدمت ہوں۔ ”پیغام ملتے ہی وہ ہائیک
نگال کر روڈ پر آ گیا اس کا رخ شاہ صاحب کی رہائش گاہ
کی طرف تھا۔

وہ مناسب رفتار سے ہائیک چلا رہا تھا روڈ
پر گاڑیاں زیادہ نہ تھیں، ایک موٹر پر اس نے ٹرن لیا مگر
سامنے کا منظر بدلا ہوا تھا وہ صحرا نما علاقہ تھا ریت ہی
ریت، لیکن یہ کیسے ممکن تھا؟ شہر کا وہ علاقہ بھلا صحرا میں
کیسے تبدیل ہو گیا؟ وہ بریک لگا نا چاہتا تھا مگر بریک نام
کی کوئی چیز کام نہ کر رہی تھی۔

اسپیڈ ہلکی کرنے کی کوشش نے اسپیڈ مزید
بڑھادی۔ صحرا کا سفر شروع ہو چکا تھا ہائیک گرم ریت
پر بڑی تیزی سے دوڑ رہی تھی۔

اچانک ایک جھٹکا لگا اور ہائیک رک گئی۔ ہائیک
چھوڑ کر وہ صحرا کے گرم ریت پر چلنے لگا تا حدنگاہ ہر طرف
صحرا کی ریت.....

وہ شہر سے اس صحرا میں کیسے پہنچا تھا! ”یہ سوچ
کر اس کا سر پھٹا جا رہا تھا، سورج کی تمازت بڑھتی

گھات کا۔ وہ دوبارہ گھر لوٹ آیا.....! تنہا آدمی اور اتنی خوف ناک اور دلخراش واقعات!

اگلی رات زیادہ خوف ناک ثابت ہوئی۔ وہ آفس سے واپس آیا فریش ہونے کے بعد ڈورنٹل بجی وہ دروازہ کی طرف بڑھا۔ دروازہ کھولا تو سامنے ایک خوبصورت لڑکی پریشان صورت لئے کھڑی تھی۔

”جی فرمائیں؟“ اس نے دروازہ کھولتے ہی کہا مگر سامنے ایک نوجوان لڑکی کود کچھ کر وہ نرم بڑ گیا۔ اس کے ذہن میں عورت سے ہمدردی موجود تھی لڑکی کی آنکھوں میں پراسرار کشش تھی۔

”جی آپ کون؟ اور اتنی رات کو یہاں کیسے؟“ اس نے پوچھا۔

”میرا نام غبت ہے۔ گاؤں سے یہاں اپنے ماموں کے گھر آئی ہوں! مگر ماموں کا گھر مل نہیں رہا۔“

”چلئے ڈھونڈتے ہیں آپ کے ماموں کا گھر۔“

”میں ہر جگہ تلاش کر چکی مگر ان کا کچھ پتہ نہیں۔“ وہ بولی۔

”تو اس حالت میں تلاش کے علاوہ اور کیا ہو سکتا ہے۔“

”مجھے آج کی رات آپ کے پاس.....!“

اسے یہ غیر اخلاقی لگا۔ ایک جوان مرد اور لڑکی بھلا کس رو سے ایک چھت تلے رات گزار سکتے تھے۔

”دیکھئے میڈم! میں اکیلا رہتا ہوں! آپ کو میں ریسٹورنٹ چھوڑ آتا ہوں۔“ وہ بولا۔

”مجھے آپ پر اعتماد ہے صرف ایک رات ہی کی تو بات ہے صبح ہوتے ہی میں اپنے گاؤں چلی جاؤں گی۔“

چار روٹا چار! ہمدردی نے فتح کے جھنڈے گاڑ دیئے اور وہ لڑکی اصحابان کے دوسرے کمرے میں ایک رات کے لئے آباد ہو گئی۔

اس رات خوف نے ڈیرے جمائے رکھے۔ رات بارو بجے کے بعد اچانک اس کے روم کا دروازہ دھڑ دھڑایا گیا۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔

ٹرپ اٹھا بیڈ تانبے کی مانند گرم ہو رہا تھا اس کا جسم لرزنے لگا پھر آہستہ آہستہ پورا کمرہ گرم ہونے لگا پورا کمرہ گرم ہو رہا تھا درجہ حرارت بڑھتا جا رہا تھا۔ وہ دروازے کی طرف بڑھا ہینڈل بھی شدید گرم ہو رہا تھا دوسرے لمحے وہ باہر تھا۔

اس نے راہداری کی طرف دوڑ لگا دی۔ میٹریوں سے وہ ہانپتا کانپتا کاؤنٹر تک جا پہنچا۔

ٹائٹ ڈیوٹی پر اسٹاف موجود تھا۔ وہ سب اچانک اس افتاد پر بوکھلا گئے۔

”بھوت، بھوت!“ وہ چلانے لگا۔ اسٹاف نے اسے زبردستی پکڑا۔

”سراہوش میں آئیں! کہاں ہے بھوت! کیسا ہے بھوت!“ سب ہی بوکھلا گئے تھے۔

”روم 272 میں..... تم لوگ میرے ساتھ چلو وہاں شدید گرمی ہے۔“ وہ بولتا چلا گیا۔ وہاں موجود لوگ ہڑبڑا گئے۔

”جناب ہمارے ریسٹورنٹ کا خیال کریں لوگ اپنے اپنے کمرے میں آرام کر رہے ہیں اور یہاں کوئی بھوت پریت نہیں.....!“ منیجر بولا۔

لیکن وہ اسٹاف کے لوگوں کو اپنے کمرے میں لے آیا مگر یہاں تو سب کچھ ٹھیک تھا۔ نہ گرمی اور نہ خوف کا احساس!

اسٹاف نے سوالیہ نظروں سے اسے گھورا!

”یہاں گرمی ہے نہ سردی! ایک دم فٹاسٹک موسم ہے اسر! آپ نے کوئی ڈراؤنا خواب دیکھ لیا ہو گا۔ سو جائیے!“ منیجر بولا۔

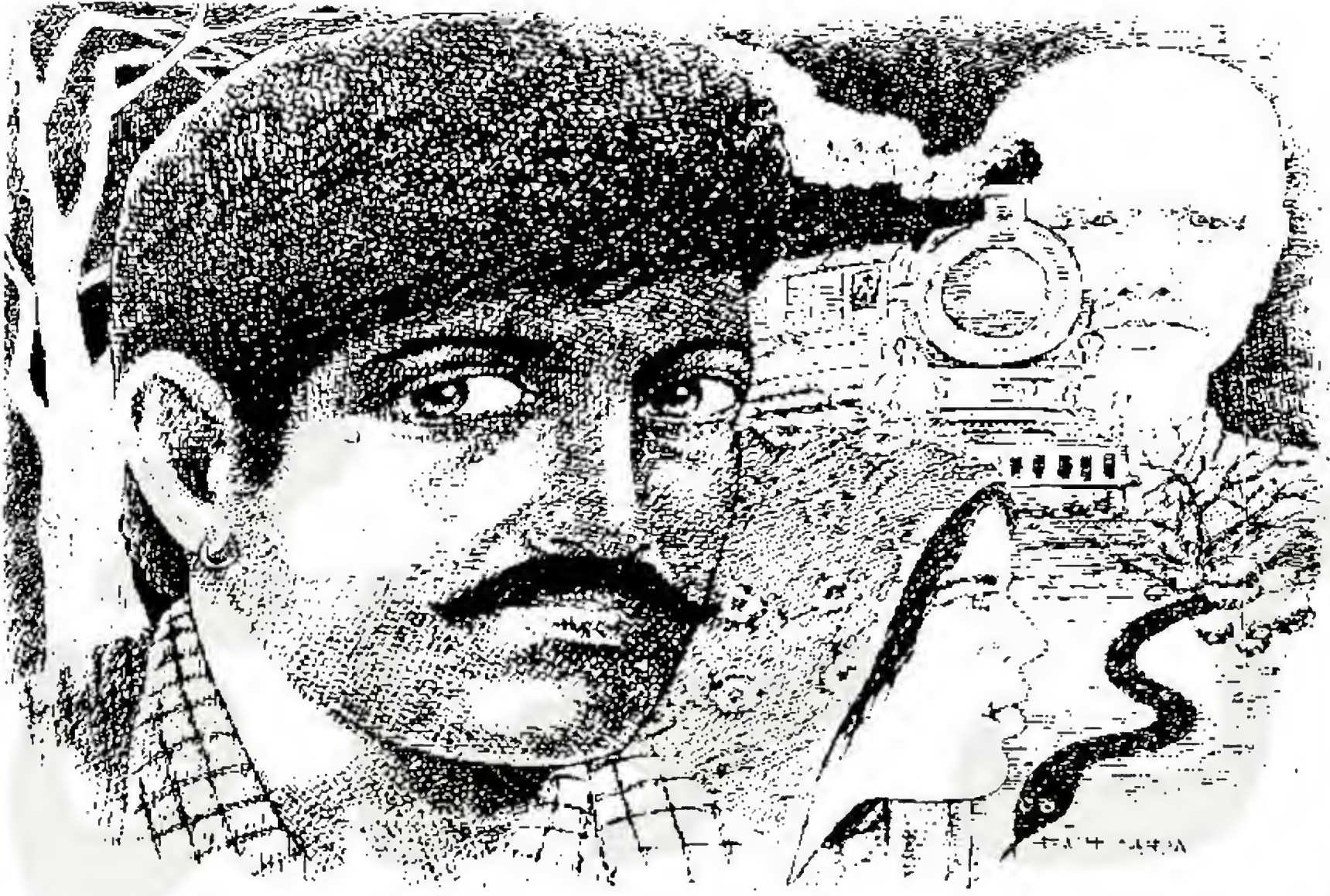
وہ حیرت ناک نظروں سے انہیں جاتا دیکھتا رہا۔

”یہ کیسے ممکن تھا سب کچھ اس کی حقیقی آنکھوں کے سامنے ہوا تھا اسٹاف کے لوگ گئے مگر باہر سے دروازہ بند کر گئے۔“

☆.....☆.....☆

اگلی صبح ریسٹورنٹ انتظامیہ نے اسے ریسٹورنٹ چھوڑنے کا نوٹس جاری کر دیا، دھوبی کا کتانہ گھر کا رہانہ

Dar Digest 234 January 2015



موت کا سامنا

ضرغام محمود - کراچی

رات کا گھٹا ٹوپ اندھیرا اور ویران قرب و جوار قدم قدم پر
جان لیوا موت کا کھٹکا ایسی صورت اور تن تنہا ناتجربہ کار،
زمانے کے اونچ نیچ سے مبرا نوجوان اور پھر واقعی موت اس کے
سامنے آن کھڑی ہوئی تو.....

جب حقیقت میں موت سامنے کھڑی ہو تو کیسا محسوس ہوگا۔ لہذا یہ حقیقی کہانی پڑھنا بھولنے کا

ہوا تھا اس کے سر پر فلیٹ ہیٹ تھا جس نے اس کا آدھا
چہرہ چھپایا ہوا تھا اس نے اپنے ہاتھ میں نارچ پکڑی
ہوئی تھی نارچ کی روشنی میں اس نے اس کمرے کا جائزہ
لیا جس میں وہ دروازہ کھول کر داخل ہوا تھا وہ کمرہ شاید
ڈرائنگ روم کے طور پر استعمال ہوتا تھا نارچ کی روشنی
صوفے سے ہوتی ہوئی سیاہ آئینے پر رکی، پھر ایک
لمحے بعد اس شخص نے نارچ کا رخ دیوار کی جانب کیا،

بجلی کی کڑک دل دہلا دینے والی تھی،
بادل اس طرح گرج رہے تھے گویا جنگل میں شیر دھاڑ رہا
ہو۔ موسلا دھار بارش ہر چیز کو بہا لے جانے کو تیار تھی
چاروں طرف مہیب سناٹا لگیا، سر ٹکیں سنسان و ویران
تھیں، اندھیری رات میں کبھی کبھی بجلی کی کڑک سے منظر
روشن ہو جاتا تھا، ایسے میں وہ شخص ایک مکان کا دروازہ
کھول کر اندر داخل ہوا اس نے لمبا سا کالا رین کوٹ پہنا

Dar Digest **237** January 2015

کیا ہے، یہ کیوں میرے پیچھے پڑ گئی ہیں؟“ اصفہان نے پوچھا۔

”کبھی کبھی بے قصور آدمی بھی عتاب کی زد سے آجاتا ہے۔ تم نے آسبی گھر میں موجود مخلوق کو تنگ کیا۔ تمہیں محسوس تک نہ ہوا، جس گھر میں تم رہتے ہو وہ آسب زدہ ہے، سالوں سے وہاں کوئی نہ گیا تبھی وہاں نظر نہ آنے والی مخلوق نے ڈیرہ جمالیا۔ وہ گھر ایک طویل عرصہ سے خالی پڑا تھا اور یہ حقیقت ہے کہ کوئی مکان ایک طویل عرصہ تک خالی پڑا رہتا ہے تو اس میں ناپیدہ مخلوق اپنا بسیرا کر لیتی ہیں، اس لئے کہا گیا ہے کہ ایسے کسی مکان کو طویل عرصہ تک خالی نہ چھوڑا جائے بلکہ اس کی کوئی نہ کوئی دیکھ بھال کرتا رہے اور مغرب کے وقت خالی مکان میں چراغ ضرور جلاتا چاہئے۔ ایسی صورت میں ناپیدہ قوتیں اس جگہ سے دور رہتی ہیں۔ یہ تو شکر ہے کہ انہوں نے تمہیں جان سے نہیں مارا۔“ بزرگ نے کہا۔

”باباجی! مجھے مشورہ دیں کہ میں کیا کروں؟“
”اس آسب زدہ گھر کو فوراً چھوڑ دو! اور پاک صاف رہو!“ بزرگ نے کہا۔

”ٹھیک ہے باباجی! لیکن میں جہاں جاتا ہوں وہ میرے ساتھ آ جھٹکتی ہیں۔“

”اب ایسا نہ ہوگا ایک خاص عمل کے تحت یہ مخلوق تمہارا پیچھا چھوڑ دیں گی۔ وہ عمل میں کردوں گا، تم فکر نہ کرو، اللہ کو ہر وقت یاد رکھا کرو اور پابندی سے نماز پڑھا کرو۔“ یہ بول کر بزرگ خاموش ہو گئے۔

”آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ نماز کی پابندی ضرور کروں گا۔“ اصفہان بولا۔

اور پھر منظر بدلا تو وہ اپنے گھر میں اپنے بستر پر موجود تھا پھر وہ چونک گیا، اور جلد از جلد اس نے اپنا سامان سمیٹا اور اس گھر کو چھوڑ دیا۔ وہ اپنے آپ میں بہت زیادہ قلبی سکون محسوس کر رہا تھا۔



جاری تھی اور گرمی کا اثر بھی بڑھتا جا رہا تھا، ریت گرم ہو رہی تھی اور پیاس بھی عروج پر تھی وہ دوڑنے لگا، اونچے اونچے ٹیلوں نے اسے بے حال کر دیا پیاس بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ سلق خشک ہوتا جا رہا تھا تبھی اسے دور سے ایک چشمہ نظر آیا وہ سراب تھا یا حقیقی نخلستان۔ وہ امید بہاراں کے مصداق اس طرف دوڑنے لگا۔

بہت نزدیک جا کر اسے نخلستان نظر آ گیا وہاں واقعی ٹھنڈے پانی کا چشمہ تھا اس نے خوب میر ہو کر پانی پیا اور پھر اچانک اسے اللہ یاد آیا۔

وہ صدق دل سے اللہ کو یاد کرنے لگا۔ اور اللہ نے اس کی مدد کی۔

پانی پی کر وہ فریش ہو گیا تھا اسے وہ جگہ بہت پسند آئی، شہر کے ہنگاموں سے دور پر سکون جگہ کہ اسنے میں اسے پہلی کا پٹر کی آواز سنائی دی مگر جب اس نے غور کیا تو وہ کسی بہت بڑے پرندے کی آواز تھی وہ بڑی چونچ والا عجیب سا پرندہ تھا اس کا رخ سیدھا اسی کی طرف تھا اس کے پر اور مضبوط پنجاں نے اس کو گردن سے پکڑ لیا اور وہ پرندہ پرواز کرنے لگا پھر جیسے صحرا ختم ہونے لگا وہ ایک پہاڑی سلسلے کی طرف آچکا تھا۔

وہاں ایک جھونپڑی تھی دامن کوہ میں خاصی چہل پہل تھی وہاں ایک جھیل موجود تھی پرندے نے اسے جھونپڑی کے سامنے چھوڑا اور دوسری جانب اڑ گیا۔

وہ حیران زدہ جھونپڑی کے سامنے کھڑا تھا کہ اسے خیال آیا کہ اس جھونپڑی کے اندر چیک کیا جائے۔ اندر کوئی ذی روح موجود نہ تھی مگر انسانی استعمالات کی اشیاء موجود تھیں شام کا دھندلا پھیلنے والا تھا کہ اس وقت جھونپڑی میں ایک باریش بزرگ کی آمد ہوئی۔ بزرگ نے اس پر شفقت بھری نظر ڈالی اور بولے۔ ”تم اصفہان قریشی ہو شکر کرو کہ شرکی قوتیں تباہ ہو گئیں ورنہ وہ آج تمہیں زندہ نہ چھوڑتیں۔“

”باباجی! یہ شرکی قوتیں کون ہیں اور کیوں میرا جینا حرام کر دیا ہے آخر میرا قصور کیا ہے؟ اور ان کا مقصد

شکر

شکر ادا کرنا بھی ایک بیماری ہوتی ہے، ایسی بیماری جو ہمارے دلوں کو روز بروز کشادگی سے تنگی کی طرف لے جاتی ہے۔ جو ہماری زبان پر شکوہ کے غلغلہ اور کچھ آنے ہی نہیں دیتی۔ ہمیں اللہ کا شکر ادا کرنے کی عادت نہ ہو تو ہمیں انسانوں کا شکر یہ ادا کرنے کی بھی عادت نہیں پڑتی۔ اگر ہمیں خالق کے احسانوں کو یاد رکھنے کی عادت نہ ہو تو ہم کسی مخلوق کا احسان بھی یاد رکھنے کی عادت نہیں سیکھ سکتے۔

(عمیرہ احمد کی ”پیر کامل“ سے اقتباس)

(انتخاب: ذکا اللہ - کراچی)

کے سر پر زور سے ضرب لگائی، جس کی وجہ سے قاتل کا سر پھٹ گیا اور اس کا منہ اس کے اپنے ہی خون سے تر ہو گیا، لڑکی ڈنڈا مار کر بھاگنا چاہتی تھی کہ اس قاتل نے اپنی ٹانگ لڑکی کی ٹانگوں میں پھنسا لی اور لڑکی دھڑام سے نیچے گر پڑی قاتل نے جلدی سے اس لڑکی کو دیوچ لیا اور اپنے مضبوط ہاتھوں سے لڑکی کا گادبانے لگا، لڑکی کی آنکھیں ابلنے لگیں، ایسا لگتا تھا کہ اس کی آنکھیں حلقوں سے باہر آجائیں گی اس کی سانس رکنے لگی اور وہ بچاؤ کے لئے ہاتھ ہیر مارنے لگی کہ..... کہ اچانک کھٹکے کی داز ہوئی اور کمرہ دو دھیاروشنی میں نہا گیا۔

”بنتے میں چھ دن دفتر میں رہتے اور پھنسی کے دن ہارر مووی دیکھتے گزارتے ہو.....“ امی جان نے پہلے کمرے کا بلب جلایا پھر ریوٹ اٹھا کر ٹی وی بند کر دیا۔

”امی جان بڑی اچھی مووی تھی.....“ میں نے بستر پر لیٹے لیٹے کہا۔

عورت کی بیٹی تھی، عورت نے قاتل کا خنجر والا ہاتھ کلائی کے پاس سے پکڑا اور زور سے چیخنی۔ ”گو بے بی.....“ ”گو“ دروازے میں کھڑی لڑکی گم سم کھڑی تھی۔ عورت قاتل سے جدوجہد کرتے ہوئے پھر چیخنی۔ ”گو.....“ بے بی..... ”گو.....“ دروازے میں کھڑی لڑکی فوراً دروازے سے باہر کی جانب بھاگی۔

اسی وقت قاتل نے اپنا خنجر والا ہاتھ پھرایا اور ایک ہٹلے سے خنجر عورت کے پیٹ میں اتار دیا۔ عورت کے منہ سے ایک بھیانک چیخ نکلی اور اس کے پیٹ سے خون ابل پڑا اور وہ مایہ بے آب کی طرح تر پنے لگی قاتل نے اس عورت کو چھوڑا اور اٹھ کھڑا ہوا، اپنے سر پر بیٹ جھامایا اور خون آلود خنجر لے کر لڑکی کے تعاقب میں چل دیا۔ لڑکی گھر سے باہر کی جانب بھاگی تھی لہذا قاتل بھی گھر سے باہر آ گیا، باہر تیز بارش ہو رہی تھی گھپ اندھیرا چھایا ہوا تھا، مگر بجلی کی کڑک کبھی کبھی منظر کو بالکل واضح کر رہی تھی قاتل کے کپڑوں اور خنجر سے خون ٹپک ٹپک کر بارش کے پانی میں مل رہا تھا قاتل نے گھر سے باہر آ کر سڑک کے دونوں جانب دیکھا، سڑک مکمل سناں تھی، اس نے اندازہ لگانے کی کوشش کی کہ لڑکی کس جانب بھاگی ہوگی، اچانک اس کی نظر سڑک کے کنارے دلدلی زمین پر پڑی جہاں پیروں کے تازہ نشان تھے قاتل کے چہرے پر ایک بھیانک مسکراہٹ آئی اور وہ ان قدموں کے نشان کے سہارے آگے بڑھا وہ چوکنے انداز میں چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔ خنجر اس نے ہاتھ میں پکڑا ہوا تھا بارش کے پانی نے اس کے کپڑوں اور خنجر پر سے خون دھو دیا تھا۔

قاتل سڑک کے اطراف جھاڑیوں کو بغور دیکھ رہا تھا اسے ایک طرف کی جھاڑیوں پر تھوڑا سا شک گزرا تو وہ اس جھاڑی کے قریب گیا اور جھک کر دیکھنے لگا، اچانک کوئی چیز اس کے سر سے بڑی زور سے ٹکرائی اور وہ منہ کے بل گر پڑا، خنجر اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا اس نے گرتے ہی پلٹ کر دیکھا لڑکی اپنے ہاتھ میں ایک موٹا سا ڈنڈا لئے کھڑی تھی اس نے اس ڈنڈے سے قاتل

پیڈ کی جانب بڑھا جہاں تصویر والا مرد اور عورت سو رہے تھے۔ اس شخص نے اپنا خنجر والا ہاتھ بلند کیا اور ایک جھٹکے سے خنجر مرد کے سینے میں اتار دیا مرد کے منہ سے ایک دلخراش چیخ نکلی اور اس کے سینے سے خون کا نوارا بلند ہو گیا، قاتل نے خنجر اس کے سینے سے نکال کر اس کے پیٹ میں کھسک دیا۔

مرد کی چیخ سن کر عورت کی آنکھ کھل گئی اس نے لمبھی روشنی میں جو یہ بھیا تک منظر دیکھا تو چیختے ہوئے بیڈ سے اٹھ کر بھاگی مگر قاتل نے اس کی ٹانگ پکڑ کر جھکا دیا تو وہ بیڈ سے نیچے کمرے کے فرش پر گر گئی مگر پھر پھرتی سے اٹھی اور کمرے کے دروازے کی جانب بھاگی، قاتل نے خنجر مرد کے پیٹ سے نکالا اور عورت کے پیچھے بھاگا، مرد بیڈ پر بری طرح تڑپ رہا تھا اس کے خون سے بیڈ اور کمرے کا فرش سرخ ہو رہا تھا۔

قاتل عورت کے پیچھے بھاگا عورت کمرے کے کھلے دروازے سے باہر بھاگی مگر قاتل نے ڈرائنگ روم میں اسے گھیر لیا عورت نے ڈرائنگ روم میں رکھی چیزیں اس قاتل پر پھینکنی شروع کر دیں، مگر قاتل نہایت چالاکی سے اس کے ہر وارے سے بچتا رہا، عورت پیچھے ہٹتے ہٹتے دیوار سے جا لگی تو قاتل نے آگے بڑھ کر عورت کی گردن پکڑ لی اور ایک قہقہہ لگایا اس کا قہقہہ نہایت کمرہ تھا عورت اس کے ہاتھوں میں بن پانی پھینکی کی طرح تڑپ رہی تھی۔

اچانک اس عورت نے اپنی دائیں ٹانگ کا گھٹنا قاتل کی دونوں ٹانگوں کے درمیان میں مارا، قاتل کے منہ سے ایک تکلیف دہ آواز نکلی اور اس کی گرفت نرم پڑ گئی، عورت فوراً اس قاتل کی گرفت سے نکل کر بھاگی مگر قاتل نے جھکتے ہوئے اس عورت کی ٹانگ پکڑ لی وہ عورت دھڑام سے فرش پر گر پڑی قاتل اس عورت کے اوپر چڑھ گیا اور خنجر والا ہاتھ اوپر کیا تاکہ خنجر اس عورت کے پیٹ میں اتار سکے۔

اسی وقت اس عورت کی نظر دروازے پر پڑی جہاں ایک پندرہ سولہ سال کی لڑکی کھڑی تھی جو اس

دیوار پر ایک پینٹنگ لگی ہوئی تھی، پینٹنگ ایک عورت کی تھی جس نے لمبا سا چنہ پہن رکھا تھا اس کے سر پر ایک زندہ سانپ کنڈلی مارے بیٹھا تھا اس سانپ کی دو شاخہ زبان اندر باہر کو ہو رہی تھی اور وہ اپنی گول گول آنکھوں میں زمانے بھر کی خوفناکی سمیٹے سامنے دیکھ رہا تھا۔

عورت نے ہاتھ میں ایک عجیب سا ڈنڈا پکڑا ہوا تھا جس کے سرے پر بھی ایک سانپ بچن پھلائے بیٹھا تھا۔

عورت کے سامنے ایک تالاب تھا جس میں ایک آدمی ڈوب رہا تھا اور اس آدمی کی آنکھوں میں موت کا خوف واضح تھا، عورت کی نظریں اس آدمی پر جمی ہوئی تھیں۔

پھر اس شخص نے نارچ کی روشنی دوسری دیوار پر ماری، دوسری دیوار پر بھی ایک پینٹنگ لگی ہوئی تھی ایک انسانی کھوپڑی کی پینٹنگ جو سیاہ مینسل سے بنائی گئی تھی اور اس کھوپڑی کے ماتھے سے سرخ رنگ کی شعاعیں نکل رہی تھیں۔ اس شخص نے نارچ کی روشنی آگے بڑھائی، آگے ایک مرد اور عورت کی تصویر تھی، شاید ان کی شاہوی کی تصویر تھی کیونکہ آدمی اور عورت دونوں ان کے مخصوص لباس میں تھے، نارچ والے آدمی کے ہونٹوں پر اس تصویر کو دیکھ کر مسکراہٹ دوڑ گئی اس شخص کی مسکراہٹ بھی بہت بھیا تک تھی اس کے پیلے پیلے دانت عجیب کراہیت کا منظر پیش کر رہے تھے، اس شخص نے نارچ کی روشنی کی مدد سے آگے کی جانب پیش قدمی کی۔

آگے ایک اور کمرہ تھا اس نے اس کمرے کا دروازہ کھولا اور اندر داخل ہوا، کمرے میں زبرد پاور کا ٹائٹ بلب جل رہا تھا اس شخص نے اپنی نارچ بند کی، کمرے کے جہازی سائز کے بیڈ پر ایک مرد اور عورت سو رہے تھے مرد اور عورت وہی تھے جن کی تصویر ڈرائنگ روم کی دیوار پر لگی ہوئی تھی۔

نارچ والے آدمی نے نارچ اپنے رین کوٹ کی جیب میں رکھی اور دوسری جیب میں ہاتھ ڈالا جب ہاتھ باہر آیا تو اس میں ایک لمبا سا خنجر تھا وہ شخص آہستہ آہستہ

ساتھ کوئی زبردستی ہو، شادی زندگی بھر کا ساتھ ہے اس لئے اگر لڑکا لڑکی اپنی خوشی اور رضامندی سے ایک دوسرے کو پسند کر لیں تو زندگی نہایت خوشگوار اور پرسکون گزرتی ہے۔۔۔۔۔ ابا جان بولے۔

”اگر تم کہیں انٹرنیشنل نہیں ہو تو ہم چاہتے ہیں کہ تمہاری شادی خاندان ہی میں ہو۔۔۔۔۔ اس لئے تم ایک ہفتے کی چھٹی لو اور گاؤں چلے جاؤ جہاں تمہارے تایا زاد بھائی ایاز کی منگنی ہے تم سنگتی میں شرکت بھی کر لو اور اگر وہاں کوئی لڑکی پسند آئے تو ہمیں مطلع بھی کر دو۔۔۔۔۔“ امی جان نے تفصیل میرے گوش گزار کی۔

”آپ لوگ نہیں جا رہے سنگتی میں۔۔۔۔۔“ میں نے پوچھا۔

”تمہارے ابا کو چھٹی نہیں ملی اور ادھر کالج میں بھی امتحانات چل رہے ہیں لہذا میرا بھی چھٹی لینا ممکن نہیں ہے اس لئے تم تیاری کر دو اگلے ہفتے سنگتی میں شرکت کے لئے چلے جاؤ۔“ امی جان نے کہا تو میں نے سعادت مندی سے گردن جھکالی۔

☆.....☆.....☆

میں نے گاڑی بڑی سی حویلی کے سامنے روکی ڈسٹرکٹ امرکوٹ جو اب امرکوٹ کہلاتا ہے کی تحصیل خانہ سے دس منٹ کی مسافت پر گوٹھ قائم صدیقی میں واقع یہ عظیم الشان حویلی میرے پردادا قائم علی صدیقی نے بنوائی تھی یہ پورا علاقہ ان کے نام پر گوٹھ قائم علی صدیقی کہلاتا ہے۔ اس حویلی کو میرے پردادا نے انگریزوں کے دور میں بڑی محنت اور محبت سے تعمیر کروایا، بے پور کے پنک پتھر سے تعمیر یہ حویلی جس کی نفاست اور فن تعمیر بنوانے والے کی محبت کی مظہر تھی، گوٹھ قائم صدیقی میں یہ حویلی سر اٹھائے بڑے شان و وقار سے کھڑی تھی، میں نے حویلی کے منقش گیٹ کے سامنے اپنی گاڑی روکی اور نیچے اتر کر بیگ کندھے پر ڈالا اور حویلی کی جانب قدم بڑھا دیئے۔ سب کو چونکانے کے خیال سے میں نے اپنی آمد کا تذکرہ نہیں کیا تھا حتیٰ کہ امی جان اور ابا جان کو بھی منع کر دیا تھا کہ وہ اس بات کا تذکرہ

تمہاری شادی کا سوچ رہے ہیں اگر تمہیں کوئی لڑکی پسند ہے تو ہمیں بتادو۔۔۔۔۔“ امی جان نے نہایت سنجیدگی سے پوچھا۔

”مما۔۔۔۔۔ جہاں تک میری پسند کا تعلق ہے تو مجھے ایک لڑکی پسند ہے۔۔۔۔۔“ میں نے بھی جواباً سنجیدگی اختیار کی میری بات سن کر اخبار پڑھتے ابا جان بھی چونک اٹھے۔

”کون۔۔۔۔۔ لڑکی۔۔۔۔۔ کس خاندان سے ہے؟“

”اچھے گھر اور خاندان کی ہے۔۔۔۔۔“

”بات کہاں تک پہنچی ہے۔“ امی جان بھی گفتگو میں شامل ہو گئیں۔

”جی پچاس فیصد بات طے ہے۔“ میں نے نہایت سنجیدگی سے جواب دیا۔

”غضب خدا کا ہمیں پتا نہیں اور بات پچاس فیصد طے بھی ہو گئی۔“ ابا جان بولے۔

”کون ہے وہ لڑکی۔۔۔۔۔؟“ امی جان نے تیکھے لہجے میں دریافت کیا۔

”کترینہ کیف۔۔۔۔۔“ میں نے انتہائی معصومیت سے جواب دیا۔

”انتہائی بھونڈا مذاق ہے۔“ امی جان میری شرارت سمجھ کر مسکرا دیں۔

”پچاس فیصد طے ہونے والی کیا بات ہے؟“

ابا جان بال کی کھال نکالنے پر قہقہے۔

”میں مکمل راضی ہوں، اس لئے پچاس فیصد بات طے ہے اس کی طرف سے ہاں کا انتظار ہے۔“

میں نے جواب دیا۔

”سنان کے مسلز دیکھے ہیں چھری طرح مسل دیئے جاؤ گے۔۔۔۔۔“ امی جان نے بھی مسکرا کر جواب دیا۔

”مما۔۔۔۔۔ آپ پہلے بھی کتنی مرتبہ مجھ سے پوچھ چکی ہیں اور میں بتا چکا ہوں کہ مجھے کوئی لڑکی پسند نہیں ہے جہاں آپ کا حکم ہوگا میں سر جھکا دوں گا۔“ میں نے انتہائی سنجیدگی سے کہا۔

”دیکھو سجاد۔۔۔۔۔ ہم نہیں چاہتے کہ تمہارے

دار Digest 241 January 2015

سکتے ہو؟“ ابا جان نے پھر پوچھا۔
 ”جی کوئی خاص کام۔۔۔؟“ میں نے پوچھا۔
 ”میں نے جو سوال کیا اس کا جواب نہیں
 ملا۔۔۔“ ابا جان نے خشکیوں نظروں سے مجھے دیکھتے
 ہوئے کہا۔

”جی۔۔۔۔۔ مل جائے گی چھٹیاں۔۔۔۔۔ جاب
 جوائن کرنے کے بعد سے میں نے چھٹی نہیں لی اس لئے
 میرا خیال ہے کمپنی کو میری چھٹیوں پر اعتراض نہیں
 ہوگا۔۔۔۔۔“ میں نے تفصیلاً جواب دیا۔
 ”ہوں۔۔۔“ ابا جان نے ایک ہنکارا بھرا پھر گویا
 ہوئے۔۔۔۔۔“ سجاد! اب تم اٹھائیس سال کے ہو چکے
 ہو۔۔۔۔۔“

”لیکن۔۔۔۔۔ لیکن میری تو صرف سات ہی
 سالگراہیں آئی ہیں۔۔۔۔۔“ میں نے ابا جان کا جملہ
 درمیان سے کاٹا۔

”اس کے لئے میں یا تمہاری ماں قصور وار
 نہیں۔۔۔۔۔“ ابا جان بولے۔

”تو پھر کون قصور دار ہے۔۔۔۔۔“ میں نے انتہائی
 معصومیت سے پوچھا کیونکہ میں اتنیس فروری کو پیدا ہوا
 تھا جو کہ چار سال میں ایک مرتبہ آتی ہے اس لحاظ سے
 اٹھائیس سال میں میری صرف سات سالگراہیں ہی
 آسکی ہیں۔
 ”بدتمیز۔۔۔۔۔“ امی جان زیراب بولیں۔

”اس کے لئے تمہیں کلینڈر بنانے والے
 گریگوری کو گریبان سے پکڑنا چاہئے جس نے کلینڈر
 بناتے ہوئے اتنیس فروری چار سال میں ایک مرتبہ رکھی
 ہے۔“ ابا جان بولے تو میں نے سعادت مندی سے
 گردن ہلا دی۔

”آپ بھی کیا فضول بحث لے کر بیٹھ گئے اصل
 بات کیجئے۔۔۔۔۔“ امی جان نے نچ میں لقمہ دیا۔

”ٹھیک ہے تم ہی کرو بات۔۔۔۔۔“ ابا جان نے
 تیرکمان امی جان کے ہاتھ میں دے دیا۔

”سجاد۔۔۔۔۔ میں اور تمہارے ابا سنجیدگی سے

”فورا اٹھ جاؤ۔۔۔۔۔ اور فریش ہو کر آؤ۔۔۔۔۔“
 تمہارے ابا تمہیں یاد کر رہے ہیں۔“ امی جان بولیں۔
 ”ارے باپ رے۔۔۔۔۔ آج ہنٹر کو میری یاد
 کیسے آگئی۔“ میں بوکھلا گیا۔

”شرم نہیں آتی اپنے ابا کو ایسے کہتے ہوئے۔“
 امی جان بولیں۔
 ”ہنٹر کو ہنٹر نہیں کہیں گے تو پھر کیا کہیں گے۔“
 میں نے معصومیت سے کہا۔

”اس سے پہلے کے ہنٹر تمہیں گیس چیمبر کی سزا
 سنا دیں۔ تم فوراً ان کے حضور پیش ہو جاؤ۔۔۔۔۔“ امی جان
 نے کہا تو میں نے جلدی سے بستر چھوڑا اور ہاتھ روم کی
 جانب بھاگا۔

”آج خیر نہیں ہے سجاد علی صدیقی۔“ میں
 بڑبڑاتے ہوئے ہاتھ روم میں داخل ہوا۔

میں سجاد علی صدیقی ٹیلی کمیونی کیشن انجینئر اور
 اپنے والدین کی اکلوتی اولاد ہوں مگر اس کے باوجود والد
 صاحب نے نہایت سختی سے میری تربیت کی ان کا مقولہ
 تھا اولاد کو کھلاؤ سونے کا نوالہ مگر دیکھو شیر کی نظر سے الہذا
 میں جلدی سے فریش ہو کر ڈرائنگ روم میں جا پہنچا،
 جہاں ابا جان بیٹھے اخبار پڑھ رہے تھے اور امی جان
 اپنے کالج کا کوئی کام دیکھ رہی تھیں، میرے والد ایک ملٹی
 نیشنل کمپنی میں اچھے عہدے پر کام کرتے تھے جبکہ امی
 جان مقامی کالج میں لیکچرار تھیں۔

”السلام علیکم ابا جان۔“ میں نے سعادت مند
 بیٹے کی طرح سلام کیا۔

”وعلیکم السلام۔“ ابا جان نے بینک کے اوپر
 سے مجھے دیکھتے ہوئے سلام کا جواب دیا۔ ”آؤ بیٹھو۔“
 انہوں نے صوفے پر اپنے پاس جگہ بنائی۔

”آج کل تمہارے کیا مشاغل ہیں؟“ ابا جان
 نے میرے بیٹھنے کے بعد پوچھا۔

”کوئی خاص نہیں جاب اتنی ٹھف ہے کہ وقت
 ہی نہیں ملتا۔۔۔۔۔“ میں نے جوابا کہا۔

”کیا تم جاب سے ایک آدھ ہفتے کی چھٹی لے

مہمان

ایک کنجوس نے اپنے مہمان سے پوچھا۔

”اور سناؤ، ٹھنڈا پوگے یا گرم؟“

مہمان۔ ”دونوں۔“

کنجوس: ”یگم ایک گلاس فریج سے لے آؤ پانی کا“

اور ایک گلاس گیزر سے لے آؤ پانی کا۔“

(انوری رمضان - پنڈ وادون خان)

چھپے ہٹ گئی، مٹھائی اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔

”یہاں کیا کر رہی ہو جاؤ۔۔۔“ تالی اماں کی آواز پھر گونجی اور وہ لڑکی تیزی سے بھیڑ چیرتی ہوئی واپس چلی گئی، لڑکی کے جاتے ہی ہنگامہ اور شور پھر محفل کا حصہ بن گئے سب محفل میں اس طرح گگن ہو گئے جیسے کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔ میں نے حیرانگی سے اس لڑکی کو دور جاتے دیکھا اس لڑکی کی آنکھوں میں بے بسی کا وہ عالم تھا کہ مجھے لگا جیسے کسی نے تیز دھار خنجر میرے سینے میں اتار دیا، وہ میں نے اتنی بے بسی کبھی کسی آنکھ میں نہیں دیکھی تھی۔

”کون ہے یہ لڑکی؟“ عام سے میا لے رنگ کے کپڑوں میں لمبوس کسی میک اپ کے بغیر یہ کوئی عام لڑکی نہ تھی۔ تھوڑی دیر میں تقریب ختم ہوگئی تو میں دادی جان سے ملنے ان کے کمرے کی جانب چل دیا ان کے کمرے کے پاس پہنچا تو اندر سے مجھے کسی کے رونے کی آواز آئی، میں ٹھٹھک گیا۔ ”اندر کون رو رہا ہے۔۔۔۔۔“ میں نے سوچا اور دروازے سے کال لگا دیئے، حالانکہ یہ ایک غیر اخلاقی حرکت تھی لیکن میں بحس کے ہاتھوں مجبور تھا۔ اندر سے کسی لڑکی کی آواز آرہی تھی۔

”میرا کیا قصور تانی۔۔۔۔۔ کیا میں نے اپنی قسمت خود بنائی ہے، اللہ میرے ساتھ ہی کیوں نا انصافی کر رہا ہے۔“

”نہیں بیٹا۔۔۔۔۔ ایسی باتیں نہیں کرتے اللہ غفور الرحیم ہے۔۔۔۔۔“ دادی جان کی آواز آئی۔

تھا۔ میں نے خاندان کی تمام لڑکیوں کو غور سے دیکھا۔ مہوش ایاز کی بہن اور بڑے تایا کی اکلوتی بیٹی تھی انا بیہ چھوٹے تایا کی بیٹی تھی مگر میں نے اس کی آنکھوں میں بچا جان کے بیٹے فیاض کے لئے پسندیدگی دیکھی تھی لہذا وہ میری فہرست سے خارج ہوگئی۔ اس کے علاوہ بڑی پھوپھو کی دو بیٹیاں زریہ اور فہمیدہ تھیں۔ ”دیکھتے ہیں قسمت کہاں یاوری کرتی ہے۔۔۔“ میں نے سوچا اور آنکھیں بند کر کے سونے کی کوشش کی۔ ایک تو دس گھنٹے کا سفر پھر رات بھی بہت ہو چکی تھی لہذا میں تھوڑی دیر میں بے سدھ ہو گیا۔

☆.....☆.....☆

آج ایاز کی منگنی تھی چونکہ دادی جان اپنی گھنٹوں کی بیماری کے باعث کہیں آج نہیں سکتی تھیں لہذا منگنی کا سارا فنکشن حویلی ہی میں رکھا گیا تھا ایاز کی سنگیتر جتنا بھی اپنے ماں باپ کے ساتھ صبح سے حویلی میں آگئی تھی کئی لڑکیاں اسے گھیرے بیٹھی تھیں اور ایاز کا نام لے لے کر اسے چھیڑ رہی تھیں اور حنا ٹنار چہرے کے ساتھ مسکرا رہی تھی یقیناً من کا میت مل جائے تو دنیا جنت بن جاتی ہے اور ان دونوں کو دنیا ہی میں جیسے جنت مل گئی تھی۔

منگنی کی رسم شروع ہوئی تو ایاز اور حنا نے ایک دوسرے کو انگلی پھینکی پھر سب حنا کا منہ میٹھا کر کے اسے ٹیک دینے لگے، میں بھی پوری طرح تیار ہو کر اس تقریب میں شریک تھا بلکہ یہ کہنا چاہئے تھا کہ دولہا و دلہن کے بعد میں ہی اس تقریب کا مہمان خصوصی تھا ہر شخص بطور خاص مجھ سے ملنے آ رہا تھا وہ سب مجھ سے اپنی محبت کا اظہار اس والہانہ طریقے سے کر رہے تھے کہ مجھے شرمندگی ہو رہی تھی۔ ایاز کی بہن مہوش اپنی بھابھی کو مٹھائی کھلا کر پیچھے ہٹی تو ایک لڑکی آگے بڑھی اور مٹھائی کے ڈبے سے مٹھائی اٹھا کر حنا کو کھلانی چاہی کہ اماں کی کراری آواز گونجی۔

”ارے یہ کیا کر رہی ہو پیچھے ہٹو تم مٹھائی مت کھلاؤ۔“

آواز اتنی تیز اور کراری تھی کہ وہ لڑکی بوکھلا کر

”چچا..... میں تمہارا چچا نہیں ہوں۔“
”آپ میرے چچا ہیں میں سجاد علی صدیقی آپ کے بڑے بھائی دائم علی صدیقی کا اکلوتا بیٹا.....“ میں نے جلدی جلدی کہا۔

”سجاد.....“ اب چچا جان کی سمجھ میں پوری بات آئی اور انہوں نے رائفل میری گردن سے ہٹا کر مجھے گلے لگالیا۔

”آنے سے پہلے اطلاع دے دیتے۔“
”میں نے سوچا سر پر انزل کرے گا..... مگر یہاں تو مجھے ہی سر پر انزل کیا۔“ میں نے مسکراتے ہوئے اپنا سامان اٹھایا۔

”بابا بابا۔“ چچا جان نے تہقیر لگایا اور مجھے گلے لگایا اور اسی حالت میں لے کر حویلی کے اندرونی حصے کی جانب بڑھ گئے..... ”وہ کچھ کون آیا ہے.....“
”کون ہے.....“ کئی آوازیں ابھریں۔

”میرا سجاد آیا ہے۔“ دادی جان نے جلدی سے مجھے خود سے چمٹا لیا اور چٹ چٹ میرا ہاتھ چومنے لگیں وہ خوشی سے نہال ہو رہی تھیں، سب پر جوش انداز میں آگے بڑھ کر مجھ سے مل رہے تھے۔

سچ ہے گاؤں کی مٹی میں ابھی تک پرانی تہذیب کے اثرات باقی ہیں، جتنی محبت سے گاؤں میں سب مجھ سے مل رہے تھے اور اپنی نگاہوں کا اظہار کر رہے تھے بڑے شہروں میں اس طرح کی محبت کے مناظر مفقود ہیں۔

رات دو بجے تک وہاں محفل جمی رہی، کل میرے تایا زاد بھائی ایاز کی منگنی اس کی خالہ زاد سے ہو رہی تھی لہذا آج وہ نوجوان پارٹی کا خاص ہدف بنا ہوا تھا۔ اس کے چہرے کی سرخی بتا رہی تھی اس نوک جھوک میں اسے بھی مزا آ رہا ہے، رات دو بجے سب بڑی تائی کی ڈانٹ کھا کر محفل سے اٹھے اور سونے کے لئے لیٹے مجھے خاص طور پر الگ کمرہ دیا گیا، شاید میں شہری بابو تھا اس لئے مجھ پر خاص عزت کی گئی تھی۔ رات کو میں بستر پر لیٹا تو مجھے وہ خاص کام یاد آیا جس کے لئے ممانے مجھے یہاں بھیجا تھا تقریباً سارا خاندان اکٹھا

کسی سے نہ کریں میں خود بھی تقریباً دس سال بعد یہاں آیا تھا پہلے تو ہر سال آتا ہوتا تھا مگر پھر ہائیر اسٹڈیز کے لئے ملک سے باہر چلا گیا اور واپسی پر فوراً ہی جاب مل گئی لہذا کئی سال سے ممکن نہیں ہوا کہ میں حویلی آسکتا۔ میں بیگ اٹھائے حویلی کے بڑے سے خوب صورت نقش و نگار سے مرین گیٹ کی جانب بڑھا گیٹ کھلا ہوا تھا میں نے سوچا دستک دوں یا اندر چلا جاؤں۔

ایک لمحے کو سوچنے کے بعد میں نے قدم آگے بڑھا دیئے اور کھلے گیٹ سے اندر داخل ہو گیا اندر داخل ہوتے ہی میری نظر سرخ فرش سے ہوتی ہوئی ڈیوڑھی پر پڑی جہاں سناٹا تھا۔ ”یا اللہ یہ کیا ماجرا ہے قریب کے گھر اتنا سناٹا.....“ میں نے چاروں طرف نظریں گھمائیں ڈیوڑھی سے آگے نیم دائرے کی صورت میں کمرے بنے ہوئے تھے میں مزید آگے بڑھا اور کمروں سے ملحق بالکونی میں پہنچا۔

”ہنڈز اپ.....“ اچانک ایک سردنال میری گردن سے آگئی..... میں بوکھلا کر پیچھے مڑتا چاہتا تھا کہ پھر حکم ملا..... ”گھومنا نہیں.....“ بیگ ہاتھ سے چپوڑ دو..... میں نے حکم کی تعمیل کی اور بیگ کندھے سے اتار کر فرش پر رکھ دیا۔

”کوئی ہتھیار ہے تو نکال دو.....“ پھر حکم ملا میں نے جیب میں ہاتھ ڈال کر اپنا لائسنس والا پستول نکالا اور زمین پر رکھ دیا اور کہا۔ ”اس کا لائسنس ہے میرے پاس.....“

”بہت خوب.....“ اب ڈاکو بھی قانون کی پاسداری کرنے لگے ہیں اور لائسنس والا اسلحہ رکھتے ہیں.....“ پیچھے سے طنزیہ آواز آئی۔

”ڈاکو.....“ میں بے ساختہ پلٹ گیا مجھے پلٹتے دیکھ کر پیچھے کھڑے آدمی نے رائفل پر اپنی گرفت مضبوط کرنی۔ ”میں ڈاکو نہیں.....“

”ڈاکو نہیں ہو تو کیا مہمان ہو.....“
”میں..... ارے چچا جان.....“ میں رائفل والے شخص کو پہچان گیا وہ میرے چچا جان تھے۔

”نہیں ماما۔۔۔۔۔ یہ بات نہیں ہے اصل میں۔۔۔۔۔ میں نے اصل مدعا بیان کیا تو دوسری طرف سے خاموشی چھا گئی۔“

”ماما۔۔۔۔۔ کیا کیا ہوا۔ کیا آپ کو یہ بات پسند نہیں آتی۔“

”نہیں بیٹا۔۔۔۔۔ یہ بات نہیں ہے۔۔۔۔۔ آج میرا سرخسر سے بلند ہو گیا آج مجھے یقین ہو گیا کہ میری تربیت میں کوئی جھول نہیں ہے میں اور تمہارے ابا بھی یہی چاہتے تھے کہ نسب اس گھر کی بہو بنے مگر تمہاری وجہ سے خاموش تھے کہ تمہیں نسب پسند آتی بھی ہے کہ نہیں۔۔۔۔۔“

”تھنک یو ماما۔۔۔۔۔ میں نے اطمینان کی سانس لی۔“ پھر آپ کہیں تو لے آؤں آپ کی بہو کو۔۔۔۔۔“

”ایسے نہیں ملے گی وہ لڑکی۔۔۔۔۔ لاکھوں میں ایک ہے میرا ہے میرا۔۔۔۔۔ ذرا ٹاک گھسوکاں پکڑو پھر سوچا جائے گا۔“ ماما میری شرارت سمجھ گئیں۔

”ماما۔۔۔۔۔ میں کسی بہرہ دے کم ہوں۔۔۔۔۔“

”اچھا فون بند کرو میں تمہاری دادی کو فون کرتی ہوں۔۔۔۔۔“ ماما نے کہا اور ساتھ ہی فون آف ہو گیا

میرے منہ سے ایک گہری سانس نکل گئی۔ جس مرحلے کو میں مشکل ترین سمجھ رہا تھا وہ نہایت آسان نکلا۔

تھوڑی دیر گزری تھی کہ دروازے پر دستک ہوئی، میں نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا تو باہر حویلی کی نوکرانی کھڑی تھی۔ ”آپ کو بڑی دادی نے بلایا ہے۔۔۔۔۔“ دادی جان کو حویلی میں سارے نوکر بڑی دادی کہتے تھے۔

”اچھا آتا ہوں۔۔۔۔۔“ میں نے جلدی سے اپنا حلیہ صحیح کیا اور دادی جان کے کمرے میں پہنچا۔

”دادی جان۔۔۔۔۔ میں آسکتا ہوں۔۔۔۔۔“ میں نے دروازے میں کھڑے ہو کر پوچھا، نسب دادی جان کی مسمری کے پاس کھڑی تھی۔

”آؤ۔۔۔۔۔ آؤ سجاد۔۔۔۔۔“ دادی جان بولیں۔

”دادی جان آپ نے بلوایا۔۔۔۔۔“

”ادھر آؤ میرے پاس۔۔۔۔۔“ دادی نے مسمری

پر اپنے پاس جگہ بنائی تو میں مسمری پر ان کے قریب بیٹھ گیا انہوں نے میرا سراپنی گود میں رکھا تو میں نے بھی مسمری پر پیر پھیلا دیئے میرا سراپنی گود میں لے کر دادی جان بولیں۔ ”تمہاری ماں کا فون آیا تھا۔۔۔۔۔ وہ مجھ سے میری سب سے قیمتی چیز مانگ رہی ہے۔“

”آپ نے انکار تو نہیں کر دیا؟“ میں دادی جان کا اشارہ سمجھ گیا اس لئے بے چینی سے اٹھ بیٹھا۔

”سجاد تم نے مجھے زندگی کی سب سے بڑی خوشی دی ہے، میری نسب بہت معصوم ہے اس نے بہت دکھ اٹھائے ہیں۔۔۔۔۔“ دادی جان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

”دادی جان پلیز! نہ روئیں، دکھوں کے دن بیت گئے اب ہر طرف خوشیاں ہی خوشیاں ہیں۔۔۔۔۔ میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ نسب کی آنکھ میں آج کے بعد بھی آنسو نہیں آئیں گے۔۔۔۔۔“

”جیتے رہو تم دونوں میری جان ہو۔۔۔۔۔“ دادی جان نے کہا پھر اپنے ہاتھ میں پہنا بھاری سا سونے کا سنگین اتارا اور نسب کے ہاتھ میں پہناتے ہوئے کہا۔

”یہ سنگن میں نے سجاد کی دلہن کے لئے ہی رکھا تھا، اب اس کی حقدار تم ہو۔۔۔۔۔“ نسب جلدی سے منہ چھپا کر بھاگ گئی اور میرے چہرے پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔

”تیری ماں اگلے مہینے شادی کا کہہ رہی ہے۔“ دادی جان پھر گویا ہوئیں۔

”اگلے مہینے۔۔۔۔۔ اتنے دن۔۔۔۔۔“ میں نے مصنوعی دکھ کے ساتھ کہا۔

”شریر۔۔۔۔۔“ دادی جان میری شرارت سمجھ کر مسکرا دیں۔

”دادی جان دعا دیجئے کہ میں نسب کو خوش رکھ سکوں۔“ میں نے کہا۔

☆.....☆.....☆

میں اپنی گاڑی میں بیٹھا کراچی کی جانب رواں دواں تھا۔ میں صبح نکلتا چاہتا تھا مگر جب حویلی میں سب کو معلوم ہوا کہ میری اور نسب کی بات ہکی ہو گئی ہے تو سب نے مجھے گھیر لیا خاص طور پر لڑکوں نے تو وہ

بے چاری سبز قدم، منحوس اور کالی قسمت والی مشہور ہو گئی۔
آج بھی تم نے دیکھا بڑی بہو کا اس کے ساتھ کیا
رویہ تھا۔ میں رو رو کر اللہ سے دعا کرتی ہوں کہ یا اللہ کسی
طرح میری زینب کو اس جہنم سے نکال اور اسے خوشی کی
زندگی عطا فرما.....“ دادی جان کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

”دادی اللہ اپنے بندوں سے بہت محبت
کرتا ہے، یقیناً زینب کے لئے یہ آزمائش کے دن ہیں
جو گزر جائیں گے۔“

”انشاء اللہ.....“ میری بات سن کر دادی جان
نے دعا کے لئے ہاتھ اٹھا دیئے۔

اس دن کے بعد میں نے زینب کو آبرو کرنا
شروع کیا وہ زیادہ تر چکن میں پائی جاتی تھی حویلی میں
پکے والے رنگ رنگ کے لذت بھرے کھانے اس کے
ہاتھوں کا کرشمہ تھے۔ میں اپنی منزل کے قریب تھا مگر
مجھے ماما کا ڈر تھا کہیں وہ بھی زمانے کی فرسودہ توہمات میں
نہ جکڑی ہوں، لہذا حویلی سے جانے سے ایک دن پہلے
میں نے ماما کو فون کیا۔

”ہیلو بیٹا کیسے ہو.....“

”ٹھیک ہوں.....“

”سب آ رہے ہو۔“

”انشاء اللہ کل یہاں سے نکلوں گا۔“

”اور اس کام کا کیا بتا جس کے لئے تم وہاں
گئے تھے.....“

”ماما میں نے اسی لئے آپ کو فون کیا ہے.....“

”بولو.....“

”ماما آپ توہمات پر یقین رکھتی ہیں۔“

”کیا مطلب.....؟“

”مطلب جیسے کوئی منحوس ہے یا کالی قسمت والا

یا سبز قدم وغیرہ..... آپ ان باتوں کو مانتی ہیں۔“ میں
نے تمہید باندھی۔

”دماغ خراب ہے تمہارا سجاد..... میں تمہیں

ایسی جاہلانہ باتوں پر یقین رکھنے والی لگتی ہوں۔“ ماما
نے ناراضگی سے جواب دیا۔

”تانی.....“ لڑکی کے سسکنے کی آواز باہر تک آ رہی
تھی، میں نے دروازے پر دستک دی اور پھر دروازہ کھول
کر اندر داخل ہوا۔ اندرونی میا لے رنگ کے کپڑوں میں
لبوس لڑکی دادی جان کی مسمری پر بیٹھی تھی اور اس کا سردادی
جان کی گود میں تھا، مجھے کمرے میں داخل ہوتا دیکھ کر وہ
جلدی سے کھڑی ہو گئی اور دوپٹہ سر پر جمانے لگی۔

”..... آؤ سجاد بیٹا۔“ دادی جان مجھے بچکچاتے
دیکھ کر بولیں۔ ”اس سے تو تم نہیں ملے ہو گے یہ اپنے
کمرے سے کم ہی باہر نکلتی ہے..... یہ تمہاری چھوٹی
پھوپھو کی بیٹی زینب ہے۔“ دادی جان نے اس لڑکی کا
تعارف کر دیا۔

”السلام علیکم.....“ میں نے سلام کیا تو وہ سلام کا
جواب دیتے ہوئے کمرے سے چلی گئی اس کی برنی
جیسی آنکھوں میں آنسو تھے اس کے گلابی چہرے پر دکھ
کی پرچھائیاں تھیں۔

”آخر یہ ماجرا کیا ہے؟..... یہ لڑکی اتنی غمزدہ
کیوں ہے؟“ میں نے دل میں سوچا اور آخر میرے دل
کا مدعا زبان پر آ گیا۔ دادی جان میرا سوال سن کر تھوڑی
دیر خاموش ہو گئیں، پھر بولیں۔

”میری چھوٹی بیٹی قد سید زینب کی ماں اس کی
پیدائش والے دن ہی اللہ کو پیاری ہو گئی تھی میں نے
جب چھوٹی سی زینب کو اپنے ساتھ لانا چاہا تو اس کے
باپ نے منع کر دیا کہ وہ اپنی بیٹی کو خود پالے گا مگر چند
سال بعد جب اس نے دوسری شادی کر لی تو سوتیلی ماں
کے ظلم کا شکار یہ معصوم زینب بنی جب مجھے پتا چلا تو میں
نے زینب کو اپنے پاس بلا لیا۔ دس سال پہلے آئی، زینب
ڈری تھی رہتی تھی، مگر میں نے نہایت پیار سے اسے اس
ڈر و خوف سے باہر نکالا۔

پچھلے سال اس کے تایا نے اپنے بیٹے کے ساتھ
اس کا نکاح کر دیا، لڑکا بہت اچھا تھا لہذا میں بھی راضی
ہو گئی مگر ہائے رے نصیب!! وہ اپنے دفتر کے کسی کام
سے اسلام آباد گیا اور ایک حادثہ میں جاں بحق ہو گیا۔ اس
واقعتے کے بعد زینب کو چپ لگ گئی اور خاندان بھر میں

دشمن.....!

دشمن ایک ایسا لفظ ہے، جس میں انسان کے چار

دشمن چھپے ہوئے ہیں۔

☆ ”و“ سے دنیا۔

☆ ”ش“ سے شیطان۔

☆ ”م“ سے مال۔

☆ ”ن“ سے نفس۔

(مرتب: ایس امتیاز احمد۔ کراچی)

نے ایک پیٹروں پمپ پر رک کر پیٹرول بھروایا اور گھڑی
میں دقت دیکھا رات کے ٹین بج رہے تھے۔

بدین ڈسٹرکٹ سے نکل کر اب میرا سفر ٹھٹھہ
ڈسٹرکٹ میں جاری تھا، ٹھٹھہ کے بعد کراچی تھا، میں
گھٹناتے ہوئے اپنا سفر طے کر رہا تھا۔ سانپ کا خوف
میرے ذہن سے نکل چکا تھا، میں اپنے اور زہن کے
بارے میں سوچ رہا تھا واقعی ابھی کہتے ہیں۔ ”من چاہا
میت مل جائے تو زندگی کا۔“ فرانتہائی خوش گوار انداز میں
گزر رہا ہے۔ ”مسکراہٹ میرے ہونٹوں پر رقصاں تھیں۔

اسی وقت میری نظر بیک مرر پر پڑی، بیک مرر
میں جو منظر مجھے نظر آیا وہ مجھے دہشت زدہ کرنے کے
لئے کافی تھا، خون میری رگوں میں جسنے لگا، میرے
ہونٹ نیم والا انداز میں کھل گئے، میری آنکھیں
سے باہر نکل آئیں، بیک مرر میں منظر ہی اتنا خوفناک تھا
اور میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ کیسے ہو گیا۔

میں نے گاڑی کی رفتار کم کی اور آہستہ آہستہ
گردن گھما کر پیچھے دیکھا سانپ کچھلی سیٹ پر گردن
اٹھائے بیٹھا تھا اس کی دو شاخہ زبان بار بار باہر نکل رہی
تھی اس کا منہ اس کے اپنے خون سے سرخ ہو رہا تھا
جس پر جا بجا ریت لگی ہوئی تھی اس کی آنکھوں میں
بجلیاں کوند رہی تھیں۔

گولی کھا کر زمین پر گر پڑا اور بے سدھ ہو گیا۔

میں دوڑ کر اس کے قریب گیا۔ گولی کی آواز
سنائے میں دور تک گئی، مجھے ڈر تھا کہ کہیں گولی کی آواز
من کر کوئی پولیس کی گاڑی ادھر نہ آ جائے کیونکہ چتر باری
سانپ کا شکار قانوناً ممنوع ہے۔ لہذا میں نے ایک لکڑی
کی مدد سے سانپ کو اپنی گاڑی کی کچھلی سیٹ پر ڈالا اور
گاڑی اسٹارٹ کر کے روانہ ہو گیا۔ گاڑی کے اندر مدھم
روشنی میں سانپ کا چمکدار جسم بہت خوفناک دکھائی دے
رہا تھا، میں نے اپنا دھیان بٹانے کے لئے دھیمے سروں
میں گنگنا شروع کر دیا۔

میں تصور کی آنکھ سے زہن کو دیکھ رہا تھا جو
ہاتھوں میں مہندی لگائے اور سرخ جوڑا پہنے میرا انتظار
کر رہی ہے، زہن کا خیال آتے ہی مسکراہٹ میرے
لبوں پر خود بخود آ گئی، اسی وقت گاڑی کو ایک زوردار جھٹکا
لگا، شاید سڑک پر کوئی گڑھا تھا جس میں گاڑی کا ٹائر چلا
گیا تھا، گاڑی کے جھٹکے کے ساتھ ہی نہ جانے کیسے کچھلی
سیٹ پر رکھا سانپ اٹھل کر میری گردن سے لپٹ گیا۔

میرے منہ سے ایک تیز چیخ نکل گئی اور میں نے
بے اختیار اپنے دونوں ہاتھوں سے سانپ کو پکڑ کر اپنی
گردن سے الگ کیا اور کچھلی سیٹ پر پیچھا اسٹیرنگ
پھونکنے کی وجہ سے گاڑی سڑک پر لہرائی اور ریت میں
اتر گئی، پھر ایک جھٹکا کھا کر گاڑی بند ہو گئی۔ میں جلدی
سے گاڑی کا دروازہ کھول کر نیچے اتر اور اپنی سانس
بحال کی پھر میں نے کچھلی سیٹ پر نظر دوڑائی سانپ
مردہ حالت میں پڑا تھا شاید گاڑی کو لگنے والے جھٹکے کی
وجہ سے وہ اچھل کر میرے اوپر آ گیا تھا۔

میں نے گاڑی میں سے پانی کی بوتل نکالی اور پانی
پیاتاکہ میرے حواس بحال ہو سکے تھوڑی دیر میں میں نے
اپنے خوف پر قابو پایا، پھر میں نے سانپ کو ہلا جا کر دیکھا
مگر وہ ساکت پڑا تھا۔ میں دوبارہ گاڑی میں بیٹھا اور گاڑی
کو سڑک پر لے کر آیا اور اپنا سفر شروع کیا مگر اب میرے
اندر اس اعتماد کا کہیں پتا نہیں تھا جو سفر شروع کرتے وقت
تھا۔ گاڑی اپنا سفر طے کر رہی تھی، رات بتی جا رہی تھی، میں

ہلا گلا کیا کہ بس..... مجھے حویلی کے کینوں کی آنکھوں میں اپنے اور زنب کے لئے خوشیاں اور نیک خواہشات نظر آئیں۔ سب نے مل کر مجھے اور زنب کو بیٹھا کر ایک چھوٹی سی تقریب کر ڈالی۔ اس وجہ سے دیر ہو گئی اور مجھے واپسی کے لئے نکلے نکلے رات ہو گئی۔

رات کی سیاہی پھیلتی جا رہی تھی میں نے گھڑی میں وقت دیکھا رات کے گیارہ بج رہے تھے میں نے گاڑی سڑک کے کنارے روکی، میں تین ٹھٹھے سے مسلسل گاڑی چلا رہا تھا اور ابھی سات آٹھ گھنٹے کا سفر باقی تھا، میں نے گاڑی کا انجن بند کیا اور گاڑی سے باہر نکلا چاند کی آج شاید بارہ تیرہ تاریخ تھی اس لئے اتنا اجالا تھا کہ ہر چیز صاف نظر آ رہی تھی۔ میں ڈسٹرکٹ عموٹ سے نکل کر تھر پارکر کے عظیم صحرا کو پار کر رہا تھا، دور دور تک بولناک سناٹا تھا کہیں آبادی کا نشان نہیں تھا کہیں کوئی ٹنڈ منڈ سا درخت سڑک کنارے نظر آتا، ہوا ٹھنڈی اور فرحت بخش لگ رہی تھی، یہی ہوا دن کے وقت گرم اور جان لیوا ہوتی ہے ریگستان کا یہ فائدہ ہے کہ وہ جلدی ٹھنڈا ہو جاتا ہے تیز ہوا ریت پر کیسے کیسے نقش و نگار بنا رہی تھی بنایا کرنا رہی تھی، مٹا مٹا کر بنا رہی تھی ریگستان کی یہ خوبی ہے کہ جہاں آج ریت کا بڑا سناٹا ہے کہ وہاں کل پھیل میدان ہوگا ساری رات ریت دوسری جانب منتقل کر دے گی۔

میں نے سڑک کے کنارے بیٹھ کر اپنی انگلیاں ریت میں ڈالیں، ٹھنڈک کی ایک لہر میرے جسم میں سرایت کر گئی۔ میں بے شک کراچی میں رہتا ہوں مگر ہوں تو اس عظیم ریت مہاساگر کا بیٹا، میرے خون میں یہاں کی خوشبو رچی بسی ہے۔

تھر میں آج بھی ایسے جہان دیدہ لوگ پائے جاتے ہیں جو رات کو ریت میں انگلیاں ڈال کر بتاویں کہ کل صبح پوچھانڈو (سورج کی پہلی کرن) کہاں پڑے گی۔ قدرت نے ہمیں ہریالی پھول اور رنگ دیتے سے ہاتھ کھینچ لیا تو اس علاقے کے لوگوں نے دھنک کے سارے پتھل رنگ اپنی اجڑکوں، رلیوں، اڑھیوں، شلوکوں اور چولیوں میں ٹانگ دیئے۔

میں نے گاڑی سے پانی کی بوتل نکالی اور منہ سے لگالی، پانی پی کر میں دوبارہ گاڑی میں بیٹھا ابھی میں نے گاڑی اسٹارٹ کرنے کے لئے چابی گھمانے کا ارادہ ہی کیا تھا کہ میری نظر سامنے سڑک پر پڑی، میری گاڑی سے کوئی تیس بیس گز کے فاصلے پر ایک سانپ کنڈلی مارے بیٹھا تھا۔

میں سانپ کو غور سے دیکھنے لگا وہ بہتر باری سانپ تھا اس کی کھال چاند کی روشنی میں چمک رہی تھی اور سنہری مائل مٹیالی جلد پر پڑے سیاہ دھبے اور خوفناک بنا رہے تھے۔

بہتر باری سانپ کو دیکھ کر میری ریڑھ کی ہڈی میں سنسنی کی ایک لہر دوڑ گئی، میں اپنی گاڑی میں ساکت بیٹھا رہ گیا۔ بہتر باری سانپ سندھ کے ریگستان کا خطرناک ترین سانپ ہے، یہ سانپ انتہائی زہریلا ہوتا ہے، اس کی نسل تقریباً دو سو سال پہلے کی ہے۔

بہتر باری سانپ کو دیکھتے ہی مجھے اپنے عزیز دوست رضا کا خیال آیا، رضا میرا سب سے اچھا دوست ہے بلکہ میرا اور اس کا بھائیوں والا معاملہ ہے، رضا کراچی کی ایک لیبارٹری میں کام کرتا ہے اور سانپ اور سانپ کے زہر پر تحقیق کر رہا ہے۔ سبے اختیار میرا دل چاہا کہ میں اس سانپ کو پکڑ لوں، یقیناً رضا کے لئے بہترین تحفہ ہوگا۔ یہ سوچ کر میں نے اپنے حواس بحال کئے اور ڈیش بورڈ سے اپنا تیس بور کا ریو الوور نکالا اور آہستہ سے کار کا دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔

سانپ اسی طرح کنڈلی مارے بیٹھا تھا اس کی دو شاخہ زبان بار بار منہ سے باہر آ رہی تھی، وہ شاید شکار پر حملہ کرنے والا تھا، میں نے اس کی نظروں کے تعاقب میں دیکھا سامنے دو موٹے تازے چوہے بیٹھے تھے، سانپ انہیں شکار کرتا چاہتا تھا، یہ غیبت تھا کہ سانپ نے اب تک مجھے نہیں دیکھا تھا میں نے اپنا ریو الوور سیدھا کیا اور سانپ کے سر کا نشانہ لیا اور غائر کر دیا، اسی وقت سانپ نے چوہوں پر چھلانگ لگائی مگر ریو الوور سے نکلی گولی کی رفتار سانپ کی رفتار سے بہت تیز تھی سانپ

”ارے ارے گھبراؤ نہیں... یہ بے ہوش ہو چکا ہے۔“ رضا بولا اور اس نے سانپ کو اپنے ہاتھوں میں ایسے اٹھا لیا جیسے وہ ربڑ کا بنا ہوا ہو۔ اس نے گاڑی کو لاک کیا اور رضا کے ساتھ اس کے گھر میں داخل ہوا، ڈرائنگ روم تک پہنچتے پہنچتے اس نے مختصر ارضا کورسات بھر کی روواستانی، رضا سانپ کو لے کر دوسرے کمرے میں چلا گیا جسے وہ لیبارٹری کے طور پر استعمال کرتا تھا۔ ملازم میرے سامنے چائے رکھ گیا، اس چائے کی شدید طلب محسوس کر رہا تھا لہذا پائے پیئے لگا۔

تھوڑی دیر میں رضا کمرے میں داخل ہوا اس کے ہاتھ میں وہی سانپ تھا اب سانپ ہوش میں تھا۔ رضا نے سانپ میرے اوپر اچھالتے ہوئے کہا۔ ”یہ بالکل بے ضرر سانپ ہے۔“

”کیا مطلب.....“ میں نے سانپ سے بچتے ہوئے پوچھا۔

”مطلب یہ کہ تم نے اسے جو گولی ماری تھی اس نے اس کے زہریلے دانت ہی اڑا دیئے تھے۔“ رضا نے جواب دیا۔

”یہ کیسے ممکن ہے.....“ میں حیرت زدہ رہ گیا۔

”وہ ایسے ممکن ہے کہ شکار کے وقت چتر باری سانپ اپنے دونوں زہریلے دانت باہر کی سمت لاتا ہے، جب تم نے اسے گولی ماری تو یہ شکار کر رہا تھا، جیسے ہی شکار کرنے کے لئے اس نے اپنے زہریلے دانت باہر کئے تم نے گولی چلا دی اور گولی نے اس کے دونوں زہریلے دانت ختم کر دیئے اسی لئے یہ تمہیں ڈس نہیں سکا اور تم رات بھر ایک بے ضرر سانپ سے ڈرتے رہے جو کسی کو ڈسنے کے قابل نہیں تھا۔“ رضا نے ہنستے ہوئے جواب دیا اور میرے منہ سے ایک ٹھنڈی سانس نکل گئی، اس نے پلٹ کر سانپ کو دیکھا، وہ قالین پر اپنا ہڈا پر کئے مجھے گھور رہا تھا اور بے اختیار میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔



سانپ میری برابر والی سیٹ پر بیٹھا تھا اس کی نظریں میرے اوپر جمی تھیں۔ اس نے گاڑی رضا کے بٹکلے کے سامنے روکی اور دروازہ کھولنے کے لئے ہاتھ بڑھایا مگر اسی وقت سانپ نے ایک پھنکار ماری اور میرا ہاتھ جہاں تھا وہیں رک گیا پھر میں نے دوسرا ہاتھ اسٹیرنگ سے ہٹا کر ہارن تک لایا اور ہارن بجا دیا۔ ہارن کی تیز آواز چاروں طرف گونج اٹھی۔

سانپ نے نہایت ناگواری سے میری جانب دیکھا مگر اس نے پروانہ کی اور دوسری بار ہارن بجا دیا۔ تھوڑی دیر میں رضا آنکھیں ملتا ہوا بالکونی میں آیا۔ میری کار دیکھ کر اس کے چہرے پر حیرت کے آثار نمودار ہوئے اور اس نے چیخ کر کچھ کہا جو میں نہ سن سکا تھوڑی دیر بعد رضا بٹکلے سے نکلتا نظر آیا۔ وہ گاڑی کے پاس آتے ہوئے بولا۔ ”کیا بیروں میں مہندی لگی ہوئی ہے جو کار سے نہیں اتر رہے ہو۔“ جملہ ممکن کرتے ہی رضا کی نظر سانپ پر پڑی۔ وہ فوراً صورتحال کی سنگینی کو سمجھ گیا اور بڑی تیزی سے اگلے قدموں واپس اپنے بٹکلے کے اندر دوڑ گیا۔ اس نے کن آنکھوں سے سانپ کی طرف دیکھا وہ بار بار پھنکار کر مجھے ڈرا رہا تھا۔

اسی وقت رضا اپنے بٹکلے سے باہر آتا نظر آیا اس کے ہاتھ میں اسپرے کرنے والی مشین تھی وہ کار کی دوسری جانب کی کھڑی پر آیا جہاں سانپ بیٹھا تھا پھر اس نے اپنی ٹاک پکڑ کر مجھے اشارہ کیا میں اس کا اشارہ سمجھ گیا وہ مجھے سانس روکنے کا کہہ رہا ہے۔ اس نے ایک لمبی سانس اپنے ہیمپھردوں میں بھری اور سانس روک لی۔ میرے سانس روکنے کے بعد رضا نے اسپرے مشین کا رخ سانپ کی جانب کیا اور مشین کا بٹن دبایا اسپرے مشین میں شاید سبے ہوشی کی دوا تھی۔ سانپ پر جیسے ہی اسپرے کی پھوار پڑی وہ اچھلا اور اس نے مجھے ڈسنے کی کوشش کی مگر میں نے چیختے ہوئے گاڑی کا دروازہ کھولا اور باہر چھلانگ لگا دی۔ سانپ میرے پیروں سے لپٹا ہوا باہر آگرا۔ اس نے اسے اپنے پیروں سے جھٹکا اور دور جا کھڑا ہوا۔

خوف سے میرا برا حال تھا، میں نے گاڑی روکنی چاہی مگر اسی وقت سانپ نے تیزی سے اپنی جگہ تبدیل کی اور میرے سامنے اسٹیرنگ سے ذرا اوپر آ کر بیٹھ گیا، گویا غم دے رہا ہو کہ گاڑی چلاتے رہو، خوف اور ڈر کیا ہوتا ہے مجھے آج احساس ہو رہا تھا۔

موت میرے سامنے سانپ کی صورت میں بیٹھی تھی اور اس کی زبان بار بار منہ سے باہر آ کر مجھے مزید خوفزدہ کر رہی تھی۔

چترہاری سانپ کا کاٹا تو پانی بھی نہیں مانگتا۔ میں دل ہی دل میں اس وقت کوکوس رہا تھا۔ جب میں نے اس سانپ کے شکار کا سوچا تھا میرا ذہن تیزی سے اپنے پیڑ کی تدبیر سوچ رہا تھا۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا اسی وقت گاڑی کسی ابھری ہوئی جگہ سے گزری اور اسے ایک جھک لگا۔ جھکا سانپ کو انتہائی ناگوار گزرا اس نے غصیلی نظروں سے مجھے گھورا اس کی آنکھوں میں نہ جانے کیا تھا مجھے اپنا دل ڈوبتا ہوا محسوس ہوا میں نے دل ہی دل میں کلمہ پڑھنا شروع کر دیا اس کے ساتھ ہی میرا ہاتھ آہستہ آہستہ ڈیش بورڈ کی جانب بڑھنے لگا جہاں میرا ریوالتور رکھا تھا۔

مگر شاید سانپ نے بھی میرا ارادہ بھانپ لیا اس نے اپنی جگہ تبدیل کی اور ڈیش بورڈ پر جا کر بیٹھ گیا۔ میرے منہ سے ایک ٹھنڈی سانس نکلی اور میں نے سارا دھیان گاڑی چلانے پر لگا دیا مجھے حیرت ہو رہی تھی کہ آخر سانپ نے مجھے اب تک ڈسا کیوں نہیں، کیونکہ چترہاری سانپ کی فطرت ہے کہ وہ اپنے شکار کو زیادہ مہلت نہیں دیتا۔

”یا اللہ تو ہی کوئی سبب بنا..... اور مجھے اس مصیبت سے نجات دلا.....“ میں نے دل ہی دل میں دعا کی اور اپنے بازو پر بندھے امام ضامن کو محسوس کیا جو سفر شروع کرنے سے پہلے دادی جان نے دعائیں پڑھتے ہوئے باندھا تھا۔

میری کار آہستہ آہستہ ٹھنڈے شہر میں داخل ہو رہی تھی۔ ٹھنڈے کے ہاں اپنے گھروں میں سکون سے سو رہے تھے مگر نیند میری آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ سانپ میری بے اہم والی سیٹ پر آ چکا تھا اور مجھے گھور رہا تھا

اس کی زبان بار بار باہر کو نکل رہی تھی۔ شاید وہ مجھے خوفزدہ کر کے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ اسی وقت میری گاڑی کے قریب سے ایک ٹرک گزرا جس نے تیز ہارن بجایا۔ ہارن کی آواز سن کر سانپ کے جسم میں لرزہ سا پیدا ہوا اور اس کے غصے میں اضافہ ہو گیا۔ وہ مجھے ایسی نظروں سے دیکھنے لگا گویا یہ تصور بھی میں نے کیا ہو۔

اچانک سانپ کے دل میں کیا نالائی کہ وہ اپنی دم کے بل پر کھڑا ہو گیا اس کا منہ میرے چہرے کے برابر آ گیا اس کی گرم گرم سانسیں میرے چہرے کو کھلوانے لگیں میرا خون رگوں میں خشک ہونے لگا خوف اور ڈر کیا ہوتا ہے مجھے آج اندازہ ہوا، میرا چہرہ ایک دم سفید پڑ گیا آج کی رات میری آخری رات ہو سکتی ہے مجھے ماما۔ ابا جان، دادی جان اور نہ نب کا خیال آ رہا تھا اگر.....

اگر مجھے کچھ ہو گیا تو دنیا والے نہ نب کا جینا حرام کر دیں گے ماما اور ابا جان کا کیا ہوگا، میں ان کی اکلوتی اولاد ہوں۔ ابا جان بے شک سخت گیر ہیں مگر وہ مجھ سے پیار بھی بے انتہا کرتے ہیں۔

”یا اللہ تو رحمن ہے رحیم ہے، مجھے اس مصیبت سے نجات دلا دے۔“ میں نے صدق دل سے دعا کی۔ میرے حلق میں کچھ پھنسنے لگا اور پھر خود بخود تیرے آنسو بہہ نکلے۔

سانپ میرے چہرے کے بالکل قریب تھا اس کی دو شاخ زبان میرے گالوں کو چھو رہی تھی۔

اچانک سانپ کے دل میں کیا بات آئی کہ وہ دوبارہ اپنی پرانی جگہ پر جا کر بیٹھ گیا اور وہیں سے مجھے گھورنے لگا۔ ٹھنڈے شہر پیچھے رہ گیا اب میں گھارو شہر سے گزر رہا تھا بس کراچی آنے والا ہی تھا۔

اسی وقت میرے ذہن میں ایک ترکیب آئی مجھے معلوم تھا کہ رضا صبح جلدی اٹھنے کا عادی ہے۔ لہذا کراچی میں داخل ہوتے ہی میں نے گاڑی کا رخ ماڈل کالونی کی جانب موڑ دیا جہاں رضا کا بنگلہ تھا۔ مساجد سے فجر کی اذانوں کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا، اجالا اتنا ہو گیا تھا کہ اب ہر چیز صاف نظر آ رہی تھی۔



گندے انڈے اور کچھ پتھر چلے
شعر جب محفل میں ہم پڑھ کر چلے
پیار سے انکار اس نے کر دیا
واپسی پر اپنا پکڑے سر چلے
تیری خاطر ہاتھ بھی جوڑے گئے
ہم سے جو بھی کچھ ہوا وہ کر چلے
روٹھنا اچھا نہیں ہے آجائے
تم ہی بتاؤ کہ کیسے گھر چلے
فیس تو عامل کو با کے دے چکا
کاش تیرے نام پر منتر چلے
(قدیر رائے.....راولپنڈی)

تجھ سے تجھ کو مانتے ایک جذبہ محکم لئے
ہم تیری محفل میں آئے دیدہ پر ہم لئے
جو ملاقات فراق انجام پر تھا منحصر
آج تک ہیں ہم نگاہوں میں وہی عالم لئے
بحرِ غم حد نظر تک، ناتواں کشتی زیت لئے
پھر کبھی احساسِ ناخدا کے ہم نے کم سے کم لئے
میں جسم دردِ غم ہوں، کرب کی تصویر ہوں
دل کے ویرانے میں صدمہ غم داستان لئے
اب مسرت کی طلب ایک بھول لئے
ساری دنیا جب ہے دامن میں قضاے غم لئے
کربا ہے ابنِ آدم ابنِ آدم کا شکار
اب کلاشکوف ہاتھوں میں لئے ہم لئے
ہوری تھی واجد دانگی تقسیم جب روزِ اجل
ہم نے واجد شادمانی کے بجائے غم لئے
(پروفیسر ڈاکٹر واجد گیلانی.....کراچی)

جہاں میں جس سے تھی زندگانی میری
بھولے سے اس نے قدر نہ جانی میری
جل کے راکھ ہو گئے ہم آخر
آکے گزر گئی پھر شام سہانی میری
کسی نے توڑ دیئے پیار کے بندھن سارے
واپس کر دی تو نے پھر نشانی میری
گزرے دنوں کی بات نہ کر ہمسفر

خواب کے باہر کچھ بھی نہیں ہے خواب کے اندر سب کچھ ہے
اجلا اجلا چہرہ تیرا چاند، سمندر سب کچھ ہے
تجھ کو خدا سے مانگ لیا ہے اور خدا سے کیا مانگوں
جب تک میرے ساتھ ہے تو مجھے میرے سب کچھ ہے
مرضی ہے انسان کی اپنی جس کو چاہے اپنا ہے
پیار محبت، نفرت دھوکہ من کے اندر سب کچھ ہے
مانگنے والو مانگو اس سے دے گا وہ اوقات سے بڑھ کر
کھلا ہوا ہے جب اس کی رحمت کا در سب کچھ ہے
کلمہ زبان سے پڑھ لینے کا نام نہیں ایمان
خوف ہو رب کا جس کے اندر اس کے اندر سب کچھ ہے
جاہوں اگر میں کر سکتا ہوں سب کے دلوں پر راج حکیم
علم و ہنر اخلاص کی دولت بخت سکندر سب کچھ ہے
(تکیم نان حکیم کامل پور موہی)

پنچھی آزاد اچھے گتے ہیں
پھول شاخوں پہ روز کھلتے ہیں
جو پہاڑوں سے چٹے جتے ہیں
پھر ندی سے گلے وہ ملتے ہیں
پڑ سارے اداس ہیں لیکن
بارشوں میں نکھر کے دھلتے ہیں
جب ہواؤں کا ساز بجتا ہے
مور جنگل میں رقص کرتے ہیں
پھول اور بچوں میں نہیں کوئی فرق
جب بھی دیکھو وہ ہنستے رہتے ہیں
دنیا میں زندہ دل رہو بدم!
سستل کب ٹھکانے رہتے ہیں
رزق ملتا ہے پتھروں میں جنہیں
میرے رب کے یہ سب کرشمے ہیں
جو خدائی سے پھر گیا خانم!
اس کو فطرت کے راز ڈستے ہیں
(فریدہ خانم.....لاہور)

زندگی کے میدان میں ”مجزے“ نہیں ہوتے
جنگ جیتنا چاہو، تو کشتیاں جاڑنا!
(انتخاب: دعا عالم بخاری..... محبوب شاہ)

فاصلے تو قریب کی پہچان ہوا کرتے ہیں
بے بس لوگ اکثر پریشان ہوا کرتے ہیں
یہ سچ ہے جہاں ٹوٹ کر چاہا جائے
وہاں پھڑکنے کے امکان بھی بہت زیادہ ہوا کرتے ہیں
(محمد قاسم رحمان..... ہری پور)

صبح کو چہرے پر تھے دو زخم آنکھوں کی جگہ
رات رونے کی خواہش تھی مگر رویا نہیں
خواب دیکھا تھا کوئی بچپن کی کھلی قیند میں
دوستو پھر چین سے میں آج تک سویا نہیں
(شرف الدین جیلانی..... ٹنڈوالیہ)

ہزاروں شوق و ارمان لے کے رہے چٹکیاں دل میں
حیات کی اجازت دے تو کچھ بے باکیاں کرلوں
(انتخاب: حافظ سبحان..... کراچی)

لب پر سجائے تھے یونہی اجنبی سے نام
دل میں تمام زخم کسی آشنا کے تھے
(انتخاب: سونیا بلال..... نوابشاہ)

مجھے کوئی گلہ نہیں ہے تمہارے یاد کرنے کا اے دوست
اجڑے ہوئے چمن کو تو پرندے بھی چھوڑ جاتے ہیں
(ظاہر اسلم مشہو خان بلوچ..... سرگودھا)

بارش کی طرح تجھ پر برسی رہیں خوشیاں
ہر یونہی تیرے دل سے ہر غم کو مٹا دے
(انتخاب: محمد ارمان..... کراچی)

میری نظر نے تو اسے دل تک راستہ دیا تھا
میری روح میں سا جانے کا ہنر اس کا اپنا تھا
(انتخاب: منیر احمد ملک..... شاہ پور چاکر کھڑو)

اے خط خطا نہ کرنا قدموں میں جا گرنا
پوچھیں جو حال میرا جھک کر سلام کرنا
(محمد سلیم مہد..... کوئٹہ کلاں)

دل کو تیری ہی تمنا اور تجھی سے پیار ہے
چاہے تو آئے نہ آئے تیرا ہی انتظار ہے
(محمد اسحاق انجم..... کنگن پور)

☆☆

قوس قزح

قارئین کے بھیجے گئے پسندیدہ اشعار

اپنے قاتل کی ذہانت سے پریشان ہوں میں
روز اک موت نئے طرز کی ایجاد کرے
بلا کی بدگمانی تھی، میرے ”صاد“ کو مجھ سے
”ذبح“ کے بعد بھی اس نے میرے کسی کس کے پر باندھے
(انتخاب: ساحل دعا بخاری..... بصیر پور)

ہر بات میں اس کی ہیں کئی سو سو مطلب
وہ تو بات کرتا ہے، وضاحت نہیں کرتا
میں اس کیلئے سارے زمانے سے لڑی ہوں
وہ شخص جو خود سے بھی بغاوت نہیں کرتا
(راہل بخاری..... محبوب شاہ)

ملاقاتیں مسلسل ہوں تو ولہاری نہیں ہوتی
بڑے دلچسپ ہوتے ہیں یہ بے ترتیب یاد آنے
(بلقیس خان..... پشاور)

بہت حفاظت سے رکھا ہے ان چہانوں کو
بیتے بیتے بھی ہواؤں سے الجھ جاتے ہیں
دیکھ فرعون کے لہجے میں مجھ سے بات نہ کر
ہم تو پاگل ہیں خداؤں سے الجھ جاتے ہیں
(عثمان غنی..... پشاور)

جو عشق کرنا خواب ہوتا.....!
یقین کر لو!!

نہ تم سے ہوتا نہ ہم سے ہوتا.....!
(قاضی حماد سرور..... اوکاڑہ)

کاش میں تم سے ملا نہ ہوتا
تو یہ حال میرا ہو یا نہ ہوتا
میں بھی اوروں کی طرح سے خوش ہوتا
یہ درد جو تم سے عابد مجھے ملا نہ ہوتا
(عابد علی جعفری..... کنڈیاں)

زندہ رہتا ہے تو حالات سے ڈرنا کیسا؟
جنگ ”لازم“ ہو، تو لشکر نہیں دیکھا جاتا

تم ساحل پر گھرے ہوئے پھولوں کی طرح ہو
ہم ریت پر لکھے ہوئے لفظوں کی طرح ہیں
تم آج آئندہ بھی زمانے کی جھلک ہو
ہم آج بھی گزرے ہوئے لمحوں کی طرح ہیں
ایک مہر ترستے ہیں کسی ایک خوشی کو
ہم لوٹ بھی بھر زمینوں کی طرہ ہیں
دنیا کے لئے خوشی ہی کسی تیرے لئے ہم
مکمل کسی ماں کی دعاؤں کی طرح ہیں
(سید عبادت راج..... ذریعہ اسامیل خان)

حسرت و یاس کی تصویر بنا ہے یہ سال
میری ناکائی کی تفسیر بنا ہے یہ سال
ایک ایک کر کے یہاں آتے رہے ہیں کچھ غم
رنج و آلام کی جاگیر بنا ہے یہ سال
اس نے خوشیوں کا گلا کاٹا ہے بے دردی سے
کیوں میرے واسطے شمشیر بنا ہے یہ سال
میرے نگاہ میں بہار آئی نہیں حلیم
ایک السردہ کی تصویر بنا ہے یہ سال
مجھ پر دیوانگی کی چھائی رہی حلیم
بار بار رنج و غم کا وزیر بنا ہے یہ سال
(محسن عزیز حلیم..... کوٹھاکاں)

محبت اک ادا ہے اس کو سب نے مانا ہے
چاہتوں کے سلسلے کو کب اس نے جانا ہے
وہ جدائی مجھ سے مانگتی ہے بہت معصوم بن کر
وہ میری منزل نہیں ہے یہ دل کو سمجھانا ہے
سوچا تھا تجھے دل میں بسا کے رکھیں گے جان وفا
لیکن اب تیری یاد کو مجھے دل سے مٹانا ہے
کاش زندگی کے اس سفر میں تم میری ہو تیں فقط میری
اب اس خواہش کو دل کے کسی کونے میں سلاتا ہے
(سونا شاہ قریشی.... کبیر والا)

دھبہ کی سردشاموں میں

جب کبھی!

کھلتے ہیں یادوں کے گل

یہاں تو ہر کوئی اپنے آپ میں ہی مشغول ہے
چھاننا ریت صحرا کی ٹھہرا عاشق کا کام
ہاں اسی لئے تو عشق بہت مشہور ہے
وہاں فریاد نے اس کیلئے نکالی نہر دودھ کی
یہاں انارکلی کو دیوار میں چنوائے کو کوئی معصوم ہے
(طارق محمود..... کامرہ کلاں)

نشر کرنے کی دہ سے عادت ہوئی ہے
کیا دنیا کیا خوشی اپنی باقی رہی ہے
جب سے یہ موسم بدلا ہے پیار کا صنم
کہاں تم آئی ہو کہاں سے چاہت آئی ہے
یاد کرتے ہوئے تم کو میں شراب کی بوتل پی گیا
ہوش کہاں باقی رہا کہاں سے سدا آئی ہے
میں تو میرے انتظار میں سب کچھ بھولا بیٹھا
نہ ہنسی رہی آئی نہ کوئی خوشی آئی ہے
ہمارے ہاتھوں سے لگا وہ پیار کا پودا خزاں رسیدہ
نہ اس کے پتے باقی رہے نہ اس پر کبھی بہار آئی ہے
(عابد علی معفری.... کندیاں)

آشفگی کے تو میری وفا بھی نہیں
میرا سلسلہ کوئی تجھ سے جدا بھی نہیں
چلیں تو کس سفر سے تجھے جانے
ہم تیرے مگر سے آشنا بھی نہیں
عداوتیں بے سبب لوگوں کا ہنر ہے
تیرے بن میرا زمانے سے جگہ بھی نہیں
زندگی کا ہر سفر طے کرنا ہے مجھے
تیرا بچھڑنا میرے غم کی ابتدا بھی نہیں
ہر قافلہ پر غم گزرتا ہے میری بستی سے
مضطرب لمحوں سے میں جدا بھی نہیں
مرا مراسم تجھ سے ساحل تک نہ تھا احمد
اب کے میں موجوں میں تھا بھی نہیں
(احمد فراز احمد..... ہری پور)

اڑ جائیں گے تصویر کے رنگوں کی طرح ہم!!!
ہم وقت کی لہی پر پرندوں کی طرح ہیں

اس سفر میں حادثے پیش آئیں گے
ہر قدم پر آپ کو لگے گا ڈر
آپ کے بند پر سوئے گی چڑیل
دیکھ لیتا کسی روز کر کے ڈر کا سفر
آپ کی مردوں سے ہوگی دوستی
آجڑھے گا جن کا بچہ آپ پر
ایک سایہ آئے گا پیکے سے اور
کاٹ کر لے جائے گا تم سب کے سر
خون کے پیالے پیو گے تم سب
اور ناگن کھاؤ گے تم بھون کر
دیکھتے ہی دیکھتے کھوپڑیوں کا پہاڑ
بھر بھرا کر گر پڑے گا آپ پر
سنگلو فرمائے گی قبرستان کی قبر
اور مردہ جائے گا زندوں کے گھر
مختصر یوں ہے کہ یہ پورا سفر
لمحہ لمحہ خوف میں ہوگا بسر
ہاں مگر ان حادثوں کے باوجود
آپ سب لوئیں گے زندہ اپنے گھر
(ایس ایم اے احمد گراچی)

جس کی آنکھیں ہیں اتنی نشلی، وہ خود کتنی حسین ہوگی
اسے دیکھتے ہی میں اس میں کھو گیا تھا
جب اپنی خبر نہ تھی، مجھے تو دوسروں کی کیا خبر ہوگی
چھین پائیں ہیں میں نے، میرے دل پہ اب قابو نہیں ہے
میری آنکھیں اب منتظر اسی کی ہیں، لگی بے چینی مجھ کو بڑی ہے
میری سمجھ سے بالا تر ہے یہ، کہ وہ انسان ہوگی
مجھے تو لگا ہے ایسے، جیسے آسمان سے اتری ہوگی
وہ کوئی پری ہوگی
(پری... لاہور)

سونا چاہتا ہوں پر نیند آنکھوں سے دور ہے
دل بھی اب تو بوجھل سا اور مجبور ہے
محبت سے دیکھنا اور پھر منہ موڑ لیتا
کیا یہی سنگدل زمانے کا دستور ہے
کس سے کہوں کون سنے گا داستان میری

اداس دل کی تھی پھر یہ کہانی میری
جاسے کوئی پلٹ کے آتا نہیں کبھی
اندھروں میں لٹ گئی جیسے جوانی میری
بیت کیا جیوں تو احساس ہوا جاوید
دل سے میرے اب جاتی نہیں پریشانی میری
(محمد اسلم جاوید... فیصل آباد)

ایک شخص میری آنکھوں کا نور ہونا چاہتا ہے
اس بے چین دل کا سرور ہونا چاہتا ہے
میری محبت کی پناہوں میں چھپا ہے وہی
پہلے اجنبی مگر اب کی بار دل کا حضور ہونا چاہتا ہے
میں بھی ہوں اسی کی چاہت میں اتنا پاگل کہ
ہر خواب آنکھوں سے عبور ہونا چاہتا ہے
اسے دیکھ کر ہر خوشی ہے خوشی میری
لگتا ہے کہ ہر غم مجھ سے دور ہونا چاہتا ہے
اس قدر حسین ہے وہ چاند نسیم میرا
دل اس کی چاہت میں چور چور ہونا چاہتا ہے
وہ چاند نسیم میرا چراغے گا نور تیرا ناز
اسے چاند چھپ جا کیوں بے نور ہونا چاہتا ہے
(شرف الدین جیلانی نذوالہ یار)

آجائے سامنے انصر تو کچھ بات ہے
چمکے ہتھیلی پہ قمر تو کچھ بات ہے
یادوں کا ہجوم، نغمات کی سدا ہو
جذبات کا ہو اثر تو کچھ بات ہے
دل گیر ہو جاں بغل گیر بھی ہو جاں
دونوں کی ہو دیدہ تر تو کچھ بات ہے
سب جھوڑ کے اشکوں کو کریں اک وعدہ
نہ ہو ہماری زیست میں بھر تو کچھ بات ہے
آرزوؤں، تمناؤں کا سفر کانٹے نہ کٹے
جلسیں جو دیکھ سحر تو کچھ بات ہے
(دلکش امیر پوری... کہروڑ پکا)

خوف کی اک وادی کا سفر
کر رہے ہیں ہر ماہ کے قیسوں پر

تمہیں کس نے کہا تھا؟
دو چہرے کے گرم سورج کی طرف دیکھو
اور اتنی دیر تک دیکھو کہ پینائی پھل
جائے؟

تمہیں کس نے کہا تھا؟
آسمان سے ٹوٹی، اندھی بچیوں سے
دوستی کر لو
اور اتنی دوستی کر لو...

کہ گھر کا گھر ہی جل جائے...
تمہیں کس نے کہا تھا؟
ایک انجانے سفر میں
انہی راہروں کے ہمراہ دور تک جاؤ

اور اتنی دور تک جاؤ...
کہ وہ رستہ بدل جائے.....
(سائل دعا بخاری..... بصیر پور)

یادوں کے گلاب کھلتے ہیں
پھنجرے ہوئے لوگ ملتے ہیں
نکلے ہوئے دل کے ہزاروں
غم آنسوؤں میں ڈھلتے ہیں
دوست بھی بدل گئے نظریں
پھر آنسو میرے سلگتے ہیں
بھتے ہیں چراغ روشنی کوئی نہیں
دکھ اپنا کسی کو سناتے ہیں
ہو گئی سحر کسی کے انتظار میں
پاس رہ کے بھی وہ سناتے ہیں
روز ذکر کرتا ہوتا ہے کسی کی وفا کا
پہلو یوں بھی لوگ بدلتے ہیں
چھوڑ گزرے دنوں کی یادوں کو جاوید
جانے والے کب لوٹ کے آتے ہیں
(محمد اسلم جاوید..... فیصل آباد)

روا حیا کی اتر گئی ہے
حوا کی بیٹی بکھر گئی ہے

جو بس رہی تھی دلوں میں غیرت
میں سوچتا ہوں کدھر گئی ہے
تجھی کو معجز نہا ہے پایا
جہاں جہاں پہ نظر گئی ہے
جو معتبر تھی جہاں میں ہستی
مثال قصہ شرر گئی ہے
ستم گردوں کی ستم گری سے
حیات اپنی سنور گئی ہے
امید فصل بہار فاقی
خزاں رتوں میں ہی سر گئی ہے
(عمران فاقی..... انک)

دل کا مگر سوتا کروں
جذبوں کو ان ہوتا کروں
پہچان اپنی
میں اپنا چہرہ

سچ دوں
اور
اس کے بدلے
حصوں ہو مجھے سیم و زر
مجھے سیم و زر
سے کیا غرض
میرا سخن میرے پاس ہو
میرا خواب میری اساس ہو
مجھے تنگ دستی قبول ہے
تری آرزو تری بھول ہے
تو گلاب ہے میں بول ہوں
تو ہے کارواں تو میں دھول ہوں
(چوہدری ترمجہاں علی پوری..... ملتان)

"عشق" کچھ سوچ کے خاموش رہا تھا ورنہ
حسن تو بکتا ہوا بازار تلک آ گیا تھا
میرے اندر کے کسی "عجز" نے روکا ہے مجھے
ورنہ میں "عشق" کے اکاد تلک آ گیا تھا

پھر ایک رات اذیت سے مر گیا تھا کہیں
تمہارے عشق کو اندر سے مارتا ہوا میں
پہلے تو زندگی کی تمنا تھی "عشق" میں
اب ڈھونڈتا ہوں، کہ میرا قاتل کدھر گیا؟
"عشق" معیار دینا کو کرتا نہیں بدنام...!
اور نہ "ادراک" نے دکھانے تھے رستے کیا کیا؟
نصوص دلوں کو "عشق" کے الہام ہوتے ہیں
محبت معجزہ ہے، معجزے کب عام ہوتے ہیں
زمانہ دیکھے گا، جب میرے "عشق" کا سورج
تیری جنہیں پہ نسوار ہو رہا ہوگا...؟
تو نے دیکھی ہی نہیں "عشق" کے قلندر کی دھمال
پاؤں اگر پھر پہنچی پڑے تو دھول اڑا کرتی ہے
"عشق" ازل سے اپنی روائتوں پہ قائم
امتحان جس کا بھی لیتا ہے رعایت نہیں کرتا
بھوکا اور پیاسا رکھنا، کسین دیوانوں کو
"عشق" تیرا انداز ستم ہے بزیروں جیسا
بہت مشکل زمانوں میں بھی ہم اہل محبت
"وفا" پر "عشق" کی بنیاد رکھنا چاہتے ہیں
لے کر زنجیریں ہاتھوں میں
کچھ لوگ تمہاری تاک میں ہیں
"عشق" ہماری گیلوں میں، نہ اور پھر ہوتا تھا ہے
(انتخاب دعا عالم بخاری..... بصیر پور)

یہ جو دور ہے آزمائش کا
مجھے اس سے کوئی گلا نہیں
یہ تو زندگی کا اصول ہے
تجھی اپنا کوئی ہوا نہیں
یہ جو سلسلہ ہے اک درد کا
یہ تحفہ یونہی ملا نہیں
تو جیسے جان کر بھی انجان ہے
وہ راز میں نے کہا نہیں
مجھے اپنی خبر تو ہے مگر
تیری سوچ کا کوئی پتہ نہیں
یہ تھا ہے میری زندگی

جانے وہ آج کون سے رستے سے آئے گھر
ہر موڑ پر گلی میں بچھائی محبتیں
دل کی حالت کا بیان سب کے سامنے
اپنے آپ سے بھی چھپائی محبتیں
نفرت کے واسطے کبھی فرصت نہیں ملی
ہے اپنی مختصر سی کہانی محبتیں
(انتخاب: آدشیہ نیازی.....بدھ موڑی بلگرام)

سیراب دید ہوں گے یقیناً پہلے سے ہم
بیسٹے ہیں وہ گزر پہ تری اس یقین سے ہم
پوچھتے تہ کوئی مجزہ سجدہ جنوں
ہر رنگ راہ توڑ دیں اپنی نہیں سے ہم
ترک خیال وصل پہ آمادہ ہو گئے
مجبور ہو کے تیری مسلسل نہیں سے ہم
یہ رعب حسن آنکھ ملانا محال ہے
کس طرح ہم کام ہوں اس مدد جہیں سے ہم
کیا خوب ہے ہماری ملاقات کا یہ کھیل
تم آسمان سے دیکھ رہے ہو زمیں سے ہم
میتا ہے جس سے درس محبت زمانے کو
رکتے ہیں پیار ایسے مکاں کے کہیں سے ہم
پوشیدہ طور پتے ہیں جس آتش میں سانپ
گرتے ہیں اجتاب اسی آتشیں سے ہم
آنکھوں میں اس کی تیر گئے اشک غم کاشف
کردیں اب اختتام فسانہ ہمیں سے ہم
(کاشف عبید کاوش.....بدھ موڑی بلگرام)

خون مسلم کا رائیگاں نہیں جائے گا
کوئی ہمیں یوں مار کر پھٹائے گا
ہم تو مر کر بھی پائیں گے اک زندگی
تو ہماری زندگی نہ پائے گا
ہم سے ہیکے گا یہ سارا گلستاں
تو کہاں گلشن مرا مہکائے گا
وقت پہلے سا نہیں تو کیا ہوا
وقت اچھا بھی تو عزیز آئے گا
(احسن عزیز.....کوشا کلاں)

عرسے تک مہکتی رہتی ہے فضا
ان خوش رنگ لحاظ کو یاد کر کے
نقش پا بھی نہیں جن کے اب دور تک
لیکن پھر بھی آیا تو آتی ہے
دیکھو.....دسمبر پھر لوٹ آیا ہے
نخ بستہ لمبی راتیں ہیں، خاموشی ہے
ان ٹھٹھرتی پھٹکتی سرد شاموں میں
کچھ پرانے درد جاگ اٹھتے ہیں
گل داؤدی کی پر کیف خوشبو سے فضا معطر ہے
میں چلتا جا رہا ہوں.....بس
قدموں تلے چہرے چہرے جیسے احساسِ دوار ہے زندگی کا
کبھی رقص کرتی تھی زندگی اس موسم میں
فضائیں گیت گاتی تھیں اور دورانِ فانی میں اڑتے پرندے
محبیوں کے پیار ہو کر تے تھے
موسم آج بھی وہی ہے، سناوین اب بھی ہرستا ہے
ہاں شاید اگر دس ایام نے حالات بدل دیئے ہیں
اب تم بھی وہ نہیں رہیں، شاید میں بھی
لیکن اک بات مشترک ہے
دسمبر آج بھی بھاتا ہے
برستی بوندوں سے دوستی آج بھی ہے
گل داؤدی آج بھی سانسوں کو معطر کرتا ہے
اور یاد کے درپہلوں سے کوئی چہرہ جھانکتا ہے
دل تمہیں کل بھی یاد کرتا تھا آج بھی یاد کرتا ہے
اگر ممکن ہو تو لوٹ آؤ کہ.....
دسمبر پھر لوٹ آیا ہے۔

(نوید قریشی.....کراچی)

دونوں کو آسکیں نہ نبھانی محبتیں
اب پڑ رہی ہیں ہم کو بھلائی محبتیں
سب سرسبز فریب ہیں کیا انکار اعتبار
پیار حسین عشق جوانی محبتیں
تنگ کن رفاقتوں کے دیئے واسطے مگر
اس کو نہ یاد آئیں پرانی محبتیں
گزری راتوں کے غم ہی اب تک بھرے نہیں
پھر اور کیا کسی سے بوجھائی محبتیں



ذہنی اذیت

صبا محمد اسلم - گوجرانوالہ

حسن سلوک اور نیکی کبھی رائیگاں نہیں جاتی، اسی حقیقت کو احاطہ کرتی یہ کہانی پڑھنے والوں کو ورطہ حیرت کے ساتھ ساتھ اچنبھے میں ڈال دے گی کہ نیکی کبھی بھی چھپاٹے نہیں جھپتی اور بھر ۔۔۔

نیکی، بدی پر مبنی خوف کے سمندر میں غوطہ زن دل گرفتہ دل نگار اور دل فریب کہانی

ابھی میری شادی کا دوسرا دن تھا جب میری ”ماس اماں“ کمرے میں تشریف لائیں۔ میں احتراماً ادب سے کھڑی ہو گئی۔ انہوں نے ناقدانہ نظروں سے کمرے کا جائزہ لیا اور صفائی پر اچھا خاصا لٹکھر سنا دیا، میں سر جھکائے سستی رہی۔ جانے لگیں تو مخاطب ہوئیں۔

”بہو یاد آیا، میں تو کچھ اور کہنے آئی تھی صبح

”شادی“ کچھ لوگوں کے لئے خوشیوں کا پیغام لاتی ہے تو کچھ لوگوں کے لئے سراپا ”نم“ بن جاتی ہے۔ میرا شمار بھی ان لوگوں میں ہوتا ہے جو شادی کے بڑے خوبصورت خواب آنکھوں میں سجا لیتے ہیں مگر دقت کی دھوپ سارے خوش رنگ ارمان چھلما دیتی ہے۔ جیسے گرمی کی دھوپ کپڑوں کے رنگ پھیکے کر دیتی ہے۔

Dar Digest 257 January 2015

یہ سب یہ بنی نہیں
یہ صدا کی ہے جو گونجتی
وہ لفظ تو نے کہا نہیں
میرا جرم ہے میری سادگی
میری اور کوئی خطا نہیں
(عثمان غنی..... پشاور)

کچھ عمر کی پہلی منزل تھی
کچھ رشتے تھے انجان بہت
کچھ ہم بھی پاگل تھے لیکن
کچھ وہ بھی تھے نادان بہت
کچھ اس نے بھی نہ سمجھایا
یہ پیار نہیں آسان بہت
اکثر ہم نے بھی کھیل لیا
جس کھیل میں تھے نقصان بہت
جب بکھیر گئے تو یہ جانا
ایسے آتے ہیں یہ طوفان بہت
اب کوئی نہیں جو اپنا ہو
لے کو تو ہیں انسان بہت
اسے کاش وہ واپس آجائے
یہ دل ہے اب سناں بہت
(ظاہر اسلام عرف منہو بلوچ..... سرگودھا)

گر بزم شب سے، بحر سے کلام رکھتے تھے
کبھی وہ دن تھے کہ زلفوں میں شام رکھتے تھے
تمہارے ہاتھ لگے ہیں تو جو کر دسو کر دسو
وگر نہ تم سے تو ہم سو غلام رکھتے تھے
یہ اور بات، ہمیں دوستی نہ اس آئی
ہوا تھی ساتھ، تو خوشبو مقام رکھتے تھے
نجانے کونسی رات میں پھڑکنے وہ لوگ
جو اپنے دل میں بہت احترام رکھتے تھے
وہ آتو جاتا کبھی ہم تو اس کے رستے پر
دیئے جلائے ہوئے شام رکھتے تھے
(راہل بخاری..... محبوب شاہ)

اسے دیکھ کر
مجھے اتنا تو ہوتا
میری جان جاناں کیسا ہے
میرا یار پرانا کیسا ہے
ستے سال کا سورج چڑھ جائے
مجھے یاد جو اس کی آجائے
تب آنکھ سے بہتے اشکوں کو
کس کرب سے میں روکوں گا
میری سانسیں تھوڑی باقی ہیں
اسے کہو کہ آکر مل جائے
اسے دیکھ کر اسے کہنا مل جائے
وہ آئے تو میرے دل کی سب
بندگیاں بھی مکمل جائیں
اسے دیکھ کر.....

(سید عبادت راجہ - ذریعہ اسٹائل خان)

میں جب کسی کو دعا کرتے دیکھوں
دعا کرنے والے عقیدت سے بہتے
پھولوں میں بیٹے ہرستے، مسکتے
شام کے آتے جگنو پیستے
منت کی چادر سر پہاڑے
محبت کا تحوید دل سے لگائے
آنکھیں چرائے، نظریں بچائے
چاہت کے موتی پختے ہی جائے
عشق کی مالا جیتے ہی جائے
صرف ایک گلی کے چکر لگائے
خوابوں کا شاو زادہ
محبوبوں کا دل دادہ
دعا کرنے والے آنکھوں کو بچتے
میں جب کسی کو دعا کرتے دیکھوں
دعا کرنے والے کے دل میں
کدورت
عدوت کا مادہ
رنجش کی بساط بچائے

نغرت بھر سے کچھ پیادے
بغاوت آمادہ
دعا کرنے والے ہر آنکھ لکھتے
میں جب کسی کو دعا کرتے دیکھوں
ظریف احسن دعا کرنے والے
میری طرح ہی یہ انسان ہیں سارے
جوگی، ملنگ، درد لیش، صوفی
بزرگ، قلندر، یار، جن، مجذوب،
سالک، کامل
سائیں، ولی، ملاحولاء، محبوب، پیا
آپ، جناب دعا کرنے والے
شب و روز چاند سورج
روشن صورت یہ سارے انسان
ظریف احسن، محبت کے محسن
یہ انسان سارے، انسان کے محسن
(ظریف احسن..... کراچی)

تیرے نام کہانی لکھوں
تجھ کو رات کی رانی لکھوں
بھیلتا جاؤں دن کی دشت
پھر بھی شام سہانی لکھوں
اول اول تیری صورت
خال و خد الاثنی لاکھوں
اپنے لبو سے میں تو بجی
تیرے نام جوانی لاکھوں
ایسے تجھ پر واری جاؤں
یعنی خون کو پانی لاکھوں
اپنے پیار کو سب لکھتے ہیں
میں بھی یار کو جانی لاکھوں
من برکھا میں تجھ کو بھگوؤں
پیار کا آنکھل دھانی لکھوں
(ڈاکٹر ثوبیہ قادری..... کوئٹہ)

☆☆

اسلم راہی ۱۴۷۱ھ کی تحریر کردہ بہترین کتابیں

حضرت ابو بکر صدیقؓ

حضرت عمر فاروقؓ

حضرت عثمان غنیؓ

حضرت علیؓ

حضرت ابوعبیدہ بن جراحؓ

حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ

حضرت سعد بن ابی وقاصؓ

حضرت طلحہ بن عبید اللہؓ

حضرت زبیر بن عوامؓ

حضرت سعید بن زیدؓ

خالد بن ولیدؓ

عمر بن عبدالعزیزؓ

حجاج بن یوسفؓ

محمد بن قاسمؓ

طارق بن زیادؓ

ہارون الرشیدؓ

مامون الرشیدؓ

رکن الدین بھیرسؓ

سلطان ملک شاہ سلجوقیؓ

سلطان الپ ارسلانؓ

قیمت فی کتاب - 40 روپے

Ph: 32773302

شیخ بک ایجنسی
نوبل اسکوائر کراچی
اردو بازار

پر تھپڑ مارا کہ آنکھوں کے آگے تارے ناچتا کسے کہتے ہیں، اس دن مجھے معلوم ہوا کہ ساس کیسی ہوتی ہے۔

ساس کے جانے کے بعد ریحان نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر تسلی دی اور کہا۔ ”کام سے فارغ ہو جاؤ پھر آج ڈھیر ساری باتیں کریں گے۔“ مجھے پتہ تھا کہ ان باتوں کا نہ میرے پاس وقت ہو گا نہ ریحان کے پاس۔

ان دنوں عجیب عجیب باتیں ہونے لگیں۔ میں اگر کمرے میں ہوتی تو مجھے آواز آتی ”بہو!“ مجھے لگتا ساس نے پکارا۔ بھاگ کر ساس کے کمرے میں جاتی تو وہ سو رہی ہوتی۔

”میں سونے لگتی تو لگتا جیسے کوئی پاؤں میں گدگدی کر رہا ہے جو چیز جہاں رکھتی ڈھونڈ ڈھونڈ کر تھک جاتی مگر نہ ملتی۔ ساس سے ڈانٹ الگ کھاتی۔“

ایک دن میرے بھیا مجھے کچھ دنوں کے لئے لینے آ گئے۔ میرے لئے تو جیسے عید ہو گئی۔ کتنی منت سماجت کے بعد میری ساس نے مجھے جانے کی اجازت دی، یہ تو میں ہی جانتی ہوں۔

میکے آ کر مجھے وہ بات نظر آئی جو پہلے کبھی نظر نہیں آئی تھی۔ جو میرے ساتھ میری ساس وہاں سلوک کر رہی تھیں۔ وہ میرے اپنے گھر میں میری بھابھی کے ساتھ میری ای کر رہی تھیں۔

میں نے سوچ لیا کہ میرے ساتھ میری ساس کا سلوک چاہے جتنا بھی خراب رہے مگر اپنی امی کا برین واش کر کے جاؤں گی۔ میں نے آہستہ آہستہ امی کے دماغ میں بٹھانا شروع کر دیا کہ ”جیسا سلوک آپ یہاں بھابھی کے ساتھ کرتی ہیں ویسا میری ساس میرے ساتھ کرتی ہے۔“

امی نے بھابھی سے اپنے روپے کی معذرت کی اس پر بھابھی نے آبدیدہ ہو کر کہا کہ ”آئندہ میں بھی ماما کی طرح ہی آپ کا خیال رکھوں گی۔“

ہمارا گھر ایک مثالی گھر نظر آنے لگا کہ ریحان

ریحان آس اور سوئی کالج چلی جاتی ہے اور گھنٹوں میں ورد کی وجہ سے مجھ سے کچھ ہوتا نہیں پہلے تو کام والی تھی مگر اب تم آگئی ہو اس لئے صبح سات بجے ناشتہ بن جائے ہر صورت۔ اب تم گھربار کی مالک ہو۔ یہ سب تمہاری ذمہ داری ہے۔" یہ کہہ کر ساس کمرے سے چلی گئیں۔

اور میں سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔ "لو ماہابی بی، تمہاری والدہ نے تو ناہید بھابھی کو چند روز بعد کام پر لگایا تھا۔ تمہاری ساس نے تو آتے ہی کام سونپ دیا۔"

میں نے جلدی سے کپڑے تبدیل کئے، ریحان کمرے میں آئے تو انہیں شک لگا مجھے دیکھ کر حیرت سے بولے۔

"ماہابی! تم نے اتنی جلدی ڈریس چینج کر لیا؟ مہمانوں کی وجہ سے تو میں نے جی بھر کر تمہیں دیکھا بھی نہیں تھا؟"

میں نے ایک شکوہ کناس نظر ان پر ڈالی اور بیڈ کی طرف آگئی۔ موبائل پر 5 بجے کا آ لارم سیٹ کیا، ساتھ ہی آنکھیں آنسوؤں سے بھر آئیں اپنے گھر میں تو میں اپنی مرضی سے اٹھنے کی عادی تھی۔

الارم لگایا اور سر سے لے کر پاؤں تک چادر تان لی تاکہ ریحان کو اندازہ ہو جائے کہ مجھے کوئی بات نہیں کرنی ان سے۔

بڑی مشکل سے سو پائی تو الارم کی آواز نے جگا دیا۔ دل چاہا پھر سو جاؤں ابھی تو سوئی تھی مگر ساس کے خوف نے اٹھنے پر مجبور کر دیا۔ الارم بند کر کے ریحان کو دیکھا جو خواب خرگوش کے مزے لے رہے تھے۔

دل چاہا انہیں اٹھا دوں کہ مجھے بتادیں کچن کہاں ہے مگر پھر خود ہی اٹھ کر کمرے سے باہر نکل آئی۔ سارا مرسائیں سائیں کر رہا تھا سوائے میرے، سب سے سو رہے تھے۔

کچن ڈھونڈ کر فریج کا جائزہ لیا آٹا نکال کر باہر نکل کا کافی سالن پڑا تھا۔ پھر کمرے میں آ کر وضو

کیا نماز سے فارغ ہو کر کچن کی راہ لی۔

پراٹھے بنارہی تھی کہ ریحان کچن میں آئے میرا خیال تھا وہ اتنی جلدی کچن کا کام کرتے دیکھ کر حیران ضرور ہوں گے مردہ آرام سے مجھے سب گھروالوں کی پسند، ناپسند کے بارے میں بتانے لگے۔ "سوئی ناشتے میں پراٹھے کے ساتھ کھن لیتی ہے۔ امی کو سالن پسند ہے مجھے پراٹھا آلیٹ کے ساتھ اچھا لگتا ہے۔"

ان سب باتوں میں بس ایک بات نہیں تھی کہ "ماہابی! تمہیں کیا پسند ہے ناشتے میں؟" اہم تھا تو بس اپنی پسند اور ناپسند کا تذکرہ۔

پونے سات تک میں نے ناشتہ ریڈی کر کے ٹیبل پر سیٹ کر دیا، اسی وقت میری ساس اور میری سہیلی سوئی چنچ گئیں اور سب نے یوں ناشتہ کیا جیسے یہ معمول کی روٹین ہو۔

دو دن بعد میری امی مجھ سے ملنے آئیں اور مجھے کچن میں کام کرتا دیکھ کر کافی افسردہ ہوئیں کہ ابھی شادی کو دن ہی کتنے ہوئے ہیں، امی نے مجھے ساتھ لے جانے کی بات کی تو میری ساس نے صاف جواب دے دیا کہ انہیں بہو کا روز روزہ سیکے جانا پسند نہیں امی میری ساس کے اس انداز سے غمزدہ واپس چلی گئیں۔

یہ اس کے دو دن بعد کا واقعہ ہے میں نے آٹا گوندنے کے لئے کنسترو کا ڈھکن اٹھایا تو میری چیخ نکل گئی اس میں ایک مردہ چڑیا خون میں لت پٹ پڑی تھی۔

میری چیخ سن کر سب آگئے۔ میری ساس نے غصے سے کہا "کیا موت پڑ گئی چیخا شروع کر دیا؟"

میں نے کنسترو کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ "اس میں مردہ چڑیا پڑی ہے۔"

میری سار اور ریحان نے دیکھا پھر ایک دم ساس سیدھی ہوئی اور بولیں۔ "بہو! اندھی ہو گئی ہو کیا؟ یہاں کچھ بھی نہیں۔"

میں نے گھبرا کر دیکھا اس میں واقعی کچھ نہیں تھا۔

میری ساس نے اتنی زور سے میرے منہ

معاف کر دے۔“

یہ سن کر ساس نے میرے ماتھے کا بوسہ لیا اور بولیں۔ ”بہو کل صبح سے میں صبح سویرے اٹھ کر ناشتہ بناؤں گی تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ اگر تم سے رینخان کوئی روکھی سوکھی بات کرے تو مجھے بتانا میں اس کے کان کھینچوں گی۔ جیسا کہ گھراب تمہارا ہے، سو بیٹی بھی چلی جائے گی اور میری زندگی کا کیا بھروسہ۔“

یہ سن کر میں بولی۔ ”اللہ آپ کو صحت دے آپ فکر نہ کریں گھر کے تمام کام ہم مل کر کر لیا کریں گے، یہ گھر ہم سب کا ہے۔ جب سب ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں تو اللہ بھی خوش ہوتا ہے۔“

ساس نے پھر میرے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرا اور دھیر ساری دعائیں دیتی ہوئی کمرے سے چلی گئیں۔

ساس کے جانے کے بعد میرے سامنے میز پر ایک کارڈ نمودار ہوا اس پر لکھا تھا۔ ”میری بات غور سے سنیں۔ میں نے جو کچھ کیا وہ آپ کی ساس کو سبق سکھانے کے لئے، آپ کی ساس کے دماغ سے آپ کی برائی اور بد سلوکی کو کھرچ کر نکال دیا ہے اور ساتھ ہی ساتھ ایسا سبق دیا ہے کہ آپ کی ساس تا حیات آپ کی طرف انگلی بھی نہیں اٹھا سکتی۔ میں نے چھٹی کا دودھ یاد دلایا ہے۔“

جھمکنوں والا ڈرامہ بھی میں نے ہی کیا تھا اور سو بیٹی کے سسرالیوں کے دماغ میں ساری باتیں میں نے ڈالی تھیں تاکہ آپ کی ساس زیادہ سے زیادہ ذلیل ہو۔

میں نے آپ کو بہن کہا ہے تو آپ میری بہن ہی رہیں گی۔ میں ہر طرح آپ کی حفاظت کرتی رہوں گی۔ ہمارا بسرا آم کے درخت پر قائم رہے گا اگر کبھی کسی بات کی ضرورت پیش آئے تو میرا نام ”شالہہ۔۔۔۔۔“

شالہہ“ لے کر تین مرتبہ پکارنا، میں فوراً حاضر ہو جاؤں گی۔ اچھا اب میں چلتی ہوں آپ آرام کریں۔“ اور اس کے ساتھ ہی آواز آنا بند ہو گئی۔



جوان کے گھر والوں نے میرے ساتھ کس اور میں نے خون کے آنسو روتے ہوئے ہر ظلم کو چپ چاپ مہا اور کسی بات کا شکوہ نہیں کیا۔ سو بیٹی کے سسرال والوں نے رشتہ ختم کر دیا چوری کی بات کو بنیاد بنا کر۔ سب سے اچھنبے اور غصہ کرنے کی بات یہ تھی کہ ان لوگوں کو ان ساری باتوں کا علم کیسے ہو گیا تھا کہ ماں نے اپنی بیٹی کا سیٹ جان بوجھ کر چرایا تھا۔

اب میری ساس کو اپنا ہر ظلم یاد آنے لگا تھا جو انہوں نے مجھ پر کیا تھا۔

اگلے دن میری ساس اور میرے شوہر گھر آ گئے۔ دونوں کافی نادام دکھائی دے رہے تھے۔ میری ساس، مجھ سے اپنے رویے کی معذرت کرنے لگیں اور شوہر سر جھکائے بیٹھے رہے۔ میں نے بھی کھلے دل کا مظاہرہ کرتے ہوئے ان کے ناروا اور ناقابل برداشت سلوک کو معاف کر دیا کہ اللہ کو معاف کرنے اور احسان کرنے والے لوگ پسند ہیں۔

میں نے بھی اللہ کی رضا کے لئے معافی دی کہ یوم حشر مجھے بھی اللہ سے معافی کی ضرورت ہے اگر میں لوگوں کو معاف کرنا نہیں سیکھوں گی تو اللہ کی ذات بھی مجھے معاف کیسے کرے گی پھر احسان کا بدلہ تو احسان ہی ہے۔ اور معاف کرنے والے لوگ اچھے ہوتے ہیں۔“

میں سسرال آ گئی رینخان کسی کام سے باہر گئے تو ساس کمرے میں آئیں اور میرے سر پر شفقت بھرا ہاتھ پھیرتے ہوئے گویا ہوئیں۔ ”بہو میں اپنی ساری غلطیوں اور زیادتیوں کی معافی مانگتی ہوں، میں نے کافی غور کیا اور یہ بات میرے دل میں بیٹھ گئی کہ واقعی میں نے تمہارے ساتھ زیادتی کی تھی۔ بہو مجھے معاف کر دو۔“

یہ سن کر میں نے ان کا ہاتھ پکڑا اور بولی۔ ”آپ بڑی ہیں میری ماں کی جگہ ہیں، آپ مجھ سے معافی نہ مانگیں اور میں نے دلی طور پر ساری باتیں بھول گئی ہوں۔ جو ہونا تھا وہ ہو گیا اور اگر کوئی بات ہے تو میں نے قلبی لگاؤ کے ساتھ معاف کر دیا، میرا اللہ بھی

مجھے لینے آگئے۔ میں اس سکون سے واپس آگئی کہ اب میرا گھر بھی سکون کا گہوارہ بن جائے گا۔ مگر میرے لئے تو وہ گھر پہلے سے بھی زیادہ جہنم کدہ بن گیا۔

میری ساس نے اپنی بیٹی کے لئے کچھ زور رکھا تھا کہ اس میں سے جھکے غائب ہو گئے۔

ریحان کے آتے ہی گھر میں طوفان آ گیا۔ میرے کمرے کی سلامتی لی گئی تو وہ جھمکنے بجائے کہاں سے میری ڈریننگ کی دراز میں آگئے جھمکوں کا ملنا تھا کہ میری ساس نے میری ہٹائی شروع کر دی اور نجانے مجھے اور میرے خاندان کو کیا کچھ سنا ڈالا۔

ریحان کی آنکھوں میں اپنے لئے شک دیکھ کر میں بالکل ٹوٹ گئی۔ میں روتے روتے یونہی سوئی۔ اچانک میری آنکھ کھلی تو میرے پاس ”معدرت“ کا کارڈ پڑا تھا۔ میں خوش ہو گئی کہ ریحان کو مجھ پر اعتبار آ گیا۔ مگر وہ کمرے میں موجود نہیں تھے میں انہیں دیکھنے کے لئے باہر آئی تو میرے پاؤں کے نیچے سے زمین نکل گئی کہ میری ساس ریحان سے مجھے چھوڑنے کا کہہ رہی تھیں۔

میں آبدیدہ نم پلکوں کے ساتھ واپس پلٹ آئی۔ بیڈ پر ایک اور کارڈ پڑا تھا جس پر لکھا تھا۔

”میرا نام شالہہ ہے اور میرا تعلق قوم جنات سے ہے۔ آپ فکر نہ کریں اور ایسا مزہ چکھاؤں گی کہ یہ بڑھیا تاحیات ذہنی اذیت کو بھلا نہ پائے گی میں شروع دن سے آپ کے ساتھ ہوتی زیادتی کو دیکھ رہی ہوں اور اب آپ کے ساتھ ہونے والی زیادتی میرے بس سے باہر ہو گئی ہے بس آپ تھوڑے وقت کا انتظار کرے۔ اپنی والدہ کو آپ نے درست راستہ دکھایا آپ کی ساس کو میں سیدھا کر دوں گی۔“

میں حیران رہ گئی کہ یہ کون ہے کیسے جانتی ہے؟ اور اب یہ کیا کر سکتی ہے، جب میرا شوہر ہی میرے خلاف ہے، یہ کیسی دھمکی ہے اور ساس کے خلاف کیا کیا جائے گا۔ اچانک پہلا کارڈ غائب ہو گیا اور ایک اور کارڈ وہاں نمودار ہوا اس پر لکھا تھا۔

”آپ کے گھر کے لان میں جو آم کا درخت ہے ہمارا اس پر بیٹا ہے، جب آپ کی شادی ہوئی تو آپ مجھے اتنی پسند آئیں کہ میں زیادہ وقت یہاں گزارنے لگی میرا کوئی بھائی بہن نہیں اس لئے آپ مجھے اپنی بہن سمجھیں۔ آپ نے کھانا نہیں کھایا میں کھانا لائی ہوں۔“

جب میری نظر ساس نے میز پر پڑی تو وہاں گرم بریانی اور راستہ پڑا تھا۔ میں کھانے لگی۔

جب کھا کر فارغ ہو گئی تو سب برتن اور کھانا غائب ہو گیا میں بستر پر لیٹ گئی اور ساتھ ہی مجھے نیند آ گئی۔

صبح حسب عادت 5 بجے انھی نماز پڑھنے کے بعد سب کی پسند کا ناشتہ بتایا اور ٹیبل پر لگا کر کمرے میں واپس آ گئی۔ کس نے کھایا کس نے نہیں مجھے نہیں معلوم۔ نہ کسی نے مجھ سے کہا کہ تم بھی کچھ کھا لو۔

اور پھر اسی دن ریحان مجھے میری امیر کے گھر چھوڑ گئے۔

میرے پیچھے میری ساس نے میری نند کی منگنی کر دی۔

میری نند کے سسرال والوں نے اسے منگنی پر گولڈ کا سیٹ دیا مگر اگلے دن ہی وہ سیٹ نبھانے کہاں غائب ہو گیا اور سوئی کے سسرال والوں کو نبھانے کیسے اس کی خبر ہو گئی۔ وہ لوگ بھی عجیب و غریب باتیں بناتے لگے۔

ایک دن اچانک سوینی نے کسی کام سے اپنی ای کی الماری کھولی تو اس میں کپڑوں کے درمیان سیٹ پڑا دیکھ کر حیران رہ گئی اس نے زور سے اپنی ماں کو آواز دی ریحان اور اس کی ماں دونوں کمرے میں آ گئے۔

ماں اپنی الماری میں پڑا سیٹ دیکھ کر حیران رہ گئی سوینی اپنی ماں پر چلائے لگی کہ ”آپ کو سیٹ اتنا پسند تھا تو مجھ سے کہہ دیتیں۔ میں خود سے دیتی آپ کو اس طرح چراغے کی کیا ضرورت تھی؟“

ریحان گہری سوچ میں ڈوب گئے اب انہیں اپنی غلطی کا احساس ہو رہا تھا اور ان زیادتیوں کا بھی



copied from



پراسرار سایہ

چاند زیب عباسی - کراچی

خود غرضی مطلب پرستی اور لالچ نے اسے اندھا کر دیا تھا، غرض شناسی کو وہ فراموش کر کے ملک دشمنوں سے جاملا مگر وقت کا آہنی پنجرہ آہستہ آہستہ اس کی طرف بڑھ رہا تھا کہ پھر اچانک اس کی گردن پھنس گئی۔

دل و دماغ سے محو نہ ہونے والی عبرت اک، حیرت اک، خوفناک اور دل گرفتہ کہانی

خان کا غشی تھا۔ شادی کے دس سال بعد شہناز نے جنم لیا۔ تو سلامت خان کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا۔ اس کے دوسرے سال اس کے گھر بیٹا ہوا جس کا نام سلیم خان رکھا گیا۔ بیٹا ہونے کے باوجود سلامت خان اپنی بیٹی کو جان سے زیادہ چاہتا تھا۔ اس کی ہر خواہش پوری کرتا تھا۔

اپنی عمر کے پانچویں سال شہناز نے اپنے باپ سے خواہش ظاہر کی کہ وہ پڑھنا چاہتی ہے اس کی خواہش جان کر سلامت خان بھونچکا رہ گیا وہ جانتا تھا کہ اس علاقے میں تعلیم کی بات کرنا ہی جرم ہے اور پھر جہانگیر خان لڑکیوں کی تعلیم کا تو انتہائی سخت مخالف تھا۔ ایک طرف جہانگیر خان کی دہشت اعصاب پر حاوی تھی تو دوسری طرف بیٹی کی خواہش کو بھی نظر انداز کرنا اس کے لئے ناممکن تھا وہ خود ہی بمشکل میٹرک تک پڑھ پایا تھا۔ لیکن یہ تعلیم بھی اس نے شہر میں اس دور میں حاصل کی تھی جب اس کے والد روزگار کے سلسلے میں شہر گئے تھے اور وہیں قیام کر کے انہوں نے سلامت خان اور اس کی ماں کو بھی شہر بلوایا تھا۔

سلامت خان کے جوان ہوتے ہی وہ واپس گاؤں لوٹ آئے۔ سلامت خان کی شادی کے دوسرے سال اس کے والد اور چوتھے سال اس کی والدہ وفات پا گئیں۔

50 سالہ بار لیش سلامت خان اپنی آٹھ سالہ بیٹی شہناز کے ساتھ دریا کے کنارے کھڑا تھا۔ صبح صادق کا وقت تھا دریا کے کنارے ان دونوں کے علاوہ کوئی اور ذی نفس موجود نہ تھا۔ سخت سردی کے اس موسم میں ان دونوں باپ بیٹی کا اس دریا کے کنارے موجود ہونا حیران کن تھا۔ سلامت خان کے چہرے پر پھانسی گھاٹ کے اس قیدی کی طرح گہرے رنج و غم کے تاثرات تھے جس کے نگلے میں پھانسی کا پھندا پڑا ہوا ہوا کسی بھی لئے جلا دیو کھینچنے والا ہو۔

شمالی علاقہ جات میں واقع دور دراز کا وہ گاؤں لالی تھا۔ جہاں جہانگیر خان اس علاقے کا بلا شرکت وغیرے مالک تھا۔ یہاں حکومت کا کوئی خاص کنٹرول نہ تھا۔ علاقے کے تمام فیصلے جہانگیر خان خود ہی کرتا تھا۔ اس علاقے میں صوبائی اسمبلی کی سیٹ اس کی خاندانی سیٹ تھی۔ اسلو اس علاقے کا زیور تھا۔ جہانگیر خان تعلیم کا سخت مخالف تھا۔ اس علاقے میں کوئی بھی اسکول یا تعلیمی ادارہ نہیں تھا۔ دو چار بار یہاں حکومت نے سرکاری اسکول بنوائے بھی لیکن جہانگیر خان کے حکم پر ان اسکولوں کی عمارت ڈھا دی گئی۔

سلامت خان کی شہناز اکلوتی بیٹی تھی۔ وہ جہانگیر

Dar Digest 262 January 2015

بار کمر ایک دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ اور سوچنے لگا۔ ”وہ کون ہے اور اسے یہاں کس نے قید کیا؟ شاید یہاں کوئی ہو جو مجھے اس قید تنہائی سے باہر نکالے۔“ یہ سوچتے ہی وہ زور زور سے چیخنے لگا۔ ”کوئی ہے؟“ لیکن اس کی یہ آواز کمرے کے درود دیوار سے ٹکرا کر دوبارہ اس کے کانوں سے ٹکرائی، اس نے وحشت کے عالم میں اپنے سر کا عقبی حصہ دیوار سے ٹکرایا اور درود کی ایک شدید لہر اس کے پورے وجود میں سرایت کر گئی اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا اس کے سر پر ایک بڑا سا گومڑ بنا ہوا تھا اور اس کے بال خون سے لچ بج ہو رہے تھے جو خشک ہو کر بالوں میں جم گیا تھا۔ گویا بے ہوش ہونے سے پہلے اس کے سر پر چوٹ لگی تھی وہ وحشت کے عالم میں کافی دیر تک وہاں بیٹھا رہا۔

اندھیرے میں صبح و شام کا اندازہ کون کر سکتا ہے اچانک اسے پنڈلی میں تکلیف کی شدید ترین احساس ہوا۔ ایسا لگا جیسے کسی جانور نے اس کی پنڈلی میں اپنے نوکیلے دانت گاڑ دیئے ہوں اس نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں یہ ایک بلی کی جسامت کا خونخوار چوہا تھا۔ جو اس کی پنڈلی میں دانت گاڑے ہوئے تھا۔ اسی قسم کے تین چار اور چوہے اس کے قریب ہی موجود تھے، گھپ اندھیرے کے باوجود اسے ان چوہوں کی چٹکتی آنکھیں صاف دکھائی دے رہی تھیں۔ بلی کی جسامت کے خوف ناک چوہے اس کے ارد گرد جمع ہونا شروع ہو چکے تھے۔ ”ہش ہش بھاگو۔“ اس نے چلا کر چوہوں کو ہشکارا اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ چوہے بدک کر پیچھے ہٹے۔

ابھی اسے کھڑے ہوئے چند ہی لمحے گزرے تھے کہ پاؤں کے انگوٹھے میں تکلیف کا شدید ترین احساس ہوا اس نے چیخنے ہوئے اپنا پاؤں جھٹکا چوہوں کی تعداد رفتہ رفتہ بڑھتی جا رہی تھی، ان کے دانت اس قدر تیز اور نوکیلے تھے کہ اسے اپنے پاؤں میں سونیاں سی اترتی محسوس ہو رہی تھیں اس کے لئے یہ احساس ہی خوف ناک تھا کہ وہ اس اندھیرے کمرے میں ان خونخوار چوہوں کی خوراک بن جائے گا۔

جلدی کرو سورج نکلنے والا ہے۔“ کارندے نے پلا کر کہا اور اسے وارنگ دینے کے لئے ہوائی فائر کیا، وہ دریا کے کنارے کھڑی شہناز کی طرف بڑھا جو اس کی طرف دیکھ رہی تھی، شہناز کی نظروں میں حسرت و یاس، بے یقینی، موت کا خوف اور بہت کچھ تھا اس کی سوالیہ نگاہیں گویا اپنے باپ سے پوچھ رہی تھیں کہ ”کیا ایک باپ اپنی بیٹی کو خود اپنے ہاتھوں سے موت کے منہ میں ڈھکیل سکتا ہے۔“ پھر سلامت خان نے اپنی بھیگی ہوئی آنکھیں جھپٹیں اور بیٹی کو دریا میں ڈھکیل دیا، وہ دریا کی سرکش لہروں میں جا گری اور نگاہوں سے اوجھل ہو گئی، اسی کا نام زندگی ہے جو گرگٹ کی طرح رنگ بدلتی ہے۔ اس کا ہر لمحہ مختلف ہوتا ہے ایک ہی وقت میں کسی کے گھر سے میت اٹھ رہی ہوتی ہے اور کسی دوسرے گھر میں خوشیوں کا رقص ہوتا ہے شہناز سلامت خان کی صرف بیٹی ہی نہیں جگر کا گوشہ تھی۔ ”اے لوگو! کیا تم اس باپ کا دکھ جان سکتے ہو جس نے خود اپنے ہاتھوں سے اپنی بیٹی کو موت کے گھاٹ اتارا ہو۔“

☆.....☆.....☆

آنکھ کھلتے ہی اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ مگر اسے مایوسی ہوئی اس دبیز اندھیرے میں اسے کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور اندھوں کی طرح ٹول ٹول کر آہستہ آہستہ چلنے لگا۔ ہر طرف گرد و غبار اور دھول سی جمی ہوئی تھی وہ دیواروں کے ساتھ چلتا ہوا آگے بڑھتا رہا۔ جلد ہی اسے اندازہ ہو گیا کہ یہ ایک وسیع و عریض کمرہ ہے۔ کافی دیر تک ادھر ادھر ٹہلنے کے بعد وہ ایک جگہ ٹک کر بیٹھ گیا۔ اور یکسوئی سے سوچنے لگا کہ وہ یہاں کیسے پہنچا لیکن اسے کچھ یاد نہیں آیا وہ یہ تک بھول چکا تھا کہ وہ کون ہے؟ اور یہاں کیسے پہنچا؟ اس کے ذہن میں ماضی کی یادداشت کی رقم تک موجود نہ تھی کچھ دیر تک بیٹھے رہنے کے بعد اس نے دیواریں دوبارہ نونئی شروع کر دیں۔ اس کی آنکھیں اتنی دیر میں اندھیرے سے مانوس ہو چکی تھیں اور کچھ دھندلے دھندلے دیواروں کے نقوش دکھائی دینے لگے تھے۔

کافی دیر تک ٹہلنے کے بعد وہ دوبارہ تھک

سلامت خان نے شہر سے کتابیں لا کر بنی کو پڑھانا شروع کیا۔ وہ انتہائی ذہین بچی تھی اس کا حافظہ بہترین تھا۔ وہ اپنا سبق اس طرح یاد کرتی کہ گویا اسے سبق کو گھول کر پلا دیا گیا ہو۔ آٹھ سلا کی عمر تک وہ اپنی ذہانت کے بل بوتے پر اس مقام پر پہنچ چکی تھی کہ سلامت خان کو خود بھی حیرت ہوتی تھی۔

سلامت خان جب شہر جاتا اس کے پڑھنے کے لئے بچوں کے رسالے اور اخبارات لے آتا۔ ایک روز وہ ایک کاپی باپ کے پاس لائی اور بولی۔ ”بابا میں نے کہانی لکھی ہے۔“

سلامت خان نے جب اس کی لکھی ہوئی کہانی پڑھی تو ششدر رہ گیا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے یہ کہانی کسی بچی نے نہیں بلکہ کسی رائٹر نے لکھی ہو۔ سلامت خان نے وہ کہانی شہر جا کر پوسٹ کر دی۔ جو اگلے ہی ماہ رسالے میں شائع ہو گئی۔

شہناز اپنی کہانی شامل اشاعت دیکھ کر بڑی خوش ہوئی پھر وہ اکثر اس رسالے کے لئے لکھنے لگی۔ ایک روز اس نے اپنے علاقے کی کہانی لکھی کہ اس کے علاقے میں بچوں اور بچیوں کے تعلیم حاصل کرنے پر پابندی لگا دی گئی ہے اور صنف نازک کو کمتر مخلوق سمجھا جاتا ہے اور پھر اس نے اپنے ساتھ کھیلنے والی بچیوں کو اپنی درسی کتابوں سے پڑھانا شروع کر دیا۔

علم کی روشنی پھیلانا اس کا ناقابل معافی جرم ٹھہرا۔ اس جرم کی اطلاع سننے ہی جہانگیر خان آگ بگولا ہو گیا۔ سلامت خان کو ڈیرے پر طلب کر لیا گیا۔ ”سلامت خان تمہاری بیٹی نے وہ حرکت کی ہے جو آج تک ہمارے علاقے میں کسی لڑکی نے نہیں کی۔ ہمیں لگتا ہے کہ یہ گاؤں کی دوسری لڑکیوں کو بھی خراب کرے گی اور گاؤں کی بدنامی کا باعث بنے گی۔ اس لئے میرا حکم ہے کہ تم سے پہلے اسے تم خود اپنے ہاتھوں سے اس دنیا سے رخصت کر دو۔“

جہانگیر خان نے بے رحمی سے حکم دیا۔

”سردار میں کیسے اپنی پھول جیسی بیٹی کو اپنے

ہاتھوں سے مار سکتا ہوں۔“ سلامت خان تڑپ اٹھا۔ ”تو پھر ہمارے حکم پر تمہارے بیٹے اور بیٹی کو تم سمیت مار دیا جائے گا۔“ جہانگیر خان سانپ کی طرح پھنکارا اس کے حکم پر اس کے کارندے سلامت خان کے بیٹے سلیم خان کو اسی وقت اس کے گھر سے اٹھا لائے۔ وہ معصوم بچہ ڈر کے مارے رو دیا تھا۔

”سلامت خان سورج نکلنے سے پہلے میرے حکم پر عملدرآمد ہونا چاہئے ورنہ تم بیٹی کے ساتھ بیٹے سے بھی ہاتھ دھو بیٹھو گے۔“ جہانگیر خان نے فیصلہ کن لہجے میں کہا اور سلامت خان خاموشی سے اس کے ڈیرے سے باہر نکل گیا۔ وہ جانتا تھا کہ احتجاج فضول ہے اب اسے بیٹے کی زندگی بچانے کے لئے بیٹی کی قربانی دینی تھی۔ اس کی بیوی ساری رات روتی رہی۔ صبح پانچ بجے کے قریب اس نے بیٹی کو جگایا اور دریا کے کنارے لئے آیا۔ اس کے گھر کی غرائی پر معمور جہانگیر خان کا ایک کارندہ بھی اس سے کچھ فاصلے پر رائفل تھامے کھڑا تھا۔

”بابا جانی آپ مجھے مار دو گے؟“ وہ معصومانہ انداز میں بولی اور سلامت خان کو ایسا لگا جیسے کسی نے اس کا دل منہی میں دیوبچ کر مسل ڈالا ہو۔ وہ بے اختیار بیٹی سے لپٹ کر رونے لگا۔

”بابا جانی آپ ہی تو کہتے تھے کہ غم اور خوشی انسان کے ساتھ ساتھ ہیں۔ بڑے سے بڑے دکھ کو صبر و تحمل سے سہنا چاہئے۔ اگر میری موت سے آپ کی اور بھائی کی زندگی بچتی ہے تو مجھے کوئی غم نہیں۔“ وہ معصوم بچی اپنی عمر سے بڑھ کر بڑی باتیں کر رہی تھی۔

اور سلامت خان کا دل غم سے پھٹا جا رہا تھا یہ بے بسی کی انتہا تھی وہ اپنے جگر کے گوشے کو خود ہی موت کے منہ میں دھکیلنے کے لئے مجبور تھا۔ اگر ایسا نہ کرتا تو جہانگیر خان اس کے بیٹے اور بیوی کے ساتھ ساتھ شہناز کو بھی جان سے مار ڈالتا۔ لیکن بیٹی کو بھی خود اپنے ہاتھوں سے موت کے منہ میں دھکیلنا آسان نہیں تھا۔

پھر اہوا دریا اس کے سامنے تھا قریب ہی جہانگیر خان کا کارندہ رائفل اٹھائے کھڑا تھا۔ ”سلامت خان

راستے میں آنے والے پتھر سے ٹھوکر کھا کر گرا اور کراہتے ہوئے جیسے ہی اٹھا تو سشدر رہ گیا۔

لڑکی غائب تھی یہ ایک دیران پہاڑی علاقہ تھا چاروں طرف ہریالی ہی ہریالی تھی دور دور تک کسی انسانی آبادی کا نام و نشان نہ تھا چیز اور دیار کے درخت و کُش مناظر پیش کر رہے تھے لیکن وہ ان سب سے بے نیاز سوچ رہا تھا کہ ”لڑکی کہاں گئی؟ کہیں اس عمارت میں دوبارہ تو نہیں پہلی گئی؟ لیکن وہ تھی کون؟ اور وہ خود کہاں ہے اور کون ہے؟ اور اس عمارت کے تہ خانے میں کیسے پہنچا؟ جہاں خون خوار چوہے موجود تھے۔“ لاتعداد سوالات اس کے ذہن میں ابھر رہے تھے۔

کچھ دیر چلنے کے بعد وہ تھک کر ایک چوڑے درخت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا اور اپنا جائزہ لیا، سر کی چوٹ کے علاوہ جسم میں جگہ جگہ چوہوں کے کاٹنے سے زخم پڑ چکے تھے اور شدید تکلیف ہو رہی تھی اس نے سوچتے سوچتے بے خیالی میں اپنے گلے پر ہاتھ پھیرا تو اس کے ہاتھ میں ایک عجیب ساخت کا لاکٹ آ گیا جو ایک سنہری چمچن سے منسلک تھا۔ اس نے چمچن کا ہک کھول کر لاکٹ نکالا یہ عام لاکٹ سے مختلف عجیب ساخت کا قدرے ابھار والا لاکٹ تھا۔ جس کے عقب میں گھڑی کی سوئی سے مشابہ ننھا سا مٹن تھا۔ اس نے اچھے ہوئے ذہن سے لاکٹ کو دیکھا اور پھر دوبارہ لاکٹ گلے میں پکھن لیا اور کرتے کی سائڈ کی جیب سے پرس نکالا ایک خانے میں تو ہزاروں کی رقم تھی جبکہ دوسرے خانے میں ایک تصویر تھی۔ اس نے تصویر پرس سے نکالی اسے تصویر دیکھ کر حیرت کا ایک اور جھٹکا لگا تصویر میں وہ ایک لڑکی کے ساتھ موجود تھا۔ دونوں نے ایک دوسرے کا ہاتھ تھام رکھا تھا۔

سب سے زیادہ حیرت کی بات یہ تھی کہ یہ وہی لڑکی تھی جس نے اسے تہ خانے سے آزاد کر دیا تھا اور اپنا نام کرن بتایا تھا۔ گویا اس کا اس لڑکی سے کوئی نہ کوئی گہرا تعلق تھا، وہی اس کے ماضی کے بارے میں بتا سکتی تھی۔

کچھ دیر آرام کرنے کے بعد وہ اٹھا اور کچی سڑک پر چلنے لگا کافی دیر بعد وہ کچی سڑک پر پہنچا تو کافی تھک

چکا تھا۔ اس لئے وہ ایک طرف سستانے کے لئے بیٹھ گیا۔ کچھ دیر بعد اسے دور سے ایک مسافر وین آتی دکھائی دی وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا اس وقت اس کی نظر سڑک کنارے نصب ایک چھوٹے سے بورڈ پر پڑی جس پر علاقے کا نام لکھا ہوا تھا۔ وین کے قریب آتے ہی اس نے اشارے سے وین کو اشارے سے روکا۔ خوش قسمتی سے وین میں ایک سیٹ خالی تھی جو کھڑکی کے ساتھ تھی۔ کچھ دیر بعد کنڈیکٹر اس کے قریب آیا اس نے خاموشی سے سوکانوٹ نکال کر کنڈیکٹر کی طرف بڑھادیا۔ ”کہاں جانا ہے؟“ کنڈیکٹر نے پوچھا اور وہ سوچ میں پڑ گیا کہ اب اسے کیا بتائے کہ اسے کہاں جانا ہے تو اپنا نام تک یاد نہ تھا۔

”میں نے پوچھا ہے کہاں جانا ہے؟“ کنڈیکٹر نے جھنجھلا کر تیز لہجے میں پوچھا۔

”گاڑی کہاں تک جائے گی؟“ اس نے پوچھا۔ ”فیض آباد اڑے تک۔“ کنڈیکٹر نے حیرت سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

”مجھے بھی وہیں جانا ہے۔“ وہ جواب دے کر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔

”لگتا ہے کھسکا ہوا ہے؟“ کنڈیکٹر بڑبڑایا۔

فیض آباد ایک پر رونق علاقہ تھا۔ ایک بھر ڈر لیسر کی شاپ پر نہانے کے بعد شیو کروا کر باہر نکلا اور ایک اوسط درجے کے ہوٹل پر کھانا کھایا، پرس میں رقم موجود ہونے کی وجہ سے اسے اب تک کوئی دشواری پیش نہیں آئی تھی۔ لیکن چوہوں کے کاٹنے سے جسم میں سخت تکلیف ہو رہی تھی، ہوٹل سے کھانا کھا کر باہر نکلا تو کچھ ہی فاصلے پر اس کی نظر ایک عمارت پر پڑی۔ یہ ایک پرائیویٹ اسپتال تھا۔ اس کے قدم بے اختیار اسپتال کی عمارت کی طرف اٹھنے لگے پارکنگ ایریا کے قریب پہنچتے ہی وہ بے اختیار رک گیا۔ کار میں ڈاکٹروں والا گاڈن پہنچے ایک لڑکی سوار ہو رہی تھی، یہ وہی لڑکی تھی جس نے اسے چوہوں والے تہ خانے سے بچایا تھا اور اپنا نام کرن بتایا تھا اور کرن کی تصویر بھی اس کے پرس میں موجود تھی جس میں اس نے کرن کا ہاتھ تھام رکھا تھا گویا کرن اور اس کا

بیڑھیاں چڑھ کر لڑکی کے قریب جا پہنچا۔ دروازے سے باہر نکلتے ہی وہ ایک دوسرے کمرے میں پہنچ چکے تھے۔ یہ کمرہ ساتھی آلات اور مختلف قسم کے جاروں سے بھرا ہوا تھا۔ جن میں محلول بھرا ہوا تھا۔ ایک طرف بڑی سی لکڑی کی الماری تھی۔ سامنے ٹرائل پر کمپیوٹر رکھا تھا۔ وہ کمرے سے نکل کر کوریڈور میں داخل ہوئے، لڑکی نے ایک کمرے کا دروازہ کھولا اور بولی۔ ”اس کمرے میں چلے جاؤ اندر الماری میں سے کپڑے نکال کر پہنو اور جلدی باہر آؤ جب تک میں یہیں کھڑی ہوں۔“

وہ کمرے میں داخل ہوا ساز و سامان سے آراستہ اس کمرے میں واقعی ایک الماری موجود تھی جس کے بیٹگر میں مختلف قسم کے لباس رکھے تھے الماری کے نچلے خانے میں نئے جوتے بھی موجود تھے اس نے الماری میں گئے بیٹگر سے ایک کرتا شلوار نکال کر پہنا جوتوں کا جوڑا پہننے کے بعد اپنے لباس کی تلاشی لی وہاں قمیض کی سائیڈ کی جب میں پھولا ہوا پرس موجود تھا پرس میں اچھی خاصی رقم موجود تھی۔ اس نے پرس جیب میں رکھا اور کمرے سے باہر نکلا۔ ”کیا یہ تمہارا گھر ہے؟“ اس نے چلتے ہوئے لڑکی سے پوچھا مگر لڑکی نے کوئی جواب نہیں دیا اور اس کے ساتھ چلتی ہوئی اس گھر سے باہر نکل گئی۔

یہ پہاڑی علاقہ تھا جو شاید ہزاروں فٹ بلند تھا اطراف میں سینکڑوں فٹ گہری کھائیاں تھیں جنہیں دیکھ کر خوف آتا تھا۔ انسانی آبادی کا دور دور تک نام و نشان نہ تھا۔ گویا اس علاقے میں یہ واحد مکان تھا ایک طرف کچی سڑک تھی وہ اس سڑک پر چلتے گئے۔ ”تم کون ہو اور مجھے یہاں کس نے قید کیا تھا مجھے اپنے بارے میں کچھ یاد کیوں نہیں؟“ وہ دونوں ہاتھوں سے سر تھامتے ہوئے بولا۔

”میں کرن ہوں یہاں سے گزر رہی تھی کہ چیخوں کی آواز سن کر تم تک جا پہنچی۔“ لڑکی نے جواب دیا لیکن وہ لڑکی کے اس جواب سے مطمئن نہیں ہوا بھلا اس ویران علاقے میں کسی تنہا خوبصورت لڑکی کا کیا کام اور پھر اس لڑکی کو کیسے پتہ چلا کہ کون سے کمرے میں الماری میں کپڑے موجود ہیں وہ بے خیالی میں سوچتا ہوا جا رہا تھا کہ

وہ زندگی بچانے کے لئے اس کمرے میں ابھر ادر بھاگنے لگا۔ جہاں جہاں وہ بھاگتا چوہے تیز رفتاری سے اس کا پیچھا کرتے اور جہاں وہ رکتا چوہے اسے گھیر کر اپنے دانت اس کے پاؤں میں گاڑنے کی کوشش کرتے۔ مسلسل بھاگتے رہنے سے اس کا سانس بھونکنی کی طرح چلنے لگا اور اعصاب جواب دینے لگے تھے، آخر کب تک وہ تنہا ان چوہوں سے لڑتا۔ یہ وسیع و عریض کمرہ اس کی قبر بننے والا تھا۔ بھاگتے بھاگتے بلآخر وہ تھک ہار کر گر پڑا اس کے گرتے ہی چوہوں نے اس پر یلغار کر دی اور جگہ جگہ سے اس کے جسم میں چھید کرنے لگے۔ وہ جان بچانے کے لئے اٹھا بھاگتا اور تھک ہار کر دوبارہ گر جاتا۔ چوہے اس کے پورے وجود پر احاطہ کر چکے تھے۔

سوت اور زندگی کے درمیان فاصلہ تھا۔ سینکڑوں خونخوار چوہوں سے جان بچانا مشکل ہی نہیں ناممکن بھی تھا اس نے کئی چوہوں کو اپنے پاؤں سے پکڑا اس کے باوجود چوہے اس کے جسم میں سوراخ کرنے کی کوششوں میں مصروف تھے، خون کی بوندیں جگہ جگہ سے کھال سے نکل رہی تھیں۔ انسانی خون کی بو چوہوں کو مشتعل کر چکی تھی زندگی کی خواہش نے اس کے بے حس و بے حرکت جسم میں ارتعاش پیدا کیا اور وہ دوبارہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

اسی وقت چہ چہ اہٹ کی آواز سنائی دی جیسے کہ دروازہ کھلا ہو اور کمرے میں روشنی درآئی اس نے سر اٹھا کر دیکھا کچھ فاصلے پر بیڑھیوں پر ایک خوبصورت لڑکی کھڑی تھی جس نے میکی تمالاس پہن رکھا تھا اس کے عقب میں دروازہ کھلا تھا دروازہ کھلنے سے روشنی اندر درآئی تھی۔ روشنی ہوتے ہی چوہوں میں ہل چل مچنے لگی اور وہ فرش میں بنے سوراخوں میں گھسنے لگے۔

”تم کون ہو؟ اور میں کہاں ہوں؟“ اس نے نحیف آواز میں پوچھا۔

”یہ وقت ان باتوں کا نہیں جلدی سے باہر نکلو۔“ کی معترف آواز میں بولی۔ اس کی آواز بھی اسی کی طرح خوبصورت تھی وہ آگے بڑھا اور کانپتی ٹانگوں سے

اور تم کہہ رہے ہو کہ میں اکیلا خود سے باتیں کر رہا تھا۔ اس کی آواز بتدریج بلند ہوتی جا رہی تھی اور گرد بیٹھے دوسرے لوگوں نے چونک کر آصف کو دیکھا جبکہ ویٹر اسے ماسف بھری نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔

آصف نے بل پے کیا اور ہوٹل سے باہر نکلا اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ اس کے ساتھ کیا ہو رہا ہے، کرن نے اس کا نام آصف حسین بتایا تھا پھر وہ کاؤنٹر سے کال کرنے کا کہہ کر گئی اور واپس نہیں لوٹی۔ جبکہ ویٹر کا کہنا تھا کہ آصف ہوٹل میں تنہا ہی داخل ہوا تھا اس کے ساتھ کوئی خاتون موجود نہیں تھی۔ وہ جتنا سوچتا اتنا ہی الجھتا پھر اس نے سوچا اس الجھن بھی ہوئی ڈور کا سرا سلجھانے کے لئے اسے اسی اسپتال میں جانا ہوگا۔ جہاں اس نے کرن کو دیکھا تھا۔

وہ وہاں سے سیدھا اسپتال جا پہنچا استقبالیہ پر ایک اسمارٹ سی لڑکی موجود تھی۔ ”میں ڈاکٹر کرن سے ملنا چاہتا ہوں۔“ اس نے استقبالیہ پر موجود لڑکی سے اپنا مدعا بیان کیا۔

”یہاں ڈاکٹر کرن نہیں ہیں۔“ لڑکی نے جواب دیا۔

اچانک اس کی نظر کوریڈور سے آتی کرن پر پڑی اس وقت وہ ڈاکٹروں والے گاؤن میں ملبوس تھی۔ ”آپ تو کہہ رہی تھیں اس اسپتال میں کوئی ڈاکٹر کرن نہیں۔ وہ دیکھیں، سامنے سے ڈاکٹر کرن آ رہی ہیں۔“ آصف نے انگلی سے اس کی طرف اشارہ کیا۔

”یہ کرن نہیں ڈاکٹر کرنس ہیں۔“ لڑکی ہلسی۔ اس اثناء میں وہ استقبالیہ تک پہنچ چکی تھی۔

آصف اس کی راہ میں حائل ہو گیا اور وہ اسے غصے سے دیکھنے لگی۔ ”اس روز تم ہوٹل سے کہاں غائب ہو گئی تھیں اور تم نے مجھے اپنا نام غلط کیوں بتایا تھا۔“ آصف خفگی آمیز لہجہ میں بولا۔

”مسٹر لگتا ہے واقعی تم پاگل ہو، اس روز بھی جب تم نے میرا راستہ روکا تھا، تب بھی میں نے یہی کہا تھا کہ میں تمہیں نہیں جانتی اور اب پھر تم میرا راستہ روکے کھڑے

قدر حیرت سے مجھے دیکھ رہے ہو، کہاں کہ ہم دونوں کے لئے انجی سی دوکپ چائے لے آؤ۔“ ویٹر اس طرح تیزی سے وہاں سے پلٹا جیسے اس نے آصف کے روپ میں کوئی بھوت دیکھ لیا ہو۔ ”کچھ دیر بعد اس نے ٹرے میں دوکپ چائے لاکے ڈرتے ڈرتے ٹرے آصف کے سامنے رکھ کر واپس لوٹ گیا۔

”ہاں تو میں کہہ رہی تھی کہ ہم دونوں کا دل کا رشتہ ہے حادثاتی طور پر ہماری ملاقات ہوئی تھی اور ہم ایک دوسرے کو چاہنے لگے اور پھر ایک حادثے میں تم یادداشت کھو بیٹھے۔“

”یہ سب کیسے ہوا مجھے تفصیل سے بتاؤ۔“ اور ہاں تم چائے تو پیو۔ ٹھنڈی ہو رہی ہے۔“ آصف نے چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔

”بی لوں گی اتنی جلدی بھی کیا ہے۔ ایک منٹ تم یہیں بیٹھو مجھے گھر ضروری کال کرنی ہے۔ اپنا موبائل فون میں گھر پر بھول آئی ہوں۔“ وہ بولی اور کرسی سے اٹھ کر ایک طرف بڑھ گئی جبکہ آصف اپنے بارے میں سوچتے ہوئے چائے پیئے لگا۔ اسے گئے ہوئے کافی دیر ہو چکی تھی اور وہ اب تک نہیں لوٹی تھی۔

آصف اپنی چائے پی چکا تھا جبکہ کرن کے لئے موجود دوسرے کپ میں چائے ہنوز موجود تھی۔ چند منٹ مزید انتظار کرنے کے بعد اس نے اشارے سے ویٹر کو بلایا۔ ”جی سر۔“ وہ قریب آ کر مودبانہ لہجہ میں بولا۔

”میری خاتون ساٹھی فون کرنے کاؤنٹر پر گئی تھیں اب تک نہیں لوٹیں کیا تم نے انہیں کاؤنٹر پر دیکھا ہے۔“

”سر آپ اکیلے ہی اس ہوٹل میں داخل ہوئے تھے اور اس میز پر تنہا ہی بیٹھے تھے۔ جب آپ نے مجھے دوکپ چائے کا آرڈر دیا تب بھی میں حیران تھا اس دوران آپ اکیلے ہی باتیں کئے جا رہے تھے۔“ ویٹر نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

”تم کیا بکواس کر رہے ہو کیا تم نے مجھے پاگل سمجھ رکھا ہے میں کرن کے ساتھ اس ہوٹل میں داخل ہوا تھا اور تم سے چائے لانے کو کہا تھا وہ اب تک میرے ساتھ تھی

وہ نہ بولی رشتہ تھا۔
وہ گاڑی میں بیٹھنے ہی والی تھی کہ اس نے پکارا
”کرن“ اور اس کی طرف دوڑا تو وہ اسے حیرت سے
دیکھنے لگی۔ ”تم مجھے اس عمارت سے باہر نکالنے کے بعد
کہاں غائب ہو گئی تھیں۔؟“

”مسٹر تمہارا دماغ تو درست ہے۔ اس سے پہلے
میں نے تمہیں کبھی دیکھا نہیں اور ہاں میرا نام کرن نہیں۔“
”یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ تم کرن ہی ہو۔ میں تمہارا
چہرہ کیسے بھول سکتا ہوں تم ہی نے تو میری جان بچائی تھی۔“
”مسٹر لگتا ہے تمہارا ذہنی توازن درست نہیں
بہتر یہی ہے کہ تم اس اسپتال میں ذہنی امراض کے
ماہر ڈاکٹر سٹیل سے ملو وہ بہترین سائیکولوجسٹ ہیں۔“ وہ
تلخ لہجہ میں بولی۔

”اگر تم کرن نہیں تو، جب میں نے تمہیں کرن
کہہ کر پکارا تو تم کیوں رکیں اور مجھے مڑ کر کیوں
دیکھا؟“ اس نے اپنی طرف سے دلیل پیش کی۔

”تم اگر پاگلوں کی طرح کسی لڑکی کی طرف دوڑو
اور اسے مادھوری کہہ کر پکارو گے تو وہ رک کر حیرت سے
تمہیں دیکھے گی، اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ وہ مادھوری ہے
۔ اب میرا راستہ چھوڑ دیجئے ویسے ہی دیر ہو رہی ہے۔“ اس
نے تند لہجہ میں کہا اور گاڑی میں بیٹھ کر اسے اسٹارٹ کیا،
ریورس کر کے پارکنگ سے باہر نکالی اور تیز رفتاری سے
اسپتال کے مین گیٹ سے باہر نکل گئی۔

وہ اسے حیرت سے جانا دیکھتا رہا اسے سمجھ نہیں
رہا تھا کہ کرن اسے پہچاننے سے کیوں انکار کر رہی ہے
۔ اس نے اس کی جان بچائی تھی اور پھر وہ اتنی جلدی
ماآباد کے اس اسپتال میں کیسے آ پہنچی۔ کچھ دیر وہاں
! رہنے کے بعد وہ اسپتال میں داخل ہوا۔
O میں موجود ڈاکٹر نے حیرت سے اس کے زخموں کا
دیکھا اور ایک انجکشن لگانے کے بعد کچھ میڈیسن لکھ کر
سے تھما دی۔

وہ میڈیکل اسٹور سے ادویات خرید کر سڑک
ن کرنے لگا دن تو اسی طرح گزر گیا رات کوئی

پریشانی لاحق ہو گئی اسے رات بسر کرنے کے لئے جگہ
درکار تھی اس نے ایک چھوٹے سے ہوٹل میں کمرہ لیا اپنا
نام تو یاد نہیں تھا اسے جو نام ذہن میں آیا کاؤنٹر پر وہی
بتا دیا۔ اس نے قین چار روز ہوٹل کے اسی کمرے میں
گزار دیئے۔ وہ دن بھر ادھر ادھر گھومتا رہتا اور رات کو
آ کر ہوٹل کے کمرے میں سو جاتا۔ وہ جانتا چاہتا تھا کہ وہ
کون ہے؟ اور اس پر کیا گزری؟ وہ اس تہہ خانے میں کیسے
پہنچا اور کرن سے اس کا کیا رشتہ ہے؟

پانچویں روز جب وہ ایک فٹ پاتھ پر سے
گزر رہا تھا کہ اسے عتب سے جانی بیچانی نسوانی آواز
سنائی دی۔ ”آصف۔“ وہ مڑا اس کی پشت پر کرن موجود
تھی۔ اس نے میکی نما خوبصورت لباس پہن رکھا تھا
۔ ”تم؟“ اس کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

”ہاں میں اب یہیں کھڑے دیکھتے رہو گے یا
ہوٹل چلو گے یاد ہے۔ ہم نے ایک بار اس ہوٹل میں ٹاؤن
کیا تھا۔“ وہ ایک فائو اسٹار ہوٹل کی طرف انگلی سے اشارہ
کرتے ہوئے شوخ لہجہ میں بولی۔

”اس روز تو تم نے اسپتال کے پارکنگ ایریا میں
مجھے پہچاننے سے انکار کر دیا تھا۔“

”میں مذاق کر رہی تھی۔“ وہ ہنس پڑی وہ اس کے
ساتھ چلتا ہوا ہوٹل میں داخل ہوا اور ایک خالی میز کے
قریب رکھی کرسی پر بیٹھ گیا۔ کرن اس کے سامنے بیٹھ گئی۔
”دو کپ اچھی سی چائے لے آؤ۔“ ڈیٹر کے قریب آتے
ہی اس نے کہا اور دبلا پتلا ڈیٹر اسے حیرت سے دیکھنے لگا۔

”اب بتاؤ میں کون ہوں؟ اور میرا تم سے کیا رشتہ
ہے تمہاری تصویر بھی میرے پاس موجود ہے۔“ اس نے
کرن کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

”میں نے تمہیں بتایا تھا کہ میرا نام کرن ہے۔ اور تم
آصف ہو۔ آصف حسین اور ام دونوں کا دل کا رشتہ ہے۔“

”گو یا میرا نام آصف حسین ہے۔“ اس نے سوچا
اسی وقت اسے محسوس ہوا کہ دبلا پتلا ڈیٹر اب تک کھڑا اسے
حیرت سے دیکھ رہا ہے۔ آصف غصے سے دھاڑا۔ ”اے
مسٹر کیا میرے سر پر سینگ نکل آئے ہیں جو اس

دستیاب فلائٹ سے اسلام آباد آنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ مگر راجیل نے منع کر دیا اور کہا کہ وہ خود ہی ایک دوروز میں آصف کو لے کر ان کے گھر آ جائے گا۔

پھر آصف صادق نے آصف سے بات کرنے کی خواہش ظاہر کی تو راجیل نے موبائل فون آصف کے ہاتھ میں تھما دیا۔ ”کیسے ہو بیٹا اور کہاں رہ گئے تھے تم جانتے نہیں کہ تمہاری گمشدگی سے ہم پر کیا گزری، تمہاری ماں تو دن رات روتی رہتی ہے۔“ ان کے لہجے سے بھی یہی لگ رہا تھا کہ وہ بھی بات کرتے ہوئے رورہے ہیں۔ آصف تڑپ اٹھا۔ ”ابو... اب میں آ گیا ہوں آپ فکر نہ کریں ایک دوروز میں گھر آ جاؤں گا بس چند ضروری کام نمٹانے ہیں۔“ اس کے بعد اس کی ماں نے اس کے ساتھ بات کی راجیل ڈاکٹر تھا اور اس اسپتال میں ڈیوٹی کر رہا تھا جہاں آصف ڈاکٹر نرس سے ملتا تھا۔ اس کی رات کی ڈیوٹی بھی وہ رات کو اسپتال چلا گیا۔

صبح ناشتہ کرتے ہی آصف ٹبلے کے لئے گھر سے باہر نکلا۔ ٹبلے ٹبلے اس نے سوچا راجیل کی موجودگی میں دوبارہ ڈاکٹر نرس سے ملوں۔ اس کا ذہن اب تک یہ تسلیم کرنے کو تیار نہیں تھا کہ کرن اور نرس دو الگ الگ شخصیتیں ہیں۔

سامنے سے ایک ٹیکسی کو آٹا دیکھ کر اس نے ٹیکسی کو ہاتھ کے اشارے سے روکا وہ اسپتال کے گیٹ سے کچھ فاصلے پر اترا۔ اور ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ راجیل کی ڈیوٹی آف ہونے میں کچھ ہی دیر تھی۔ شاید ابھی نرس بھی ڈیوٹی پر نہیں آئی تھی۔ اس کا ارادہ یہاں آتے ہی بدل گیا تھا اس نے سوچا جیسے ہی نرس آئے گی وہ اسے روکے گا اگر وہ اپنی بات اڑی رہی تو وہ اسے وہ تصویر دکھائے گا جس میں وہ آصف کے ساتھ موجود تھی۔

آصف وہیں کھڑے کھڑے جب اکتا گیا تو ارد گرد کا جائزہ لینے لگا اسپتال کے گیٹ سے کچھ فاصلے پر ایک بغیر چھت والی جیپ کھڑی تھی جس میں تین اوہاش صورت افراد بیٹھے تھے اسی وقت ایک طرف سے مہراں کار آتی دکھائی دی وہ اسپتال کے گیٹ پر لمحہ بھر کے لئے

آہستہ ہوئی سی تھی کہ اچانک جیپ سے تینوں اوہاش صورت افراد اترے اور چشم زدوں میں کار کے قریب پہنچ گئے۔ اب ان میں سے دو کے ہاتھوں میں ہسٹل بھی نظر آ رہے تھے جو انہوں نے شاید لباس میں چھپا رکھے تھے اس سے پہلے کہ کوئی ہتھ بھتاوہ کار کا دروازہ کھول کر نرس کو باہر گھیسٹ کر جیپ میں ڈال چکے تھے۔

نرس مدد کے لئے چیخا اور چلا رہی تھی ان کے ہاتھوں میں موجود ہسٹل کی وجہ سے وہاں موجود افراد میں سے کسی کی ہمت نہ ہوئی کہ نرس کو بچانے کی کوشش کرتا اور موقع پر موجود آصف حرکت میں آیا۔ اور ایک جھٹکے سے آگے بڑھنے والی جیپ کے پیچھے دوڑا۔ اور بھاگ کر لمحوں میں جیپ میں سوار ہو گیا جیپ کے اندر زبردست کش مکش شروع ہو چکی تھی وہ اگرچہ اپنی یادداشت کھوپکا تھا لیکن شاید ماضی میں مارشل آرٹ کا کھلاڑی رہ چکا تھا اس لئے اس کے الشعور میں دبے مارشل آرٹ کے داؤ پیچ خود بخود سامنے آنے لگے اور اس کے ہاتھ پاؤں چلنے لگے اس نے اسٹیرنگ پر ہاتھ ڈال کر مزاحمت کی ایک ہسٹل بردار نے ہسٹل کا دستہ اس کے سر پر مارنے کی کوشش کی آصف کی زوردار بیک کک اس کے سینے پر پڑی اور وہ چیخا ہوا چلتی جیپ سے گر پڑا۔

یہ دیکھ کر دوسرے نے آصف کی طرف ہسٹل سیدھا کیا ہی تھا کہ آصف نے اس کے ہسٹل والے ہاتھ پر ہاتھ ڈال دیا ٹریگرو باگونی چلی جو آصف کے کان کی لو کو چھوتی ہوئی گزر گئی۔ آصف کا زوردار گھونسا اس شخص کے جڑے پر پڑا ہسٹل اس کے ہاتھ سے نکل گیا۔

فائر کے ہولناک دھماکے نے آصف کے حافظے کو بلا دیا اسے ایسا لگا جیسے یہ فائر کی آواز وہ پہلے بھی کہیں سن چکا ہے۔ ماضی کا کچھ حصہ اسے یاد آنے لگا اور حملہ آور نے اس کی لمبائی غفلت سے فائدہ اٹھا کر اس کے گلے پر دونوں ہاتھ جمادیے اور پوری قوت سے اس کا گلا دبائے لگا جیپ اب تک سڑک پر دوڑ رہی تھی۔

ڈاکٹر نرس خوف زدہ ہر اسان سی ایک طرف پڑی تھی۔ جبکہ آصف کا دم گھٹنے لگا اور آنکھوں کے آگے

”یہ تم کیا کہہ رہی ہو۔“ وہ چراغ پا ہو گئی۔

گاڑی آئے بڑھادی اس کے استفسار پر آصف نے ہوش میں آنے کے بعد کے تمام واقعات سنا ڈالے پھر راجیل نے اسے اس کے ماضی کے بارے میں بتایا۔

باہر سے کبھی خود ہی ملتی ہو اور کبھی پیچھا سننے سے انکار کر دیتی ہو۔“ وہ گرگٹ کی طرح رنگ بدلتی کرن یا زنگس کے رویے پر حیران تھا۔

راجیل اس کا تایا زاد بھائی تھا ان کی رہائش اسلام آباد میں تھی آصف کے والد و اصف حسین ایک ٹیکسٹائل مل میں منیجر کے پوسٹ پر فائز تھے آصف ان کا اکلوتا بیٹا تھا اور میڈیکل کالج کا اسٹوڈنٹ تھا۔ کچھ روز پہلے آصف نے اپنے والد سے مری گھومنے کی اجازت چاہی اس کا کہنا تھا کہ وہ اپنے نکاح کی فیلووز دوستوں کے ساتھ کوہ مری گھومنے جا رہا ہے۔ ان کا موبائل فون پر آصف سے رابطہ تھا۔

”مسنز اب اگر تم دوبارہ میرے راستے میں آئے تو اچھا نہیں ہوگا۔“ کرن کا رویہ جارحانہ ہو گیا تھا۔ ان کی گفتگو کے دوران چند وارڈ بوائے اور ڈاکٹرز بھی آچکے تھے۔ جو جسمیں نگاہوں سے آصف کو گھور رہے تھے اس سے پہلے کہ صورتحال کوئی سنگین رخ اختیار کرتی۔ آصف تنہی سے چلتا ہوا اسپتال سے باہر نکل گیا۔ اپنا بے عزتی پر اس کا دل اور دماغ دونوں سلگ رہے تھے کرن یا زنگس اس کے ساتھ تصویر اور پیش آنے والے واقعات اس بات کا اشارہ کر رہے تھے کہ اس کا اور اس لڑکی کا کوئی نہ کوئی گہرا تعلق ہے لیکن کیا یہ اس کی سمجھ سے باہر تھا۔

پھر اچانک آصف الپتہ ہو گیا۔ ڈھونڈنے کے باوجود آصف کا کوئی سراغ نہیں ملا اس کا موبائل فون بھی آف تھا۔ اس کے والد اس کی تلاش میں یہاں بھی آچکے تھے اور پھر مایوس ہو کر واپس لوٹ گئے تھے۔ راجیل کے کہنے کے مطابق آصف کی کہیں آنیج منٹ بھی نہیں ہوئی تھی اور نہ ہی کسی ذخیرہ سے بارے میں سنا تھا تو پھر زنگس یا کرن کی اس کے ساتھ تصویر بھی دکھائی اور راجیل چونک گیا۔ ”یاد رہے اسے کرن کی تصویر بھی دکھائی اور راجیل چونک گیا۔“ یاد رہے تو واقعی ڈاکٹر زنگس جس ہمارے ہی اسپتال میں ہیں۔ بلکہ یہ اسپتال ان ہی کی ملکیت ہے۔ ان کے والدین کا ایک حادثے میں انتقال ہو چکا ہے۔“

وہ کرن کے رویے سے دل برداشتہ سرگم کے کنارے سر جھکائے سوچوں میں حفری جا رہا تھا کہ بریکوں کی جہ جہاٹ سے اس کے قدم رک گئے، اس کے قریب ہی ایک سوزوکی کار کے بریک جہ جہائے تھے ڈرائیونگ سیٹ پر ایک اسمارٹ سا نوجوان بیٹھا تھا کار رکتے ہی وہ باہر نکلا اور اس سے لپٹ گیا۔ ”آصف تم کہاں غائب ہو گئے تھے، ہم اور بچا جان تمہیں کہاں کہاں نہیں ڈھونڈتے رہے۔“ وہ بولے جا رہا تھا۔

”وہ بھی بیٹی کہہ رہی تھی لیکن اس سسٹان عمارت کے تہہ خانے سے اسی نے مجھے آزاد کر دیا تھا اور پھر اس فانیو اسٹار ہوٹل کے باہر بھی مجھے وہی ملی تھی۔“ آصف بولا۔

”پر تم ہو کون؟“ آصف نے اسے خود سے بمشکل بلکھہ کرتے ہوئے کہا اور وہ نوجوان اسے حیرت سے دیکھنے لگا۔

”آصف یادداشت کھو بیٹھے ہو شاید تمہاری دینی حالت کی وجہ سے تم اس دوسری لڑکی کو ڈاکٹر زنگس سمجھ بیٹھے ہو۔“ باتوں کے دوران وہ گھر پہنچ چکے تھے۔ راجیل کے والد حقیقت صاحب بھی گھر پر تھے۔ آصف کو راجیل کے ساتھ دیکھ کر وہ بھی حیران ہو گئے۔ راجیل کی بہن جمیلہ بھی اسے دیکھ کر کھل اٹھی تھی راجیل نے گھر پر آصف کی موجودہ دینی حالت کے بارے میں نہیں بتایا، و اصف صاحب کو آصف کے ملنے کی اطلاع کر دی گئی تھی انہوں نے پہلی

”آصف تمہارا دماغ تو درست ہے تم مجھے نئے سے انکاری ہو میں راجیل ہوں۔“

”دیکھو تم راجیل ہو یا کوئی اور اصل بات یہ ہے کہ اپنی یادداشت کھو بیٹھا ہوں۔“ آصف نے کہا۔

”چلو گاڑی میں بیٹھو گھر چلتے ہیں راستے میں می ہوتی رہیں گی۔“ راجیل ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھنے والا اور آصف کے فرنٹ سیٹ پر بیٹھتے ہی اس نے

کرن نے اپنی روداد بیان کر ڈالی۔ اس کے والد پروفیسر داؤد ایک سائنسدان تھے وہ دارالحکومت سے دور ایک بلند و بالا پہاڑی علاقے میں رہتے تھے۔ انہوں نے اپنی رہائش کے لئے جو عمارت بنارکھی تھی وہ آبادی سے الگ تھلک تھی۔ اسی عمارت میں انہوں نے تجربہ گاہ بنارکھی تھی جہاں وہ تجربے کرتے تھے پروفیسر داؤد تنہائی پسند اور آدم بیزار شخص تھے۔ بیوی کا انتقال ہو چکا تھا کرن ان کی اکلوتی بیٹی تھی۔ ان کے خاندان میں ان کا صرف ایک بھائی سجاد تھا۔ جنو عمر میں ہی اوباش فطرت دوستوں کے ساتھ گھومنے لگا اور پھر ایک روز برسوں پہلے اچانک نابینہ ہو گیا۔

پروفیسر داؤد ان دنوں کسی نئی ایجاد کے چکر میں تھے پورا دن صرف چار گھنٹے سوتے اور بیس گھنٹے تجربہ گاہ میں مصروف رہتے ان کی ایجاد تکمیل کے آخری مراحل میں تھی کہ کسی نے فون پر بھاری رقم کے عوض اس ایجاد اور فارمولے کو خریدنے کی پیش کش کی، اسے نہ جانے کیسے اس ایجاد کی بھنگ پڑ گئی تھی انکار پر اس نامعلوم شخص نے پروفیسر داؤد کو دھمکیاں دیں، اس بارے میں پروفیسر داؤد نے کرن کو بھی آگاہ کیا اور ایک عجیب ساخت کا لاکٹ اسے پہننے کے لئے دیا اور کہا کہ اس لاکٹ کا خاص خیال رکھے۔ دھمکیاں ملنے کے بعد انہوں نے پولیس کو بھی اطلاع دی۔

ایک روز جب کہ کرن کالج سے گھر پہنچی تو گھر کا دروازہ خلاف معمول کھلا ہوا ملا وہ دھڑکتے دل سے اندر داخل ہوئی کوریڈور میں چوکیدار کی لاش پڑی تھی۔ اس کی گروں میں گولی ماری گئی تھی اور تجربہ گاہ کے فرش پر پروفیسر داؤد کی لاش پڑی تھی۔ گولی ان کے عین دل کے مقام پر پوسٹ تھی تجربہ گاہ سمیت گھر کے ہر کمرے میں چیزیں ادھر ادھر بکھری پڑی تھیں گویا قاتل کو کسی خاص چیز کی تلاش تھی۔

نامعلوم افراد کے خلاف FIR درج کر لی گئی جس نمبر سے پروفیسر داؤد کو فون کیا گیا تھا وہ ہو گس موبائل نمبر تھا۔ دوسرے روز کرن کو ایک نئے نمبر سے فون کیا گیا۔

زدن میں بائی روف میں ڈالا اس سے پہلے کہ آصف اب تک پہنچا بائی روف حیز رفتاری سے ایک طرف نکل گئی۔ لڑکی ایک طرف بھڑکی خوف سے کپکپا رہی تھی۔ ”یہ لوگ کون تھے؟ اور آپ کو کیوں انوا کرنا چاہتے تھے؟“ آصف نے پوچھا۔

”آپ مم..... مجھے گھربک چھوڑ دیں۔“ لڑکی نے اس کی بات کا جواب دیئے بغیر ہکلاتے ہوئے کہا۔ وہ اب تک خوف زدہ تھی۔ آصف کو اپنی غلطی کا احساس ہوا سڑک پر موجود چند افراد عجیب نظروں سے ان کی طرف دیکھ رہے تھے۔ آصف نے موٹر سائیکل ایک اسپر پائرس کی دکان کے سامنے پارک کی اور اس کا خیال رکھنے کی تاکید کر کے دوبارہ لڑکی کے قریب پہنچا۔

ہنڈا کار ڈاڑھی لڑکی کی تھی۔ لیکن اس حادثے سے اس کے اعصاب پر برا اثر پڑا تھا۔ اس وقت لڑکی کا ڈرائیونگ کرنا خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔ آصف نے ہنڈا کار ڈاڑھی ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ لڑکی کا گھر ایک پوش علاقے میں تھا اس نے لڑکی کی ہدایت کے مطابق گاڑی ایک شاندار قسم کے بنگلے کے سامنے جار کی اور اتر کر ڈورنٹل بجائی۔ دروازہ ادھیر عمر خاتون نے کھولا۔ ”اچھا اب میں چلتا ہوں۔“ آصف مڑا۔

پلیز! ”اندر آئیں، آپ نے میری جان بچائی ہے۔“

”وہ میرا فرض تھا۔“ آصف نے جواب دیا۔ ”پلیز! آئیں ناں میں آپ کو اس طرح نہیں جانے دوں گی۔“ لڑکی بولی اور وہ انکار نہ کر سکا۔

دوسو چالیس گز پر بنے ہوئے اس بنگلے میں خوب صورتی کے ساتھ ساتھ مضبوطی کا بھی خیال رکھا گیا تھا۔ لڑکی نے اسے ڈرائنگ روم میں بیٹھایا کچھ دیر بعد ادھیر عمر خاتون چائے اور بسکٹ لائی اور اس کے سامنے میز پر رکھ کر چلی گئی۔ لڑکی کا نام کرن تھا اور ادھیر عمر خاتون اس کی ملازمہ تھی۔

”وہ کون لوگ تھے اور آپ کو کیوں انوا کرنا چاہتے تھے؟“ آصف نے چائے پیتے ہوئے اپنا سوال دہرایا۔

پوشوں نے اچانک ہم پر حملہ کر دیا تھا اور پھر میں نے بے ہوش ہوتے ہوئے تمہاری چیخ سنی تھی۔“ آصف بولا۔
 ”میں نے تمہیں پہلے بھی بتایا تھا کہ میں کرن نہیں ڈاکٹر نرگس ہوں۔“ وہ منمناتے ہوئے بولی اور آصف اسے بے یقینی سے گھورنے لگا۔ ”یہ کیسے ہو سکتا ہے۔“ وہ سوچنے لگا کہ سر پر لگنے والی دوبارہ چوٹ سے اس کی یادداشت لوٹ چکی تھی۔

آصف کا تعلق متوسط گھرانے سے تھا اکلوتا ہونے کے باعث اس کے والدین اسے بے انتہا چاہتے تھے وہ ایک ایذا و انحر پسند نوجوان تھا مارشل آرٹس سے اسے جنون کی حد تک لگاؤ تھا اس نے گھر میں سینڈ بیک اور اس قسم کی دوسری چیزیں رکھ چھوڑی تھیں اس کا سارا دن مصروفیت میں گزرتا۔ کالج سے گھر آ کر سارا دن سینڈ بیک سے مصروف رہتا اور شام کو کراسے کلب چلا جاتا اس روز وہ شام کے وقت کلب جانے کے لئے اپنی بائیک پر نکلا شادمان کے قریب ایک نسبتاً سنان سڑک پر بائیک جھٹکا کھا کر بند ہو گئی کئی لکس لگانے کے باوجود بھی جب بائیک اشارت نہ ہوئی تو وہ جھنجھلا اٹھا۔

اسی وقت ایک نسوانی آواز سنائی دی۔ ”ہیلپ ہیلپ۔“ اس نے آواز کی سمت دیکھا۔ دائیں طرف فٹ پاتھ کے قریب ایک ہنڈا کارڈ کھڑی تھی ہنڈا کارڈ کے سامنے ایک ہائی روف اس طرح آڑی ترچھی کھڑی تھی کہ ہنڈا کارڈ کا راستہ مسدود ہو چکا تھا۔ دونوں شخص ایک خوبصورت لڑکی کو گھسیٹ کر ہائی روف میں ڈالنے کی کوشش کر رہے تھے ان میں سے ایک کے ہاتھ میں بٹل موجود تھا شاید اسی لئے سڑک پر موجود چند افراد کی مداخلت کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ اپنی مذہم کوشش میں کامیاب ہوتے۔ آصف نے موٹر سائیکل ایک طرف بھٹکی سڑک پر بڑا ایک پتھر اٹھایا اور پوری قوت سے بٹل بردار کی طرف پھینک دیا تو کیلا پتھر بٹل بردار کے سر میں لگا اور وہ چیخ کر ایک طرف گر پڑا۔

لڑکی ان کی گرفت سے نکل چکی تھی بساط کا رخ پلٹے دیکھ کر اس کے ساتھی نے اپنے بے ہوش ساتھی کو چشم

سب بھاری جرم میں اس پر سوار اس کا گلا دبا رہا تھا آصف نے دونوں ہاتھوں سے اس کی کلاںیاں تھامیں اور دایاں پاؤں اس کے سینے پر جما کر اوپر کی طرف زوردار جھٹکا دیا۔ وہ شخص آصف کے اوپر سے اڑتا ہوا سا جیب سے باہر سڑک پر جا گرا اب آصف نے چلتی ہوئی جیب کے ڈرائیور کو پیچھے سے دبوچ لیا، ڈرائیور نے خود کو چھڑانے کی کوشش کی اس کٹکٹش میں جیب اس کے کنٹرول سے باہر ہوئی اور سڑک کنارے نصب پول سے جا ٹکرائی اور ایک زوردار جھٹکے سے الٹ گئی۔

نرگس جیب اٹھنے سے پہلے ہی اچھل کر جیب سے باہر جا گری، تھی خوش قسمتی سے وہ فٹ پاتھ کے قریب قطار میں لگے ہوئے پودوں پر گری اس لئے اسے کوئی خاص چوٹ نہیں لگی جبکہ ڈرائیور کا سر پوری قوت سے اسٹیرنگ سے ٹکرایا اور وہ بے ہوش ہو گیا جبکہ آصف کے سر پر بھی چوٹ لگی اور وہ ہوش و حواس سے عاری ہو گیا۔

☆.....☆.....☆

”ڈاکٹر مریم کسمار ہا ہے۔“ اس کی سماعت سے ایک جانی پہچانی آواز نکلئی اور آصف نے آنکھیں کھول دیں یہ کسی اسپتال کا کمرہ تھا وہ بیڈ پر لیٹا ہوا تھا اس کے سامنے راحیل اور نرگس موجود تھے جبکہ قریب ہی ایک بنگ ڈاکٹر کھڑا تھا۔ اسٹینڈ سے ڈرپ لگی ہوئی تھی جس میں بالکل آصف کی رگوں میں اتر رہا تھا اس نے بڑا رائٹنے کی کوشش کی بے اختیار حرکت کرنے سے اسکے میں درد کی ایک شدید لہر اٹھی اور اس نے دونوں ہاتھوں اپنا سر تھام لیا۔ ”خیریت تو ہے۔“ راحیل نے متوش میں پوچھا۔

”ہاں سر میں درد سا ہو رہا ہے۔“ آصف نے دیا۔

ڈاکٹر نے آگے بڑھ کر اس کا معائنہ کیا۔ ”اب یہ کوئی خطرے والی بات نہیں، صرف سر پر چوٹ ہے ہوش ہوئے تھے۔“ ڈاکٹر نے کہا اور اسے شن لگا کر کمرے سے باہر نکل گیا۔

شکر ہے کرن تم خیریت سے ہو ان نقاب

ایک طرف ہٹایا اور کرن کے ہمراہ سیڑھیاں اترنے لگا
سیڑھیوں کے اختتام پر دروازہ تھا جو خوش قسمتی سے لاک
نہیں تھا وہ دروازہ کھول کر اس ہال نما کمرے میں داخل
ہو گئے۔ اندر دروازے کی سیور نصب تھی جنہوں نے اس
وقت کمرے کو روشن کر رکھا تھا۔

سب سے زیادہ حیرت کی بات یہ تھی کہ اس
کمرے میں کسی بھی قسم کا ساز و سامان نہیں تھا اور کمرے
کے فرش میں درجنوں کی تعداد میں چھوٹے چھوٹے
موراخ تھے۔ جیسے یہ سانپ یا چوہوں کے بل ہوں۔ وہ
دوبارہ تجربہ گاہ میں لوٹ آئے اور تختہ اپنی جگہ رکھ کر اوپر
پہلے کی طرح قالین رکھ دیا۔

اچانک نہ جانے کس خیال کے تحت آصف
دوبارہ تجربہ گاہ میں رکھی الماری کی طرف بڑھا اور بالآخر وہ
الماری کا ایک خفیہ دروازہ تلاش کرنے میں کامیاب ہو گیا
اس دروازے میں ایک فائل رکھی تھی جس میں بہت سے
کاغذات تھے ان کاغذات میں سائنسی اصلاحات میں
فارمولے لکھے تھے جو ان دونوں کی سمجھ میں نہیں آئے۔

البتہ صرف ایک کاغذ پر اردو میں تحریر تھا
۔ سپر شید و ایک ایسی ایجاد ہے جو دنیا بھر میں تہلکہ مچا دے
گی یہ ایک لاکٹ نما آلے کی شکل میں ہے جو عجیب
ساخت کا ہے۔ اس لاکٹ کے پیچھے ایک انتہائی مختصر
ترین ٹیٹن ہے اگر کوئی انسان اس لاکٹ کو گلے میں پہن کر
اس ٹیٹن کو دبائے گا تو وہ سائے میں تبدیل ہو جائے گا
بالکل حقیقی سائے کی مانند جو روشنی میں تو دکھائی دیتا ہے
مگر تاریکی میں نظر نہیں آتا۔ سائے میں تبدیل ہونے
کے بعد اس پر نہ ہی کوئی اثر کرے گی اور نہ ہی کوئی
دوسرا ہتھیار اسے نقصان پہنچا سکے گا۔ ہاں البتہ خود لاکٹ
پہننے والا مخالف کو ہر قسم کا نقصان پہنچا سکتا ہے اس لاکٹ
نما آلے کے متحرک ہوتے ہی انسانی جسم اربوں ذرات
میں تقسیم ہو کر سائے میں تبدیل ہو جاتا ہے اور دوبارہ
انسانی جسم میں آنے کے لئے لاکٹ کا ٹیٹن دوبارہ
دبانا ضروری ہے۔ ابھی ابتدائی طور پر صرف ایک لاکٹ
تیار کیا گیا ہے جسے میں نے کرن کے گلے میں پہنا دیا ہے

آصف کا ہاتھ تمام رکھا تھا۔
کرن کے گداز ہاتھوں کے لمس سے آصف کا دل
تیزی سے دھڑکنے لگا اس نے دوسرا ہاتھ کرن کی کمر میں
ڈالا اور اسے خود سے قریب کر لیا اس کے بدن سے اٹھنے
والی مسور کن خوشبو آصف کو سحر زدہ کر چکی تھی۔ وہ کرن
کو لئے ہوئے بیڈ تک گیا اور اسے ہاتھوں میں اٹھا کر بیڈ
پر لٹا کر خود اس کے پہلو میں بیٹھ گیا۔ کرن خود سپردگی کی
کیفیت میں لپٹی تھی اور اس نے اپنی آنکھیں موند رکھی
تھیں۔ آصف نے جیسے ہی اس کے رخساروں پر اپنے
ہونٹ رکھے تو اس کا دل تیزی سے یوں دھڑکنے لگا جیسے
پسیلیوں کو توڑ کر باہر نکل آئے گا۔

وہ حسن کی سلطنت پر قدم بڑھتا ہوا لب جاں تک
آیا اور اس کے چلتے ہونٹوں پر اپنے ہونٹ رکھ دیئے
اور اپنے لبوں سے اس کے لبوں کو جکڑ لیا۔ ”مم مجھے.....
چھوڑو، نکک کوئی آجائے گا۔“ وہ تیز و تند طوفان کے لپیٹ
میں آتے ہوئے تنکے کی طرح ڈول رہی تھی۔

”آنے دو۔“ وہ بے خودی میں بولا۔
”کوئی دیکھ لے گا۔“ کرن سرگوشی میں بولی۔

”دیکھنے دو۔“ بکھری ہوئی سانسوں سے جواب
دیا گیا اور پھر جب طوفان تھما تو دونوں آسودہ اور شرمسار
ہو چکے تھے۔

کچھ دیر بعد انہوں نے گھر کی تلاشی لی۔ کمروں کی
تلاشی کے بعد وہ تجربہ گاہ میں جا گئے وہاں بھی انہیں کوئی
خاص چیز نہ ملی مایوس ہو کر مڑے اور تجربہ گاہ سے باہر نکلنے
لگے۔ اچانک آصف ایک جگہ کسی چیز سے ٹکرا گئے ہی
گرا، اس نے گرتے گرتے بے اختیار دونوں ہاتھوں کی
ہتھیلیوں کو آگے کر لیا تھا۔ اس لئے چہرے پر کوئی چوٹ نہ
لگی البتہ اس کے گرنے سے جو دھمک پیدا ہوئی اس نے
اسے چونکا دیا ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے قالین کے نیچے کوئی
لکڑی کا تختہ ہو۔

اس نے کرن کے ساتھ مل کر وہاں سے قالین
ہٹایا وہاں چار ضرب چار فرش سے ہم آہنگ لکڑی کا
ایک تختہ رکھا ہوا تھا گویا وہ کوئی تہ خانہ تھا۔ آصف نے تختہ

سین اصل بات اسے بھی نہیں بتائی اس فارمولے کو مزید بہتر بنانے کے بعد میں اسے حکومت کے حوالے کر دوں گا تاکہ ہمارا ملک اس فارمولے سے مستفید ہو سکے، میں نے برسوں پرانی یہ عمارت اسی تجربے کو کامیاب بنانے کی غرض سے خریدی تھی۔

اس عمارت میں تجربہ گاہ کے نیچے ایک تہہ خانہ بھی ہے جس میں درجنوں کی تعداد میں بلی سے مشابہ خونخوار چوہے ہیں جو تار کی ہوتے ہی انسانوں کو پیٹ کر جاتے ہیں۔“ کاغذ پر لکھی تحریر پڑھتے ہی آصف ششدر رہ گیا خود کرن کا منہ بھی حیرت سے کھل گیا تھا۔ ”امپا سبل یہ کیسے ممکن ہے۔“ وہ بڑبڑائی۔

”کرن اس جدید دور میں کچھ بھی مشکل نہیں سینکڑوں سال پہلے کسی کے وہم گمان میں بھی نہ ہوگا کہ انسان چاند پر پہنچ سکتا ہے۔ دیکھو آج پہنچ چکا ہے ویسے بھی تجربہ سچائی کی کسوٹی ہے۔“ آصف نے کہا اور فائل دوبارہ الماری کے خفیہ خانے میں رکھ کر الماری بند کی اور لاکٹ کی پشت پر موجود مٹن دبا دیا۔

کرن حیرت سے اچھل پڑی آصف غائب ہو چکا تھا اب وہاں سایہ نظر آرہا تھا۔ ”تتم تو سچ سچ سائے میں تبدیل ہو چکے ہو۔“ کرن ہلکائی۔

آصف نے اپنی اور کرن کی تسلی کے لئے تین چار بار اس عمل کو دہرایا اور پھر سائے سے انسان بن گیا۔ ”نا قابل یقین سچائی سامنے آنے کے بعد مجھے اب تک یقین نہیں آ رہا۔“ وہ تجربہ گاہ سے اٹھ کر کمرے میں آ چکے تھے جس میں انہوں نے نشاۃ انگیز لمحات گزارے تھے۔

آصف نے DSP چوہدری ممتاز کا نمبر ڈائل کیا اور دوسری طرف سے کال ریسو ہوتے ہی بولا۔ ”انکل ہم سپر شیڈ کا فارمولا تلاش کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔“ ”ایجاد اور فارمولے کے بارے میں تفصیل سے بتاؤ۔“ چوہدری ممتاز نے بے تابی سے کہا۔

”سرا رات کا وقت ہے ہم دونوں صبح سویرے اس جگہ سے روانہ ہو جائیں گے اور وہاں آ کر آپ کو تفصیل سے آگاہ کروں گا۔“ آصف نے اتنا ہی کہا تھا کہ کال

ڈراپ ہو گئی آصف نے دوبارہ نمبر ملا ناچا مگر ناکامی ہوئی۔ اس پہاڑی مقام پر سگنل پرابلم تھا۔

وہ رات دیر تک مستقبل کی منصوبہ بندی کرتے رہے۔ پھر نصف شب کے بعد سو گئے رات کا آخری پہر تھا وہ گہری نیند میں تھے کہ ایک کھٹکے سے آصف کی آنکھ کھل گئی وہ پھرتی سے اٹھا اور کرن کو جگادیا۔ ”کیا ہوا خیریت تو ہے۔“ وہ گھبرا گئی۔

”خاموشی سے! بھوایا محسوس ہو رہا ہے جیسے کوئی گھر میں کودا ہو۔“ آصف نے احاطے میں کھانے والی کھڑکی کا پٹ کھولا تو اس کے اندیشوں کی تصدیق ہو گئی، احاطے میں نصف درجن مسلح نقاب پوش موجود تھے۔

”اس سے پہلے کہ یہ ہمیں گھیر لیں ہمارے یہاں سے نکلنا ضروری ہے۔“ آصف نے کہا اور پھر قدرے توقف سے پوچھا۔ ”کیا اس عمارت سے باہر نکلنے کا کوئی دوسرا راستہ بھی ہے؟“

”ہاں تجربہ گاہ سے عمارت کی عقیبی سمت بھی راستہ ہے۔“ کرن نے جواب دیا۔ وہ کرن کا ہاتھ پکڑ کر حمزی سے تجربہ گاہ کی طرف دوڑا۔ اور تجربہ گاہ کے عقیبی دروازے سے باہر نکل گیا۔ نقاب پوش عمارت میں داخل ہو چکے تھے اس سے پہلے کہ وہ صورتحال کو سمجھتے آصف اور کرن باہر نکل چکے تھے باہر ایک پراڈ اور ایک بڑے ٹائروں والی جیپ موجود تھی انہوں نے دونوں گاڑیوں میں جھانکا خوش قسمتی سے چابی پراڈ کے انکیشن میں لگی ہوئی تھی دونوں پراڈ میں سوار ہو گئے آصف نے گاڑی اسٹارٹ کی اور تیز رفتاری سے اس ناہموار اور کچے راستے پر دوڑادی۔ ایک تورات کا اندھیرا اور کچی سڑک ناہموار تھی اور پھر دائیں بائیں سینکڑوں فٹ گہری کھائیاں تھیں وہ ایک حد سے زیادہ رفتار نہیں بڑھا سکتا تھا۔ پھر اسے دور سے اپنے تعاقب میں کسی گاڑی کی ہیڈ لائٹس کی روشنی دکھائی دی جو رفتہ رفتہ قریب آتی جا رہی تھی۔ وہ سپر شیڈ وٹائی کرشائی لاکٹ کی خصوصیات کو بھول چکا تھا۔ اگرچہ ایسا گھبراہٹ میں ہوا تھا لیکن اسی کو مقدمہ کا کھیل کہتے ہیں ان کی گاڑی فائرنگ رینج میں آ چکی تھی۔

غلط فہمی کا شکار ہوئی تھی لیکن اب جب کہ میں جان چکی ہوں کہ آپ ایک مخلص انسان ہیں اس روز اگر آپ نہ ہوتے تو نہ جانے وہ غنڈے انخوا کرنے کے بعد میرے ساتھ کیا سلوک کرتے جو دن دعاڑے نہ جانے کیوں مجھے اغوا کرنا چاہتے تھے۔

میرا نام نرگس ہے اور تعلق ایک دور دراز کے پہاڑی علاقے سے ہے۔ میرا باپ لالی گاؤں کے سردار جہانگیر خان کا فشتی تھا۔ تعلیم حاصل کرنا اور علم کی شمع کو جلانا میرا جرم ٹھہرا سردار جہانگیر نے میرے چھوٹے بھائی کو گن پوائنٹ پر رکھ کر میرے باپ کو حکم دیا کہ شہناز کو دریا میں پھینک دو مجبوراً میرے باپ کو ایسا کرنا پڑا۔

ان دنوں میری عمر دس سال تھی لیکن کسی نے جچ کہا ہے جس کا کوئی نہیں اس کا خدا ہوتا ہے۔ اور مارنے والے سے بچانے والا بڑا ہے۔ دریا میں گرتے ہی میں لمحوں میں بہتی ہوئی نہ جانے کہاں جا پہنچی دریا کی سرکش لہروں نے مجھے تھنی جھاڑیوں میں اچھال دیا۔ وہاں ڈاکٹر خاور اپنی اہلیہ شبانہ کے ساتھ تفریح کی غرض سے آئے ہوئے تھے ان کا خیمہ دریا سے کچھ فاصلے پر نصب تھا ڈاکٹر خاور صبح سویرے اٹھ کر ایکسائز کرنے کے عادی تھے۔ اس روز بھی وہ صبح سویرے دوڑتے ہوئے دریا کے کنارے پہنچے تو ان کی نظر جھاڑیوں میں پڑی بے ہوش دس سالہ بچی پر پڑی۔ وہ بڑی شہناز تھی ان کی فوری طبی امداد سے میری زندگی بچ گئی وہ بے اولاد تھے میری سرگزشت سن کر مجھے اسلام آباد لے آئے۔ میرا نام شہناز سے تبدیل کر کے نرگس رکھ دیا گیا انہوں نے حقیقی اولاد کی طرح میری پرورش کی۔ ابھی میں نے میڈیکل کی تعلیم مکمل کی ہی تھی کہ ٹریفک حادثے میں ڈاکٹر خاور اور شبانہ کا انتقال ہو گیا ان کی کروڑوں کی جائیداد اور بینک بیلنس میرے حق میں کی گئی وصیت کی وجہ سے مجھے ملا۔

میں نے ڈاکٹر خاور کے نام سے اسپتال قائم کیا جہاں غریبوں اور مستحق افراد کا مفت علاج کیا جاتا ہے۔ ہمارے اسپتال کی ذاتی ایسویٹنس سروس شہر بھر سے حادثے کے افراد کو فوری طور پر اسپتال پہنچاتی ہے کچھ

ایک نقاب پوش نے رائفل جیب کی کھڑکی سے باہر نکالی اور گولی چلا دی گولی پراڈو کے پیچھے ہار میں لگی اور پراڈو آصف کے کنٹرول سے باہر ہو کر ایک درخت سے جا ٹکرائی آصف کا سر ڈیش بورڈ سے ٹکرایا اور اس نے بے ہوش ہونے سے پہلے کرن کی چیخ سنی۔

پھر اسے جب ہوش آیا تو وہ چوہوں والے تہہ خانے میں قید تھا۔ اس کے بعد دوبارہ چوٹ لگنے سے اس کی یادداشت لوٹ آئی تھی اس کے ذہن میں سب سے اہم سوال یہ تھا کہ اگر یہ لڑکی کرن نہیں اس کی کوئی ہم شکل ڈاکٹر نرگس ہے تو پھر کرن کہاں ہے اور کس حال میں ہے؟ لیکن آصف کا دل یہ ماننے کو تیار ہی نہیں تھا کہ وہ کرن نہیں۔ ہو یہ وہی شکل و صورت وہی قد و قامت وہی لب و لہجہ کہیں یہ بھی تو میری طرح یادداشت نہیں کھوتی تھی۔

”اگر ایسا ہے تو مجھے اس کے سر پر بھی ڈانڈا مار کر اسے دوبارہ بے ہوش کرنا ہوگا تا کہ دوبارہ ہوش آتے ہی اس کی یادداشت بھی بحال ہو جائے۔“ اس نے سوچا اور پھر اپنی اس بچکانہ سوچ پر خود ہی ہنس پڑا۔

”کیا دماغ کا کوئی دوسرا اسکرو ڈھیلا ہو گیا ہے جو آنکھیں موندے خود بخود بلا وجہ ہنس رہے ہو۔“ راجیل کی ہنستی ہوئی آواز سنائی دی اور اس نے آنکھیں کھول دیں چوٹیں معمولی تھیں اسے شام سے پہلے ہی ڈسچارج کر دیا گیا۔

وہ نرگس سے چند ضروری باتیں کرنا چاہتا تھا اس لئے راجیل کے ساتھ اس کے گھر چلا گیا جہاں وہ اپنی فرینڈز لیڈی ڈاکٹر کے ساتھ رہائش پذیر تھی۔

آصف نے چائے پینے کے دوران اپنی روداد نرگس کو سنائی اس روداد میں اس نے سپر شیڈ ویجینی کریمائی لاکٹ کا ذکر نہیں کیا پھر اپنی اور کرن کی مشترکہ تصویر اسے دکھائی جسے دیکھ کر نرگس حیران ہو گئی۔ ”یہ تو ہو بہو میری ہم شکل ہے۔“

آصف بولا۔ ”اب میری آپ سے گزارش ہے کہ سب سے پہلے تو مجھے اپنے بارے میں بتائیں آپ کون ہیں؟“

نرگس بولی۔ ”پہلے تو میں آپ کے بارے میں

اور بوگی ان کے قہقہوں سے گونج اٹھی۔

آصف کا خون کھول اٹھا ان کی بے ہودگیاں بڑھتی جا رہی تھیں۔ آصف ان پر ہاتھ نہیں اٹھاتا چاہتا تھا لیکن اب معاملہ اس کی برداشت سے باہر ہوتا جا رہا تھا وہ انہیں پھوٹا سا سبق سکھانا چاہتا تھا۔ ”میں ذرا ٹوائٹ سے ہو کر آتا ہوں۔“ اس نے نرگس سے کہا اور اپنی سیٹ پر سے اٹھا۔

”ابھی سے ہی سو سو آ رہی ہے۔“ ان میں سے ایک نے طنز کیا آصف ان کی بات کا جواب دیئے بغیر ٹوائٹ میں گیا اور گلے میں پڑے لاکٹ کا ٹین دبا دیا۔ اگلے ہی لمحے وہ سائے میں تبدیل ہو گیا۔

ادھر شیطانوں کی ٹولی مسلسل نرگس پر فترے کس رہی تھی۔ جبکہ نرگس خوف زدہ۔ وہ اس سائے سے بے خبر تھے جو ان کے پیچھے کھڑا تھا۔ پھر ایک لڑکے کی پشت پر زوردار لٹ پڑی۔ وہ چیخا ہوا ایک طرف جا گرا۔ دن کے وقت تو انسان کا سایہ ویسے بھی گھٹ جاتا ہے اور اس وقت تو وہ سایہ ان کے اپنے سایوں کے ساتھ گم ہو چکا تھا اس لئے وہ سمجھ ہی نہیں سکے کہ ان کے ساتھ کیا ہو رہا ہے، اس نے بے ہودگیاں کرنے والے ایک دوسرے لڑکے کے منہ پر زوردار تھپڑ رسید کیا شیطانوں کی ٹولی خوف زدہ ہو چکی تھی ان کی پٹائی کرنے والا نظر نہیں آ رہا تھا، وہ سب بری طرح سہم چکے تھے اور ”بھوت بھوت“ کہہ کر چلا رہے تھے۔

آصف نے ان لڑکوں کی اچھی خاصی ٹھکائی کرنے کے بعد ہاتھ روک دیئے۔ اب شیطانوں کی ٹولی سہمی ہوئی خوف زدہ ادھر ادھر بھاگ رہی تھی۔ اس نے داش روم جا کر دوبارہ لاکٹ کی پشت پر موجود ٹین دبایا اور حاضر ہوتے ہی داش روم سے نکل کر اپنی سیٹ پر آ بیٹھا شرارتی اسٹوڈنٹ اگلے جنکشن پر اتر گئے۔

”آپ کے جانے کے بعد یہاں عجیب تماشہ ہوا کوئی نادیدہ ہستی جو شاید جن یا بھوت تھی اس نے ان شرارتی لڑکوں کی پٹائی شروع کر دی تھی تو یہ خاموش ہو کر بیٹھے ہیں سچ تو یہ ہے کہ میں خود خوف زدہ ہو گئی تھی۔“ حیران و پریشان نرگس نے اسے بتایا۔

”سب سے پہلی بات تو یہ کہ اب تم مجھے آپ نہیں

وہی علاقوں میں سماجی تنظیموں کے تعاون سے میں نے اسکول بھی قائم کئے ہیں۔ میں نے محسوس کیا ہے کہ آپ ایک اچھے اور مخلص انسان ہیں اگر اس کا رخیر میں ہمارا ساتھ دیں تو یہ انسانیت کی خدمت ہوگی۔“

”مس نرگس سچی بات تو یہ ہے کہ میں آپ کے خیالات سے بہت متاثر ہوا ہوں اور وعدہ کرتا ہوں کہ اس مشن میں آپ کا ساتھ ضرور دوں گا اور یہ بھی امید کرتا ہوں کہ آپ انسانیت کے ناطے میری مدد ضرور کریں گی۔“

نرگس نے اسے استفسار یہ نگاہوں سے دیکھا۔ ”کرن کی کہانی کراچی سے شروع ہوئی تھی مجھے امید ہے اس دور کا کوئی نہ کوئی سرا نہیں وہاں ملے گا۔ آپ میں اور کرن میں رتی برابر بھی فرق نہیں آپ کرن بن کر میرے ساتھ چلیں ہو سکتا ہے آپ کو دیکھ کر کرن کے دشمن بوکھلا کر سامنے آ جائیں اور ہم انہیں ٹریس کریں اور کرن کو ڈھونڈ نکالیں گے۔“ کچھ دیر سوچنے کے بعد نرگس نے حامی بھر لی۔

دوسرے روز ڈاکٹر نرگس خاصی مصروف رہی اس نے اسپتال کی ذمہ داری راجیل کے سپرد کی تیسرے روز وہ نرین پر سوار ہو گئے جہلم چھاؤنی پر ٹرین چنڈمانٹ کے لئے رکی اور ٹکسی کالج کے ساتھ آٹھ لڑکے ان کی بوگی میں سوار ہوئے یہ نہایت ہی شریر اور شوخ لڑکے تھے وہ ویسے بھی کم عمر تھے یہ عمر ہونی ہی لالہالی ہے۔ وہ بوگی کے تقریباً ہر مسافر کو تنگ کر رہے تھے۔ ویسے بھی اس بوگی میں مسافروں کی تعداد کم تھی۔

لکا ایک ان کی نظر آنے سامنے بیٹھے آصف اور نرگس پر پڑی، اب شیطانوں کی اس ٹولی کا رخ ان کی طرف ہو گیا۔ ایک منچلا لڑکا نرگس کے سامنے فرش پر گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا اور گانے لگا۔

چاند میرا دل، چاندنی ہوتی، چاند سے ہے دور چاندنی کہاں۔

دوسرا آصف کے قریب آیا۔ ”بابو جی آپ کی داڑھی میں جگا۔“

”ابے اس کی داڑھی نہیں۔“ تیسرے نے کہا

تم کہو گی کیوں کہ دوستوں میں آپ کا تکلف نہیں کیا جاتا۔“ آصف نے اسے مصنوعی غصے سے گھورا اور وہ مسکرائی۔

آگے کا سفر خوشگوار گزرادوسرے روز وہ شام کے قریب کراچی پہنچے، پلیٹ فارم پر اس وقت آنے اور جانے والے مسافروں کا کافی رش تھا۔ اس لئے ان دونوں نے اپنے چلنے کی رفتار سست کر لی تاکہ رش ختم ہوتے ہی پلیٹ فارم سے باہر نکلیں لیکن وہ اس بات سے بے خبر تھے کہ ایک نومند شخص انہیں غور سے دیکھ رہا تھا اس شخص کی آنکھوں میں حیرت تھی۔ اس کی نظریں خاص طور پر نرگس پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ جیسے ہی اس کے قریب سے گزر کر چند قدم آگے گئے۔

نومند شخص نے موبائل فون نکالا اور کسی کا نمبر ڈائل کیا اور دوسری طرف سے کال رسیو ہوتے ہی بولا۔ ”سر میں اسٹیشن پر موجود ہوں میری آنکھوں کے سامنے کرن اور آصف ہیں“

پرویز تم ہوش میں تو ہو گتا ہے آج تم نے زیادہ پی لی ہے۔“ دوسری طرف موجود شخص نے اسے ڈانٹا۔

”سر میں سچ کہہ رہا ہوں اگر آپ کو یقین نہیں تو آپ خود آ کر دیکھ لیں۔“ پرویز نامی شخص بولا۔ ”ٹھیک ہے اس لڑکی کو اڑ دو۔“ دوسری طرف موجود شخص نے حکم دیا اس کے انداز میں لا پراو ہی تھی گویا وہ کسی انسان کو نہیں کیڑے مکوڑے کو مارنے کی بات کر رہا تھا۔ پرویز نے موبائل فون ہپ پاکٹ میں ڈالا اور اپنی بیلٹ میں اڑسا بسٹل نکال کر نرگس کا نشانہ لینے لگا۔

ادھر اچانک آصف چلتے چلتے جب بے اختیار مڑا تو اس کی نظر پرویز پڑی جو بسٹل بیلٹ سے نکال کر نرگس کا نشانہ لے رہا تھا۔ آصف نے نرگس کو اپنی بانہوں کے حصار میں لیا اور پلیٹ فارم کے فرش پر گر گیا۔

فائر کی ہولناک آواز سے پلیٹ فارم پر افراد تفری پھیل گئی لوگ جان بچانے کے لئے ادھر ادھر بھاگنے لگے۔ نرگس پر چلائی جانے والی گولی ایک مسافر کے سر میں پڑی ہوئی اور وہ لاش میں تبدیل ہو کر گر پڑا۔

ادھر نرگس آصف کے نیچے تھے اس کے گداز جسم کی حرارت آصف کے دل کی دھڑکنوں کو بے تحیب کر رہی تھی لیکن اس بھوکھن میں وہ اپنے جذبات کو نظر انداز کر کے اس کے اوپر سے اٹھا حملہ آور بھگدڑ سے فائدہ اٹھا کر ایک طرف بھاگا۔ آصف کسی بھوت کی طرح اس کے پیچھے دوڑ رہا تھا، پرویز نے مڑ کر پے درپے دو فائر کئے مگر بھاگتے ہوئے فائر کرنے سے اس کا نشانہ خطا ہو گیا۔ پرویز پلیٹ فارم نمبر 3 پر پہنچا اور وہاں کھڑی ایک خالی ٹرین میں سوار ہو گیا آصف بھی اس کے پیچھے اس بوگی میں جا گھسا جس پر پرویز جڑھا تھا۔ ایک طرف سے اس پر فائر ہوا اس بار بھی آصف کی قسمت نے اس کا ساتھ دیا اور پرویز کا نشانہ خطا ہو گیا۔

آصف نے چھٹانگ لگائی اور پرویز کو لئے ہوئے نیچے گرا وہ پرویز کے ہاتھ میں موجود بسٹل پر ہاتھ ڈال چکا تھا۔ دونوں میں بسٹل کے حصول کے لئے کشاکش جاری تھی کبھی بسٹل کی نال کا رخ پرویز کی طرف ہو جاتا اور کبھی آصف کی طرف اور پھر ٹریگر دب گیا گولی چلنے کے ہولناک دھماکے سے پرویز کے جسم کو جو کا لگا۔ گولی اس کے دل میں اتر گئی تھی۔ وہ بنا پیچھے جہنم رسید ہو گیا۔

آصف ابھی اس کے اوپر سے اٹھا ہی تھا کہ قین چار پولیس اہلکار بوگی میں داخل ہوئے اور اس پر رائفلیں تان لیں۔ ”خبردار بٹنے کی کوشش مت کرنا ورنہ گولی مار دوں گا۔“ ان میں سے ایک فرمایا۔

”اس نے ہم پر گولی چلائی تھی اس کی گولی سے ایک مسافر بھی مارا گیا۔ میں اس کے پیچھے بھاگا۔ راستے میں بھی اس نے مجھ پر گولیاں چلائیں مگر میں بچ نکلا اور یہاں جب ہم دونوں ختم گئے تھے تو چھینا جھپٹی میں گولی چلی اور یہ مارا گیا۔“ آصف نے وضاحت کی۔

”بکو اس بند کرو تم کوئی سپر ہیرو نہیں جو اس نے تم پر اتنی گولیاں چلائیں اور تمہیں ایک بھی نہیں لگی۔“ سب انسپکٹر رینک کا آفیسر بولا اور مقتول کا معائنہ کرنے لگا۔ مقتول کی جیب سے کارڈ نکالتے ہی وہ چونک پڑا۔ ”اوہ یہ تو پولیس ڈپارٹمنٹ کا بندہ ہے۔“

آصف سناٹے میں آگیا مرنے والا پولیس اہلکار تھا۔ صورتحال گھمبیر ہو چکی تھی وہ جانتا تھا کہ پولیس اپنے ہٹی بھائی کے قتل کے جرم میں اس کا حشر نشر کر دے گی وہ اسے گن پوائنٹ پر لئے ہوئے ٹرین سے باہر نکلے۔ کرن پلیٹ فارم پر پریشان کھڑی تھی، آصف کو پولیس کے گھیرنے میں دیکھ کر اس کے رہے رہے اوسان بھی خطا ہو گئے۔ ”آپ انہیں کہاں لے جا رہے ہیں۔“ وہ ان کے قریب آ کر گھبرائے ہوئے لہجے میں بولی۔

”اوہ تو تمہارے ساتھ پھولن دیوی بھی ہے۔ چلو دیوی جی تم بھی آگے لگو آج پولیس اسٹیشن میں تم دونوں کی خوب خاطر تواضع ہوگی۔“ سب انسپکٹر نے معنی خیز لہجے میں کہا۔ وہ ان دونوں کو لئے ہوئے اسٹیشن سے باہر نکلے اور انہیں ایک پولیس موہائل میں دھکیل دیا۔

تین سپاہی ان کے قریب بیٹھ گئے جبکہ سب انسپکٹر ڈرائیور کے ساتھ کھڑا کسی سے موہائل فون پر بات کر رہا تھا اب سوچنے کا وقت نہیں تھا۔ اگر وہ پولیس اسٹیشن تک پہنچ جاتے تو معاملہ مزید سنگین ہو جاتا اور پھر نرگس بھی ساتھ تھی۔ جو آصف کی وجہ سے اس گرداب میں پھنسی تھی اسے حیرت اس بات پر تھی کہ مقتول پولیس اہلکار نے نرگس پر گولی کیوں چلائی تھی۔

آصف نے بیٹھے بیٹھے غیر محسوس انداز میں لاکٹ کا بٹن دبایا اور دیدہ سے نادیدہ ہو گیا اب سیٹ پر اس کا سایہ دکھائی دے رہا تھا سپاہیوں سمیت نرگس بھی خوفزدہ ہو گئی۔

”یہ یہ کہاں غائب ہو گیا؟“ ایک سپاہی بولا۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے سائے نے چشم زدن میں اس کے ہاتھ سے رائفل چھین کر اس کے سر پر ماری وہ چیخا ہوا گرا اور آٹاں غفل ہو گیا دوسرا بھوت بھوت چلاتا ہوا پولیس موہائل سے اترنے لگا سائے نے رائفل کے دستے سے اس کا بھی سر بجا دیا وہ بھی ہوش و حواس سے عادی ہو گیا۔ تیسرا ڈر کے مارے لہرا کر گرا اور خود بخود بے ہوش ہو گیا۔ ڈرائیور یہ منظر دیکھتے ہی بھاگ اٹھا سب انسپکٹر حیرت سے یہ ناقابل یقین منظر دیکھ رہا تھا اس کی نظروں

کے سامنے ملزم کسی بھوت کی طرح غائب ہو کر سائے میں تبدیل ہو گیا تھا۔ خوف کے باعث موہائل فون اس کے ہاتھ سے گرا اور اس کی ٹانگیں ڈر سے کپکپانے لگیں۔ اس کے دیکھتے ہی دیکھتے سایہ پولیس موہائل سے کودا اور اس کی کپٹی پر ایرو کنج رسید کیا وہ بھی ہوش و حواس سے عادی ہو گیا۔ وہاں بہت سے افراد کھڑے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ ان میں بھلڈرٹج گنی اور لوگ بھوت بھوت کہہ رہے تھے اور ہر بھاگے۔

آصف موہائل کی طرف لپکا۔ ”نرگس جلدی سے یہاں سے نکلو۔“

”تم تم غائب کیسے ہو گئے؟“
”یہ وقت ان باتوں کا نہیں وہ نرگس کا ہاتھ تھام کر دوڑا۔“

اور مختلف گلیوں سے ہوتا ہوا ایک دوسری سڑک پر جا پہنچا پھر ایک ٹیکسی کے ذریعے دوسرے علاقے میں پہنچ کر ایک درمیانے درجے کے ہوٹل میں کمرہ حاصل کیا۔

رات کے نو بج چکے تھے کھانا آئے تک وہ خوف زدہ نرگس کو سپر شیڈ کے فارمولے اور ایجاد کے بارے میں تفصیل سے بتا چکا تھا۔

”یہ سب تو ٹھیک ہے لیکن ریلوے اسٹیشن پر پولیس اہلکار نے ہم پر گولی کیوں چلائی تھی؟“ نرگس نے پوچھا۔

”میری خود سمجھ میں نہیں آ رہا یہ کیا چکر ہے۔ میں اور کرن کوئی کمرنل ریکارڈ نہیں رکھتے جرائم پیشہ افراد کی تو سمجھا آتی ہے کہ وہ اس فارمولے کی وجہ سے ہمارے دشمن ہیں۔“ وہ اٹھتے ہوئے لہجے میں بولا پھر قدرے توقف سے کہا۔

میں DSP چوہدری ممتاز کو کال کر کے اصل بات بتاتا ہوں وہ ضرور ہماری مدد کریں گے، نرگس ٹی وی کی طرف بڑھی اور TV آن کیا۔ یہ کوئی پراسیوٹنٹ بھی نوز چیل تھا جس پر بریکنگ نوز چل رہی تھیں۔

اچانک آصف چونک پڑا نوز کا سڑکی چنٹی چلاتی

کو ساتھ لا کر حقیقی معنوں میں پھتار رہا تھا۔ وہ بے چاری آصف کی وجہ سے مصیبت میں پھنس چکی تھی۔

”نرگس بہتر یہی ہے کہ تم واپس فیض آباد لوٹ جاؤ، ورنہ میری وجہ سے کسی بڑی مصیبت میں پھنس جاؤں گی۔“ ایک پارک کے ایک گوشے میں بیٹھ کر آصف نے کہا، انہیں یہاں پہنچے کچھ ہی دیر ہوئی تھی۔

”میں نے ایک نیک مقصد کے لئے تمہارا ساتھ دینے کی حامی بھری ہے اور تم نے یہ کیسے سوتا لیا کہ میں اس مشکل کی گھڑی میں تمہارا ساتھ چھوڑ دوں گی۔“ نرگس نے جواب دیا۔

”اب ہم کسی ہوٹل میں بھی کر رہے نہیں لے سکتے رات بھی ہو چکی ہے کسی نہ کسی ٹھکانے کا بندوبست کرنا ہوگا ایسا کرتا ہوں پہلے ڈی ایس پی چوہدری ممتاز سے رابطہ کرتا ہوں۔“ آصف نے DSP کا نمبر ڈائل کیا یہ موبائل فون اس نے فیض آباد سے روانہ ہوتے ہوئے خرید لیا تھا۔

”آصف کہاں ہو بھی یہ کیا تہلکہ مچا رہا ہے۔“ شہر بھر کی پولیس تمہاری تلاش میں ہے۔“ چوہدری ممتاز نے کال رسو کرتے ہی کہا۔

”سر میں نے کوئی جرم نہیں کیا۔ وہ پولیس اہلکار سادہ لباس میں تھا۔ اور پھر ریلوے اسٹیشن پر اس نے خود ہی ہم پر فائرنگ کی تھی اور ہاتھ پائی میں اپنے ہی اسلحہ سے چلنے والی گولی سے مارا گیا۔ آپ میرا یقین کریں، میں بے گناہ ہوں میں خود ہی کرن کے ساتھ قاتلوں سے بچتا پھر رہا ہوں اور اب تو پولیس بھی میرے پیچھے پڑ گئی ہے۔“

”اور یہ تم بیٹھے بیٹھے پولیس موبائل سے غائب ہو کر سائے میں کیسے تبدیل ہو گئے؟“ چوہدری ممتاز نے تجسس آمیز لہجہ میں پوچھا۔

”سریہ پروفیسر داؤد کی ایجاد پیرشید و ایک عجیب ساخت کا لاکٹ میرے پاس ہے یہی تو وہ ایجاد ہے جس کی وجہ سے پروفیسر داؤد کا قتل ہوا، نامعلوم جرائم پیشہ افراد اس کی تلاش میں ہیں جبکہ میں یہ فارمولا اور ایجاد حکومت کے حوالے کرنا چاہتا ہوں۔“

آواز سنائی دے رہی تھی۔ خبر سے متعلق سلائڈنگ نوز بلیٹ بھی چل رہی تھی۔ ”ریلوے اسٹیشن پر پولیس اہلکار قتل۔ اسے ایس آئی پرویز کے قاتل کی ویڈیو کلپ آشکارہ ہو گئی۔ اس ویڈیو کلپ میں آپ قاتل کا چہرہ صاف دیکھ سکتے ہیں جو اپنی ساکھی خاتون کے ساتھ ریلوے اسٹیشن کے باہر پولیس موبائل میں بیٹھا ہے۔“ TV چینل نے آصف اور نرگس کا چہرہ بالکل واضح کر رکھا تھا۔ مزید تفصیلات بتائی جانے لگیں۔

پولیس موبائل میں بیٹھا پولیس اہلکار کا قاتل اچانک سائے میں تبدیل ہو گیا۔ ”آصف آنکھیں پھاڑے اور منہ کھولے خبریں دیکھ رہا تھا گویا وہ آنکھوں سے نہیں منہ سے TV دیکھ رہا ہو۔“ نرگس جلدی سے یہاں سے نکلوا بھارے لئے اس شہر میں مشکلات بڑھ گئی ہیں، TV میں ہماری ویڈیو کلپ آنے سے ہم بہت سے لوگوں کی نظروں میں آچکے ہیں اب ہمیں یہ ہوٹل چھوڑنا ہوگا۔“

صورتحال ان کے لئے منہ دوش ترین ہو چکی تھی وہ عجلت میں اس ہوٹل سے نکلے خیریت گزری کہ کسی نے انہیں پہچانا نہیں۔ نرگس کا مسئلہ تو آسانی سے حل ہو گیا انہیں صرف ایک دکان سے برقع خریدنا پڑا سب سے بڑا مسئلہ آصف کا تھا وہ بے چارہ برقع تو نہیں پہن سکتا تھا اس مسئلے کا حل اس نے اس طرح نکالا کہ ایک اجرک اور سندھی ٹوپی خرید لی ٹوپی پہن کر اس نے اجرک چہرے کے گرد لپیٹ لیا ویسے بھی دسمبر کا مہینہ تھا ان دنوں شہر سردی کی لپیٹ میں تھا۔ سرد ہواؤں سے بچنے کے لئے بہت سے لوگ چہرے کے گرد چادر یا رومال لپیٹ لیتے تھے وہ ایک سی این جی آرکشہ پر بیٹھ کر سلطان آباد کی مین سڑک پر اترے آصف ابھی اپنے گھر سے بیس پچیس قدم دور تھا کہ ٹھٹک کر رک گیا۔ اس کے گھر سے کچھ فاصلے پر تین چار پولیس اہلکار کھڑے تھے۔ صاف نظر آ رہا تھا وہ اس کے گھر کی گمرانی کر رہے تھے گویا پورے شہر کی پولیس اس کی تلاش میں فعال ہو چکی تھی گویا اب ان کے دو حریف ہو چکے تھے کرن کے باپ کے قاتلوں کے علاوہ شہر بھر کی پولیس انہیں پاگلوں کی طرح ڈھونڈ رہی تھی وہ نرگس

”اس وقت تم اور کرن کہاں ہو؟“

”سرم فلاں پارک میں ہیں۔“

”ٹھیک ہے میں اعلیٰ حکام سے بات کرتا ہوں۔“

چوہدری ممتاز نے کہا اور رابطہ منقطع کر دیا۔

کچھ دیر بعد اس نے اپنے ایک دوسرے کلاس فیلو

دوست امجد کا نمبر ڈائل کیا۔ ”امجد میں اس وقت فلاں پارک

میں ہوں اور مجھ دھن کے لئے کوئی محفوظ جگہ چاہئے۔“ امجد

نے دوسری طرف سے کال ریسو ہوتے ہی کہا۔

”یاریہ تم کیا کرتے پھر رہے ہو ہر جھنڈ پر تمہاری

ہی خبر ہے اور پورے شہر کی پولیس تمہاری تلاش میں ہے۔“

امجد نے ہڈیانی انداز میں کہا۔

”یاریہ میں تمہیں ملنے پر تفصیل سے بتاؤں گا

الحال اتنا سمجھ لو کہ یہ میرے خلاف سازش ہے۔“

”اچھا تو ایسا کرو تم فلاں چورنگی پر آ جاؤ میں تمہیں

دہیں ملوں گا۔“ امجد بولا اور آصف نے رابطہ منقطع کیا

اور نرگس کے ساتھ پارک سے باہر نکلا۔

اچانک اس کی نگاہ مخالف سمت سے آتی پولیس

موبائل پر پڑی جو ہوٹر بجاتی ہوئی آرہی تھی۔ پولیس

موبائل میں نصف درجن سے زائد پولیس اہلکار تھے۔

شاید انہیں دیکھ لیا گیا تھا اور آصف کو پہچان لیا گیا تھا

کیونکہ ڈرائیور کے ساتھ بیٹھے پولیس انسپکٹر نے انگلی سے

اس کی طرف اشارہ کیا تھا۔ وہ نرگس کا ہاتھ تھام کر فٹ

پاتھ پر بھاگنے لگا۔ سڑک پر ٹریفک زیادہ تھا۔ پولیس

موبائل کی رفتار کم تھی پھر پولیس موبائل رکی اور پولیس

اہلکار نیچے اتر کر ان کے پیچھے دوڑے۔ اگر آصف اکیلا ہوتا

تو لاکٹ کا بٹن دبا کر سائے میں تبدیل ہو جاتا لیکن

پھر مسئلہ نرگس کا تھا۔ فٹ پاتھ پر چلنے والے لوگ حیرت

و استعجاب سے ایک نوجوان کو برقع پوش خاتون کا ہاتھ

تھامے بھاگتا دیکھ رہے تھے جن کے پیچھے پولیس

اہلکار اٹھائیں اٹھائے دوڑ رہے تھے وہ خواتین کو اٹھاتے

لوگوں کو دھکیلتے ہوئے ایک گلی میں جا گئے یہ طویل گلی تھی

جس کا اختتام ایک وسیع و عریض گراؤنڈ میں ہوا جہاں

سینکڑوں لوگ جمع تھے۔

اس گراؤنڈ میں چاروں طرف لگے پوٹر

پراسٹریٹ لائٹ روشن تھیں کچھ فاصلے پر اسٹیج پر ایک شخص

کھڑا ٹیک میں تقریر کر رہا تھا۔ اس مجمع میں عورتیں بچے

بوڑھے جوان بھی تھے جو وقتاً فوقتاً جئے جئے کے نعرے

لگا رہے تھے۔ آصف بھی نعرے لگاتا ہوا نرگس کا ہاتھ تھام

کر اس جلسے میں جا گھسا۔

پولیس اہلکار بھی وہاں پہنچ چکے تھے۔ اور اب دور

ہی سے اس جلسے کو دیکھ رہے تھے۔ سینکڑوں لوگوں کے مجمع

میں جانا ان کے بس میں نہیں تھا۔ ان کو مطلوب ملزم اپنی

ساتھی خاتون سمیت اس مجمع میں گھس چکا تھا۔ اور وہ بے

بسی سے دیکھنے کے علاوہ کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ وہ جانتے

تھے کہ اپوزیشن سے تعلق رکھنے والے اس لیڈر کے بنیالے

پولیس اہلکاروں کو اندر نہیں گھسن دیں گے۔

پولیس اہلکار اب آہستہ آہستہ اس جلسے کے

چاروں طرف پھیل رہے تھے تاکہ آصف اور نرگس کہیں

سے نکل کر بھاگ نہ جائیں۔ آصف پہلے تو اس صورتحال

پر گھبرایا کہ جلسے کے اختتام پر پولیس انہیں دھرلے گی

پھر ایک خیال کے تحت اس کی آنکھیں چمکنے لگیں اور اس

نے لاکٹ کی پشت پر موجود بٹن دبا دیا وہ سائے

میں تبدیل ہوتے ہی زور سے چلایا۔ ”یہ پولیس والے اس

جلسہ گاہ کو گھیرے میں لے کر ہمارے لیڈر کو گرفتار کرنا

چاہتے ہیں۔“ اس کی بلند آواز نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔

جلسہ گاہ میں موجود لوگوں نے خطرناک تیوروں

سے ان پولیس اہلکاروں کو دیکھا اور ان پر ٹوٹ پڑے۔

آصف اس موقع پر لاکٹ کا بٹن دبا کر دوبارہ حاضر ہو چکا

تھا نرگس کا ہاتھ تھام کر جلسہ گاہ سے نکل گیا۔

امجد مطلوبہ جگہ پر اپنی گاڑی میں بیٹھا اونگھ رہا تھا

آصف نرگس کو پچھلی نشست پر بیٹھا کر خود فرنٹ سیٹ

پر جا بیٹھا۔ ”بڑی دیر لگا دی۔“ امجد نے اسے گھورا۔

”بس یار ایک ٹریجڈی ہو گئی تھی۔“ آصف نے کہا

اور مختصر الفاظ میں اپنی روداد سنا ڈالی، اس نے بہت سی باتیں

چھپائی تھیں۔ جیسا کہ لاکٹ کا راز نرگس کی اصلیت۔

”ویسے تم نے پولیس اہلکاروں کے ساتھ اچھا

نہیں کیا۔ بہتے چڑھ گئے تو پولیس خاطر خواہ دھلائی کرے گی۔“ امجد ہنس پڑا۔ وہ انہیں ایک جگہ لے گیا وہاں اس کا ساز و سامان سے یہ راستہ بنگلہ خالی پڑا تھا۔ امجد کا تعلق امیر و کبیر گھرانے سے تھا۔ والد امپورٹ ایکسپورٹ کا کام کرتے تھے۔ بڑا بھائی اصغر ایک نجی ٹی وی چینل میں۔ منکر پرسن اور رپورٹر تھا۔ یہ کام وہ شوقیہ کرتا تھا کچھ دیر گپ شپ لگانے کے بعد امجد چلا گیا۔ فریج کھانے پینے کی اشیاء سے بھرا پڑا تھا۔ نرگس نے چائے بنائی چائے پینے کے بعد کچھ دیر گپ شپ لگانے کے بعد وہ سو گئے۔ صبح ابھی آصف جاگا ہی تھا کہ اس کے موبائل فون کی بیل بجی اس نے اسکرین پر نمبر دیکھا۔ DSP کا لنک لکھا ہوا نظر آ رہا تھا۔

”ہیلو سر السلام علیکم۔“

”تم لوگ کہاں غائب ہو گئے تھے، میں رات بھر تمہیں پارک میں ڈھونڈتا رہا اور پھر کال کی تو تمہارا نمبر آف تھا۔“ دوسری طرف سے چودہدہری ممتاز خٹکی آمیز لہجے میں مخاطب تھے۔

”سر ہم جیسے ہی پارک سے نکلے وہاں پولیس آن پہنچی بڑی مشکل سے پیچھا چھڑا کر محفوظ مقام تک پہنچے ہیں۔“

”بے قواف لڑکے تمہیں پارک سے نکلنے کی کیا ضرورت تھی وہیں میرا انتظار کرتے۔ میرے خیال میں وہ کوئی گشتی پولیس موبائل ہوگی جو تم پر نظر پڑتے ہی تمہارے پیچھے پڑ گئے۔ میں نے ڈی آئی جی صاحب سے بات کر لی ہے تم کسی بھی وقت مجھ سے ملو۔“

”اوکے سر میں شام کو دوبارہ کال کر کے آپ سے ملاقات کی جگہ طے کر لوں گا۔ اللہ حافظ!“ آصف نے رابطہ منقطع کر دیا۔

وہ ناشتہ کر کے گھر سے نکلا اس کا ارادہ اس پوش علاقے میں جانا تھا جہاں پروفیسر داؤد کا گھر تھا، وہی گھر جہاں کرن اسے پہنچی بار لے کر گئی تھی اس کا خیال تھا کہ شاید کرن وہیں ہو مگر اسے ناکامی ہوئی کرن کے گھر پر تالا تھا۔ وہ واپس گھر آ گیا مین گیٹ کھلا دیکھ کر اس کا ہاتھ

ٹھنکا۔ وہ تیزی سے اندر داخل ہوا گھر میں ہر چیز ادھر ادھر بکھری پڑی تھی ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے کسی نے گھر کی تلاشی لی ہو اور پھر نرگس بھی نظر نہیں آ رہی تھی، اس نے نرگس کا موبائل نمبر ڈائل کیا مگر اسے مایوسی ہوئی۔ نرگس کا نمبر آف تھا۔ ”کہیں اسے بھی تو اغوا نہیں کر لیا گیا۔“ یہ سوچتے ہی اس کا دل ڈوبنے لگا اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ نرگس کہاں گئی اسے پولیس نے گرفتار کر لیا تھا یا پھر پروفیسر داؤد کے قاتل یہاں تک پہنچ گئے۔

”کہیں امجد نے اسکی بخبری تو نہیں کی۔“ لیکن اس کا دل یہ تسلیم کرنے سے انکار کرتا تھا امجد اس کا گہرا دوست تھا۔

کچھ دیر سوچنے کے بعد اس نے امجد کا نمبر ڈائل کیا اور دوسری طرف سے کال ریسور ہوتے ہی بولا۔ ”یار میں گھر سے کسی کام کے سلسلے میں نکلا تھا۔ واپس آیا تو نرگس گھر پر نہیں سے اور گھر کا سامان ادھر ادھر بکھرا پڑا ہے ایسا لگ رہا ہے کہ جیسے کسی نے گھر کی تلاشی لی ہو۔“

دوسری طرف سے امجد نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”تم فوری طور پر وہ جگہ چھوڑ دو ہو سکتا ہے کہ دشمن تمہاری تاک میں ہو اور ہاں یہاں میرے گھر پر آ جاؤ میں اکیلا ہوں گھر والے ایک پارٹی میں گئے ہوئے ہیں۔“

آصف ابھی گھر سے نکلنے ہی والا تھا کہ اس کے موبائل فون کی بیل بجی اس نے اسکرین پر دیکھا کوئی نیا نمبر تھا۔ ”ہیلو آصف اگر لڑکی کی زندگی چاہتے ہو تو وہ فارمولا اور لاکٹ میرے حوالے کر دو۔“ دوسری طرف سے صہمیر اور سرسراتی ہوئی آواز سنائی دی۔

”تم کون بول رہے ہو؟“ آصف نے پوچھا۔ ”تمہارے لئے یہ جاننا ضروری نہیں البتہ اتنا جان لو کہ اس لڑکی کی زندگی کی ضمانت اسی میں ہے کہ تم میری ہدایات پر حرف بہ حرف عمل کرو۔“ دوسری طرف سے کہا گیا۔

”تم مجھے کہاں ملو گے؟“ آصف نے پوچھا۔ ”تمہیں کالا باغ میں جس عمارت کے تہہ خانے میں قید کیا گیا تھا وہ عمارت تو تمہیں یاد ہوگی یہ وہی عمارت

ہے جو کبھی پروفیسر داؤد کی ملکیت تھی جتنی جلدی ہو سکے تم وہ فارمولا اور لاکٹ لے کر وہیں آ جاؤ اور ہاں یہ یاد رہے اگر تم دونوں چیزیں لے کر نہیں پہنچے تو تمہیں اس لڑکی کی لاش ملے گی۔“ اچھی شخص نے کہا اور رابطہ منقطع ہو گیا۔

آصف نے موبائل فون جیب میں رکھا اور لاکٹ کا ہٹن دبا کر سائے میں تبدیل ہو گیا، پولیس اس کے پیچھے تھی وہ نرگس کی بازیابی سے پہلے پولیس کے ہاتھ نہیں آتا چاہتا تھا۔ ایک مسافر بس میں سوار ہو کر وہ امجد کے گھر کے دروازے پر پہنچا اور دوبارہ لاکٹ کا ہٹن دبا کر اپنی اصل حالت میں لوٹ آیا اور ڈورنٹل بجادی، دروازہ امجد نے کھولا وہ اسے لئے ہوئے ایک کمرے میں پہنچا جہاں صوفے پر امجد کا بھائی اصغر بیٹھا تھا۔ ”تم بھائی کے ساتھ گپ شب لگاؤ میں چائے بناتا ہوں۔“ امجد نے کہا اور اس کے منع کرنے کے باوجود کمرے سے باہر نکل گیا۔

”آصف مجھے امجد نے تمہارے بارے میں کافی کچھ بتایا ہے۔ اب تم بھی تفصیل سے مجھے بتاؤ، ہو سکتا ہے کہ میں تمہارے کام آ سکوں میرا ایک دوست وقاص حساس ادارے کا اعلیٰ افسر ہے ویسے ایک بات بتاؤں اس حساس معاملے میں کچھ چھپانا تمہارے لئے بہت نقصان دہ ثابت ہو سکتا ہے شہر بھر کے قانون نافذ کرنے والے ادارے تمہارے پیچھے ہیں تم کب تک چھپو گے۔“ اصغر نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

کچھ دیر سوچنے کے بعد آصف نے اسے تفصیل سے واقعات سے آگاہ کیا اس نے یہ بھی بتا دیا کہ ڈاکٹر نرگس کرن کی ہم شکل ہے۔

”اس کا مطلب ہے تمہیں وہاں ضرور جانا ہوگا۔ ہم دونوں علیحدہ علیحدہ روانہ ہوں گے تاکہ بوقت ضرورت تمہاری مدد کر سکوں۔“ امجد چائے بنا کر لاپکا تھا، ان کے درمیان طے پایا کہ اصغر اور آصف دونوں آگے پیچھے کالا باغ جائیں گے تاکہ بوقت ضرورت ایک دوسرے کی مدد کر سکیں۔

اصغر کا تعلق میڈیا سے تھا اسے بعض اوقات اکثر اپنا حلیہ تبدیل کرنا پڑتا تھا میک اپ کے جملہ لوازمات اس کے

پاس موجود تھے اس نے گھنٹہ بھر کی محنت سے آصف کا حلیہ یکسر تبدیل کر ڈالا اب اسے شناخت کرنا آسان نہیں تھا۔ دوسرے روز وہ صبح صبح اصغر کے ساتھ حساس ادارے کے افسر اعلیٰ سے ملا۔ اس نے تفصیل سے آصف سے سب کچھ پوچھا اور آصف نے افسر اعلیٰ کو سچ بتایا ان کے درمیان کافی دیر تک گفتگو ہوتی رہی پھر وہ وہاں سے روانہ ہو گئے، آصف فلائٹ سے اسلام آباد پہنچا اور کالا باغ کے لئے ایک ٹیکسی کرائے پر بک کر دہائی سڑک پر اس وقت اچھا خاصا ہجوم تھا۔

اچانک مخالف سمت سے ایک نئے مازل کی پراڈو تیز رفتاری سے آئی ٹیکسی ڈرائیور نے بروقت بریک لگا کر اسٹیزنگ کو بانٹیں ست گھمایا ادھر پراڈو کا ڈرائیور بھی بریک لگا چکا تھا۔ اس کے باوجود بھی رکتے رکتے دونوں گاڑیاں ہلکے سے ٹکرائیں۔ غلطی سراسر پراڈو کے ڈرائیور کی تھی۔ پراڈو پر کسی سیاسی پارٹی کا جھنڈا لہرا رہا تھا۔ رانگل بردار شخص اور ڈرائیور پراڈو سے اتر کر ٹیکسی کے قریب آئے اور ٹیکسی ڈرائیور کو گریبان سے پکڑ کر گھسیٹ لیا۔ ”اندھے تمہیں نظر نہیں آتا بہت جلدی ہے تمہیں اور اس جلدی میں تم نے یہ بھی نہیں دیکھا کہ ایم پی اسے سردار جہاگیر خان کی گاڑی سامنے سے آرہی ہے۔“ رانگل بردار کے الفاظ سن کر آصف چونک پڑا، نرگس نے اپنی روداد سنائی تھی اس کے مطابق اسے جان سے مارنے کا حکم سردار جہاگیر خان نے دیا تھا۔

آصف تیزی سے باہر نکلا، اسے مسٹر غلطی تمہارے ڈرائیور کی ہے جو رنگ سائیڈ سے تیز رفتاری سے اچانک سامنے آیا تھا۔

”اچھا تو تم مجھے بتاؤ گے کہ غلطی کسی ہے۔“ رانگل بردار تند لہجے میں بولا۔

ان کی بحث کے دوران سردار جہاگیر خان اور نومند نو جوان بھی اتر کر ان کے قریب آچکے تھے۔ پچھلی دو گاڑیوں سے بھی مسلح افراد نے انہیں گھیر لیا۔ یہ چار پانچ افراد تھے جو یقیناً جہاگیر خان کے کارندے تھے۔ ”کیا بات ہے جوان زیادہ اچھلنا اچھا نہیں۔“ جہاگیر خان نے

چالاکی یا ہوشیاری دکھانے کی کوشش مت کرنا اور نہ ہی یہاں سے بھاگنے کی کوشش کرنا یہاں جگہ جگہ میرے مسلح کارندے موجود ہیں۔“

وہ اسے تنبیہ کرتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔

☆.....☆.....☆

رائفل بردار نے جیسے ہی ٹریڈر دایا سرور جہانگیر خان نے برقی سرعت سے اس کی رائفل کا رخ اوپر کر دیا اور فضا ترزاہٹ کی آوازوں سے گونج اٹھی، اور اسی لمحہ بھری تاخیر ہو جاتی تو آصف اپنی زندگی سے محروم ہو جاتا۔ ادھر وہ تو مند نو جوان بھی پہلے نکال چکا تھا۔“ نہیں شیر خان رک جاؤ۔“ جہانگیر خان اس کی راہ میں مزاحم ہو گیا۔

”بابا جان میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔“ شیر خان بچہ چکا تھا گویا وہ جہانگیر خان کا بیٹا تھا اس سے پہلے کہ صورتحال مزید گھبراہٹ ہوئی پولیس موبائل ہوٹل بھائی ہوئی وہاں پہنچ گئی اور وہ اسے دھمکیاں دیتے ہوئے رخصت ہو گئے۔

چند گھنٹوں بعد ٹیکسی کالاباغ کی حدود میں داخل ہو چکی تھی ٹیکسی ڈرائیور کو کرایہ دے کر رخصت کرنے کے بعد آصف نے لاکٹ کی پشت پر موجود مین دایا اور سائے میں تبدیل ہو گیا، وقت سے دس منٹ پہلے ہی وہ پردیسر داؤد کے گھر سے کچھ فاصلے پر کھڑا تھا۔ عمارت کے اندر اور باہر ہر طرف از جی سید روشن تھے اور سرچ لائٹس روشن تھیں۔ غرض کہ وہاں اتنی روشنی تھی کہ دن سا لگا ہوا تھا، اس غیر معمولی روشنی میں معمولی سے معمولی چیز با آسانی نظر آ سکتی تھی۔ آصف اس شاطر مجرم کی ہوشیاری سے متاثر ہو چکا تھا۔ وہ جیسے ہی آگے بڑھتا اس کا سایہ نظر آ جاتا اور یہی ہوا، وہ جیسے ہی چند قدم آگے بڑھتا تیز روشنی میں سایہ بخوبی نظر آنے لگا۔

چند قدم کے فاصلے پر ایک ادھیر عمر شخص چار رائفل بردار افراد کے ساتھ چوکنا کھڑا تھا وہ جس جگہ کھڑے تھے اس کے دونوں اطراف سینکڑوں فٹ گہری خوف ناک کھائیاں تھیں۔“ آصف وہیں کھڑے رہو

بھاری بھر کم لہجہ میں اس سے مخاطب تھا، اسی لمحے تو مند نو جوان نے آصف کے گھر بان پر ہاتھ ڈال دیا۔ آصف کا ہاتھ بے اختیار حرکت میں آیا اور تو مند نو جوان کے چہرے پر زوردار گھونسا لگا۔ وہ پیچھے کی طرف ٹڑکھڑایا اور رائفل بردار نے گن کی نال کا رخ آصف کی طرف کر کے ٹریڈر دایا۔

آصف کی موت یقینی تھی لاکٹ کا مین دبانے کا اسے موقع ہی نہیں ملا اور فضا گولیوں کی ترزاہٹ سے گونج اٹھی۔

☆.....☆.....☆

آصف کے گھر سے نکلتے ہی زگس اپنے موبائل فون پر Game کھیل رہی تھی کہ اچانک اسے ایسا لگا جیسے احاطے میں کوئی گودا ہو وہ ہڑبڑا کر اٹھی اسی وقت دو نقاب پوش کمرے میں داخل ہوئے اس نے چیخنے کے لئے منہ کھولا ہی تھا کہ ایک نقاب پوش کا ہاتھ تختی سے اس کے منہ پر جم گیا ایک ناگوار بو اس کے دماغ میں حاوی ہو گئی اور وہ بے ہوش ہو کر اس کے بازوؤں میں جھولی گئی زگس کو ہوش آیا تو خود کو ایک کمرے کے فرش پر پڑے پایا، کمرے میں کسی بھی قسم کا ساز و سامان نہیں تھا۔ وہ اٹھی ہی تھی کہ ایک ادھیر عمر شخص کمرے میں داخل ہوا۔“ تو تمہیں ہوش آئی گیا، اب بتاؤ تم کون ہو؟“ ادھیر عمر شخص نے پوچھا۔

”میں کون ہوں؟“

”یرم کون ہو؟“ اس نے خوف زدہ لہجہ میں پوچھا۔

”اگر تم کرن ہوتی تو مجھے پہچان لیتی، تم کرن نہیں اس کی کوئی ہم شکل ہو۔“ اس نے استہزائیہ لہجہ میں کہا۔

”میں کرن ہی ہوں۔“ وہ اپنی بات پر قائم رہی۔

”سوچ لو اگر سچ نہیں بولو گی تو جان کے ساتھ ساتھ اپنی عزت سے بھی محروم ہو جاؤ گی۔“

اگر وہ جان سے مار دینے کی دھمکی دیتا تو شاید وہ نہ ڈرتی۔ لیکن عزت بچانے کے لئے وہ ہلکتی چلی گئی۔ ”تم نے ہمارے ساتھ تعاون کیا ہے۔ اس لئے تمہیں کچھ نہیں کہا جائے گا لیکن جب تک فارمولا اور لاکٹ ہمارے ہاتھ نہیں آتا تم ہماری قید میں رہو گی اور ہاں کسی قسم کی

آگے بڑھنے اور ہلنے جلنے کی کوشش مت کرنا ورنہ نرگس کے جسم کے پرچے اڑ جائیں گے وہ اسی عمارت کے ایک کمرے میں میں قید ہے اور عمارت میں طاقتور ریموٹ کنٹرول بم نصب ہے۔ جیسے ہی تم نے میری مرضی کے خلاف حرکت کی، میں ریموٹ کا بٹن دبا دوں گا۔ وہ اپنا ریموٹ والا ہاتھ آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

”تم کیا چاہتے ہو؟“ آصف نے پوچھا۔

”سب سے پہلے تو تم جسمانی طور پر میرے سامنے حاضر ہو جاؤ۔“ ادھیڑ عمر شخص نے حکم دیا۔

اور آصف نے لاکٹ کی پشت پر موجود بٹن دبا دیا اگلے ہی لمحے وہ سائے سے اپنے اصل روپ میں حاضر ہو چکا تھا۔

”بہت خوب واقعی پروفیسر دؤر نے کمال کی چیز ایجاد کی ہے۔ اب یہ لاکٹ مجھے دے دو اور فارمولا بھی میرے حوالے کر دو۔“ ادھیڑ عمر شخص تیزی سے بولا۔

”تم کون ہو؟ اور کون کہاں ہے؟“ آصف نے پوچھا۔

”ان باتوں کو چھوڑو اور لاکٹ میرے حوالے کر دو ورنہ میں ریموٹ کا بٹن دبا دوں گا۔“ ادھیڑ عمر شخص سانپ کی طرح پھنکارا اور آصف نے اپنے گلے سے لاکٹ نکال لیا۔ وہ جانتا تھا کہ کسی بھی قسم کی مزاحمت بیکار ہے۔ اگر وہ ادھیڑ عمر شخص کی بات نہیں مانتا تو وہ سفاک قحط ریموٹ کا بٹن دبا دیتا اور نرگس جیسی شخص لڑکی زندگی سے محروم ہو جاتی۔

اس نے لاکٹ گلے سے اتار کر ادھیڑ عمر شخص کی طرف بڑھایا ہی تھا کہ ایک نسوانی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔ ”ٹھہرو میں بتاتی ہوں یہ کون ہے؟“ یہ نرگس کی آواز تھی سب نے مڑ کر دیکھا ان سے کچھ فاصلے پر نرگس کھڑی تھی سب اسی کی طرف متوجہ تھے۔

ادھیڑ عمر شخص اور اس کے کارندے حیران تھے کہ عمارت کے کمرے میں قید نرگس کیسے آزاد ہو گئی اور پھر آزاد ہو کر اس طرح عمارت سے باہر آئی کہ انہیں کانوں کان خبر بھی نہ ہوئی۔

آصف نے ان کی توجہ نرگس کی طرف ہوتی دیکھ کر چھلانگ لگائی اور چشم زدن میں ادھیڑ عمر شخص کو دبوچ لیا۔ اس کا بازو سانپ کی طرح ادھیڑ عمر شخص کی گردن سے لپٹا ہوا تھا اور وہ اپنی پینٹ کی بیلٹ میں اڑسا ہوا سطل نکال کر ادھیڑ عمر شخص کی کینٹی سے لگا چکا تھا۔ یہ سطل اسے حفاظت کی غرض سے روانہ ہوتے وقت اصرار دیا تھا۔

”اس کہنے کی زندگی چاہتے ہو تو اپنے اپنے ہتھیار پھینک دو۔“ آصف چلایا تو ادھیڑ عمر شخص کے چاروں ساتھی سوچ میں پڑ گئے۔ ”جلدی کرو ورنہ گولی چلا دوں گا، انہیں کہو ہتھیار پھینک دیں۔“ اس نے ادھیڑ عمر شخص کی گردن پر دباؤ بڑھاتے ہوئے کہا۔

”ہتھیار پھینک دو۔“ ادھیڑ عمر شخص بھینچنے بھینچنے آوا

ز میں بولا۔

ان چاروں نے رائفلیں پھینک دیں آصف نے ان کے ہتھیار پھینکتے ہی اپنے درجہ ان کا نشانہ لے کر ٹریگر دبا دیا گولیاں ان کی ٹانگوں میں ٹپکی تھیں وہ پیچھے ہوئے گر پڑے، آصف نے ادھیڑ عمر شخص کو ایک طرف دھکیلا۔

”اب بولو تم کون ہو ورنہ تم بھی اپنے ساتھیوں کی طرح اپنا بیج ہو جاؤ گے میرا نشانہ تو تم دیکھ ہی چکے“ وہ بولتا ہوا رائفلیں کے قریب گیا اور رائفلیں اٹھا کر کھائی میں پھینک دیں اس دوران وہ ادھیڑ عمر شخص کی طرف سے محتاط تھا۔

ادھیڑ عمر شخص کا چہرہ تاریک پڑ چکا تھا۔ اپنا ایک طرف سے کسی نے فار کیا اور سطل آصف کے ہاتھ سے نکل گیا۔ گولی اس کے ہاتھ پر لگی تھی اس نے مڑ کر دیکھا تو اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ اس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے ان سے کچھ فاصلے پر ڈی ایس پی ممتاز کھڑا تھا۔

جس کے ہاتھ میں موجود سطل کی مال کا رخ اس کی طرف تھا۔ ”سر آپ ان کے ساتھی ہیں۔“ آصف کے لہجے میں اب تک بے یقینی تھی۔

”ہاں میں ڈی ایس پی چوہدری ممتاز اس کا پارٹنر ہوں ریلوے اسٹیشن پر نرگس پر گولی چلانے والا بھی میرا ہی ساتھی تھا۔ مگر وہ تمہارے ہاتھوں مارا گیا میں نے ہوشیاری

سے تم پر پولیس کیس بنا دیا تاکہ تم مدد کے لئے پولیس کے پاس نہ جاسکو اور امجد کے جنگلے پر میں نے ہی تمہاری کال ٹرپس کر کے نرگس کو اغوا کر دیا اور اسے یہاں منتقل کر دیا اور پھر تمہیں فون کیا تاکہ تم اسے بچانے آؤ اور میں تم سے سپر شیڈ کی ایجاد اور فارمولا حاصل کر سکوں۔“

”ہہ، تم نے یہ سب کچھ کیوں کیا؟“ آصف نے پوچھا۔

DSP کے بجائے ادھیڑ عمر شخص بولا۔ اس کا جواب میں دیتا ہوں، میں پروفیسر داؤد کا سگا بھائی سجاواں ہوں، مجھے پڑھائی سے کوئی خاص دلچسپی نہ تھی نو جوانی سے جرائم کی راہ پر چل نکلا۔ والد صاحب سخت گیر طبیعت کے مالک تھے انہوں نے مجھے گھر سے بے دخل کر دیا۔ میں جرائم کی دنیا میں بڑھتا چلا گیا۔ ہارگٹ کلنگ سے لے کر منشیات کی اسمگلنگ تک میں نے ہر جرم کیا۔ پر مجھے پتہ چلا کہ پروفیسر داؤد سائنسی میدان میں بہت بڑی کامیابی حاصل کر چکا ہے۔

ایک اخباری رپورٹر کو انٹر ویو دیتے وقت داؤد نے سرسری انداز میں سپر شیڈ نامی ایجاد کا ذکر کیا ان ہی دنوں ایک پڑوسی دشمن ملک کے ایجنٹ شیکھر نے مجھے اس فارمولے اور ایجاد کے عوض کروڑوں ڈالر کی پیش کش کی۔ ہم نے اپنا ہی ایک کارندہ جو کیدار کے بھیس میں پروفیسر داؤد کے گھر میں بیچ دیا۔ فارمولے کے بارے میں مکمل سن گن ملتے ہی اسے فون بھی کیا مگر پروفیسر داؤد نہیں مانا پھر ایک روز میں خود اس سے ملا اور اسے ان کروڑوں ڈالر میں سے نصف کی پیش کش کی مگر اس پر حب الوطنی کا بھوت سوار تھا۔ میں نے اسے دھمکانے کے لئے ہتھل نکالا وہ مجھ سے غصہ گتھا ہو گیا اسی دوران گولی چلی، اور پروفیسر داؤد کے مرتے ہی تلاشی کے باوجود فارمولا اور ایجاد نہ ملا تو میں نے چوکیدار کو بھی قتل کر دیا۔

میں کوئی خطرہ مول لینا نہیں چاہتا تھا، وہ ویسے بھی عام سا کارندہ تھا اس کی اتنی اہمیت نہ تھی۔“ ڈی ایس پی ممتاز چوہدری میرا پرانا دوست تھا، میں اس سے ملا اور ہم دونوں نے پلاننگ بنائی کہ کرن کو اغوا کیا جائے ہو سکتا ہے

اسے اس فارمولے کے بارے میں علم ہو پھر تم ڈی ایس پی سے ملے اور کرن کے ساتھ پروفیسر کے گھر پہنچے تم نے فارمولا ملتے ہی ڈی ایس پی کو فون کیا یوں میں اور DSP کجالت میں کالا باغ کی اس عمارت میں آ پہنچے۔“ سجاواں روانی سے بولتا چلا جا رہا تھا کہ ڈی ایس پی نے مداخلت کی۔ ”وقت ضائع مت کرو یہاں گولیاں چل چکی ہیں اس سے فارمولا لے کر یہاں سے نکلو۔“

شیکھر ہمارا انتظار کر رہا ہوگا۔“

نرگس چند قدم آگے بڑھی۔ ”تم کیا سمجھتے ہو میں تمہیں اتنی آسانی سے یہاں سے جانے دوں گی۔“

”تم ہمیں روکو گی۔“ ڈی ایس پی ہنسا۔

”ہاں میں روکوں گی اب اس سے آگے کی داستان مجھے مکمل کرنے دیتا کہ آصف حقیقت جان سکے۔“

اس روز جب میں اور آصف لاکٹ لے کر جان بچانے کے لئے بھاگے۔ تم دونوں اپنے مسلح کارندوں کے ساتھ ہمارے تعاقب میں تھے گولی لگنے سے ہماری گاڑی کا تار برسٹ ہوا اور پراڈ بے قابو ہو کر درخت سے جا ٹکرائی میں اور آصف دونوں بے ہوش ہو چکے تھے تم انہیں اٹھا کر اسی عمارت میں لے آئے آصف کو تہہ خانے میں قید کرنے کے بعد تم دونوں مجھے ایک کمرے میں لے گئے جہاں میں ہوش میں آ گئی تم دونوں نے تشدد کر کے مجھ سے فارمولے اور ایجاد کے بارے میں جاننا چاہا مگر میں تمہارا تشدد سستی رہی اور کچھ نہیں بتایا کیوں کہ میں جانتی تھی کہ فارمولا اور ایجاد حاصل کرنے کے باوجود تم دونوں مجھے مار ڈالو گے اور آصف بھی نہیں بچے گا۔

اس دوران اس کیلئے DSP چوہدری ممتاز کی نیت مجھ پر خراب ہو گئی اس نے شراب پی رکھی تھی اور نشے میں تھا۔

اور تم سجاواں میرے بے غیرت چچا میری بے بسی کا تماشا دیکھتے رہے اسی دوران میں نے میز پر پڑی چھری اٹھالی اور دھمکی دی ”اگر DSP نے مجھے ہاتھ بھی لگانے کی کوشش کی تو میں خودکشی کر لوں گی۔“ مگر DSP خباثت سے ہنسا ہوا میری طرف بڑھتا رہا۔

ادھر سجاوٹ دروازے پر پہنچا۔ اس سے پہلے کہ چوہدری ممتاز مجھے دبوچتا میں نے اپنی عزت بچانے کے لئے اپنے سینے میں چھری گھونپ دی اور چند لمحے ٹڑپنے کے بعد جب میں بے حس و حرکت ہو گئی تو تم دونوں نے مل کر میری لاش اٹھائی اور گھر سے باہر اس گہری کھائی میں پھینک دی۔

وہ ایک طرف واقع کھائی کی سمت اشارہ کرتے ہوئے بولی اور قدرے توقف سے پھر بولی۔ ”میرے قتل کے بعد یہ دونوں وہاں سے بھاگ گئے۔ تمہارے بھاگنے کے بعد میں نے تمہارے خاٹے کا دروازہ کھولا اور آصف آزاد ہو کر یہاں سے نکل گیا اس روز فائیو اسٹار ہوٹل کے باہر بھی میں ہی اس سے ملی تھی۔“

چوہدری ممتاز نے کہا۔ ”واہ واہ نرگس تمہیں تو ہالی ووڈ کی کسی فلم میں مرکزی کردار ملنا چاہئے کیا زبردست پرفارمنس دی ہے۔ لیکن تم یہ سب کیسے جان گئی؟“

”میں نرگس نہیں بلکہ کرن کی روح ہوں۔“ اس نے کہا۔

چوہدری ممتاز برہم ہو گیا۔ ”بند کرو یہ ڈرامہ میں تمہاری اس نونکنی سے ڈرنے والا نہیں، اور آصف لاکٹ میری طرف پھینکو ورنہ میں تم دونوں کو مار دوں گا۔“

ادھر وہ بدستور چوہدری ممتاز کی طرف بڑھتی رہی۔ ”اسے روکو ورنہ گولی چلا دوں گا۔“ وہ چلایا۔

مگر وہ رکنے بغیر اس پر نظریں جمائے بدستور آگے بڑھتی رہی، چوہدری ممتاز نے اس کا نشانہ لے کر پے درپے دو فائر کئے مگر دونوں گولیاں اس کے جسم پر بے اثر رہیں وہ بدستور اس کی طرف بڑھ رہی تھی۔

چوہدری ممتاز بوکھلا کر ٹریگر دبائے جا رہا تھا گولیاں اس کے جسم پر بے اثر تھیں بالآخر DSP کے ہاسٹل میں گولیاں ختم ہو گئیں، ادھر شمشاد کھڑے آصف نے چوہدری ممتاز پر چھٹا ٹنگ لگائی اور اسے لئے ہوئے نیچے گرا اور پے درپے کئی گھونٹے DSP کے چہرے پر رسید کئے اس مارا ماری کے دوران آصف کا لاکٹ گر گیا۔

سجاوٹ کی نظر لاکٹ پر پڑی تو وہ لاکٹ کی طرف نپکا اور لاکٹ اٹھا کر ایک طرف دوڑا اسے لاکٹ اٹھاتا دیکھ کر وہ بھی اس کے پیچھے دوڑی وہ دونوں ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتے کھائی کے قریب پہنچ چکے تھے۔

”سجاوٹ رک جاؤ۔“ وہ اس کے پیچھے دوڑتی ہوئی چلائی، سجاوٹ نے بھاگتے بھاگتے مڑ کر دیکھا۔ اسی وقت ایک پتھر سے ٹھوکر لگنے کے باعث چیخا ہوا سپر شیڈ کے کرشناٹی لاکٹ سمیت سینکڑوں فٹ گہری کھائی میں گرتا چلا گیا۔ یہ وہی کھائی تھی جس میں ان دونوں شیطانوں نے کرن کی لاش پھینکی تھی۔

ادھر آصف نے چوہدری ممتاز کے چہرے پر گھونٹے مار مار کر اس کا حلیہ بگاڑ دیا تھا اسی وقت اس کی نظر عمارت کے داخلی دروازے پر پڑی وہاں نرگس کھڑی تھی وہ حیرت سے آنکھیں پھاڑے عمارت کے دروازے پر کھڑی نرگس اور کبھی اپنے قریب کھڑی کرن کو دیکھ رہا تھا۔ گویا وہ واقعی کرن کی روح تھی۔

ادھر اسے غافل ہوتا دیکھ کر چوہدری ممتاز کے جسم میں تحریک پیدا ہوئی اس نے قریب ہی پڑا ریوٹ اٹھالیا آصف اس پر نظر پڑتے ہی چلایا۔ ”نرگس بھاگو۔“ نرگس اس کی طرف دوڑی۔

چوہدری ممتاز نے ریوٹ کا ٹین دبا دیا ایک ساعت شکن دھماکہ ہوا اور عمارت کے پرچے اڑ گئے۔ دھماکے سے ارد گرد کی زمین لرز اٹھی دھماکے کی شاک دیوے آصف، نرگس اور ڈی ایس پی دوبارہ زمین پر گر پڑے۔

DSP جہاں گرا وہاں آصف کا ہاسٹل پڑا تھا۔ اس نے ہاسٹل اٹھالیا اور اس کا رخ آصف کی طرف کر کے بولا۔ ”سیدھی طرح فارمولا میرے حوالے کر دو ورنہ گولی چلا دوں گا۔“

آصف ہنسا اور بولا۔ ”چوہدری ممتاز پاگل کے بچے میں یہاں باقاعدہ پلاننگ کے تحت آیا تھا میرے لباس میں ایک انتہائی حساس ڈیوائس موجود ہے ہمارے درمیان اب تک ہونے والی تمام گفتگو حساس ادارے کے اعلیٰ حکام سن رہے ہیں اور قریب ایک درخت کی گھنٹی

☆.....☆.....☆

کوہ پیما کے ماہر ترین افراد کی مدد سے بڑی مشکل سے کرن کی لاش اس کھائی سے نکال کر نماز جنازہ پڑھانے کے بعد وفتاوی گنی البتہ سپر شید و لاکٹ کا کوئی سراغ نہیں ملا۔ لائیو نیلی کاسٹ وڈیو کلیپ اور ریکارڈنگ سے آصف کی بے گناہی ثابت ہو چکی تھی زخمی کارندوں کی نشاندہی پر دشمن ملک کے ایجنٹ شیکھر اور اس گروہ کے دیگر کارندوں کو گرفتار کر لیا گیا البتہ اس ایجاد اور فارمولے کے ضائع ہونے کا دکھ تھا۔

زرگس نے بتایا۔ ”جب وہ کمرے میں قید تھی اس کی ہمشکل لڑکی نے اسے آزاد کیا اور تاکید کی کہ وہ کچھ دیر عمارت کے دروازے کے پیچھے چھپی رہے پھر باہر آجائے جب ممتاز کے چہرے پر آصف گھونے مار رہا تھا تبھی وہ باہر آگئی تھی پھر DSP نے ریموٹ اٹھایا اور زرگس آصف کے پکارنے پر وہاں سے بھاگی۔

زرگس فیض آباد لوٹ گئی۔ آصف اور اصغر اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے مگر کہانی یہیں پر ختم نہیں ہوتی کچھ دنوں بعد آصف کے والدین اصغر کے ساتھ فیض آباد آئے۔ زرگس کا کوئی سرپرست نہیں تھا اس لئے اصغر نے زرگس سے بات کی اور اس کا بھائی بن کر آصف کا رشتہ منظور کیا مگر اس کے لئے آصف کو ازدواجی زنجیر میں جکڑتے اس کی کئی شرائط ماننا پڑیں۔

آصف شادی کے بعد زرگس کے ساتھ اسپتال میں اس کا ہاتھ بٹانے لگا۔

اس روز بھی وہ اسپتال میں ہی تھے اور شام کو گھر جانے کے لئے اسپتال کی سیڑھیاں اترنے لگے کہ ایک ایسبولینس ہوڑ بھائی ہوئی اسپتال کے گیٹ پر رکی ایسبولینس کے پیچھے ایک پراڈ بھی تھی پراڈ سے نکلنے والے شخص کو دیکھ کر آصف چونک پڑا۔ وہ سردار جہانگیر خان تھا اس کے ساتھ موجود دوسرے بوڑھے کو دیکھ کر زرگس ششدر رہ گئی وہ اس کا باپ سلامت خان تھا جس نے اسے مجبوراً دریا میں دھکیلا تھا اس کے ساتھ ایک نوجوان لڑکا بھی تھا۔ ”ڈاکٹر خدا کے لئے میرے شیر خان

شاخوں میں روپوش نئی پھیل کارپورٹ جدید ترین اور حساس کیمرے سے ریکارڈنگ کر رہا ہے۔ بے وقوف جب سے میں یہاں آیا ہوں تمہیں اور مجھے لاکھوں لوگ اپنے اپنے ٹیلی ویژن سٹیشن پر دیکھ اور سن رہے ہیں سب تمہاری اسلیت جان پکے ہیں۔

اب رہا سوال پروفیسر کی ایجاد کا تو سپر شید و لاکٹ تمہارے ساتھی کی لاش سمیت سینکڑوں فٹ سبزی کھائی میں جاگرا ہے جواب شاید ہی کسی کو ملے اگر مل بھی تو اتنی بلندی سے گرنے سے ناکارہ ہو چکا ہوگا۔ رہا فارمولا تو وہ اسی عمارت کی تجربہ گاہ کے کمرے کی اماری میں خفیہ خانے میں پڑا تھا جسے تم نے ہم سے اڑا دیا ہے اب تم خالی ہاتھ ہو اور ساری زندگی جیل میں سڑتے رہو گے۔“ آصف ہنسا۔

”چوہدری ممتاز ہتھیار پھینک دو تم کمانڈوز کے گھیرے میں ہو۔“ ایک آواز گونجی اس نے آواز کی سمت دیکھا، پاروں طرف درجنوں کمانڈوز اور پولیس اہلکار موجود تھے، ان کی مہیب گنوں کا رخ اس کی طرف تھا۔

دوسری طرف آصف زرگس اور کرن کی روت موجود تھی، اب بچنے کا کوئی راستہ نہیں تھا اگر وہ آصف کو گولی مار دیتا تب بھی گرفتار ہو کر ساری زندگی جیل کی سلاخوں کے پیچھے گزار دیتا، یا پھانسی چڑھا دیا جاتا اس کا مستقبل تاریک ہو چکا تھا۔ بدنامی اور رسوائیاں اس کا مقدر تھیں۔ فارمولا اور ایجاد دونوں ہی اس کے ہاتھوں سے نکل چکے تھے۔

اس سے پہلے کہ کوئی سمجھتا چوہدری ممتاز نے پھل کی مال اپنی کپٹی سے لگائی اور ٹیگر و بادیا، فار کی ہولناک آواز فضا میں گونجی یوں ملک اور قوم کا ایک اور غدار جہنم رسید ہو گیا۔

کرن کی راج آصف کی طرف دیکھ کر مسکرائی اور غائب ہو گئی۔ درجنوں کمانڈوز زرگس آصف سمیت لاکھوں افراد اپنے اپنے TV سیٹوں پر یہ ناقابل یقین منظر دیکھ رہے تھے۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✧ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریچ
- ✧ ایڈ فری لنکس، لنکس کو پیسے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا
- ✧ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریزیوم ایبل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پریویو
- ✧ ہر پوسٹ کے ساتھ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریچ
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤسنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

کو بچا لویہ میرا کلوتا وارث ہے۔“

جان بچایا۔“ جہانگیر خان بولا۔
 ”خان صاحب شکریہ ہمارا نہیں ڈاکٹر زکس
 عرف شہناز بن سلامت خان کا ادا کریں جنہوں نے
 شیر خان کو خون دیا ورنہ اس گروپ کا خون ڈھونڈتے
 ڈھونڈتے شیر خان عالم بالا میں جا چکا ہوتا۔“ آصف
 بولا۔

اور جہانگیر خان سمیت سب چونک پڑے۔
 ”تم کس کی بات کر رہے ہو۔“ جہانگیر خان نے لرزتی
 ہوئی آواز میں پوچھا۔

”میں اسی شہناز کی بات کر رہا ہوں جسے تم نے کئی
 سال پہلے علم کی شمع جلانے کے جرم میں دریا برد کرنے
 کا حکم دیا تھا، وہ شہناز جو آج ڈاکٹر زکس ہے ذرا سوچو
 اگر آج وہ زندہ نہ ہوتی تو تمہارے بیٹے کی زندگی کون
 بچاتا، تم اس تباہ خون کا گروپ کہاں سے ڈھونڈتے۔“
 آصف جذباتی انداز میں بولا۔

اور جہانگیر خان نے شرمندگی سے سر جھکا کر کہا
 ”میں اپنی بیٹی سے ملنا چاہتا ہوں۔“

آصف کے اصرار پر جب زکس اس کمرے
 میں داخل ہوئی تو جہانگیر خان کے آنسو بہہ رہے تھے
 اس نے زکس کے سر پر شفقت سے ہاتھ رکھا اور لکھو گیر
 لہجے میں بولا۔

”بیٹی ہم کو معاف کر دو، میں غلط تھا تعلیم لڑکا
 اور لڑکی دونوں کے لئے ضروری ہے۔“

دو سال بعد ہی شیر خان اور جہانگیر خان کے
 گاؤں میں ان کی زمینوں پر بچوں اور بچیوں کے لئے
 دو اسکول تعمیر کر لئے گئے جہاں بچوں کو مفت یکساں تعلیم
 دی جاتی ہے۔ اس لالی گاؤں میں زکس نے ایک
 اسپتال بھی قائم کر رکھا ہے، ہر روز صبح گاؤں کے بچے وہ
 پڑھتے ہیں۔

لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری
 زندگی شمع کی صورت ہو خدایا میری



اپنے علاقے کا ایم پی اے غرور اور تکبر کا پیکر اس
 وقت اس معمولی ڈاکٹر کے سامنے گڑ گڑا رہا تھا جس کی
 موت کا حکم اس نے کئی برس پہلے صادر کیا تھا۔

شیر خان کو آپریشن ٹھیڑ میں پہنچا دیا گیا تیز
 رفتاری کے باعث شیر خان کی کارلوڈنگ ٹرک سے
 جاگرائی تھی اس حادثے میں ڈرائیور اور گارڈ موقع
 پر ہی جاں بحق ہو چکے تھے جب کہ شیر خان شدید زخمی
 تھا۔ اس کے جسم سے کافی مقدار میں خون بہہ چکا تھا
 سر میں شدید چوٹیں آئی تھیں۔ پسلیاں بھی ٹوٹ چکی
 تھیں اس کی نبض ڈوبتی جا رہی تھی اسے فوری طور پر
 خون کی ضرورت تھی۔

شیر خان کا بلڈ گروپ چیک کرنے پر پتہ چلا کہ
 اس کے خون کا گروپ تباہ ہے، یہ گروپ ہزاروں
 افراد میں سے ایک کا ہوتا ہے شیر خان کی زندگی بچانے
 کے لئے اس تباہ خون کی ضرورت تھی۔

وقت ٹھہری سے ریت کی مانند سرک رہا تھا
 اور شیر خان کی نبض ڈوبتی جا رہی تھی۔ اتفاق سے زکس کے
 خون کا بھی یہی گروپ تھا اس نے شیر خان کو خون کا عطیہ
 دینے کا فیصلہ کیا تو آصف تڑپ اٹھا۔ ”تمہیں کیا ہو گیا یہ
 وہی لوگ ہیں جنہوں نے تمہیں جان سے مارنا چاہا۔“
 ”لیکن میں مری تو نہیں ناں آصف، موت

اور زندگی اللہ کے اختیار میں ہے اور پھر میں ایک
 ڈاکٹر ہوں ایک ڈاکٹر کا فرض ہے کہ وہ اپنے مریض کی
 جان بچائے، چاہے وہ اس کا دشمن ہی کیوں نہ ہو۔“ وہ
 فیصلہ کن لہجے میں بولی اور آصف بے بس ہو گیا۔

شیر خان زکس کے دیئے گئے خون کے عطیہ کے
 بدولت بچ گیا اور روبہ صحت ہونے لگا۔

کچھ دنوں بعد جب آصف اور ڈاکٹر راہیل اس
 کمرے میں داخل ہوئے جس میں شیر خان ایڈمٹ تھا،
 شیر خان بیڈ پر ٹیک لگائے بیٹھا تھا، اس کے قریب
 جہانگیر خان سلامت خان اور زکس کا بھائی سلیم موجود
 تھے۔ ”ڈاکٹر تم لوگوں کا مہربانی جو آپ نے میرے بیٹے کا